شاداب

Rs 6-

ماہنامہ حیدرآباد

شاداب

(۸) — شمارہ (۱) — جنوری ۱۹۹۱ء — حیدرآباد

زرِ تعاون

	سالانہ	دو سالہ	تاحیات
ہندوستان	65 روپے	120 روپے	1500 روپے
خلیجی ممالک	200 روپے	360 روپے	3700 روپے
امریکہ	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	45 پونڈ	400 پونڈ
پاکستان	175 روپے	300 روپے	3000 روپے

قارئینِ شاداب

کو

سالِ نو مبارک

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ "شاداب"

147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد 4

• ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن آرٹ پریس چارکمان سے چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا ہے۔

فہرست

اُردو کی بقاء و ترویج کے لئے لازم ہے کہ ہر اُردو داں ایک شخص کو اردو سکھا

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

دینی مدارس اسلام کے قلعے

جدید اجتماعی و سیاسی تغیرات نے بہت سے قومی و مذہبی مسائل کو موضوع بحث بنادیا ہے اور زندگی کے بہت سے شعبوں اور اداروں کی ضرورت اور فائدہ پر بحث و تنقید کا دروازہ کھل گیا ہے مسلمانوں کے بعض حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہو گیا کہ عربی مدارس کی اس انقلابی زمانہ میں کیا ضرورت ہے اور ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی کا کون سا خانہ خالی رہتا ہے، آج کی صحبت میں ہم اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا سمجھ لینا ضروری ہے جو اس مسئلہ میں مبادی کا کام دیں گے

پہلی چیز یہ ہے کہ مسلمان قوم کا مزاج اور اقوام دنیا کی تمام قوموں سے مختلف ہے مذہب امت مسلمہ کے خمیر اور ترکیب میں داخل ہے یہ قوم کسی جگہ اور کسی وقت بھی غیر مذہبی نہیں ہو سکتی بلکہ مذہب اور ایک متعین مذہب، (اسلام) اس کے لئے اس کا تصور حیات، ملی قانون، مذہب، اس کے فکر و عمل کا مرکز، اس کے کاموں کی صحت و غلطی اور اس کی ترقی و تنزل کی میزان اور اس کی صحت مزاجی اور انحراف مزاج کا مقیاس ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس امت کی بنیاد ایک خاص قانون (شریعت) اور خاص دستور (قرآن و حدیث) پر ہے، یہ قانون مکمل اور یہ دستور محفوظ ہے اس امت کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی زندگی اور فکر کا سرچشمہ تغیر پذیر،

انسانی اجتہادات و تجربات اور غیر قطعی نظریات کے بجائے وحی الٰہی ہے، دنیا کی دوسری تہذیبوں کے برخلاف اس کی تہذیب و تمدن کی بنیاد دیواروں اور ستونوں، میناروں گنبدوں کاغذ کے شیرازوں، تصویروں کے نقوش اور موسیقی کے آلات پر نہیں ہے بلکہ چند ابدی حقائق چند اصولوں و نظریات اور اس مخصوص اخلاقی فلسفہ پر ہے جو وحی سے ماخوذ اور اس کا پیدا کیا ہوا ہے، دنیا کی دوسری "خوددار" اور "خودساختہ" قوموں کے برخلاف اس کے مستقبل کی بنیاد اس کے ماضی پر ہے، اس کے سامنے زندگی کا ایک بلند ترین معیار اور ترقی کا آخری نمونہ ہے اور یہ نمونہ گذر چکا ہے لیکن تاریخی و تحریری طور پر محفوظ ہے یہ سنتِ رسولؐ، اسوۂ صحابہ اور خلافتِ راشدہ کا عہد ہے "سنت" اور "سلف" کی جو اہمیت اسلامی تعلیمات میں ہے غالباً کسی دوسرے مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔

یہ چیز بھی قابلِ ذکر ہے کہ دین کا مفہوم جتنا اسلام میں وسیع اور ہمہ گیر ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو اسلام کے صحیح نقطۂ نظر اور تعلیماتِ نبویؐ کے مطابق سچے مسلمان کی پوری زندگی دین ہے اور نیت کے تغیر سے اس کا ہر کام عبادت ہے، اس لئے اس میں دین و دنیا کی وہ تقسیم نہیں ہے جو کسی مذہب میں ہے نہ دین و دنیا کے شعبے اور ان کے اشخاص اس طرح علیحدہ علیحدہ اور ان کے حدود ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں جس طرح ... مذہب مسلمان کی زندگی میں جلد موثر ہوتا ہے اور جلد متاثر، اگر اس کی زندگی کے مسائل نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ دین کی روشنی میں اور اس کی مصالحت اور سمجھوتہ سے طے نہ کئے جائیں تو نہایت آسانی سے وہ دین سے ٹکرا جاتے ہیں اور مسلمان کی زندگی اور اس کے مذہب پر ان کا اثر پڑتا ہے، مثال کے طور پر صلح و جنگ کے قوانین، تعزیرات، لین دین کے معاملات اور کتنے اجتماعی و معاشرتی سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن کا مذہب سے گہرا تعلق اور ... قانون سے ارتباط ہے۔ ان مسائل کو طے کرنے کے لئے کتنی دینی بصیرت اور ... قدر علم کی ضر... ...

جس قوم کا مزاج اتنا نازک اور پیچیدہ ہو اور جس کے مذہب وقانون کا دائرہ اتنا وسیع ہو اس کے علاج و طبی مشورے کے لئے کیسے مزاج داں و نباض اور کیسے حاذق کی ضرورت ہے ۔

جو طبقہ یا جماعت مسلمانوں کی رہنمائی کے منصب کی امیدوار ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے قانون اور دستور سے واقف ہو۔ اس سرچشمہ سے سیراب ہو جس سے اس کی زندگی کی نہریں پھوٹی ہیں اور اس کی رگوں میں اس کا آبِ حیات جاری ہے ان ابدی حقائق کا علم اور ان اصول و نظریات پر یقین رکھتا ہو اور اس اخلاقی فلسفہ کا قائل اور حامل ہو جس پر امت کے تمدن و تہذیب کی بنیاد ہے اس کے ماضی سے باخبر اور اس بلند معیار اور نمونہ سے متاثر ہو جس پر نیز امت کے حال و مستقبل کی تعمیر ہونی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت سمجھ لینی چاہیئے اسلام دراصل نام ہے اس مستقل واضح اور متعین دینی اخلاقی اور اجتماعی نظام کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں لے کر آئے اسی کا نام شریعتِ محمدی ہے، اس میں عقائد بھی ہیں، اعمال اخلاق و معاملات بھی باقی جو کچھ ہے یا اس کے لئے وسیلہ ہے یا اس کا نتیجہ ۔ امت کا سب سے بڑا فریضہ اس نظام کی حفاظت ہے ۔
عقائد کی حفاظت بھی ضروری ہے اور احکام کی حفاظت بھی ! ضرورت ہے کہ عقائد ان تمام تحریفات سے محفوظ رہیں جو دوسروں کے مذاہب میں پیش آئیں اور جس کا اس امت میں بھی ہر وقت خطرہ ہے، ضرورت ہے کہ نبوتِ محمدیؐ نے ذات و صفاتِ باری تعالیٰ توحید و رسالت، قضا و قدر، حشر و نشر امورِ غیب اور وحی کے متعلق جو تشریح کی ہے اور ان کے جو حدود قائم کئے ہیں۔ اس لئے کہ ان تمام مسائل کی بنیاد قیاس و تخمین پر نہیں بلکہ وحی و نبوت پر ہے اور نبوت محمدیؐ نے اس کی تکمیل کر دی ہے۔

احکام پر عمل اسی طرح ہو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا اور صحابہ کرام رضؓ کے زمانہ میں ہوا ۔ شرعی احکام و عبادات میں ترمیم و اضافہ (بدعت) سے مذہب کو محفوظ رکھا جائے پرانے آسمانی مذاہب ان بدعات کی وجہ سے اس طرح مسخ ہوئے کہ اب ان کے انبیاء کی

لئے ان مذاہب کا پہچاننا ناممکن ہے ۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان عقائد و احکام کی برابر اشاعت وتعلیم ہوتی ہے ، اس لئے کہ دین کا بقا اسی پر منحصر ہے ۔

اس کے علاوہ اُمتِ محمدیؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا میں بھلائی کی تلقین (امر بالمعروف) اور برائی کی ممانعت (نہی عن المنکر) کرتی رہے ۔ایک آیت میں اُمت کے پیدائش و ظہور کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کنتم خیر امۃٍ اُخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر وتؤمنون باللّٰہ (آل عمران ع ۱۲)

(تم سب اُمتوں سے بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو ۔)

لیکن یہ اُمت کا بحیثیت مجموعی فریضہ ہے اگر اس میں سے ایک معتد بہ جماعت یہ فرض انجام دے تو گویا پوری اُمت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے اس لئے دوسری آیت میں اُمت کے ایک بڑے گروہ کا جس پر خود اُمت کا اطلاق ہو سکے یہ فریضہ بتایا گیا ہے مگر امتِ صغریٰ کا پیدا کرنا اور اس کو اس کا موقع دینا خود امتِ کبریٰ کا فرض قرار دیا گیا ہے ۔فرمایا :

ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (آل عمران ع ۱۱)

"(تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئیے جو خیر کی دعوت دے ، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے")

اس تقسیم عمل کے اصول کو یہ آیت اور زیادہ واضح کرتی ہے

وما کان المومنون لینفروا کافۃً فلولا نفر من کل فرقۃٍ منھم طائفۃٌ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (توبہ ع ۱۵)

" (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کریں کہ ہر جماعت میں سے چند اشخاص نکل جائیں تاکہ دین کا علم سیکھیں اور اس میں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو ان کو خوف دلائیں تاکہ وہ کچھ خوف کریں) "

نہایت آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ مندرجہ بالا فرائض نظامِ شرعی کی حفاظت عقائد و نظام کو اپنے مقام پر رکھنا اور ان کو تحریف و بدعات سے بچانا شریعت کی اشاعت و تعلیم اور تبلیغ و اصلاح کے فرائض قوم کا کون سا طبقہ انجام دے سکتا ہے۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ نظامِ شرعی کی حفاظت اور اس کے لئے ایثار و قربانی صرف وہ طبقہ کر سکتا ہے جس کی ذہنی اور عملی تربیت اس کے موافق ہوئی ہو، جس کے رگ و ریشہ میں اس نظام کی محبت اور اس کا عشق و احترام پیوست ہو گیا ہو، اور جس کے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اس کا یقین اُتر گیا ہو، اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ جب اس نظام پر کوئی کاری ضرب لگائی گئی یا اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو ہمیشہ یہی طبقہ بے چین ہوا اور سر سے کفن باندھ کر میدان میں اُتر آیا، حضرت حسینؓ، زید شہیدؒ، محمد ذوالنفس الزکیہؒ، ابراہیم بن عبداللہؒ کی قربانیاں اور سرفروشی، اور اموی و عباسی محرّف نظامِ سلطنت کے خلاف تحریک جہاد اسلامی نظام کی حفاظت کی کوششیں ہی تھیں، پھر ان خونیں معرکوں کے مظلوم شہدا اگر عالم کہلانے کے مستحق نہیں تو روئے زمین پر پھر عالمِ دین کہلانے کے مستحق کون ہے؟ ان کے حامیوں اور مددگاروں میں بھی سرفہرست نام امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

جب عباسی سلطنت کی طرف سے اُمت پر جبر یہ خلقِ قرآن کا عقیدہ مسلط کیا جا رہا تھا اس خطرناک تحریف والحاد اور اس غیر اسلامی عقیدہ کے خلاف وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی کے مقابلہ میں حفاظتِ دین کے لئے جو شخص تنہا میدان میں آیا وہ جماعت علماء کا ممتاز فرد احمد بن حنبلؒ تھا جس کے عزم و استقامت اور ایمان کے سامنے حکومتِ وقت کو

جھکنا پڑا۔ اور یہ عقیدہ تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ آج کتنے مسلمان [illegible] بھی سمجھتے ہیں۔

تیسری صدی کے آغاز میں جب عباسی سلطنت کی غفلت سے بغداد میں سخت ابتری، فجور اور بدامنی پھیلی تو دو عالموں خالد الدریوش اور سہیل بن سلامتہ الانصاری نے قانون ہاتھ میں لیا اور قوت و جمعیت کے ساتھ "من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ" پر عمل شروع کر دیا، جس کی پاداش میں وہ دونوں گرفتار ہوئے اور قید کر دیئے گئے۔

بعد کے زمانے میں دو جلیل القدر عالم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور امام ابن جوزیؒ نے اسلامی نظام اخلاق کی حفاظت اور مسلمانوں کی روحانی و دینی اصلاح کے سلسلے میں [illegible] انجام دیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد اسلامی نظام کو اپنے مرکز اصل پر لانے کے لئے عقائد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفہیم اور صحابہؓ کے فہم کے مطابق سمجھنے کے لئے امام ابن تیمیہؒ نے جو علمی و عملی خدمات دیں وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔

ہمارے ہندوستان میں اسلام کے نازک ترین دور میں جب (مورخ اسلام [illegible] الفاظ میں) عجم کے ایک جادوگر نے بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہو گئی وقت ہے کہ ایک شہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین [illegible] بھی گرجا سے عیسائیوں نے ناقوس بجائے، برہمنوں نے بت [illegible] اور [illegible] کہ مسجد اور بت خانے کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار [illegible] تو جو مسلمان مجاہد اس فتنہ اکبر کے مقابلہ کے لئے میدان میں آیا اور جس نے سلطنت کا رخ ہی پھیر دیا اور جس کی عہد آفریں تحریک اور انقلاب انگیز تجدید نے اکبر کے گھرانے میں عالمگیر جیسا متشرع فرمانروا [illegible] پیدا کیا وہ علمائے ربانی کا سرتاج مجدد الف ثانی شیخ سرہندی رحمۃ اللہ تھا۔

اس کے بعد آج اس وقت تک ان عجمی دیار میں غریب الوطن عربی مہمان کی جس نے سرپرستی اور حفاظت کی اور ہوا کے طوفانوں میں اس چراغ کو جو بار ہا چراغ سحری بنا، گل نہ ہونے دیا وہ علمائے دہلی کا مشہور بابرکت خاندان ہے جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے عہد آفریں علمی کارناموں اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اپنی قربانی اور سرفروشیوں کی بنا پر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ بھی حفاظتِ دین، ردِ بدعات، اصلاحِ رسوم اور الحاد و زندقہ کے مقابلہ کا جتنا کام اس وقت تک ہوا اور اس وقت بھی ہو رہا ہے وہ سراسر اسی طبقہ سے ہو رہا ہے۔

اگر دین اور اس کے شرعی نظام کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کو محض ایک قوم بن کر نہیں بلکہ ایک صاحبِ شریعت و کتاب قوم بن کر رہنا ہے تو مذہب کے محافظین و حاملین اور شریعت کے ترجمان و شارحین کی ضرورت ہے اور اگر ان کی ضرورت ہے تو لامحالہ ان مرکزوں اور اداروں کی ضرورت ہے، جو ایسے اشخاص پیدا کر سکتے ہیں اور یہ ضرورت مسلمانوں کی ہر قومی ضرورت سے اہم ہے۔

خلافتِ راشدہ کے طرز کی اسلامی سلطنت میں بھی دینی مدارس کی ضرورت ہے تاکہ امت کے اسلامی جسم میں ہر دم تازہ خون پہونچتا رہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ جس نظام کی پشت پر ایسا ادارہ یا تربیت گاہ نہ ہو جو اس قسم کے اشخاص پیدا کرتا رہے جو اس نظام کو چلا سکیں اگلوں کی جگہ لے سکیں اور اس مشین میں فٹ ہو سکیں، اس نظام کی جڑیں ہمیشہ کھوکھلی اور اس کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔

اگر برائے نام اسلامی سلطنت بھی ہے تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لئے دیندار امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے والے کارکن مل سکیں۔

لیکن اگر کسی ملک میں بدقسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہو تو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ قائم مقامی کر سکتی ہے اور حفاظتِ دین

(بقیہ ص ۲۶ پر)

سید عروج احمد قادری

قسط ۶

اسلامی تصوّف

۵۔ اس عظیم حدیث میں جس پر گفتگو ہو رہی ہے کہا گیا ہے "اور جس کی ہجرت کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہے تو وہ اسی کے لئے ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی"

امام نووی نے اس کی شرح میں لکھا ہے۔

ومن قصد بها دنیا او امرءة فهی حظه ولا نصیب له فی الآخرة سبب هذه الهجرة۔	اور جس نے ہجرت سے دنیا یا کسی عورت کا قصد کیا تو وہی اس کا حصہ ہے اور اس ہجرت کی وجہ سے آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

حدیث کے اس ٹکڑے نے نیت کے اخلاص کو عدم اخلاص سے بالکل الگ کر دیا ہے عبادت کسی نیک کام کے پردے میں دنیا کے کسی فائدے کو مقصد بنانا بدترین نیت ہے کیونکہ یہ منافقت ہے۔ آدمی دوسروں کو یہ دکھائے کہ وہ عبادت یا نیک کام اللہ کے لئے کر رہا ہے لیکن اصل غرض دنیا کا حصول ہو۔ علماء سوء، مکار صوفیہ اور دوسرے دین فروش لوگوں نے اس پردے میں نہ جانے اللہ کے کتنے بندوں کو لوٹا اور انھیں گمراہ کیا ہے۔

آج کل کتنے ہی لوگ بظاہر حج کے ارادے سے مکہ جاتے ہیں لیکن اصل غرض دنیا کا حصول ہوتا ہے۔

مثلاً مختلف قسم کے ارزاں سامانِ تجارت خرید کر چوری چھپے اور رشوت دے کر ہندوستان لانا اور

یہاں کثیر منافع پر اس کو فروخت کرنا۔ یہ دنیا پرست لوگ اتنے مدہوش ہیں کہ حج کی عبادت کو
ی بدنام کر رہے ہیں۔

۶۔ دوسری صحیح احادیث سے کسی اچھے کام کی نیت اور کسی بُرے کام کی نیت کا ایک پہلو سامنے
آتا ہے کہ اچھے اور نیک کاموں کی صرف نیتوں کو بھی نیکیوں میں شمار کیا گیا ہے جن پر اجر ملے گا
ور بُرے کاموں کی نیتوں کو اس وقت تک بُرائیوں میں شمار نہیں کیا جاتا جب تک ان پر عمل نہ کیا
اۓ بلکہ بعض صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی بُرے کام کا ارادہ کیا گیا مگر اس پر
ل نہ کیا جائے تو اس ارادے (نیت) کو بھی ایک نیکی شمار کیا جائے گا۔

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور یہ ان حدیثوں میں ہے جو آپ نے اپنے رب تبارک و تعالےٰ سے بیان کی ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے حسنات و سیئات لکھ دیئے ہیں اور پھر ان کو بیان کر دیا ہے تو جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا پھر اس پر عمل نہیں کیا، اللہ اس کو اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھے گا اور اگر اس کا ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کیا تو اللہ اپنے پاس اس کو دس نیکیاں سات سو گونہ تک بلکہ اس سے بھی زیادہ لکھے گا اور اگر کسی بُرائی کا ارادہ کیا پھر اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھے گا اور اگر اس کا ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کیا تو اللہ تعالےٰ اپنے پاس اس کو ایک بُرائی لکھے گا [1]

اسی مضمون کی حدیث امام مسلم نے کتاب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی نے بُرے کام کے ارادے پر عمل نہیں کیا تو وہ اس کے نامۂ اعمال میں درج نہیں کیا جائے گا۔

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم

نے کہا، تمہارا صدقہ قبول کر لیا گیا۔ رہی بدکار عورت تو شاید وہ اس صدقہ کی وجہ سے اپنی بدکاری سے باز آ جائے اور مالدار آدمی عبرت حاصل کرے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے لگے اور چور تو شاید آئندہ وہ اپنی چوری کی عادت ترک کر دے ۔ ؎

یہ حدیث امام نسائیؒ نے بھی کتاب الزکوٰۃ "باب اذا اعطاہا غنیا و ہو لا یشعر" میں روایت کی ہے محدثین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ہے اس حدیث میں اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کا جو جملہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بدکار عورت یا مالدار یا چور کو صدقہ مل جانا میرے ارادے سے نہیں ہوا۔ تیری مشیت اور ارادے سے ہوا اور تیرے تمام ارادے اچھے اور قابلِ تعریف ہیں۔

اس حدیث میں "اس کے پاس کوئی آنے والا آیا اور کہا" اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو خواب میں خبر دی گئی یا اس نے کسی ہاتف کی آواز سنی یا وقت کے کسی نبی نے اُسے بتایا، یا بنی اسرائیل کے کسی عالمِ دین نے اس کو یہ فتوی دیا کہ تیرا صدقہ قبول ہو گیا ۔۔۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین بار [illegible] جو اس کے مستحق نہ تھے، اور نہ انھیں صدقہ دینے کا ارادہ کیا گیا تھا [illegible] لیکن وہ صدقات عند اللہ مقبول ہوئے۔ کیونکہ صدقہ دینے والے کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔

دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ نیت میں خلوص ہو تو صدقہ لاعلمی میں کسی غیر مستحق ایسے شخص کو مل جائے جس کا ارادہ نہ کیا گیا ہو تو صدقہ دینے والے کے اجر میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا اور وہ صدقہ عند اللہ قبول ہوگا۔ (باقی آئندہ)

اردو زبان میں جس قدر مستند دینی لٹریچر ہے کسی اور زبان میں نہیں
لہذا اپنے بچوں کو اردو پڑھائیے

؎ مسلم کتاب الزکوٰۃ باب اجر المتصدق وان وقعت الصدقۃ فی ید فاسق و نحوہ

سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی
بیبہ آغا پورہ ۔ حیدرآباد

بیعت و ارادت

بیعت کیا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں ! بیعت ایک معاہدہ ہے ۔ عربوں ایک عادت یہ ہے کہ کوئی معاہدہ کیا جاتا ہے تو ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں ۔ تمام سلطنتوں میں ف وفاداری لیا جاتا ہے اسی طرح کسی اہم بات کی تاکید پر بیعت لی جاتی ہے رسول خدا صلی اللہ یہ وسلم کے زمانے میں کوئی مسلمان ہوتا تو بیعت کرتا ۔ توبہ کرتا تو بیعت لی جاتی بعض دفعہ رسول خدا ن اللہ علیہ وسلم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ثابت قدم رہنے کے لئے ، بیعت لی ہے غرض کہ کسی اہم چیز پر عہد لینے کا ۔ ۔ ۔

ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان میں دو چیزیں ہیں

(۱) جسم اور (۲) روح

روح کو جسم پر فضیلت ہے ۔ اچھی روح اچھے جسم میں ہوتی ہے جسمانی نظام قائم رکھنے لئے جسم کو تندرست رکھے اور بیماریوں سے صحت تامہ حاصل کرنے جس طرح ڈاکٹروں طبیبوں ضرورت ہے اسی طرح روحانی تربیت کے لئے طریقت ، حقیقت ، معرفت کے معلموں کی ضرورت ہے روحانی امراض کو دور کرنے کی تدابیر بتانے والے مرشد ہوتے ہیں شریعت تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے اس کے ماہر علماء اور مشائخین کرام ہوتے ہیں ۔ طریقت کے لئے بیعت کا ہونا ضروری ہے ۔ بہترین شریعت وہ ہے جس میں طریقت کی بھی چاشنی ہو ۔ ۔ ابتدائی مراتب کا نام ہے اور طریقت اس کے مدارج کا ۔ اخلاقی اسباق کردار کو اچھے

اس صورت حال کا کسی شاعر نے خوب جائزہ لیا ہے۔

ز نقص تشنہ لبی دان بہ عقل خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

پیر اور مرید کا تعلق اللہ واسطہ کا ہوتا ہے اس لئے پیر کی باتوں اور ہدایتوں پر مرید
ن و دل سے عمل پیرا ہوتا ہے تب ہی تو پیر کی تعلیم مرید کے حق میں اصلاح کا موجب ہوتی ہے عالم
پر مرشد کو فضیلت ہے اس لئے کہ مرشد عالم بھی ہوتا ہے اور واقف راز حقیقت بھی۔ عشق محبت
ر خلوص کے ساتھ وہ اپنے مریدوں کو شریعت کا پابند بھی بناتا ہے اور طریقت کے منازل بھی طے کرتا ہے
قرآن مجید میں آیا ہے "مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ
رَفِيقًا" یعنی جو لوگ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں وہ لوگ ان حضرات
کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے اپنا فضل اور احسان فرمایا۔ یعنی نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور
صالحین کے ساتھ رہیں گے یہ ان کے بہترین ساتھی ہیں لہٰذا طالب حق کو مرشد کی صحبت اختیار کرنی
چاہیئے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اَلشَّيْخُ فِي قَوْمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِي اُمَّتِهٖ۔ مرشد اپنے
[illegible] ایسا ہے جیسا کہ نبی اپنی امت میں۔

قرآن مجید میں جو بیعت کے احکام ہیں اگر صاف طور پر احکام دیئے جاتے ہیں تو بیعت کرنا
فرض ہو جاتا۔ اس لئے کہیں واقعتاً۔ کہیں ضمناً ہدایت فرمائی گئی ہے بیعت کرنا سنت ہے چنانچہ بیعت
کرنے سے توبہ قبول ہوتی ہے دل کا آئینہ مرشد کی صحبت میں جلا پاتا ہے مرشد اعمال کی قبولیت کا وسیلہ
بنتا ہے بیعت کے ذریعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت متصلہ حاصل ہو جاتی ہے۔ مرشد جانکنی کے وقت
مرید کو شیطان کے وسوسوں سے بچاتا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد مرتب ہوتے ہیں

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

مولانا ہادی نقشبندی
خانقاہ نقشبندیہ۔ بالاپور (۴۴۴۳۰۲)
مہاراشٹرا

رئیس جامعہ علی گڑھ

۱۹۴۸ء کے سقوط حیدرآباد کے بعد نامساعد حالات نے حکومت آصفیہ اور آصف سابع سے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں اس کی تلافی و تدارک کے علاوہ صحت و عدم صحت کا اندازہ اس وقت ہو سکے گا جب اس دور کے رفاہی و فلاحی علمی و ادبی افکار اور کارناموں کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے اور ان میں اصلی مسائل و مقاصد کا خصوصی طور پر ہندو مسلم اتحاد کی واحد یادگار ان کے تمدن و معاشرت اور ثقافت کا دائمی ذریعہ اردو میں اولین یونیورسٹی "جامعہ عثمانیہ" و "دارالترجمہ" دور آصفی کا وہ عظیم کارنامہ ہے جو باوجود خاتمہ و امتداد زمانہ رہتی دنیا تک زریں تاریخ رہے گا ان تمام امور کی حقیقت نگاری کے ذریعہ یاد تازہ کرنے کا "شاداب" نے آصف جاہی عہد یادوں کی اشاعت کے عملی اقدام سے اپنایا ہے قابل قدر و لائق ستائش ہیں اور اس کے مدیر اعلیٰ جناب محمد قمرالدین صابری صاحب بھی لائق مبارکباد ہیں۔

۱۹۳۷ء میں "الرایات" آگرہ نے اپنے عثمانیہ سلور جوبلی نمبر میں حضرت مولانا ہادی نقشبندی صاحب سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ عنایت اللّٰہی بالاپور کا مضمون "رئیس جامعہ علی گڑھ" شائع کیا جو ۱۹۲۶ء میں، پچپن سال پہلے جب موصوف مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے تحریر فرمایا تھا جو اس سلسلہ کی ایک

کرتی ہے پیش کررہا ہوں۔

یہاں اس کا اظہار بے موقع نہ ہوگا کہ ڈاکٹر زور نور اللہ مرقدہ نے حیدرآباد کی آبادیاں والے مضمون میں "شاہ عنایت گنج" جو بیگم بازار سے متصل ہے کا ذکر نہیں کیا جو اپنی تاریخی اہمیت و نوعیت کا ایک عظیم واقعہ ہے ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں آصف جاہ اول محاربہ بالاپور میں رات کے آخری حصہ میں آستانۂ حضرت شیخ الاسلام سید شاہ عنایت اللہ حسینی الحسینی نقشبندی القادری قدس سرہ پر حضرت حجۃ الاسلام سید شاہ ظہیرالدین عنایت اللّٰہی رح (سجادہ نشین دوم) کی صحبت میں حاضر ہوئے اور درخواست دعا کی اور بعد فتح و کامرانی بطور یادگار حیدرآباد میں "شاہ عنایت گنج" آباد کیا۔ اور جو محلہ مبارک میں بیالیس حفاظ بغرض ایصالِ ثواب بزرگانِ خانقاہ مقرر کئے اور تیسرا باغ نقشبند روشن کروایا۔

(ذکی نقشبندی عنایت اللّٰہی عفی عنہ)

جامعہ یا یونیورسٹی اس درس گاہ کو کہا جاتا ہے جو تمام علوم و فنون، تمدن کا منبع و مخزن ہو۔ تاہم یونانیوں نے اس کو "مرکز علم و حکمت" سے تعبیر کیا ہے یہی وجہ تھی کہ انگلستان کے ایک مشہور [illegible] جان ہنری نیومن نے اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ" ایک یونیورسٹی میں دنیا کے مختلف حصوں کے [illegible] علماء کا اجتماع ضروری ہے اگر ایسا نہ ہو تو علم کے ہر شعبہ کے لئے موزوں اساتذہ ایک خطہ سے کیسے فراہم ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ لوگ ایک ہی جگہ جمع ہوں۔ ورنہ جامع درسگاہ کا [illegible] ہو سکے گا۔ بس یونیورسٹی وہ درس گاہ علوم و فنون ہے جس میں ہر قسم کے علم و حکمت کے ماہرین اور طلباء دنیا کے مختلف حصوں سے آکر ایک جگہ جمع ہوں اور ان کی زندگی کا مقصد صرف ایک ہی ہو جس کو ہم "علم" کہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں جامعہ عثمانیہ ہی ایک واحد درس گاہ ہے جو اس نظریہ کا پورے طور پر

اطلاق ہو سکتا ہے جو نہ صرف ہندی مسلمانوں کی محدود درس گاہ ہے بلکہ اُسے ہندوستان کے تمام طبقات اور دنیائے اسلام کا مرکزِ علم ہونے کا فخر حاصل ہے جس کے اساتذہ و طلبار میں دنیا کے ہر خطہ ملک و مذہب قوم کے لوگ شامل ہیں بس اس درجہ عظیم الاثر درس گاہ کی قیادت اصلاح اور رہنمائی کے لئے کس درجہ ممتاز صلاحیت کی شخصیت درکار ہے اور اُسے کن چیزوں سے متصف ہونا چاہیئے یہی ایک نصب العین ہے جس کے پیش نظر میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم حضور بندگانِ عالی متعالی نواب میر عثمان علی خاں بہادر خسرو دکن خلد اللہ ملکہ، سلطنتہ رئیس جامعہ علی گڑھ سے بحث کروں گا۔

سلطنت آصفیہ اور علی گڑھ کو جو قرب ایک دوسرے سے حاصل ہے اُس کا ثبوت علی گڑھ کی گذشتہ ساٹھ سالہ تاریخ ہے جس کا ایک ایک حرف حیدرآباد اور والئی حیدرآباد کے احسانات سے مملو ہے جس سے ملک و قوم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ حضور غفران مکان سے لے کر موجودہ آصف جاہ سابع تک علی گڑھ کی ہر تحریک والئی حیدرآباد کی ممنونِ کرم ہے ایم اے او کالج نے جب یونیورسٹی کے قالب میں جنم لیا اُس وقت آصف جاہ موجودہ خسرو دکن ہی نے سب سے پہلے اس کے کثیر اخراجات کے بارگراں میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے نظام میوزیم، آسمان منزل، عثمانیہ ہاسٹل، معملات سائنس نظام صدر کرسی، کیمیار و طبعیات اور ایک عطیہ خطیر جو سالانہ مستقل طور سے جاری ہے او لذکر دو عمارات کو چھوڑ کر بقیہ تمام موجودہ فرمانروائے حیدرآباد کی عنایات کی مرہونِ منت ہیں علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے سب سے بڑے محسن و مربی اعلیٰحضرت ظل السبحانی کی چانسلرشپ سے اس وقت تک فیضیاب نہ ہو سکا تھا آج وہ اپنی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کرے بجا ہے۔

اعلیٰحضرت بندگانِ عالی کا شغف علمی، معارف پروری، ادب نوازی اور مشرق پرستی اظہر من الشمس ہے مشرقی ادبیات و فنون سے دلچسپی کا انداز اس فرمانِ خسروی سے جو رجب ۱۳۳۵ھ ۱۹۱۲ء میں بموقعہ "تاسیس جامعہ عثمانیہ" صادر ہوا ہے جس کو یہاں درج کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔

" ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم، مشرقی و مغربی علوم وفنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمانی، دماغی و روحانی تعلیم کے جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبار کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو کو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازم گردانی جائے "۔

ان سطور کا حامل بحیثیت " رئیس جامعہ " جامعہ علی گڑھ کی قیادت و رہنمائی کے لئے جس قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے وہ محتاج بیاں نہیں ہے۔

حیدرآباد اور ریاست حیدرآباد نے حضورِ اقدس کے ظلِ عاطفت میں جو علمی، معاشرتی اور معاشی ترقی کی ہے اس کی مثال ہندوستان کی کوئی ریاست پیش نہیں کر سکتی۔ احیائے علوم و فنون میں حضرت ظلِ السبحانی کی خاص توجہ نے اس جمود کو توڑ دیا جو عرصہ سے حیدرآباد پر چھایا ہوا تھا " جامعہ عثمانیہ " کے قیام نے دکن کی علمی فضار میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے جس کے شاندار نتائج آج ہمارے سامنے ہیں دَورِ ہمایونی میں " بابِ حکومت " کا قیام اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اعلیحضرت کتنے روشن خیال اور بیدار مغز فرمانروا ہیں " آرائشِ بلدہ " کی اسکیم نے حیدرآباد کی حُسن و خوبصورتی میں جان ڈال دی۔ قحط و امساکِ باراں سے حفاظت کے لئے عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر جیسے تالاب اس عہدِ میمنت ... کی ... یادگار ہیں برقی روشنی کا تعارف، عام نلوں کی تنصیب میں اصلاح۔ اضلاع میں نلوں اور ٹیلیفون کا قیام اور ڈرینج کی تکمیل۔ اس ذاتِ اقدس کے فیوض و اکرامِ شاہانہ ہیں۔ اس قدر روشن خیال منتظم اور بیدار مغز رئیس جامعہ کو نصیب ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ شاید علی گڑھ کے اب دن پھرے ہیں جیسے اعلیحضرت جیسا چانسلر ملا ہے جو آئندہ اس کے

حسن و قبح کا امین و محافظ ہوگا۔

اعلیٰحضرت کی رواداری و اکرام شاہانہ بلا کسی امتیاز قوم و مذہب و ملک عام ہیں۔ تجر علمی، سیاست، تدبر اور حکمرانی کی صفات عالی کے علاوہ حضور کے اخلاق عالیہ، بے نظیر رعایا پروری، فقید المثال کیریکٹر اور سادگی بھی اپنے آپ نظیر ہے آج دنیا میں کتنے ایسے ادارے ہوں گے اور کتنے مفلس و غریب ہوں گے جو شاہ دکن کے جود و کرم و سخا سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ہندو یونیورسٹی، شانتی نکیتن، اینگلو عربک و طبی کالج دہلی، جامعہ ملیہ، ندوہ، دیوبند، بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونہ اور صدہا رفاہ عام کے کام ہیں جن کے لئے کئی مستقل کتابوں کی ضرورت ہوگی جو نہ اس وقت میرے اس مضمون کی تحریر کا مقصد ہے۔ اور نہ اس کی ضرورت مجھے تو یہ بتلانا ہے کہ میرے ممدوح کو مشرقی ادبیات و علوم و فنون سے کس قدر دلچسپی ہے اور وہ بحیثیت انسان و حکمران کس قدر زبردست و اعلیٰ اخلاق و عادات اور سادگی کا نمونہ ہیں جو ہر ایک لئے باعث تقلید و قابل عمل ہے اور ایک رئیس جامعہ (چانسلر) کے لئے ان تمام صفات کی ضرورت ہے جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں، دنیا دیکھ لے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست و عمارت کا مالک جسے خود اپنی ریاست کے کاروبار سے فرصت نہیں ہے جو اپنی یونیورسٹی کی چانسلری بھی قبول نہیں کرتا ملک و قوم اور خلق اللہ کی خدمت کے لئے دارالسلطنت سے ہزاروں میل دور کی یونیورسٹی کی قیادت و رہنمائی کا بارگراں اپنے جواں ہمت و جواں بخت کاندھوں پر اٹھا لیتا ہے۔

خدایا ایسے محبوب و مخدوم بادشاہ کے عمر و اقبال میں ترقی عطا فرما جو اپنے آرام و آسائش سے زیادہ خلق خدا کی خدمت و بہبودی کا جذبہ و خیال رکھتا ہے آج ہم اسی عظیم المرتبت ہستی کے دور حکومت کی پچیس ۲۵ سالہ نقرئی جوبلی منا رہے ہیں ہمارے قلوب مسرت و شادمانی سے معمور ہیں اس کا اظہار قوت تحریر و تقریر سے باہر ہے دعا ہے کہ اے خدائے قدیر ہمارے آقائے ولی نعمت کی ہمیں کئی ایسی جوبلیاں منانی نصیب کرے اور دکن و علی گڑھ اس بیدار مغز فرمانروا کے ظل عاطفت میں مدتوں فیض کام رہیں۔

الہٰی دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد (عثمانیہ جوبلی نمبر البرہان آکولہ کے شکریہ کے ساتھ)

مولانا بدرالحسن قاسمی
صلالہ۔ حیدرآباد

کویت علمی و دینی خدمات

مولانا بدرالحسن قاسمی جامعہ عثمانیہ کے ہونہار سپوت ہیں۔ آپ عربی کے عالم ہیں تقریباً ایک دہے سے زائد عرصہ تک کویت میں مختلف کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ کویت کے بارے میں آپ قیمتی معلومات قارئینِ شاداب" کی خدمت میں پیش ہیں۔

"کویت" خلیج کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جسے عام طور پر لوگ پٹرول کی دولت کی فراوانی شکوہ محلا بے، عالیشان عمارتوں، کشادہ اور خوشنما سڑکوں اور ان پر دوڑتی ہوئی قیمتی اعلٰی قسم کی جرمن، جاپانی اور امریکن کاروں کی وجہ سے جانتے ہیں اور جو لوگ وہاں رہ کر آئے ہیں ن کے ذہنوں میں بھی عام طور پر یہ صحرا کے دامن میں لندن اور پیرس کے ہم پلہ ایک جنت نشان ہر' جہاں ساری دنیا کی قومیتیں حصولِ معاش کے لئے اکٹھی ہوگئی ہیں کوئی اور دوسرا کوئی اور یل نہیں آتا اور عراقی جارحیت سے پیدا ہونے والے بحران کے بعد تو کچھ ذہنی مرض کے شکار کچھ عزمن کے بندوں نے اس کی ایسی تصویر کشی شروع کی کہ گویا وہاں کے ذمہ داروں اور وہاں بسنے والے لوگوں کو داد عیش دینے اور بے فکری کی زندگی بسر کرنے کے علاوہ دنیا کے معاملات و ل سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

کویت کی سرزمین پہ کم و بیش سات سال میں نے بھی گذارے ہیں، ملازمت کا تعلق وزارت اوقاف و امور مذہبی کے انفارمیشن سنٹر سے تھا اور وابستگی بڑی حد تک وہاں کی صحافت اور ریڈیو سے رہی اور وہاں کی اجتماعی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لئے سب سے قابل اعتماد ذریعہ مخصوص دیوانیوں یا دیوان خانوں کے پروگراموں سے بھی دلچسپی کچھ کم نہیں رہی۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کویت میں انجام پانے والے دینی، علمی، ثقافتی اور رفاہی سرگرمیوں پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے جن سے کویت کا حقیقی چہرہ نظروں کے سامنے آئے اور سیاسی نعرہ بازیوں سے ہٹ کر ملت کے ساتھ حقیقی ہمدردی رکھنے والوں کو اس خسارہ کا اندازہ ہو سکے جو عراق کی جارحیت کے نتیجے میں علمی اور دینی حیثیت سے رونما ہوا ہے جن کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیماں گم شدے : ہم سلیماں، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

کویت اپنے رقبہ کے لحاظ سے یقیناً ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن کویت میں انجام پاتے والے علمی و ثقافتی کاموں کا اثر تمام دنیا پر تھا۔ کویت کی آبادی بھی بہت محدود تھی لیکن کویت میں قائم رفاہی اداروں کا فیض، افغانستان، بنگلہ دیش اور انڈونیشیا و فلپائن سے لے کر زامبیا، گھانا، ایوری کوسٹ اور کینیا و تنزانیہ و سینیگال جیسے افریقی ممالک سے لے کر جنوبی اور لاطینی امریکہ کے دور دراز ممالک تک پھیلا ہوا تھا اس لئے کویت کے خلاف عراق کی جارحیت نے نہ صرف کویت کی سرزمین پر سانس لینے والے لاکھوں انسانوں کو خانماں برباد کیا ہے بلکہ سینکڑوں علمی و تحقیقی کاموں کا بھی گلا گھونٹ دیا ہے اور لاکھوں یتیموں، بیواؤں اور ان ناداروں کی اعانت بھی منقطع کر دی ہے جو دنیا کے دور دراز علاقوں میں فقر و غربت کی وجہ سے عیسائی مشنریوں کے نرغے میں ہیں اور عالمی چرچ کونسل کی طرف سے منصوبہ بند طریقہ پر ان کی غربت کا استحصال کیا جا رہا ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ کویت پر عراقی حملہ سے چند ہفتے پیشتر ہی بعض برطانوی اخبارات میں شد و مد کے ساتھ افریقی ممالک میں کویت اور سعودیہ وغیرہ کی طرف سے جاری اسلامی دعوتی سرگرمیوں کے خلاف واویلا مچایا جانے لگا اور براہ راست ویٹیکن کے پوپ اعظم کو اس سلسلے میں حرکت میں آنے کے

لئے کہا گیا تھا جو لوگ جاسے ہیں کہ عراقی سیاست کے روح رواں اور صدر صدام حسین کے دست راست طارق حنا عزیز ، عیسائی ہیں اور انہیں عالمی چرچ کے حلقوں میں خصوصی اعتماد حاصل ہے ان کے لئے خلیج کے موجودہ بحران کے مضمرات کو سمجھنا شائد مشکل نہ ہو ، فلسطینی لیڈروں میں جارج حبش اور نائف حواتمہ جیسے لیڈروں کا جو برسوں سے عراق میں داخلہ کا حق نہیں رکھتے تھے کویت کے خلاف مہم میں اس جوش و جذبہ کے ساتھ سامنے آئے کے جہاں اور دوسرے سیاسی اسباب ہیں وہیں اس کے دینی مضمرات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔

بہرکیف میرا مقصد اس وقت خلیج کے بحران کا سیاسی تجزیہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان کاموں کی ایک جھلک دکھلانا ہے جو خالص علمی ، ثقافتی اور رفاہی قسم کے تھے اور جو اب یکسر ختم ہو گئے ہیں زیر نظر مضمون میں کویت حکومت کی علمی و دینی خدمات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جارہا ہے ۔

۱) ۔ وزارت اوقاف کا عام طور پر کام ، وقف کی جائیدادوں کی نگہداشت اور مسجدوں اور عبادتگاہوں کی حفاظت ہوا کرتا ہے کویت میں وزارت اوقاف کے تحت ایک ادارہ مذہبی کا بھی تھا جو (ادارہ الشئون الاسلامیہ) کہلاتا تھا یہ ادارہ نہایت ہی فعال اور متحرک تھا اسی کا ایک شعبہ مرکز المعلومات یا انفارمیشن سنٹر بھی تھا جس کی ذمہ داریاں احقر کے سپرد تھیں ، اس شعبہ کا بنیادی کام ساری دنیا کے مسلمانوں کے احوال سے باخبر رہنا ، مسلمانوں کو پیش آنے والے دینی اور ثقافتی مسائل کا جائزہ لینا ، فری میسن ، قادیانیت ، بہائیت اور صیہونیت جیسی ان تحریکوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ، جو اسلام کی بیخ کنی کے لئے وجود میں آئی ہیں اسی طرح اسلامی جماعتوں اور تحریکوں کی سرگرمیوں سے واقفیت کے ساتھ یہ جائزہ لیتے رہنا کہ عیسائی مشنریوں کا زور دنیا میں کہاں کہاں ہے مستشرقین کے خیالات کا اثر کن طبقوں پر پڑ رہا ہے پھر یہ تجویز کرنا کہ ان کے تدارک کی کیا شکلیں ہوسکتی ہیں چنانچہ اس سلسلے میں ہمیں نہ صرف دنیا بھر میں شائع ہونے والے اخبارات ، ورسائل سے مدد ملتی ہے بلکہ امریکہ ، یوروپ اور آفریقہ کے بیشتر ممالک میں پھیلے ہوئے وزارتِ اوقاف کی طرف سے متعین داعیوں کو بھی اس پر مامور کریں ۔ خاص طور پر اسپین میں متعین ڈاکٹر ملا بہیج حوبش ، لندن میں متعین ڈاکٹر ولید محمود علی اور

مشرقی یورپ میں متعین فاتح حسین بڑے باصلاحیت اور متحرک داعی ہیں اور انہیں کویت کی وزارت اوقاف کی طرف سے گرانقدر تنخواہیں دی جاتی تھیں اور بعض خاص خاص موضوعات پر تحقیق کے لئے ان کو ضروری سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ اس طرح کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ ان سائیکلو اسٹائل شدہ رپورٹوں سے کیا جاسکتا ہے جو ہم نے اپنے شعبہ کی طرف سے گذشتہ چار رسالوں میں شائع کی تھیں اور عربی کے مختلف ماہناموں اور ہفت روزوں نے نمایاں طور پر جگہ دی اور ان میں سے چند کے ترجمے اردو کے رسالہ "زندگی" وغیرہ میں شائع بھی ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ مفصل اور مفید ڈاکٹر ولید محمود علی کی تیار کردہ وہ رپورٹ تھی جس میں برطانیہ میں پائے جانے والے تمام استشراقی مراکز کا جائزہ لیا گیا ہے ان کے پتے دیئے گئے ہیں اور ان کے کام کی نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے وزارت اوقاف کی طرف سے متعین دعوتی کام کرنے والوں کی تعداد دوسو کے قریب تھی۔

اس کے علاوہ شئون اسلامیہ یا امور مذہبی سے متعلق ادارے کے تحت دینی مراکز کی مالی امداد کا شعبہ بھی تھا جس کا کام ایشیاء، آفریقہ، امریکہ کے مختلف ممالک میں تعمیر ہونے والی مسجدوں، دینی مدارس اسلامی مراکز وغیرہ کی مالی اعانت تھا اس شعبہ کے کام کے پھیلاؤ کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں موجود فائیلوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد پہنچ چکی تھی۔ واشنگٹن میں قائم ہونے والا اسلامی سنٹر ہو یا جزیرہ مالدیپ کا اسلامی مرکز، ملیشیا میں قائم ہونے والی اسلامی یونیورسٹی ہو یا سوڈان میں قائم ہونے والا المرکز الدعوۃ الاسلامیہ سب کے روبعمل آنے اور ترقی کرنے میں کویت کا نمایاں حصہ تھا آفریقہ کے صرف ایک ملک سینیگال میں تعمیر ہونے والی مسجدوں میں دوبئی کے مجلہ "منارالاسلام" کی چشم دید رپورٹ کے مطابق سو مسجدیں ایسی ہیں جن کو کویت کی رفاہی تنظیموں اور وہاں کے اہل خیر نے تعمیر کرایا۔

اس ادارہ امور مذہبی کے پہلے ڈائرکٹر شیخ عبداللہ العقیل تھے انہوں نے ۲۵ سال تک نہایت سرگرمی کے ساتھ ادارے کے فیض کو ساری دنیا میں عام کیا اس وقت وہ رابطۂ عالم اسلامی میں عالمی مساجد کونسل کے سربراہ ہیں اور ان کے بعد شیخ نادر عبدالعزیز النوری ڈائرکٹر متعین ہوئے جو جواں سال ہونے

کے ساتھ ساتھ زبردست دینی ولولہ اور تحریکی ذہن رکھتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر علی فہد الزمیع جو حال ہی میں انڈر سکریٹری متعین ہوئے تھے اور اس سے پہلے اسسٹنٹ انڈر سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے بڑا سلجھا ہوا دماغ، دینی کاموں کا شعور اور جماعتی اور گروہی سیاست سے بالاتر ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں وہ ان دینی دعوتی سرگرمیوں کے روح رواں سمجھے جاتے تھے اور یہ سب مل کر بڑے تعمیری انداز پر دعوتی کام کا خاکہ بناتے تھے اور پھر ان میں رنگ بھرنے کی سعی کرتے۔ پچھلے دنوں مشرقی یوروپ اور روس و چین میں وہاں کی نئی سیاسی صورتحال کے بعد اسلامی دعوتی کاموں کے جو امکانات روشن ہوئے ہیں ان کی روشنی میں بڑی جان سوزی سے ان لوگوں نے نئے منصوبے بنائے تھے مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

۲) کویت کی وزارت اوقاف و امور مذہبی کا ایک دوسرا قابل ستائش کام اس کا وہ اشاعتی منصوبہ تھا جس کے تحت سینکڑوں علمی و دینی کتابیں، فقہ و اصول کے ذخائر، تفسیر و حدیث کی نادر نایاب کتابیں تحقیق و تعلیق کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر مفت اہم علم تک پہنچتی تھیں چنانچہ ادارہ شئون اسلامیہ کی طرف سے شائع ہونے والی جن کتابوں کے نام میرے ذہن میں ہیں وہ یہاں درج ہیں۔ امام ماوردی کی تفسیر جو "النکت والعیون" کے نام سے چار جلدوں میں طبع ہو کر تقسیم ہوئی ہے امام ابن حجر عسقلانی کی المطلب العالیہ جس کا شمار فن حدیث کی نادر کتابوں میں ہوتا ہے وہ بھی چار ضخیم جلدوں کی نادر کتابوں میں ہوتا ہے وہ بھی چار ضخیم جلدوں میں جناب مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

قرآنی علوم پر ابن ناقیا بغدادی کی الجمان فی تشبیہات القرآن جس کی تحقیق ڈاکٹر عدنان زرزور نے کی ہے اور علامہ ابن عبدالسلام کی الغوائد فی مشکل القرآن جس کی تحقیق ڈاکٹر رضوان علی الندوی نے کی ہے اس کا پہلا ایڈیشن بھی اسی ادارہ کی طرف سے شائع ہوا ہے

ان کتابوں کے علاوہ نواف عبدالباقی کی اللؤلؤ والمرجان علامہ منذری کی مختصر صحیح مسلم، شیخ محمد ناصرالدین البانی کی تحقیق کے ساتھ اور جوہری کی الزاہر فی لغۃ الاسلام الشافعی "کو شائع کرنے کا سہرا بھی کویت

کی وزارت اوقاف ہی کے سر ہے۔ دینی کتابوں کی نشر و اشاعت ہی کے ضمن میں شیخ حسنین محمد مخلوف کی تفسیر صفوۃ البیان علامہ شوکانی کی تفسیر کا خلاصہ "زبدۃ التفسیر" کے نام سے لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے عام لوگوں میں تقسیم کی گئی، ان کے علاوہ ایک طرف تو وزارت اوقاف کے سالانہ بجٹ کا ایک معقول حصہ اس پر صرف کیا جاتا تھا کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں دعوتی لٹریچر خرید کر بغیر کسی معاوضہ کے ان ممالک میں تقسیم کرایا جائے جہاں ان کی ضرورت ہے۔ گذشتہ سال ایک نئی اسکیم یہ شروع کی گئی تھی کہ متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے کچھ ہلکے پھلکے دینی لٹریچر تیار کئے جائیں چنانچہ اس ضمن میں جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں چند یہ ہیں۔ "رجال و مناہج"۔ اس کتاب میں نہایت سلجھے ہوئے انداز میں ائمہ اربعہ، امام ابوحنیفہ امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل کی زندگی اور کارنامے پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے ان میں کسی کے خلاف نفرت کے بجائے ان میں سے ہر ایک سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے کی ایک دوسری کتاب "ھذا القرآن فاین منہ المسلمون؟" قرآن کریم کی تعلیمات کے تئیں مسلمانوں کے رویہ کے بارے میں ہے یہ بھی نہایت وقیع اور مفید کتاب ہے یہ دونوں کتابیں ہمارے فاضل دوست شیخ محمد زکی الدین قاسم کی تالیف کردہ ہیں ایک اور کتاب نحو کلمۃ سواء" کے نام سے شائع کی گئی جس میں نظریاتی اختلاف کے باوجود ادب کا پاس و لحاظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

"الفکر الغربی" کے نام سے ایک کتاب میں مغربیت زندگی کے مسموم اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جو مشہور انشاء پرداز احمد المجذوی کے قلم سے ہے ان کے علاوہ بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں اور کئی ابھی طباعت کے مرحلہ میں ہیں وزارت اوقاف کی طرف سے شائع ہونے والا ماہنامہ مجلہ "الوعی الاسلامی" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ گذشتہ ۸ سالوں سے نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور دینی میگزینوں میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے ضمیمہ کے طور پر بچوں کے لئے شائع ہونے والا براعم الایمان (ایمان کی کلیاں) اپنی دیدہ زیب طباعت، تعمیری و اصلاحی مضامین اور لطائف و ظرائف کی وجہ سے بچوں میں بڑا مقبول ہے حج، زکوۃ اور روزے وغیرہ سے متعلق "الوعی الاسلامی" کے ... ضمیمے بھی بڑے مفید ہوا کرتے تھے

(۳) علمی و تحقیقی میدان میں کویت کی وزارت اوقاف نے جس کارنامہ کو شاہکار کی حیثیت حاصل

ہے وہ اس کی فقہی انسائیکلو پیڈیا "تیار کرنے کا منصوبہ ہے اس کام کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ پس منظر ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ۱۹۵۵ء میں پیرس کے اندر فقہ اسلامی کے موضوع پر یہ ایک ایسی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں بلند پایہ علمائے اسلام کے ساتھ کچھ نامور مستشرقین نے بھی شرکت کی تھی مصر کے نامور عالم اور فقیہ شیخ محمد ابو زہرہ بھی اس کانفرنس کے شرکا میں تھے۔ اس کانفرنس میں مستشرقین نے بالاتفاق اسبابات کا اعتراف کیا کہ ' اسلامی فقہ کی نظیر دنیا کا کوئی دوسرا قانون پیش کرنے سے قاصر ہے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کیا گیا کہ فقہ و فتاوی کی کتابوں کی ترتیب چونکہ قدیم انداز کی ہے ان کی اصطلاحات کو سمجھنا اور شروح و حواشی سے پیش آمدہ مسائل کے احکام کا معلوم کرنا خود ان کی (مسلمان) قانون دانوں کے بس کی بات بھی نہیں ہے جنھوں نے قدیم طرز کے مدارس میں تعلیم حاصل نہ کی ہو تو مستشرقین، اور دوسرے غیر مسلم محققین کا اسلامی فقہ سمجھنا اور اس سے استفادہ کرنا اور بھی پیچیدہ مرحلہ ہے اس لئے طے کیا گیا کہ فقہ کو نئے انداز پہ مرتب کیا جائے چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کوشش دمشق میں شروع ہوئی اور وہاں کے شریعت کالج کے زیر اہتمام ایک مختصر سا انسائیکلو پیڈیا تیار کیا گیا جو پہلی کوشش ہونے کی وجہ سے قابل ستائش ضرور تھا لیکن وہ قطعی ناکافی تھا۔

اسی احساس کے پیش نظر دوبارہ زیادہ وسیع پیمانہ پہ کام کا آغاز مصر میں کیا گیا چنانچہ "موسوعہ جمال عبدالناصر" کے نام سے ایک فقہی انسائیکلو پیڈیا کی ۱۶ جلدیں شائع ہوئیں لیکن کام کے پھیلاؤ اور سیاسی اور جذبہ دونوں کی کمی کی وجہ سے یہ سلسلہ موقوف ہوگیا اور کام نامکمل رہ گیا۔ بالآخر کویت کے ذمہ داروں کو بعض اہل علم نے اس طرف توجہ دلائی اور اس کام کی ایک نئے انداز پہ انجام دہی کے لئے ایک بڑا ادارہ قائم کر دیا گیا اور اس مقصد کے لئے ایک مکمل فقہی لائبریری بھی تیار کر دی گئی اور کئی ملین دینار اس کام کے لئے مختص کر دیئے گئے اور بڑی بڑی تنخواہیں دے کر مصر، شام، عراق، فلسطین وغیرہ کے متعدد نامور علماء کی ایک ٹیم جمع کر لی گئی۔ پہلے کام کا آغاز مشہور شامی فقیہ ڈاکٹر مصطفیٰ احمد الزرقاء کی نگرانی میں شروع ہوا تھا کچھ عرصہ کے بعد وہ بعض وجوہ کی بنا پر علیحدہ ہو گئے تو دوسرے شامی نوجوان عالم ڈاکٹر عبدالستار ابو غدہ نے اس شعبہ کی ذمہ داری سنبھالی اور [illegible] یہ کام [illegible] اہتمام کے ساتھ

انجام دیا جا رہا ہے۔

کویت حکومت کی اس کام سے دلچسپی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جو علماء اس شعبہ میں کام کرنے کے لئے منتخب کئے گئے ان میں سے کئی کی تنخواہیں وہاں کے وزیروں سے بھی زیادہ تھیں اوسطا ایک عالم کو ماہانہ پچاس ساٹھ ہزار روپے فقہی انسائیکلوپیڈیا کے کام کی انجام دہی کے لئے تو تیونس اور مصر کی یونیورسٹیوں کے بعض اساتذہ کو الگ سے معاوضے دیئے جاتے تھے اور ان سے لکھی ہوئی بحثیں منگائی جاتی تھیں۔

اب تک انسائیکلوپیڈیا کی ۱۴ جلدیں شائع ہو چکی تھیں جو اپنی حسن ترتیب، طباعت اور افادیت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ اس کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی گئی ہے اور ائمہ اربعہ کے مذاہب مستند فقہی مصادر سے لئے گئے ہیں اور حوالوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اس کے علاوہ ہر جلد کے آخر میں ان فقہاء کے مختصر سوانحی خاکے بھی دیئے گئے ہیں جن کا نام اس جلد میں آیا ہے امید کی جا رہی تھی کہ ۴۰ جلدوں میں اس انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل ہو سکے گی اور پھر اس کا اردو، انگریزی اور فرنچ زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جائے گا اس کے علاوہ اصول فقہ اور نئے فقہی مسائل پر علیحدہ جلدیں مرتب کی جائیں گی۔

اس کے علاوہ اس شعبہ سے جو فقہ اور اصول فقہ کی نادر و نایاب کتابیں ضمنی کام کے طور پر تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، وہ خود ایک بیش بہا اور نادر تحفہ ہیں۔ اگر کویت کی وزارت اوقاف زر کثیر صرف کر کے ان کتابوں کے قلمی نسخوں کو جمع کرنے اور ان کی تحقیق و ایڈیٹ کے بعد طباعت کا اہتمام نہ کرتی تو علمی دنیا شاید ابھی برسوں ان کتابوں سے محروم رہتی۔ چنانچہ اس ضمن میں جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں

امام ابو بکر الجصاص رازی مشہور حنفی فقیہ ہیں جن کی احکام القرآن قرآن کریم کی فقہی تفسیروں میں خاص امتیاز رکھتی ہے ان کی تصنیف کردہ کتاب "الفصول فی الاصول" کا حوالہ تو کتابوں میں ملتا تھا لیکن خود کتاب دستیاب نہیں تھی۔ وزارت اوقاف نے لوہیت یونیورسٹی کی شریعت فیکلٹی کے پرنسپل ڈاکٹر عجیل النشمی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کی ہے بلکہ چوتھی جلد ابھی [illegible]

کہ عراقی صدر کے جنون نے سارا نظام درہم برہم کردیا۔

امام زرکشی کی "المنثور فی القواعد" اور "خبایا الزوایا" بھی کویت سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ امام قرافی کی الذخیرہ کا مقدمہ اور سمرقندی کی "مختلف الروایہ" کی پہلی جلد عبدالغنی نابلسی کی "تحقیق القضیہ" اور امام کرابیسی کی کتاب الفروق یہ سب نادر نایاب کتابیں فقہی انسائیکلوپیڈیا کے ضمنی کام کے طور پر شائع ہوئی ہیں۔ راقم سطور کی ایڈٹ کردہ کتاب توفیہ الکیل " بھی اسی ادارہ نے شائع کی ہے اور کویت پر عراق کے حملے سے چند ہی دن پہلے امام زرکشی کی تصنیف کردہ اصول فقہ کی جامع کتاب "البحر المحیط" کے نام سے چھ ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر آئی تھی جس میں ائمہ اربعہ کے اصول کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا گیا ہے ان کتابوں کے علاوہ اہل علم کی سہولت کی خاطر فتح القدیر فتاوی ابن عابدین شامی۔ مسلم الثبوت' مختصر الخلیل المنہاج وغیرہ کی فہرستیں بھی ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے اہل علم میں تقسیم کی جارہی تھیں افسوس ہے کہ عراقیوں کی چیرہ دستیوں سے یہ سارا علمی ذخیرہ بھی تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔

اس ضمن میں کویت کے "دارالافتاء" کا ذکر نہ کرنا نا انصافی ہوگی جس کی سربراہی حکمران صباح خاندان کے ایک، پاک طینت جوان سال فرد شیخ مشعل الصباح کے ذمہ تھی جو اپنی نیک نفسی، تواضع اور نظم و نسق کے احترام کے ساتھ شرعی اصولوں کی پابندی میں بھی اپنی مثال آپ تھے اسی خاندان کے ایک دوسرے نوجوان شیخ علی ناصر الصباح سے بھی ان کے علمی و ادبی ذوق کی وجہ سے برسوں سے ہمارا تعلق رہا ہے عراقی ہمنوائی میں ظالمانہ پروپیگنڈہ کرنے والے بے ضمیر صحافیوں کے برعکس ہم نے ان لوگوں کی زندگی میں داد عیش دینے کا تصور تو کیا، کھانے پینے کے آداب میں سنت تک سے انحراف بھی نہیں دیکھا۔ میں نہیں کہتا کہ خاندان کے تمام افراد اسی نمونہ کے تھے لیکن میرا کہنا یہ ضرور ہے کہ عیاشی کا بورے خاندان پر عمومی الزام رکھنا نہایت ہی ظالمانہ ہے اچھے برے افراد ہر خاندان میں ہوا کرتے ہیں۔ دارالافتاء کا اجلاس ہر روز شنبہ اور یکشنبہ کو ہوا کرتا تھا اور علماء کی ایک کمیٹی طلاق و نکاح سے لے کر عمومی قسم کے سوالات تک پر غور کرتے اور پھر اجتماعی فتوی صادر کیا کرتے تھے ان تمام فتوؤں کا مجموعہ بھی مدون ہو رہا تھا لیکن جہاں اور دوسرے منصوبوں کا خون ہوا وہیں یہ فقہی ذخیرہ بھی تباہ و برباد ہو کر رہا۔

جلا ہے جسم وہیں دل بھی جل گیا ہوگا ✤ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اشاعتی منصوبہ کے ضمن میں یہ بات ذکر کرنے سے رہ گئی کہ کویت اس وقت اسلامی تنظیم کانفرنس کا صدر ملک ہے اس نے عالم اسلام کے لئے دو علمی تحفے تیار کرائے تھے تاکہ اس مناسبت سے عالم اسلام کو بطور ہدیہ پیش کئے جائیں۔ ایک "اسلامی کانفرنس کا انسائیکلوپیڈیا" اور دوسرے قرآن کریم کا ایک جامع لغت۔ یہ دونوں کام اختتام کے مرحلے میں تھے لیکن عراق کی جارحیت کی نذر ہو کر رہ گئے۔

عرب اور غیر عرب سبھی ممالک میں سرکاری ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے عام پروگراموں میں تو قومی ترانے، لوک گیت، رقص و سرود کی محفلیں، ڈرامے اور فلمیں سبھی کچھ ہوا کرتی ہیں اور ان میں بعض چیزوں کے مضر اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کویت ٹیلی ویژن، پہ دینی پروگراموں میں شرعی احکام و مسائل بیان کرنے کا ہفتہ وار پروگرام بھی تھا اور خاصا مفید تھا۔ کسی زمانہ میں کویت کے ٹیلی ویژن مفتی (یہ کوئی سرکاری منصب نہیں ہے) شیخ عبداللہ النوری ہوا کرتے تھے جن کے فتاوی کا مجموعہ "سالونی و من غریب ماسالونی" کے نام سے معروف و متداول ہیں اس وقت یہ فریضہ شریعت کالج کے ایک پروفیسر ڈاکٹر خالد المذکور انجام دے رہے تھے انگریزی کا پروگرام جسے عام طور پر لاکھوں کی تعداد میں موجود غیر مسلم حضرات بھی دیکھا کرتے تھے ان کے لئے ہمارے محترم دوست جناب عرفات کامل العشی کا مرتب کردہ پروگرام "انڈر اسٹینڈنگ آف اسلام" اور دوسرے پروگرام اسلامی تعلیمات کے تعارف کے لئے مفید تھے۔

ریڈیو میں اذاعۃ القرآن الکریم کا ایک مستقل شعبہ تھا اس کے علاوہ ریڈیو کی اردو سروس بھی روزانہ دو گھنٹے کی تھی فروری ۱۹۸۶ء سے یکم اگست ۱۹۹۰ء تک پابندی سے احقر کے بھی دو پروگرام براڈ کاسٹ ہوتے رہے ایک کا عنوان "اسلام اور دنیائے حاضر" تھا اور دوسرا تعلیمی پروگرام "درس الیوم" (آج کا سبق) کے عنوان سے تھا جس کے ایک ہزار سے زائد سبق براڈ کاسٹ ہو چکے تھے کویت ریڈیو کے ممتاز [illegible] کا خاص تعاون اس سلسلے میں ہمارے ساتھ رہا۔ اردو میں ہی دینی سوال جواب کا سلسلہ تھا جو مولانا اعلاء احمد [illegible] لکھا کرتے تھے۔ وزارت الاوقاف [illegible] کے زیر اہتمام بھی علمی کاموں کا بڑا مفید سلسلہ تھا۔ چنانچہ عربی لغت کی مشہور و معروف کتاب "تاج العروس" جس کی

کا سہرا بھی ایک ہندوستانی عالم علامہ مرتضیٰ بلگرامی زبیدی کے سر جاتا ہے اسی وزارت کی طرف سے تحقیق و ایڈیٹ کے ساتھ شائع ہو رہی تھی اور اب تک (۲۶) ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں امام ذہبی کی مشہور تاریخ العبر فی اخبار من غبر بھی پانچ جلدوں میں یہیں سے شائع ہوئی ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادی کی تحقیق کردہ کتاب ذخائر و التحف اور شریف رضی کے ادبی رسائل اور المعون فی الادب" مآثر الخلافہ اور دیوان ابی الاحوص اور اس طرح سے دوسری بہت سی کتابیں بھی اسی وزارت کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔ خالص ثقافتی کاموں کے لئے کویت کا ادارہ المجلس الاعلیٰ للثقافتہ الفنون والاداب بھی قابل ذکر ہے جو کتاب المعرفہ کے زیر عنوان مختلف ادبی و ثقافتی موضوعات پر ایک سو پچاس سے زائد کتابیں شائع کر چکا ہے نشر و اشاعت کے میدان میں سعودی عرب اور مصر کے بعد اگر کسی دوسرے ملک کا ذکر کیا جاسکتا ہے تو وہ کویت ہی ہے جہاں سال میں کتابوں کی دو نمائشیں بھی بڑے اہتمام سے لگا کرتی تھیں ایک خالص دینی کتابوں کی اور دوسری عمومی موضوعات کی جس میں مصر، لبنان، شام اور دوسرے تمام عرب ممالک کے اشاعتی ادارے شرکت کیا کرتے تھے اور عورتوں اور مردوں کے بھر وقتی ہجوم اور کتابوں کی فروخت سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ تعلیم و ثقافت کے میدان میں کویت کتنا آگے جا چکا تھا۔

کویت سے عربی کے پانچ روز نامے الوطن، القبس، السیاسہ، الانباء، الرای العام، شائع ہوا کرتے تھے جن میں خالص سرکاری نقطہ نظر کا ترجمان کوئی بھی نہ تھا اور لمن بائیں بازو کے خیالات کا ترجمان سمجھا جاتا تھا دو انگریزی کے اخبارات عرب ٹائمز اور کویت ٹائمز کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ ایک اردو اور دوسرا تامل زبان کا اخبار بھی کویت سے شائع ہوا کرتا تھا دو صفحے پابندی سے اردو اور تامل کے عرب ٹائمز اور کویت ٹائمز میں شامل کئے جاتے تھے جو بعد میں آپسی اختلافات کی وجہ سے موقوف ہو گئے تھے۔ صحافت ایک حد تک آزاد تھی لیکن بعض دفعہ لگام [illegible] اٹھا لیا کرتے تھے دینی حیثیت سے اگر کوئی غلط بات شائع ہوتی تو اس کے جواب دینے والے بھی [illegible] قلم اٹھا [illegible] ایک [illegible] لمبی [illegible] ان لگاروں [illegible] ایک سخت تنقیدی مضمون لکھا تھا۔

اور ذمہ داران اس طرح کی چیزوں کا نوٹس لیا کرتے تھے ہفت روزہ میگزینوں میں "المجتمع" اور "البلاغ" کافی شہرت رکھتے تھے اور دونوں کے ادارتی اسٹاف کے ساتھ کام کرنے اور سینکڑوں مضامین اس میں لکھنے کا بھی موقع میسر رہا چنانچہ المجتمع میں متعدد اداریے راقم الحروف کے قلم سے نکل کر شائع ہوئے جو کبھی افغانستان کی صورتحال پر ہوا کبھی فلپائن کے مسلمانوں کے مسائل پر اور ان میں بعض ایسے مسائل بھی زیر بحث آئے جن کا ذکر مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ المجتمع سارے عالم عرب دنیا کا سب سے بے باک اور تحریکی ذہن رکھنے والے اسلام پسندوں کا ترجمان سمجھا جاتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس میں جس طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے کسی دوسری عرب ریاست میں ہرگز برداشت نہیں کیے جا سکتے۔ ماہنامہ رسالہ "العربی" ساری دنیا میں مشہور ہے اس کی ڈھائی تین لاکھ کا پیانہ تعداد [illegible] گذشتہ [illegible] سالوں سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جب تک ڈاکٹر احمد زکی [illegible] رہے عربیت کے شائقین اسے ہاتھوں ہاتھ لیا کرتے تھے اس کے بعد بھی [illegible] شائقین میں اس کی مانگ کم نہیں ہوئی بچوں کے لیے "العربی الصغیر" [illegible] ماہنامہ [illegible] مفید سلسلہ تھا تحقیقی رسالوں میں "المسلم المعاصر" [illegible] "الوعی الاسلامی" [illegible] کی طرف سے شائع کیا جاتا تھا اور اس کی ایڈیٹری [illegible] انجام دیا کرتے تھے جن کو [illegible] منتظم [illegible] کرنے کا خاص سلیقہ دیا ہے اس [illegible] انجام دے رہے ہیں [illegible] کمیشنر [illegible]

اب [illegible] جا رہے [illegible]
ذکر [illegible] کا کام [illegible]
[illegible] الشریعت [illegible]
شائع ہونا شروع ہوا [illegible] ایڈیشن

ڈاکٹر محمد انوارالدین
لکچرار شعبۂ اردو ۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد

فانیؔ کا شعری سفر

حالیؔ کے تنقیدی حملوں اور علی گڑھ تحریک کے ناموافق اثرات کی زد میں آکر اردو شاعری کی غزالِ رعنا یعنی صنفِ غزل سخت گھائل بلکہ نیم جاں ہو چکی تھی لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں چار شاعر ایسے پیدا ہوئے جو پژمردہ و نیم جاں غزل کے حق میں مسیحا بن کے اٹھے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے غزل کی آبیاری کی۔ ان کی جگر کاری نے غزل کی عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ اُن کی کوششوں سے اردو غزل جس کی موت کا یقین سا ہو چلا تھا نہ صرف جی اُٹھی بلکہ پوری آب و تاب اور زندگی کی کُلّیت رونق کے ساتھ ہماری تہذیب کی آبرو بن گئی۔ یہ چار سخن ور جنھیں اردو غزل کے عناصرِ اربعہ کہا جاتا ہے حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور فانیؔ ہیں۔

فانیؔ بدایونی جن کا پورا نام شوکت علی خاں تھا ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے ان کے والد شجاعت علی خاں محکمہ پولیس میں عہدہ دار تھے انھوں نے فانیؔ کی ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی کیا بعد ازاں انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں شریک کروایا۔ انٹرنس کے بعد فانی نے بریلی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۱ء میں وہاں سے بی۔ اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ کامیاب کیا ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک وہ علی گڑھ میں رہے اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ عملی زندگی میں فانیؔ ایک کامیاب انسان نہیں تھے۔ انھوں نے وکالت کی جو نہیں چلی۔ حیدرآباد آئے اور ابتداً مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کے دربار سے متوسل ہوئے لیکن حق مغفرت کرے ... ان کی سفارش سے انھیں مدرسے

ملازمت ملی لیکن وہ کما حقہ اِس کے فرائض کی انجام دہی سے قاصر رہے۔ شہزادہ معظم جاہ کے دربار
ے وابستہ ہوئے لیکن اس دربارِ دُربار میں بھی ان کا صدف تقدیر گوہرِ مراد سے نا آشنا ہی رہا
ماشی ومالی طور پر وہ ہمیشہ پریشان حال اور فکری اعتبار سے آشفتہ روزگار رہے۔ ہر چند کہ
یدرآباد نے اُن کی عزت و توقیر۔ دستگیری و دلجمعی اور سرپرستی و پذیرائی میں کوئی کسر نہ
ہونے دی لیکن فانی کی افتادِ طبع تھی ہی ایسی کہ عسر و یُسر تنگی و فراخی۔ ہر حال میں وہ اپنے
یے رنجوری و غم۔ درد و الم اور حسرت و مایوسی کا گوشہ تلاش کر لیتے تھے نجی زندگی میں اُنھیں دخترِ
داں کی موت کے علاوہ بھی بہت سارے حادثات و سانحات سے گزرنا پڑا۔ وکالت میں ناکامی۔ وطن
ے ہجرت آبائی جائیداد کا فروخت ہونا وغیرہ ایک حساس اور غیور آدمی کی شکست و ریخت کے لئے یہ
سباب کافی ہیں۔ مجلسی زندگی میں بھی انھیں کچھ کم پریشانیاں نہ اُٹھانی پڑیں۔ غرض یہ کہ مایوسی۔
پریشانی‘ بے دلی اور حُزن و ملال کی کیفیت میں فانی کی زندگی گذرتی رہی اور انھوں نے اسی طرح
جی جی کر مرتے ہوئے اور مر مر کے جیتے ہوئے اگست ۱۹۴۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان
کی خاطرِ پریشان کو درگاہ یوسفین حیدرآباد میں آسودگی نصیب ہوئی۔ ؎

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانی ⁂ ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

فانی کا ابتدائی کلام تو اُن کے والد نے جنھیں اپنے بیٹے کا شاعر بننا سخت ناپسند تھا
ضائع کر دیا۔ سن ۱۹۲۱ء میں اُن کا پہلا مجموعۂ کلام "دیوانِ فانی" کے نام سے بدایوں سے اشاعت
پذیر ہوا‘ ۱۹۲۶ء میں اُن کا کلام" باقیاتِ فانی" کے عنوان سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آگرہ سے
شائع ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں مولوی عبدالحق کی مساعی سے فانی کا قدیم و جدید کلام" عرفانیاتِ فانی" کے نام
سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں فانی کے تازہ کلام کا مختصر مجموعہ" وجدانیاتِ فانی" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔
چند سال پیشتر" کلیاتِ فانی" بھی شائع ہوا جس میں فانی کے تمام مطبوعہ کلام کو یکجا کیا گیا ہے۔

فانی کی شاعری کو ان کی زندگی میں ہی بڑی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اور فنِ شعر میں ان کی
عظمت کی توثیق اِن کی حینِ حیات ہی ہو چکی تھی چنانچہ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں اُنھوں نے ایک غزل

مُسنائی اور صبح ہوتے ہوتے اُن کی وہ غزل لکھنو کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی اور سارے ہندوستان میں زبانِ زدِ خاص و عام ہوگئی۔ مذکورہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حُسن کے صدقے کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

فانی کو امام المتغزلین تو مانا گیا لیکن ساتھ ہی امامِ یاسیت کے لقب سے بھی نوازا گیا۔ نقادوں نے فانی کے کلام میں موت کے قدموں کی آہٹ پائی۔ معاصرین نے اُن کی شاعری میں کافور و کفن کی بو محسوس کی۔ ان آرا کے جواز میں فانی کے یہ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانا چاہا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لیئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانی کے فلسفۂ غم اور زندگی میں ایک قسم کی ہم آہنگی سی پائی جاتی ہے وہ موت اور زندگی میں کسی بڑے فرق کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک زندگی موت کا پیش خیمہ اور موت زندگی کا آغاز ہے۔ انھیں موت میں وہ دلفریبی اور دلربائی نظر آتی ہے جس کی تلاش ایک عاشق اپنے محبوب کے سراپا میں کرتا ہے۔ موت کا عمل اور کیفیت بہرحال نادیدہ ہے لیکن فانی کے ہاں مرگ سے بڑی ہمدردی کا رویہ ملتا ہے۔

[illegible] اجل [illegible] تو [illegible] کر دیا
[illegible] ڈال مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا

مژدۂ جنت وہاں ہے [illegible]
زندگی محبت [illegible] فدائی ہے

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے ۔۔ موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

اگر فانیؔ کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے زیادہ غم پسند تھے یا انہوں نے اپنے آپ کو ایسا بنا لیا تھا کہ ایک نارمل انسان نہیں رہے تھے۔ انھیں خوشی سے نفرت اور غم سے رغبت ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں ۔

دہر میں جو ہاتھ آئے کھو دیتا ہوں ساحل پہ سفینے کو ڈبو دیتا ہوں

فانیؔ میں غم آشنا ہوں ایسا کہ یہاں سامانِ خوشی دیکھ کے رو دیتا ہوں

ابتدائی دور میں فانیؔ کی شاعری پر داغؔ اور امیرؔ کا رنگ نمایاں تھا ذیل کے اشعار میں شوخ نگاری امیرؔ اور داغؔ کی یاد تازہ کرتی ہے۔

اداسے آڑ میں خنجر کے منہ چھپاتے ہوئے ۔ مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب ۔ اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

در پیش ہے پھر مسئلہ طاقتِ دیدار ۔۔ پھر کچھ نگہ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

داغؔ اور امیرؔ کے بعد ان کی شاعری نے میرؔ و غالبؔ سے شدید اور گہرا تاثر قبول کیا میر تقی میرؔ نے اردو شاعری میں حزنیہ شاعری کی جو طرح قائم کی تھی فانیؔ نے اپنی بساط اور مزاج کے مطابق اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ فانیؔ کی شاعری کا مرکزی تاثر یاس و حرماں نصیبی۔ درد اور کسک اور سوز و گداز کا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرؔ کے غم نے فانی کے ہاں شدت اختیار کی ہے لیکن میرؔ کے غم اور فانیؔ کے غم میں فرق ہے میرؔ کا غم بقول یوسفؔ حسین خان "ایک انفرادی تجربے کا اظہار ہے جبکہ فانیؔ کے یہاں غم جمالیاتی قدر کا مرتبہ رکھتا ہے۔ میرؔ نے غم کی تفسیر و ترجمانی سادگی سے کی ہے جبکہ فانیؔ نے اسے فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے ۔ فانیؔ نے غم کو نیا مزاج دیا اور اسے نئے آداب سکھائے فانیؔ کے یہ اشعار میرؔ کی حزنیہ لے میں ہیں ؎

کس کی کشتی تہہ گردابِ فنا جا پہنچی ۔ شورِ لبیک جو فانیؔ لبِ ساحل سے اٹھا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا ۔ ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

فانی کے کلام میں میر کے بعد جس شاعر کے اثرات واضح اور گہرے مرتسم نظر آتے ہیں وہ ہے غالب۔ فانی نے غالب کی نکتہ رسی، تراکیب و تغزل اور لفظی تراکیب کو اپنے طور پر برتنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب رہے ذیل کے اشعار پر غالب کے رنگ و نقوش نمایاں اور ابھرے ہوئے ہیں۔

قطرہ قطرہ رہتا ہے دریا سے جدا رہ سکنے تک : جو تابِ جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے
ہر مژدۂ نگاہِ غلط جلوہ خود فریب : عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش ہے
جلوۂ آتش پنہاں جسے غم کہتے ہیں ، دل ہوا بجھ کے وہی شعلہ عریاں میرا
دل ہے وہ داغ غم کدہ عمر دو کش کا : رکھی ہے جس پہ شعلۂ تمنا بجھی ہوئی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم : رہا یہ وہم کہ ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فانی صرف رلا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں حسن تاثیر اور شعریت پورے طور پر موجود ہیں مثلاً اُن کے یہ نور آگیں شعر دیکھیے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ۔۔ بات پہنچی تری جوانی تک
تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول گئے ۔ وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے
لے برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی ۔ دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
اُفر کی نیت میں ایمان کے لالے تھے ۔ چھپ کے دعاؤں میں وہ دشمن دیں آیا

اردو غزل کو حیات نو عطا کرنے والوں میں فانی کا نام سرِ فہرست ہے ان کے اسلوب میں اردو غزل کے سفر اور ارتقاء کا مکمل پس منظر ملتا ہے ان کے تغزل میں جو رچاؤ اور نکھار ہے اس کی مشاطگی میں صدیوں کی روایات اور تجربات کا نچوڑ شامل ہے۔

(بقیہ سلسلہ ص ۵۸ پر)

وف خیر
الہ بازار گولکنڈہ حیدرآباد

رحمٰن جامی 'جامِ انا' میں

رحمٰن جامی ۔ ۱۹۶۰ء سے بھی بہت پہلے سے شعر کہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ان کے فن میں بڑی پختگی محسوس کی جاسکتی ہے ان کے بیشتر ہم قدم کب کے " اہلِ کتاب " ہو چکے بلکہ رحمٰن جامی کے بہت بعد شعری سفر اختیار کرنے والے بعض ایسے لوگوں کی غزلیں بھی کتابیں آگئیں جو ع " نیست پیغمبر ولے دارد کتاب " کے زمرے میں آتے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے کہ رحمٰن جامی کا مجموعہ " جامِ انا " آج ادب دوستوں کی نگاہوں کا مرکز ہے ویسے اس مجموعے کو برسوں پہلے شائع ہو جانا چاہیئے تھا مگر ع " دیر آید درست آید " اس میں شک نہیں اچھا فن پارہ کبھی از کار رفتہ نہیں ہوتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہر دور کا اپنا محاورہ ہوتا ہے ۔ گل و بلبل شمع و پروانہ ، شراب و ساغر کی اصطلاحیں بھی مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے چھوٹی پڑ جاتی ہیں دار و رسن ، طوق و گلو اور زنجیر کی جھنکار شبک پڑتی ہے اسی طرح صحرا ، سمندر ، دھوپ ، سایہ ، ریت بھی بے مزہ لگتی ہے اگر کوئی چیز زندہ رہتی ہے اور زندہ رکھتی ہے تو وہ ہے فنکار کا جذبہ ، اس کے سوچنے کا انداز ___ اور یہ جذبہ و فکر اپنا اک خاص منفرد اور تازہ کار اسلوب لے کر سامنے آتے ہیں تو پذیرائی پاتے ہیں ۔ رحمٰن جامی کے شعری سفر میں ان کی فکر ، ان کا تخیل ، ان کی لفظیات اور ان کا الفاظ کو برتنے کا سلیقہ ان کی پہچان مانتا ہے .

رحمٰن جامی نے شعر کے سر پر نئی تخلیقی تراکیب کا کوئی تاج نہیں رکھا لیکن یہ کیا کم ہے کہ لفظ کے بدن پر جو قبائے لغوی ہے ، اس میں کہیں جھول نہیں پایا جاتا ۔ حتیٰ کہ " ہائے " جیسے

بھرتی کا لفظ سمجھا جاتا ہے رحمٰن جامی کے ہاں آتا ہے تو "واہ" وصول کرتا ہے اور یہ ہائے ہائے بھی مزہ دیتی ہے۔

ہائے لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہے نشہ یہ بھی — توبہ کرنے کے لئے میں جو ساغر پھینکے
خونِ دل سے سینچا تھا جس نے گلستاں تنہا — ہائے پے ٹھکانا ہے اب وہ باغباں تنہا
جامی کا ہائے دامنِ یوسف ہوا ہے دل — اس زندگی کا جب سے زلیخائی بڑھ گئی
ہائے کیا ہم پہ قیامت نہیں گزری ہوگی — اجنبی بن کے وہ جب پاس سے گزرے ہوں گے

بڑے بڑے لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کرنا ہی شاعری نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے لفظوں میں چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا بھی شاعری ہے جو ذرہ جس جگہ ہے وہاں وہ آفتاب نہ سہی لیکن اپنی ذات سے اپنا اور آفتاب کا آفتاب کا الگ الگ احساس تو کراتا ہے۔

ہماری فکر ہے جامی الگ تھلگ سب سے
یہ شاعری نہیں اوروں کی شاعری کی طرح

رحمٰن جامی کی زبان نہایت سلیس اور عوام سے بہت قریب ہے آس پاس کے معمولی معمولی واقعات و واردات کو رحمٰن جامی نے آسان اور فوری سمجھ میں آجانے والا پیرایۂ اظہار دے دیا ہے اس طرح عوامی مقبولیت کے لئے راہ ہموار کرلی۔ ان کی تخلیقات دل سے نکل کر دل میں اُترنے والی ہیں۔ دماغ پر بار کا نتیجہ ہیں نہ دماغ پر بار بنتی ہیں انہوں نے شعر گوئی میں اس قدر مشق بہم پہنچائی ہے کہ کہتے ہیں ؎

غزل کہنی پڑی کا رحمٰن جامی — کھڑے تھے آکے صف بستہ قوافی

رحمٰن جامی ایک عرصہ تک بلا مبالغہ روزانہ اک غزل بغیر عرق ریزی کے بڑی آسانی سے کہہ لیا کرتے تھے (پتہ نہیں یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے کہ نہیں) ان کے شعروں میں اس قدر روانی اور سلاست ہوتی ہے کہ پہلا مصرعہ سن کر دوسرے مصرعے کے لئے ذہن بالکل تیار رہتا ہے۔ بلکہ پہلا مصرعہ دوسرے مصرعہ کا اتا پتا بھی دیتا ہے ؎

کہی تھی بات اک دل کی ذرا سی — انھیں آنے لگی اس پر حیا سی

ہے سر شام ڈوب جانا ہی — قسمتِ آفتاب میں لکھا

آپ سے جو بچھڑ گیا ہوگا — وہ ابھی تک بھٹک رہا ہوگا

آپ کو جس نے اک نظر دیکھا — وہ فقط دیکھتا رہا ہوگا

سہلِ ممتنع سے عہدہ برآ ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ذرائع ابلاغ کی فراوانی کے باوجود یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان دنوں زبانِ اُردو بے زبانی کا شکار ہوتی جارہی ہے شمال میں تو یہ کب کی "بنداپائی" جا چکی ہے ہماری نئی نسل پڑھے گہرے فلسفیانہ لہجے کی متحمل نہیں رہ گئی اور زیادہ تر اُردو' سماعی درجہ اختیار کرگئی ہے کہ نئی نسل کے بیشتر اربابِ ذوق کا شمار قارئین میں نہیں بلکہ سامعین میں ہوتا ہے اور غزل اب ساز و آواز سے بھی عبارت ہوگئی ہے۔ ایسے میں رحمٰن جامی نے سلیس بیانی سے کام لے کر غزل کی زندگی بڑھا دی ہے۔

ان کے اندازِ خوش بیانی میں — لطف آنے لگا کہانی میں

اس کی آنکھوں میں اشک کے قطرے — جل رہے ہیں چراغ پانی میں

کام آتا تھا بس یہی جامی — شاعری کی ہے زندگانی میں

رحمٰن جامی کی شاعری میں ایک رومانی فضا کے ساتھ ساتھ غنائیت بھی پائی جاتی ہے

صبح کا دوپہر کا شب کا تھا — تیرا وعدہ بھی کس غضب کا تھا

آنا جانا وہاں تھا میرا بھی — میں بھی ممبر اسی کلب کا تھا

میں کسی کا نہ بن سکا اب تک — تو اکیلا تھا اور سب کا تھا

زندگی میں رومان اور رومان میں زندگی کی جو اہمیت ہے اس سے اُردو شاعری بھری پڑی ہے مومن کی پوری شاعری کا انتخاب یہ ایک شعر سمجھا گیا ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی رومانی لہجے کو داغ نے بام پر بٹھا دیا۔

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

حسرت موہانی اسے پھر گھر لے گئے ؎

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

اختر شیرانی کا رومان تو ماورائے خاک زادگی تھا۔ انہوں نے سلمیٰ کے لئے پر کیف گیت چھیڑے۔ رحمٰن جامی اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں رحمٰن جامی ایک زرخیز ذہن FERTILE MIND رکھتے ہیں۔ ان کا تخیل افسانوی حسن لئے ہوئے ہے۔

ہوگئی پھر مجھے رہ رہ کے غلط فہمی سی — آج ہے پھر ترے لہجے میں گھلاوٹ کیا کیا
کبھی ہنس کر، کبھی رو کر، کبھی غصہ ہو کر — اس نے ڈالی مرے رستے میں رکاوٹ کیا کیا

اس کا چہرہ تھا خواب میں لکھا — کیا نشہ تھا شراب میں لکھا
اس کی آنکھوں میں پڑھ رہا تھا میں — تھا بہت کچھ حجاب میں لکھا

جس گھڑی سامنا ہوا تیرا — وہ گھڑی جیسے عمر بھر ٹھہری
ہر ملاقات پہ ہوا محسوس — ہر ملاقات مختصر ٹھہری
ہر حسیں سے گزر گئی جامی — آئینے پر مری نظر ٹھہری

آئینے پر نظر ٹھہری کہہ کر رحمٰن جامی نے بڑی ذو معنی بات کہہ دی ہے اس میں حسنِ نظر بھی ہے اور خود نگری یا خود آگہی بھی ہے

ہر بار اسے سن کر میں ہو گیا گم سم سا — آواز میں جادو تھا لہجہ تھا ترنم سا
اک ہم بھی جیالے ہیں دنیا سے نرالے ہیں — اک یہ بھی حقیقت ہے کوئی بھی نہیں تم سا

رحمٰن جامی کی شاعری میں رومانی فضا کے علاوہ بعض کڑوی سچائیاں بھی در آئی ہیں۔
حق گوئی و بے باکی میں بدنامی کی حد تک شہرت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ؎

منہ پہ کہہ دی جو بات کہنی تھی مجھ میں کب احتیاطِ ذہنی تھی

انہوں نے کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کی تو ع پیچھے "انھیں" ڈھکیل کے سچائی بڑھ گئی۔

اس حق گوئی کی وجہ سے کوئی انھیں دور کر دے تو وہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

تو نے جو مجھ کو دور کیا اپنے آپ سے : تجھ سے محبت اور مرے سچائی بڑھ گئی

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

کو مرے اندر مجھے باہر سے نہ دیکھو : بدکار نظر آؤں گا منبر سے نہ دیکھو

ائی بے پناہ ہے ہر ہر مقام پر جاتی کی شاعری کی یہی تو ہے خاص بات

حق گوئی و بیباکی دراصل مردانگیِ عشق کی طالب ہوا کرتی ہے تبھی تو شاعر کہتا ہے ؎

ل پھینکے کہ مری راہ میں پتھر پھینکے جس کو جو پھینکنا ہے سوچ سمجھ کر پھینکے

گنہگار سہی مجھ پہ بقولِ عیسیٰ جو گنہگار نہیں ہے وہی پتھر پھینکے

ہنے بچ بچ کے ہر اک بار دکھایا ہے اُسے جال دنیا نے تو ہر بار برابر پھینکے

اور اگر سچائی کا بوتا کسی میں نہیں تو اس کے لئے رحمٰن جاتی کا مشورہ ہے ؎

حال اپنا جو چھپا نا ہی سی ہو ہے تو وہ : گھر کا کوڑا بھی نہ دروازے کے باہر پھینکے

تقریباً چار دہائیوں کے عرصے میں رحمٰن جاتی نے بے تحاشہ غزلیں کہیں اور ظاہر ہے

ن تمام کا اس مجموعے میں شامل کر لیا جانا بڑی مشکلیں کھڑی کر دیتا اس لیئے بڑی بے مروتی کے ساتھ

ھیں رد کیا گیا ہوگا۔ اور اس بے مروتی کی زد میں بعض اچھی غزلیں بھی آ گئی ہوں گی۔ مجھے

ب غزل کے دو الگ الگ مصرعے یاد آ رہے ہیں جو

دب دب گئے ہم ابھرتے رہے ندیاں کی طرح اور

بادِ صبا بھی آ گئی ہے مندیب کی طرح

ایک اور غزل کا شعر تھا ؎ باہر تو بڑی جلیب سبب بے سبب کھلی

گھر میں ذرا ذرا گئے ملابوں میں کھو گیا

اک غزل کا مطلع تھا ؎

دروازے سے ناز و عشوہ کے سب بند ہو گئے
جانے کس اعتبار کی سوگند ہو گئے

یہ غزلیں "جامِ آنا" میں شامل نہیں۔ افسوس کہ نگاہِ انتخاب نے انھیں رد کر دیا۔ رحمٰن جامی کی زیادہ تر غزلیں "زمین" کی دین لگتی ہیں۔ نئی نئی زمینیں انھیں صف بستہ قوافی کی فوج پیش کرتی ہیں اور یہ فوج ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اقلیمِ شعر کے تخت پر بٹھا کر وظیفۂ شاہ عالم نذر کرتی ہے ؎

مرا کلام ہے جامی نئی زمینوں میں کہ اک پیام ہے جامی نئی زمینوں میں

مگر انھیں اس بات کا ادراک و احساس بھی ہے کہ ؎

یہی جنوں کا بنے گا پیامبر جو ابھی عروسِ خام ہے جامی نئی زمینوں میں

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۹ سے آگے)

عرش انجام دے سکتی ہے تو وہ صرف [illegible] تھا۔ یہ چنانچہ اسی [illegible] کی وجہ سے اسلامی سلطنت کے زوال کے وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس و تدریس کا نظام قائم کیا جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی [illegible] ہو سکیں۔ اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ عملی حیثیت سے اسلام ہندوستان [illegible] بہتر حالت میں ہے جہاں برائے نام اسلامی سلطنت موجود ہے مگر دینی آزادی اس کا کوئی [illegible] ولی اللّٰہی کا سا ان کے علماء نہیں پیدا ہوئے ہیں۔

جب ہندوستان میں حکومت مغلیہ کا چراغ گُل ہو گیا اور مسلمانوں کا سیاسی قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تو [illegible] انھوں نے اسلام کی [illegible] کے قلعے تعمیر کر دیئے انھیں قلعوں کا نام عربی مدارس ہے [illegible] اسلامی [illegible] قومیت و استحکام انھیں قلعوں پر موقوف [illegible]

ابراہیم جلیس

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن — ڈرامہ

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مرزا غالبؔ کے اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لڑکپن میں دوسرے لڑکے بالے صاحب جہاں کسی مجنوں پہ آزادانہ سنگ باری کرتے تھے۔ وہاں مرزا غالبؔ اکیلے ایسے لڑکے تھے جو اگر کسی مجنوں پر سنگ [illegible] [illegible] مرزا [illegible] کے پتھر سے زخمی ہوا ہوگا اس ترحم کی تکلیف انہیں یاد آئی۔ اور وہ مجنوں پر ترس کھا کے سنگ ہاتھ میں لئے کے لئے رہ جاتے۔

لڑکپن ہی سے مجبور انسانوں پر ترس کھانا مرزا غالبؔ کی خوبی سہی — لیکن اس شعر سے ان زمانے کے لڑکوں کے اس مشغلے کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے لڑکے گلیوں میں جب کبھی کسی مجنوں کو دیکھتے تھے تو اس پر سنگ باری ضرور کرتے تھے۔

اب اس زمانے کے مجنوں بھی کچھ عجب ہٹیلے تھے!

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا!
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!

[illegible] آتے سنگ دل کے سنگِ آستاں پہ [illegible]

پہلے ہی گلی کے لونڈے لواڑی سنگ اٹھا کر ان کا سر پھوڑ کر رکھ دیتے۔ جنوری - ۱۹۹ء

مرزا غالب کے زمانے کے لونڈے لواڑی اور موجودہ زمانے کے لونڈے لواڑیوں میں صرف یہ ہے کہ مرزا غالب کے زمانے کے لونڈے لواڑی صرف اسی شخص کا سر پھوڑتے تھے جو مجنوں دیوانہ یا سڑی ہوتا۔

لیکن آج کل کے لونڈے گلی میں سے گزرنے والے ہر شخص کا سر پھوڑتے ہیں خواہ وہ مجنوں ہو یا نہ ہو — البتہ سر پھوڑنے کے لئے وہ پتھر استعمال کرتے نہیں۔ بلکہ ہاکی یا کرکٹ کی گیند یا پھر ڈنڈے کی گلی استعمال کرتے ہیں۔

ثبوت کے طور پر اخبار کی ایک خبر ملاحظہ ہو۔

آزاد نگر کے ایک محلے کی ایک گلی سے ایک شخص گزر رہا تھا۔ اسی گلی میں چند لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکے نے گلی پر ایسے زور کا ڈنڈا مارا کہ گلی اڑ کر راہگیر کی آنکھ میں لگی اور اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ کھیل ختم اور فوجداری شروع — لڑکے تھانے اور راہگیر ہسپتال پہنچا دیا گیا — اور لغت سازوں کو

"ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ"

کے علاوہ ایک نیا محاورہ ہاتھ لگا کہ

"ماروں گلی پھوٹے آنکھ"

ہاکی یا کرکٹ کھیلنے کے لئے میدان اور گلی ڈنڈا کھیلنے کے لئے آنگن نہایت ضروری ہیں گلی ڈنڈے کا آنگن سے تو جیسے چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس کا حوالہ تو ہمارے "لوک گیتوں" میں بھی ملتا ہے چنانچہ یہ لوک گیت تو بڑا ہی مشہور ہے کہ

ع　چھوٹا سا بلما مورا　　　　آنگنا میں گلی کھیلے

لیکن موجودہ زمانے میں انسانوں کی آبادی کچھ اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس کی وجہ سے مکانات کا طرزِ تعمیر ایسا بدلا ہے کہ نہ تو ہاکی یا کرکٹ کھیلنے کے لئے میدان نظر آتے ہیں اور گھروں میں آنگن۔

آبادیوں میں میدان کا فقدان
مکان میں آنگن کا فقدان
پرانے زمانے کے لوگ تو کہتے تھے
کیا جھونپڑی کیا میدان

اب تو جہاں آج میدان نظر آتا ہے وہاں کل جھونپڑی اور مکان نظر آتے ہیں۔ میدان تو اب "دوا دارو" کے لئے ہی رہ گئے ہیں۔ حکیم اور ڈاکٹر مریض کو مشورہ دیتے ہیں کہ

"آپ کا علاج صرف کھلے میدان میں چہل قدمی ہے"

"اگر کھلا میدان میسر نہیں تو [illegible] کیا کیجیے"

طرزِ تعمیر میں "فلیٹ سسٹم" [illegible] گھروں میں آنگن نہیں اور جھونپڑی مکان [illegible] میدان غائب [illegible]

چھوٹا سا [illegible] گلی کھیلے

جب [illegible] کوئی راہ گیر ہسپتال میں مصیبت جھیلے۔ کوئی دن نہیں جاتا [illegible] اور [illegible] پیٹ [illegible] میں آ [illegible] کی گیند [illegible] فلاں گلی سے فلاں [illegible] کے سسرال [illegible] کی بجائے سرکاری اسپتا

[illegible] پہنچا دیا۔

یہ حکایتیں اور شکایتیں بھی درست —— لیکن سوال یہ ہے کہ بچپن اور لڑکپن تو کھیل کود ہی کا زمانہ ہے۔ اب لڑکے بالے کھیلیں تو کہاں کھیلیں۔ نہ کھلے میدان ہیں اور نہ گھروں میں آنگن ہیں۔ ناچار بچے گلیوں ہی میں گلی کھیلیں گے۔ اب اگر آپ کو یہ شکایت ہے کہ

ع بیٹھتے ہی کوچۂ دلدار کو صبا نہ کرد

تو حکومت سے کہہ کر ہر محلے میں کھیل کے میدان عرف پلے گراونڈ بنوائیے۔ پھر لڑکے بالے اگر گلی میں گلی کھیلیں تو بھاری وہی سزا جو مرزا غالب کے لڑکپن میں مجنوں کی سزا ہوا کرتی تھی۔

ہمارے لڑکپن کے زمانے میں ہر اسکول کے ساتھ کھیل کے میدان لازمی طور پر ہوتے تھے اور جو لڑکا کھیل میں حصہ نہ لیتا تھا تو رجسٹر حاضری میں اس کی غیر حاضری لگ جاتی تھی۔ لیکن آج کل [illegible] نے یہ بیمار لوگوں نے محکمۂ تعلیم کو خود ایک کھیل بنا رکھا ہے تو اسکول کے ساتھ کھیل کے میدان [illegible]۔

ہمارے آپ کے بچے اسی لئے گلیوں میں کھیلنے پر مجبور ہیں لیکن بے چارے گلیوں میں بھی پوری طرح نہیں کھیل پاتے۔ یا تو کوئی کھلاڑی کسی موٹر گاڑی تلے آ جاتا ہے یا پھر کوئی راہگیر زخمی ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کرکٹ کے علاوہ ہاکی فٹ بال اور کبڈی وغیرہ تک ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہو جاتے ہیں۔

ہر محلے میں بچوں کے لئے کھیل کے میدان نہایت ضروری ہیں

یہ بات میونسپلٹی کے سوائے ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن ہر شخص کر ہی کیا سکتا ہے۔

[illegible] تو [illegible] آفت [illegible] ہے

[illegible]

زخمی کرتے ہیں
اور گلیوں میں لڑکے بالے گیند گلی سے
زخمی کرتے ہیں
ہر رہگزر ـــ رہگزر سیلِ حوادث گویا
لیکن اس کے باوجود ہم آپ گھروں سے نکلتے ہیں تو پھر واقعی

ع اپنی ہمت ہے کہ ہم گھر سے نکل آتے ہیں

اور گلیوں میں کھیلنے والی "نئی نسل" سے اپنے جسم وجان کو بچاتے ہوئے اور اپنے وطن کی گلیوں پر فخر کرتے چلتے ہیں کہ

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے جسم وجاں بچا کے چلے
(نثار میں تری گلی پہ اے وطن .... ڈنڈا)

ڈاکٹر کے بھگتہ وتسل راؤ

پوسٹ آفس لین نیو نلہ کنٹہ۔ حیدرآباد ۴۴

انشائیہ

گولی

گولی کی ایک تاریخ ہے اس کا جغرافیہ ہے کہانی ہے وہ بھی لازمینی۔ پتھر کے زمانہ سے لے کر ایٹم کے دور تک اس کی شہرت رہی ہے انسان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے انسان سے پہلے پہاڑ بنے ندیاں بہتی گئیں۔ چٹان گھستے گئے بڑے بڑے پتھر بھی اس چکر میں آگئے۔ گول گول اجسام کی طرح رہ گئے۔ دنیا کے کئی مقامات پر چند چٹان، بھاری وزن کے پتھر گول اشکال اختیار کر گئے ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فن کار نے سنگ تراش نے کافی محنت سے تراشا ہے سنوارا ہے اور اچانک رکھ دیا ہے نہ مزدور کی ضرورت نہ کرین کی ضرورت۔ قدرت کا ہی کرشمہ ہے۔

گولی کا لفظ زبان پر آتے ہی کئی اقسام کی گولیاں منظر عام ہو جاتی ہیں کانچ کی گولی۔ مٹھائی کی گولی۔ صفرہ کی گولی۔ دوا کی گولی۔ افیون کی گولی۔ گولی کی محیط کو گولائی کہہ پاتے ہیں۔ کانچ کی گولی سے بچے کھیلتے ہیں دو تین سال کا رہے تو حادثتاً نگل بھی سکتا ہے نگل جانے پر ماہر کے پاس، ڈاکٹر کے پاس رجوع ہونا پڑتا ہے پیٹ پھول جاتا ہے آنکھوں میں لالی۔ حلق میں اٹک جانے پر والدین کا رونا ایک سین رچ جاتا ہے دوڑ دھوپ ہوتی ہے دواخانہ میں۔ مٹھائی کی گولیاں بھی مدرسہ کے آزو بازو میں ٹھیلہ پر یا کاغذ پہ پوس کر رکھ دیتے ہیں بیچنے والے۔ اسٹرول میں بھیڑ ہو پاتی ہے تل کی چھوٹی گولیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ نصف قطر ڈیڑھ انچ سے زیادہ ہو جائے تو لڈو کے زمرہ میں آجاتا ہے لڈو ایک طرح سے مٹھائی بھی ہے۔ [illegible] کی شادی بیاہ میں [illegible] دانتوں میں بڑے [illegible] تل کے لڈو، چنے کے لڈو بڑے ذائقہ دار ہوتے ہیں۔

ہیں۔ مزہ آنے میں کمی نہیں۔ باورچی کیٹرر بنانا شروع کر دیتے ہیں منہ میں پانی آتا ہے کیسری پیڑے بھی لذیذ اور گول واقع ہوتے ہیں تروپتی لڈو کی کافی بکری ہے پیتروں کے کھانے میں لڈو ایک ایٹم ہے بعض ڈنر میں لڈو ایک بگونہ میں یا ڈش میں رکھے جاتے ہیں۔ چاول کھانے کے بعد ہاتھ دھونے سے پہلے اکثر لڈو کھاتے ہیں مہمان ہو یا میزبان۔ بڑے پیاتے پہ لڈو بنانے والے بعض اوقات چار یا پانچ اٹھا لیتے ہیں محض ہاتھ کی صفائی ہے ایک چھوٹا سا فن ہے صنعت و حرفت کا پیشہ بھی۔ حیدرآباد و دیگر شہروں میں تو لڈو بنانے میں ماہر بھی مل جاتے ہیں۔ گو مٹھائی میں اجزاء یا مرکبات یعنی تیل، بیسن، لوازمات ٹھیک طور پر نہ ہوں تو کڑواہٹ پیدا ہوتی ہے کاجو، کشمش کا شمول ضروری ہے صعترہ کی گولیاں یونانی و آیورویدک میں کئی اقسام کے ہر دواساز کے پاس ہیں مثلاً لال دواساز کی چھدا پوڑی کی دوکان میں ان گولیوں کی کمی نہیں۔ دوا کی گولیوں میں گروہ بندی بھی ہے الوپیتھی ہے تو ہومیوپیتھک آیورویدک ہے تو یونانی بھی۔ الوپیتھک کی گولیوں کے اوپر مٹھاس کی پرت ہوتی ہے اندر کی کڑوی دوا مرض پر کام کرتی ہے ہو سکتا ہے ایک درد کم ہوتا ہے لیکن دوسری تکلیف کا انتظار رہتا ہے پرہیز کی بالکلیہ ضرورت نہیں۔ آیورویدک کی گولیاں جو کی توں کھا جانے سے کمی ہونے کے بجائے تکلیف بڑھ سکتی ہے پرہیز نہ کرنے پر ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ وصیت نامہ لکھے بغیر، بیوی بچوں کو دیکھ لیئے بغیر خدا کو پیارا ہو جاتا ہے مریض۔ ہومیوپیتھی گولیاں تو میٹھی ہوتی ہیں زبان پر رکھتے ہی جذب ہو جاتی ہیں یہ گولیاں، ٹیبلٹس، سفوف کی شکل میں ملتی ہیں۔ ایک دن آڑ ایک دن، چند گھنٹوں کے وقفہ سے بیوکیمک ہو یا ہر یہ منزل یا ہومیوپیتھی کی گولیاں دی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ گھنٹوں نے امراض کا بھی علاج کر سکتی ہیں۔ ... واہ رے واہ گولی کے کیا کرشمے ہیں۔

افیون کی گولیوں کے چکر میں اگر انسان آجائے تو اس کا شیدا ہو جاتا ہے عاشق ہو جاتا ہے غلام بھی بن جاتا ہے افیونی نشہ میں لگ جاتا ہے افیون کی قیمت میں اضافہ ہو جائے یا ملاوٹ ہو اس کے بغیر رہ نہیں پاتا اس کا عادی۔ عادت بھی برائی و بلاء کی ہوتی ہے افیون کی گولی کی وجہ سے

زندگی میں بھی بیزاری، ناراضگی آجاتی ہے۔ بیوی کو مارنا شروع کر دیتا ہے سوچ کر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ بچوں کو توستانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے بازار میں افیون نہ ملے تو کالے بازار میں منہ مانگے داموں میں خرید تا ہے اس کی اسمگلنگ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ افیون ایک سونے کے مانند نظر آتا ہے خیالی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ افیونی عیش و عشرت کے خواب دیکھتا ہے۔

گھیرہ ہو یا پھیری، حلقہ ہو یا پہیہ، دائرہ ہو یا دو چاندوں کی گولائی گولی کے احاطہ میں شمار لئے جاتے ہیں۔ گول گنبد بیجاپور میں ہے عجائبات میں اس کا شمار ہوتا ہے دُور دُور سے لوگ دیکھنے چلے آتے ہیں گول مینار کئی ہمارے ملک میں دیکھے جا سکتے ہیں گولکنڈہ قلعہ دنیا بھر میں مشہور ہے قلی کا شہر بھاگ نگر، حیدرآباد یہیں کے حکمران نے منصوبہ بنایا۔ تعمیر کروایا۔ نام رکھا، آباد کیا بستی بنتی گئی۔ حیدرآباد میں عنبر پیٹ کے قریب گول ناکہ بھی ہے شائد یہ چھوٹی ناکہ تھا۔ آبادی کا آخری علاقہ تھا۔

گولی کے کھیل ہی نرالے ہیں۔ گولی دینا، گولی مارنا، گولی کھیلنا، گولی پھینکنا، گولی کے ہی محاورے ہیں گول کر دینا بھی سماج میں عام ہے دھوکہ دینے کے برابر ہے گول مال ہے کہ معنی ہیں کچھ معاملہ گول ہے گول اجسام کی حرکات، گولی کی حرکت پر نظریئے بھی ہیں۔ نیوٹن کے کلیات میں تین اصول ہیں کوئی گول چیز اپنے آپ ہل نہیں پاتی۔ جب تک کوئی چیز اُسے مس نہ کر پائے۔ مس کرنے پر حرکت میں آتی ہے تغیر کا ہونا، معیار حرکت کا ہونا اس میں تناسب و رفتار کا اخذ نیوٹن کے کرشمات ہیں گولی کا نکلنا جس تیزی سے ہے دھکہ بھی اتنی ہی تیزی سے ہو پاتا ہے بندوق سے گولی کا نکلنا۔ قصہ یہ ہے کہ عمل ہوتا ہے اُس کا ردعمل ہوتا ہے یہ دونوں مساوی اور متضاد ہوتے ہیں یہ ہیں گولی کے اصول جو دُنیا پر چھا گئے ہیں حلقہ میں سے گولی گرم کرنے پر گذر نہیں پاتی۔ حرارت کا تجربہ ہے جو ہر بچہ دیکھے بڑا ہو نہیں سکتا۔ اُستادی مکمل ہو نہیں پاتی۔ تجربہ خانہ میں ہو یا سائنس کی نمائش، گولا کا مظاہرہ تو ہوتا جا رہا ہے۔

احاطہ صحت و طب میں گولی کا ذکر ہے دوا کی گولی کے ساتھ زائد نمو بھی جلد پہ بدن پہ چہرہ پہ

کندھے پر، ہاتھ گولی کے مانند اجسام آجاتے ہیں دوا سے علاج ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ ماہران امراض کینسر کہنے سے بھی گریز نہیں کر پاتے ہیں مخصوص اعضاء کے قریب گول دُمبل کے مانند آجائے تو آنکٹر ی کا اشارہ یہ ہر بینہ کہتے ہیں بعض اوقات جراحی ہی آخری چارہ بن جاتا ہے "حب ڈب" کی گولیاں تو بچوں میں عام ہیں سانس کے پھولنے پر ڈال دیتے ہیں ماتائیں۔ ابر آلود رہا تو بچوں میں سانس اُبھر آتا ہے بے چینی۔ حب ڈب کی مانگ بڑھ جاتی ہے استعمال کرنے پر آرام ہی آرام۔ حیدرآباد کی نشانی ہے علامت ہے بچوں کے امراض کی روک تھام کی دوا۔ حیدرآباد یت کی وراثت ہے۔ تہذیب کی میراث ہے۔

سوڈا باٹل کی گولی کی کہانی الگ ہے گولی سوڈا مشہور ہے آندھرا کی طرف تو عام آدمی کی صحت کا ترجمان ہے حفظان صحت کی علامت ہے گرمی کا دشمن ہے سوڈا ہو یا لیمن سوڈا۔ چھلکے کو بوتل پر زور دیتے ہی "بھش بھش" یا "بھٹیوں بھٹیوں" کی آوازیں آتی ہیں گیس کے بلبلے نوارد۔ گاہک غٹاغٹ پیتا چلا جاتا ہے۔ کسان مزدور، اُستاد، طالب علم، ٹیچر، منسٹر کی تمیز نہیں ہر ایک کی خدمت میں مصروف ہے گولی سوڈا۔ علاءالدین سوڈا، اشوک سوڈا۔ شہر حیدرآباد میں مل جاتے ہیں ان کا مزہ ہی الگ ہے بھاری محنت کر پاتے ہیں سوڈا پی لیں تو راحت ہی راحت۔ حاملہ عورتیں۔ اور کے مریض، کالج کے طلبار اکثر سوڈے کی بنڈیوں کے پاس اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں سوڈا کا۔

جنگ میں گولی کا دخل ہے۔ امن کی برقراری میں گولی کا کردار ہے ملک کی تمیز نہیں۔ کا فرق نہیں۔ فلسطین میں گولی چلتی ہے تو ہندوستان، پاکستان و برما کی سرحدوں پر بھی برسائی جاتی ہیں۔ افغانستان میں گولیاں بند تو روس میں اندرونی خلفشار ہے گولہ بار۔ بدامنی پھیلانے والے گولیوں کے زور سے ہی امن کو برباد کرتے ہیں چاہے آسام، پنجاب، راجستھان کی سرحد ہو، ارونا چل پردیش کی سرحد، اونچ نیچ ذات پات کا بھید نہ گولی کا استعمال میں۔ ہمیشہ اصولوں کے خلاف گولی نظر آتی ہے۔

بات چیت مکمل نہ ہو پائے، بسوں کے کرایہ میں کمی نہ ہو، ریزرویشن کے جھگڑے ہوں قیمتوں کے اضافہ کے خلاف ہنگامے ہوں، اُجرت کے اضافہ کے لئے احتجاج ہوں، پارٹی کے اصولوں کا پرچار ہو، مانگوں کی تکمیل کے نعرہ ہوں، امن کے ماحول میں جلوس، جلسے، بات چیت چلے تو ٹھیک ہے ورنہ چیتاونی، مدبھیڑ، آگے پیچھے دھکا دینا، کسی کی طرف سے پتھراؤ پولیس کے مسلح دستہ کا اشک آور گولیوں کا پھینکنا۔ وہ بھی اثر نہ کرے تو بندوق کی گولیوں کی ورشا اُوپر کی طرف۔ کسی کے ٹانگ میں سے گذر جاتا۔ دس بارہ مرجانا۔ پچیس تیس کا گھائل ہونا۔ موافق و خلاف میں بیان بازی، پریس کانفرنس، تیمارداری، معاوضہ دلانے کا انتظام سمجھوتہ کا ہونا۔ چند دن کے لئے اخبارات میں خبریں غائب۔ سماجی، فلاح بہبودی، امدادی کاموں میں خلفشاری میں پستول سے گولی نکل جانے کا امکان ہے چور، ڈاکو، طبقہ جرائم، مسلح ٹولی ہمیشہ گولی کا ہی سہارا لیتے ہیں اور امن کو مشتعل کر دیتے ہیں سیاسی پارٹیوں کے افراد بھی گولی سے شکار کرتے ہیں اور گولی کا شکار ہو جاتے ہیں حمل کا محافظ دستہ کا سالار، فوج کا سپہ سالار، میر کارواں بھی گولی ہی کی بدولت فخر حاصل کر پاتا ہے گولی میں بارود بھی ہو سکتا ہے یا مضر رساں کیمیائی اشیاء یا جراثیم۔ ہوائی جہاز سے بھی گرا دیتے ہیں جنگ کے میدان میں دشمن پر یا بکتر بند گاڑیوں کے توپ سے۔ توپ اور گولیاں بھی کنٹونمنٹ، چھاؤنی میں نشان ہیں۔ شاہراہ کی نشانیاں ہیں ہر روز جوان پالش کرتے ہیں دو بندوق کے بیچ میں گولی بھی ایک فوج کی پلٹن کا نشانی یا اعزاز بھی ہو سکتا ہے۔

گول مارنا کھیل کے میدان میں [illegible] کو ایک انداز سے ایک محیط کردہ احاطہ کے اندر سے گذارنا ہے۔ گھٹنے ٹیک کر گول کرنے [illegible] پاتے ہیں والی بال، فٹ بال، بیس بال، ہاکی میں بکثرت استعمال میں ہے ہاتھ سے دور تک پھینکنے کا مظاہرہ بھی [illegible] کی گولی سے یا لوہے کی گولی سے۔ نیپال کا آئین کے [illegible] ہے تو جنگلی [illegible] میں جمہوریہ طرز کے قیام میں بھی ہے ایل ٹی ٹی ای کی گولیوں کا مقابلہ [illegible] گولی کھانے سے جنگ میں بعض اوقات

قوی اعزاز بھی حاصل ہو پاتا ہے دشمن کو دوست، دوست کو دشمن میں بدل دیتی ہے گولی۔

گولی کے عجب چمتکار ہیں۔ مدھیشر میں ہے تو سماجی افراتفری میں بھی ہے اندر یا باہر کی تمیز نہیں اسے۔ جلسہ میں ہے تو گھر میں بھی ہے ہر قوم میں ہے ملک میں ہے فوج میں ہے دستہ میں ہے، پلٹن میں ہے کوتوالی میں ہے امن کے لئے ہے تو حفاظت کے لئے بھی ہے۔

تشدد میں گولی ہمیشہ مصروف نظر آتی ہے اس کی یہ ٹھوس حالت ہے کھیل میں اس کی خلائی کیفیت ہے صحت کے میدان میں فائدہ کرتی ہے بجا استعمال سے۔ ٹھیک استعمال نہ کریں تو بغیر کسی زخم کے پائمال کردیتی ہے یا موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔

گولی ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرتی چلی جاتی ہے سرحد کی فکر نہیں ایک قوم سے دوسری قوم تک، ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی تک، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، جوان سے لے کر جوانمرد تک، بچی سے لے کر عورت تک، ہر ایک رشتہ تک اس کی پہنچ ہے۔

گولی چلتی ہے، گولی ملتی ہے، گولی ڈھلتی ہے گولی کام کرتی ہے گولی کھلتی ہے گولی چھپتی ہے گولی جاتی ہے گولی مس کرتی ہے گولی گھلتی ہے گولی کی ایک رفتار ہے تیز بھی، دھیمی بھی۔

دیکھ رفتار گولی اے انسان ، کتنی آہستہ اور کتنی تیز

گولی کی کیفیت، کارنامہ، تاریخ، جغرافیہ، سوانح، روپ ریکھا، ڈھنگ، ریت، روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس کی پرورش ہوتی چلی آئی ہے افزائش ہر ایک نوع میں ہوتی ہے کھُلی مل گئی ہے۔ محراب میں رکھیئے یا بند صندوق میں یہ اپنی عادت، طور طریق چھوڑ نہیں دیتی۔ مساوات، جنگ میں، امن میں، جمہوریت میں، ہنگاموں میں اس کا بے حد دخل ہے رول ہے۔ گولی پے درپے چلی جارہی ہے معلوم پڑتا ہے کہ گولی دنیا پر چھاگئی ہے بجر کی تمیز ہے نہ ذخیرہ کی۔ بترہ پر ہے تو اس کی مہر، چھاپ، عکس، سماج پر ہے۔ واہ رے واہ گولی تیری یت ہی عجب ہے تانتا باندھتی ہے روح کا پروردگار ہے۔ بعض اوقات ایکدم نجات دلاتی ہے ٹ ماسٹر کے طور پر پیش ہوجاتی ہے چند لوگوں کے لئے۔ ہر روز کہیں نہ کہیں گولی کی آواز ہوتی ہے

گونج ہوتی ہے اس کا ذکر ہوتا ہے اس کی تشویش ہوتی ہے اس کی کارکردگی پر مچلے کیسے جاتے ہیں منظر ایسا ہے کہ ہر ایک اس کو یاد کیئے بغیر آگے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتا۔ درس گاہوں میں ہے تو عبادت گاہوں میں بھی ہے۔

غرض گولی کو بجا طور پر اپنایئے تو فائدہ مند ہے بیجا کھایئے مضر ہے ٹھیک طور پر جان کر استعمال نہ کریں تو مالک کو بھی مجروح کر دیتی ہے۔ نسلی امتیاز نہیں۔ زبان کی قید نہیں، قوم کی فکر نہیں، محقق کو دعوت دیتی ہے کہ فرض سے کنارہ کشی نہ کریں ورنہ سزا دینے پر تل جاتی ہے یہ گولی۔ صرف ولی کے پاس اس کی پہنچ نہیں۔ سادھو سنت بھی اسے پرے رکھتے تھے۔ زمانہ قدیم میں۔ جدیدیت میں تو ان میں بھی گھل مل گئی ہے۔

واہ رے واہ گولی تیری بھی کیا بات ہے۔
داد دیئے بغیر ایک لمحہ بھی ہم ٹال نہیں سکتے ▲▲

(سلسلہ صفحہ ۵ سے آگے)

میں شفافی ڈوبتی دیکھی ہے نبضِ کائنات ۔ جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا ہے مجھے
بے قراری میں اب یہ ہوش نہیں .. کس کے در پر تجھے پکار آیا

ل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا
بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا

بہرحال ڈاکٹر مسعود حسن خاں کے بقول

"فانی نے اپنے مخصوص انداز میں عشق اور حسن کے معاملات اور زندگی کے اسرار بیان کیے ہیں۔ جن کی تشریح وہ غم ہی کی زبان سے کرتے ہیں۔ ان کے خیالات فرضی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ صداقت اور خلوص پر مبنی ہیں اسی لیئے ادب ہمیشہ ان کی قدر کرے گا۔" ▲

نوجوانوں سے متعلق نئی قومی پالیسی

نوجوان جو ہمارے ملک کی کل آبادی کے ایک تہائی کی نمائندگی کرتے ہیں فعال اور زندگی سے بھرپور انسانی وسائل کے آئینہ دار ہیں ۶۸۵ ملین آبادی والے اس وسیع و عریض ملک میں نوجوانوں کی تعداد تقریباً ۲۲۱ ملین ہے۔

نوجوانوں کی آبادی میں ۷۱ - ۱۹۶۱ء کے دہے میں ۱۶ فیصد کا اضافہ ہوا اور ۸۱ - ۱۹۷۱ء کے دوران یہ مزید بڑھ کر ۳۲ فیصد ہو گئی نوجوانوں کی اس جملہ آبادی (۲۲ ملین) میں مردوں کی تعداد ۱۱۳٫۴۲ ملین اور خواتین کی تعداد ۱۰۷٫۵۸ ملین ہے دیہی نوجوانوں کی تعداد ۷۳ فیصد ہے جو تقریباً ۱۶۱ ملین کے برابر ہے اسی طرح خواندہ نوجوانوں کی تعداد ۵۰ فیصد ہے۔

توقع ہے کہ ملک میں نوجوانوں کی آبادی ۹۱ - ۱۹۹۰ء کے دوران تقریباً ۲۹۷ ملین اور ۱۹۹۹ء میں ۳۲۸ ملین تک بڑھ جائے گی جبکہ ۲۰۰۰ء تک یہ اضافہ تقریباً ۳۵۶ ملین ہو چکا ہوگا۔

نقلِ مقام کرنے والے دیہی نوجوانوں کی تعداد نقلِ مقام کرنے والے شہری نوجوانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے نوجوان ایک ایسی فعال اور قابلِ لحاظ قوت ہیں جو اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ترقیاتی کاموں میں اپنا حصہ ادا کریں اور اس طرح قوم کو ترقی کی منزل سے ہمکنار کریں۔ اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ روزگار اور دیگر شعبہ ہائے حیات میں ان کی کارکردگی کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں تاکہ وہ اپنی شخصیت کو ابھار کر سماجی اعتبار سے قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہو سکیں۔ اس لئے

نوجوانوں کے لئے منصوبہ بند طریقہ پر پالیسیاں اور پروگرام مرتب کرنے والے اداروں کی موثر عمل آوری کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح نوجوان خواتین کے لئے بھی خصوصی پروگرامس ترتیب دے کر معاشرہ میں ان کے نمایاں رول کو قبولیت کا درجہ دیا جانا چاہیئے۔ اگر نوجوانوں کو مناسب انداز میں تعلیم دے کر متحرک کیا جائے تو پھر وہ قومی سطح پر سماجی تبدیلی اور ایک نئی تاریخ سازی کا حیرت آفریں کارنامہ بھی انجام دے سکتے ہیں۔ ہمارے نوجوان اس بات کے متحمل ہیں کہ جہیز کی لعنت، ڈرگس کا استعمال، دلہنوں کی خودسوزی، رشوت خوری اور فرقہ پرستی وغیرہ جیسی سماجی برائیوں سے لڑ سکیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں سے متعلق تمام پروگرامس میں ایسے نئے محرکات کو شامل کئے جائیں جن کا مقصد نوجوانوں کو ایسی معلومات بہم پہونچانا ہو جو ان میں نہ صرف ملک کے دستور سے تعلق خاطر اور اس کے احترام پر مبنی احساس کی بیداری کا باعث ہوں بلکہ جمہوری اور سماجی اقدار کی پاسبانی کرتے ہوئے نوجوانوں کو قومی کردار کی علامت کے طور پر ابھرنے کا موقع بھی فراہم کرتے ہوں۔

خد و خال :۔ نوجوانوں سے متعلق موجودہ قومی پالیسی میں ایک نئی جان ڈالنے کے لئے اور نوجوانوں کی امنگوں کی تکمیل تحریک کے علاوہ قومی تعمیرِ نو کو درپیش ہمہ جہتی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے کی خاطر نوجوانوں سے متعلق ایک ایسی مربوط قومی پالیسی مرتب کی جانی چاہیئے جو حسب ذیل تصورات پر مبنی ہو۔

نوجوانوں سے متعلق نئی قومی پالیسی کا بنیادی مقصد "یوا شکتی" (نوجوانوں کی طاقت) کے ذریعہ "جن شکتی" (انسانی طاقت) کا استحکام ہے جس کے لئے نوجوانوں میں سماجی بیداری اور شہریت کے اقدار کی پاسداری کا شعور پیدا کیا جانا چاہیئے تاکہ وہ سماجی و معاشی تبدیلی لانے جیسے کے عمل میں خاطر خواہ اپنا حصہ ادا کر سکیں۔

اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس کرنے کا نوجوانوں میں جذبہ پیدا کرنے کے لئے انہیں ہماری تہذیبی ورثہ سے مالامال تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔

کامل اتحاد اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے بین ریاستی سیاحت اور قومی یکجہتی کیمپس جیسے پروگرام کو روبہ عمل لایا جائے۔

دیہی نوجوانوں کو قومی تعمیر کے کام میں حصہ لینے کے لئے ان کو حاصل حقوق کے بارے میں واقف کروایا جائے۔

نوجوانوں کے لئے ایسے تربیتی پروگرامس منظم کئے جائیں جن میں پیشہ وارانہ تربیت Vocational-Training اور ہنرمندی کو بڑھاوا دینے کی گنجائش ہو تاکہ انھیں روزگار حاصل کرنے اور خود روزگار اسکیمات چلانے کے مواقع فراہم ہوسکیں۔

نوجوانوں کے لئے ایسے خصوصی کیمپس منظم کئے جائیں جہاں فرقہ پرستی، ذات پرستی، جہیز کی لعنت، کمسنی کی شادیاں، منشیات کا استعمال، رشوت خوری اور سرمایہ کی طاقت کے استعمال جیسی سماجی برائیوں کے خلاف لڑنے کی انھیں تربیت دی جاسکے۔

کارہائے نمایاں انجام دینے والے نوجوانوں اور نوجوانوں کی تنظیموں کو ان کی اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر مناسب اعزازات دئے جائیں۔

قومی خدمت اسکیم (این ایس ایس) کے پروگراموں کو مزید مستحکم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس اسکیم سے طالب علموں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں وابستگی کو یقینی بنایا جاسکے۔

نہرو یوا کیندر کے تحت چلائے جانے والے پروگراموں کی از سر نو تشکیل کی جائے اور انھیں مزید بہتر بنایا جائے۔

نوجوانوں میں کم لاگت پر مہمات سر کرنے کے رجحان کو بڑھاوا دینے کے لئے نوجوانوں کا ایک قومی انسٹیٹیوٹ برائے مہمات قائم کیا جائے۔

نوجوانوں کی تنظیموں کو مہمات سر کرنے کے لئے درکار اشیاء کی خریدی کے لئے خصوصی مدد دی جائے۔

نوجوانوں سے متعلق قومی پالیسی کے تحت چلائے جانے والے پروگراموں کی عمل آوری کو یقینی بنانے اور ان کے لئے رہنمایانہ خطوط پر مبنی ہدایات جاری کرنے کے لئے قومی اور ریاستی سطح پر نوجوانوں کے ادارے بنائے جائیں۔

٭٭٭

غزلیں

ڈاکٹر منشاالرحمن خان منشا
۱۱ اسٹاسک ٹامت۔ ناگپور

سخن طرازی کے دعوؤں کی کوئی حد بھی تو ہو
زباں سے بات جو نکلے وہ مستند بھی تو ہو
فقط بلندیٔ قامت کا زعم کیا معنیٰ
حقیقتاً کوئی ہم سا دراز قد بھی تو ہو
خیال و فکر کی رعنائیاں بجا لیکن
شعورِ فرقِ شناسیٔ نیک و بد بھی تو ہو
ادا شناسِ زمانہ جو تم نہیں نہ سہی
خود اپنے آپ کے بارے میں نابلد بھی تو ہو
ہم انقلاب زمانے میں لائیں گے بے شک
کسی بھی رخ سے ہماری ذرا مدد بھی تو ہو
وہ جس پہ اس طرح مرتے ہیں لوگ بن دیکھے
حصارِ ذہن میں کچھ اس کا خال و خد بھی تو ہو
کمالِ فن تو ہے منشا بیانِ محکم میں
چھپا ہوا کہیں امکانِ رد و کد بھی تو ہو

منظور ندیم (مالاپوری)
جوڈیشیل مجسٹریٹ۔ ناگپور

پھر آج فرقہ پرستی نے پر نکالے ہیں
فضا میں کس نے یہ نیزے یہاں اچھالے ہیں
اٹھا کے مندر و مسجد کی سرحدوں کا سوال
دلوں میں کس نے عداوت کے بیج ڈالے ہیں
نہ جانے تیز ہوا لے اڑی کہاں ان کو
سنا تو یہ تھا کہ بادل برسنے والے ہیں
جو ذات پات کی کنجی سے کھولے جائیں گے
ملازمت کے کواڑوں پہ اب وہ تالے ہیں
عجیب رت ہے سلگتا ہے ان دنوں پنجاب
مزاج وادیٔ آسام کے نرالے ہیں
سری نگر پہ بھی بارود کا دھواں ہے محیط
جو برف پوش مناظر تھے آج کالے ہیں
ترے وطن کو نظر کس کی لگ گئی ہے ندیم
یہ کیسی صبح کہ سہمے ہوئے اجالے ہیں

مومن خاں شوق
اشرف ولا۔ ملے پلی
حیدرآباد

مروتوں کے شہر میں

(شہر کے فسادات سے متاثر ہو کر......)

مروتوں کے شہر میں، یہ کیسا سانحہ ہوا
دیارِ آرزو ہوا، دھواں دھواں
گلی گلی کے شہر میں
یہ کیا ہوا، یہ کیوں ہوا ؟
نظر نظر، کرن کرن، حیات تھی، جہاں جہاں
یہ لوٹ مار، قتل و خون کیوں ہوا ؟
کہاں گئی وہ روشنی ؟
محبتیں، رفاقتیں کہاں گئیں
اے دوستو، اے بھائیو !
مروتوں کے شہر کو کرو نہ یوں تباہ تم
خلوص، پیار سے رہو
وفا کے ساتھ ہی رہو
وہ روشنی
جو پیار تھی، نشاط تھی حیات تھی
اُسے اگر جلا سکو تو زندگی ہو زندگی
گلی نگر نگر ہو پیار کی ہی چاندنی ہو

ظلمتوں میں پیار کی شمع جلانا چاہیئے

(شہر کے فسادات سے متاثر ہو کر)

سورج سے ملی ظلمت، کیا یہ تماشہ ہے
مسمار ہوئی عظمت، کیا یہ تماشہ ہے
اِن بستیوں میں اب کیا انسان نہیں بستے
بڑھنے لگی ہے وحشت، کیا یہ تماشہ ہے

●

ظلمتوں میں پیار کی شمع جلانا چاہیئے
لُٹ گئیں جو بستیاں اُن کو بسانا چاہیئے
دوسروں کو آزمانے سے یہی بہتر ہے شوق
آج اپنے آپ ہی کو آزمانا چاہیئے

غزلیں

کلیم ضیاء

اسماعیل یوسف کالج، جوگیشوری (ایسٹ)

بمبئی ۴۰۰۰۶۰

گرتی دیوار کے سائے میں بٹھا رکھا ہے
میں نے ارمانوں کو درویش بنا رکھا ہے

قاتلِ عصر کی نظروں سے چھپا رکھا ہے
ایک قطرہ جو لہو میں نے بچا رکھا ہے

سنگ کٹتا ہے کہیں پھول کی پتی سے جناب
شاخ سے توڑ کے کیوں پھول سجا رکھا ہے

میں نے چاہا تھا کہ تو جان لے قیمت میری
خود کو فطرت کی دکانوں میں سجا رکھا ہے

گردشِ وقت نے قسمت ہی بدل دی میری
وقت ملنے کا تجھے پھر بھی بتا رکھا ہے

سمجھو کہ وہ عشق و محبت کی پرانی رسمیں
ایسی فرسودہ روایات میں کیا رکھا ہے

ڈوبنے والے کو کس طرح بچایا جائے
جس نے ہر سانس کو طوفان بنا رکھا ہے

عقل کہتی ہے ضیاؔ [illegible] سمجھو
کیوں چراغوں کو سرِ شام بجھا رکھا ہے

شجاع الدین شاہد

نارتھ بمبئی سارٹنگ آفس

اندھیری (ایسٹ) بمبئی ۹

کبھی تو روح کبھی دل پہ آ کے چھائے کوئی
ڈھلے جو شام تو چپکے سے یاد آئے کوئی

سفر ہے دھوپ کا اور دور تک شجر بھی نہیں
بدن ہے برف کا کیسے سفر پہ جائے کوئی

تمام عمر نہیں کچھ ساعتیں ہی مانگیں ہیں
ہمارے ساتھ کبھی پل دو پل بتائے کوئی

میں خود شناس تھا منزل کی سمت چل نکلا
قدم اٹھے تو میرے ساتھ ساتھ آئے کوئی

ہے زندگی تو کئی حادثے ضروری ہیں
سہیں گے ہنس کے اگر آ کے آزمائے کوئی

ہمارے بیچ میں ہیں نام بدگماں سائے
دلوں کے بیچ کی دیوار آ کے ڈھائے کوئی

ہمارے چہروں پہ لکھی ہے داستانِ حیات
ہے انتظار کہ اب آئینہ دکھائے کوئی

میں بن کے اشک نکل ہی گیا مگر شاہدؔ
ہے آرزو مجھے پلکوں پہ اب سجائے کوئی

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

Rs 6/=

جلد (۸) شمارہ (۲) فبروری ۱۹۹۱ء حیدرآباد

زرِ تعاون

	سالانہ	دو سال	تاحیات
...ن	65 روپے	120 روپے	1500 روپے
...لک	200 "	360 "	3700 "
	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
...ان	25 پونڈ	45 پونڈ	400 پونڈ
...ت	175 روپے	300 روپے	3000 روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: 147-5-11 ریڈ ہلز ۔ حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپواکر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے جاری کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

ہمارا معاشرہ اور اُس کا علاج

حکومت کی زیر سرپرستی ہندو اور مسلمانوں کے مشترک ایک طبقہ کی طرف سے ۱۲ ڈسمبر ۱۹۹۰ء کو دہلی میں ہونے والے جلسہ میں مولانا مدظلہ کا یہ مضمون ڈاکٹر محمد یونس نگرامی چیرمین اردو اکیڈمی لکھنؤ نے پڑھ کر سنایا۔
"تعمیر حیات" ۲۵ر ار ۹۱ء سے شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین "شاداب" ہے

حضرات! آج خوش قسمتی سے مجھے ملک کے اتنے دانشوروں، فاضلوں، مذہبی عالموں (RELIGIOUS SCHOLARS) رہنماؤں اور سیاسی قائدین (POLITICAL LEADERS) اور ملک کے صاحبِ نظر اور بااثر شخصیتوں کے سامنے اپنی بات کہنے اور اپنا مطالعہ اور تجربہ اور گذارش و مشورہ رکھنے کا موقع مل رہا ہے جو اس سے پہلے (اس پیمانہ پر) کبھی نہیں ملا اور اس کا بھی یقین نہیں کہ آئندہ مل سکے۔ اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں اور یہ شعر پڑھوں سے

آمیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

حاضرین کرام! میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے قضیہ کو زمانۂ قریب کے ہولناک فسادات

درلرزہ خیز مظالم کا واحد سبب نہیں سمجھتا میرے نزدیک یہ افسوسناک بلکہ شرمناک واقعات ایک
سب کا نہیں بلکہ چار سببوں کا نتیجہ ہیں جن میں آپس میں قریبی رشتہ ہے ان کا رقبہ AREA زیادہ
سیع، ان کی جڑیں زیادہ گہری اور ان کی تاریخ زیادہ طویل ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فرقہ وارانہ منافرت (COMMUNAL HATRED) جسے انگریزی حکومت نے اپنے مفاد
ے اور اپنی ضرورت و جواز (JUSTIFICATION) ثابت کرنے کے لئے پیدا کیا اور منصوبہ بند
یخ اور مبالغہ آمیز روایات کے ذریعہ اس کو غذا پہنچائی آزادی کے بعد ملک کی بعض سیاسی
ٹیوں نے حصولِ اقتدار کے لئے اس کا باقی رہنا ضروری سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

۲۔ ظلم اور سفاکی (TYRANNY) سے نفرت کا نہ ہونا، اور انسانی جان و مال اور عزت و
رو کی بے قیمتی۔

۳۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں، اس کے مقابلہ میں صف آرا (CONFRONT) ہو جانے
دں اور اس کو روکنے کے لئے ہر طرح کا خطرہ مول لینے والوں کی کمی خاص طور پر اس موقعہ پر
ہی پیشواؤں (RELIGIOUS LEADERS) کا میدان میں نہ آنا اور حالات سے مقابلہ نہ کرنا۔

۴۔ حکومت اور اقتدار (POWER) کو ہر ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرنے اور اس کے لئے
سول و معیار اور صداقت و انصاف کو قربان کر دینے کا مزاج، پھر انتخاب (ELECTIONS)
طریقہ جس میں ہر اصول و اخلاق کو پس پشت ڈال کر اور ملک کے مفاد کو نظر انداز کر کے زیادہ
یادہ لوگوں کی حمایت و تائید (SUPRORT) حاصل ہو سکے۔

ہر ملک اور ہر دور اور ہر مذہب و معاشرہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر ملک و معاشرہ
(SOCIE) بارہا بدنیتی، فسادانگیز اور انتشار پسند قوتوں (DIVISIVE FORCES)
سازشوں (CONSPIRACIES) کا شکار ہوئے ہیں اور ایسا نظر آنے لگا ہے کہ انسانیت
(HUMANI) سکرات (AT DEATH'S-DOOR) کے عالم میں ہے وہ بہت جلد دم توڑ دے گی

لیکن یہی تاریخ بتلاتی ہے کہ ایسے ہر موقع پر ایسے کچھ افراد میدان میں آ گئے جنھوں نے زمانہ کی آنکھو میں آنکھیں ڈال کر حالات کا مقابلہ کیا، ان غلط رہنمائیوں اور حالات کا مقابلہ کیا۔ ان غلط رہنما اور قیادتوں کے مدّمقابل بن کر کھڑے ہو گئے اور جان کی بازی لگا دی انسانی تہذیب۔ VIL IZATION کا تسلسل (CONTINUITY) جو ابھی تک قائم ہے محض نسلی تسلسل نہیں، انسانی خصوصیت (HUMANQUALITIES) کا تسلسل جو ہر دور میں رہا ہے انسانی احساسات شریفانہ جذبات اعلیٰ مقاصد، اخلاقی تعلیمات اور ان کی بقار اور ترقی کے لئے ہمت و جرارت اور قربانی کا جذبہ جو اس وقت تک چلا آ رہا ہے یہ درحقیقت انھیں لوگوں کا رہین منت ہے جو بگڑے ہوئے حالات میں میدان میں آئے اور ان بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ لڑایا اور بعض اوقات زمانے کی کلائی (میں یہ نہیں کہتا کہ توڑ دی) موڑ دی۔ انھیں لوگوں کی بدولت انسانیت زندہ ہے اور اخلاق و شرافت کا بھرم قائم ہے۔

انسانیت کی کھیتی ہری نہ میں کھاد چاہتی ہے جس طرح فرٹیلائزرس (FERTILISERS) زمین کی قوتِ نمو (GROWTH) بڑھاتے ہیں پیداوار کو طاقت بخشتے ہیں اسی طرح انسانیت کی کھیتی کے تئے بھی کھاد کی ضرورت ہے، انسانیت کی کھیتی کے لئے کھاد ذاتی اور جماعتی مفادات۔ (PARTY- INT- ERESTS) میں اغراض و مفادات کی یہ کھاد جب اس کھیتی میں پڑتی ہے تو وہ کھیتی لہلہا اٹھتی ہے زمین اپنی پیداوار بڑھا دیتی ہے انسانیت کی جھولی بھر جاتی ہے اور اس کو زندگی کی ایک نئی قسط (A NEW LIFE) عطا ہو جاتی ہے انسانیت کی بقار کی حقیقی ضمانت وہ جری دلیر اور جانباز ڈ منچلے اور جلتے ہوئے دل و دماغ رکھتے ہیں، چوٹ کو برداشت کرتے ہیں اور تاریخ کے دھار کو بدلنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

حضرات! کسی سماج کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس میں ظلم کا مزاج (TEMPERAMENT) پیدا ہو جائے، پھر اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس ظلم کو ناپسند کرنے والے اتنے کم اور

وشے افراد ہوں جو دوربین (TELESCOPE) تو دوربین، خردبین (MICROSCOPE) سے بھی نظر نہ آئیں گے گھر میں بیٹھ کر ناپسند کرتے والے تو مل جائیں گے جو چار چھ آدمیوں کی موجودگی میں یہ کہہ دیں کہ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کریں اور اس کو لے کر میدان میں آجائیں وہ انگلیوں پر گنے جاتے ہوں۔

جب ظلم کے لئے معیار یہ بن گیا ہو کہ ظالم کون ہے ؟ ظالم کی قومیت (NATIONALITY) ظالم کا فرقہ (SECT) کیا ہے ؟ ظالم کی زبان کیا ہے ؟ اس کا مذہب کیا ہے ؟ تو انسانیت کے لئے ایک عظیم خطرہ پیدا ہو جاتا ہے جب آدمی اخبار میں کسی فساد کسی ظلم و زیادتی کی خبر دیکھے تو پہلے اس کی نگاہیں یہ تلاش کریں کہ کس فرقہ کی طرف سے یہ بات شروع ہوئی ؟ اس میں نقصان کس فرقہ کو زیادہ پہنچا ؟ جب ظلم کو ناپنے اور ظالم ہونے کا فیصلہ کا یہ پیمانہ بن جاتا ہے تو اس وقت معاشرہ کو کوئی طاقت اور بڑے بڑے تعمیری منصوبے (PLANS) بھی بچا نہیں سکتے۔

بزرگو ! اور بھائیو!

جب کسی انسانی نسل پر کسی دور میں اخلاقی گراوٹ کا ایسا دورہ پڑتا ہے یا وہ کسی انسانی و جماعتی سازش یا کسی انتشار پسند (DIVISIVE FORCES) کا شکار ہوتی ہے تو تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس وقت دو طبقے میدان میں آتے ہیں ایک دانشوروں (INTELECTUALS) کا طبقہ اور ایک مذہبی انسانوں کا طبقہ، یہ دو طبقے ہیں جن میں بگاڑ سب سے آخر میں داخل ہوتا ہے خاص طور پر مذہبی انسانوں کا طبقہ، لیکن جب اس طبقہ میں بھی غفلت، تساہل (APATHY) اور فرض ناشناسی پیدا ہو جاتی ہے تو اس معاشرہ کو، اس دلدل سے کوئی طاقت نکال نہیں سکتی۔

میں بغیر کسی معذرت کے صاف صاف کہتا ہوں کہ ملکی اور بین الاقوامی تاریخ کا ایک طالب علم اور حقیر مصنف ہوں، میں نہیں سمجھتا ہمارا ہندوستانی معاشرہ کبھی ایسے خطرہ سے دوچار ہوا ہو جیسا کہ اس دور میں (۲۰ ـ ۲۵ برس کے اندر) ہوا ہے۔ میں اس پر بالکل معذرت نہیں کروں گا۔ ہندوستان

کا جسم بارہا زار و نزار ہوا۔ ہندوستان پر برطانیہ کی برسوں بدیسی (ALIEN) حکومت رہی، یہ سب تاریخی واقعات ہیں لیکن ہندوستان کی روح اور ہندوستان کا ضمیر اس طرح کمزور نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنا کام چھوڑ دیا ہو۔ ہندوستان کی تاریخ میں کبھی ایسا دور نہیں آیا کہ برائی اور ظلم کو اس آسانی کے ساتھ گوارہ کر لیا گیا جس آسانی کے ساتھ آج گوارا کیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس کو فلسفہ بنایا جا رہا ہے اس کے ذریعے جماعتوں کو مستحکم اور منظم کیا جا رہا ہے اس کے ذریعہ ہندوستان میں حکومت کا استحقاق ثابت کیا جا رہا ہے ہندوستان میں سینکڑوں مصیبتوں کا شکار رہا ہے لیکن ضمیر انسانی ہندوستان کا (CONCIENCE) زندہ رہا۔ اس نے اپنا کام کرنا، اپنا (FUNCTION) کبھی چھوڑا نہیں اس وقت جو اصل خطرہ کی چیز ہے وہ اردو کے شاعر کے بقول اور مولانا آزاد کے پسندیدہ شعر کے مطابق یہ ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے — کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

انسانیت کی حفاظت اسی ضمیر نے کی ہے تفنگ و شمشیر نے نہیں کی ہے سپاہ اور فوج نے نہیں کی ہے، شاہی خزانوں اور دولت کی بہتات نے نہیں کی ہے، علم کی ترقی نے نہیں کی ہے مجھے جو خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ کہیں ہندوستانی معاشرہ کا ضمیر تعطل (STAGNATION) کا شکار نہ ہو گیا ہو اس نے اپنا کام کرنا نہ چھوڑ دیا ہو، یہ اصل خطرہ کی بات ہے اس لئے کہ انسانیت کی آس اسی ضمیر سے ہے اس دنیا میں جو کچھ خیر و فلاح کی اُمید ہے وہ اسی ضمیر سے ہے انسانوں کی قسمتوں کا جہاں تک تعلق ہے حکومتوں، تہذیبوں اور معاشروں کی قسمتوں کا جہاں تک تعلق ہے ظلم ان کے لئے پیغام موت ہے ظلم کے بعد ان کو ڈھیل نہیں دی جاتی اور وہ زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرات! اگر میں نے بعض تلخ حقیقتوں کو تلخ الفاظ میں کہا ہے تو مجھے معاف فرمائیں کہ جب حقائق کی تلخی حد سے بڑھ جاتی ہے تو کوئی شیریں کلامی اسے شیریں نہیں بنا سکتی وہ فریب دہی ہوتی ہے

۔۔۔ سنے ایک تلخ حقیقت کو تلخ انداز میں کہا ہے اس پر ہمیں آپ سے معذرت خواہ ہونا ہے ہماری سوسائٹی کا روگ یہ ہے کہ بہت دور سے چل کر اپنی پارٹی اور اپنے فرقہ کو محفوظ رکھتے ہوئے اس بچاتے ہوئے ہزار احتیاط کے ساتھ بات اس طرح کہی جاتی ہے کہ کوئی پکڑ نہ سکے، ان کو پکڑے جانے کی زیادہ ہوتی ہے اور سوسائٹی کے تباہ ہونے کی فکر کم، لیکن جب آگ لگی ہو تو یہ تحفظات اور گفتگو کے آداب باقی نہیں رہتے۔ جب آگ لگی ہوتی ہے تو کسی زبان میں کیسے ہی بے ڈھنگے طریقہ سے اس کا اعلان کیا جاتا ہے، بے زبان بچہ بھی بول اٹھتا ہے کہ آگ لگی ہے اس وقت صورتحال یہی ہے اس سے کم نہ اس سے زیادہ، اس وقت ہمارا معاشرہ کوہِ آتش فشاں (VALCANO) کے دہانے پر کھڑا ہے اگر کوئی چیز اس کو بچا سکتی ہے تو وہ سچے مذہبی انسانوں، باہمت دانشوروں اور بے غرض رہنماؤں کا میدان میں آنا، حالات سے پنجہ آزمائی کرنا اور اپنا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے ناامیدی اور بدشگونی کی کوئی بات نہیں صرف خلوص، عزم، ہمت اور محنت و قربانی کی ضرورت ہے اس ملک کو دنیا کی اخلاقی قیادت کا فرض انجام دینا اور اصول و اخلاق پر مبنی صحیح جمہوریت اور انسان دوستی کا نمونہ پیش کرنا ہے اور یہ ہر طرح اس ملک کے شایانِ شان اور اگر اس کے لئے خلوص کے ساتھ کوشش کی گئی تو آسان ہے۔۔۔

سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی
مدیر سلے بلی آغا پورہ ۔ حیدرآباد

حقیقتِ تصوف یعنی علمِ لدُنی یا طریقت

صوفی اعظم حضرت جلال الدین رومیؒ نے اپنی مثنوی میں یوں گہر افشانی فرمائی ہے۔

قیمت ہر چیز میدانی کہ کیست قیمت خود را ندانی احمقیت

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ خودشناسی ہی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ تصوف کا مقصد یہ ہے کہ انسان دنیوی ہمہ جہتی ترقی، اخلاقی و مذہبی کے ساتھ ساتھ روحانی مدارج و عروج طے کرے۔ اصول اسلام کی پابندی کے ذریعہ خداشناسی و خدارسی کے درجہ پر فائز ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیشہ سے علم ظاہر کے ساتھ علم باطن، شریعت کے ساتھ طریقت کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، تجلیہ روح و تخلیہ سر کے مواقع حاصل رہتے ہیں اور حضور و شہود رب العزت کے درجات سے عالم اسلام سرفراز ہوتا ہے اس تعلیم کو علم لدنی، طریقت و تصوف سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ شریعت کے جملہ علوم ظاہری تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، معانی و بیان مقدمات طریقت و مبادی تصوف ہیں۔ تصوف، بہترین رشد و ہدایت برکات نبوت و فیضان رسالت کا نام ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث لکھی ہے۔

الشَّرِيْعَةُ كَالسَّفِيْنَةِ وَالطَّرِيْقَةُ كَالْبَحْرِ

یعنی شریعت کشتی کی طرح ہے اور طریقت سمندر کے مانند ہے صوفیائے کرام عام طور پر اس عا

کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں۔

اَلتَّصَوُّفُ تَصْحِیْحُ الْخَیَالِ وَالْاَعْمَالِ

یعنی دراصل تصوف عقیدہ وعمل کی درستی کا نام ہے جس کی بدولت انسان پر مطابق صلاحیت روحانی کیفیت وارد ہوتے ہیں چنانچہ سب سے بڑے سلطان العارفین، مراد المشتاقین، حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم ہی ہیں اور آپ ہی کی ذات بابرکات ان تعلیمات کی سرچشمہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو جو پیغام خدائی پہنچایا اور کلام ربانی سنایا اور اس کی جو تصریحات اپنے قول، فعل اور حال سے ظاہر فرمائی وہی اس علم کی اساس ہیں قرآن مجید ناطق ہے۔

وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمٰن ۲۱ ع ۳)

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ساری نعمتوں کے ظاہری و باطنی محاسن کی کافی وضاحت فرمادی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (الانعام ۷ ع ۶)

کوئی تر و خشک شئے ایسی نہیں جس کو اس کھلے پیام آسمانی میں ظاہر نہ کیا گیا ہو۔

تذکرۂ خضر علیہ السلام کے سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکہف ۱۸ ع ۹)

کہ ہم نے ان کو علم لدنی کی تعلیم دی تھی

اس علم میں شان تنزیہہ و تشبیہہ کی تحقیق ہوتی ہے جس سے توحید ربانی کا نام مقصود انسان خلیفۃ اللہ ہے ۔۔۔ ہ ماموں ہے کہ پہلے خودی کو جانے پھر خدا کو پہچانے۔

چنانچہ قرآن مجید ناطق ہے۔

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات ع ۱)

اگر تم اپنے اندر نگاہ کرو تو "وحدتِ ربانی" کی بے شمار نشانیاں دیکھیں گے۔ ملک میں آثار سے موثر کا پتہ لگے گا۔ ملکوت میں افعال سے فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ سمجھ میں آئے گا جبروت سے صفات سے "لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ" کا مشاہدہ ہوگا اور لاہوت میں ذات سے هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ کا معائنہ ہوگا۔ الغرض۔

جملہ تن را می گذاری درنظر

درنظر و درنظر و درنظر (مولانا رومؒ)

جیسا کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب تک ان مراتب سے نہ گذریں گے کمالِ عروج حاصل نہ ہوگا۔ ہر مرتبہ عروج میں نیا نشان اور نئی مشاق نمایاں ہوگی۔ ہماری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ وہ جو بہر حال ہمارے ساتھ ساتھ موجود ہے۔ جہاں کہیں ہم ہوں۔

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (الحدید ع)

اُس کا علم و عرفان اس درجہ حاصل ہو کہ اس کو اپنی رگ جان سے بھی قریب تر دیکھیں۔

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ع)

صوفیائے کرام کا ارشاد ہے کہ حقیقت سلوک وسیلہ ہے جس کی تحقیق میں فرماتے ہیں کہ جناب باری نے "روح قدسی پر محبت کا دارو مدار رکھا جو روح اعظم روح محمدی ہے" کیونکہ یہی حق سبحانہ تعالیٰ شانہ کی محبوب اول بھی ہے اور محبتِ اول بھی۔ آپ کی ذات والا صفات منتہائے تخلیق و محب تحقیق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں درجہ عشق میں آپ کی روش پر عاشقانہ انداز میں مطابقت و مطابعت لازمی ہے تاکہ نفس پر غفلت دور ہو۔ قلب بیدار ہو اور آپ کے فیض باطنی سے معیت جناب باری عز اسمہ کا شرف حاصل ہو۔

حضرت غوث صمدانی قطب ربانی سیدنا عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تصوف کے آٹھ خصائل ہیں۔ جن میں ایک ایک خصلت ایک ایک پیغمبر کے ساتھ مختص ہے۔

تصوف ان (۸) خصائل پر مبنی ہے۔

۱) ابراہیم علیہ السلام کی سخاوت (۲) اسحٰق علیہ السلام کی رضا

۳) ایوب علیہ السلام کا صبر (۴) ذکریا علیہ السلام کی مناجات

۵) یحیٰی علیہ السلام کی عزیمت (۶) موسیٰ علیہ السلام کی خرقہ پوشی

۷) عیسیٰ علیہ السلام کی سیر و سیاحت (۸) محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فقیری

اسی سلسلہ میں یہ بھی جاننا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ ہائے طریقت متعدد ہیں جملہ سلاسل کی تعلیم خالص سنت نبوی پر منحصر ہے۔ ہر ایک صوفی اپنے طریقہ سلوک کی تعلیم دیتا ہے جس سے انہیں فیضان الہی میسر آتا ہے بہرحال جملہ سلاسل کا سرچشمہ فیض رحمۃ اللعالمین ہیں جن کے برکات سے اقصائے عالم میں تصوف کی بیشمار نہریں جاری ہوئیں۔

البتہ مشہور سلاسل طریقت قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ ہیں انہیں سلاسل کے شیوخ کے طفیل سے چار دانگ عالم میں ایمان و عرفان کی نشر و اشاعت ہوئی ہے۔ انہیں کے اثر و نفوذ، روحانیت و للہیت کی بدولت وہ آبادیاں جہاں کفر و الحاد پرورش پاتا رہا۔ ضیائے توحید سے جگمگا اٹھیں۔ اور کرۂ ارض کے گوشہ گوشہ میں اسلام و ایمان کا پھریرا ہو گیا۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

عالم اثر است ذات یکتائی را
روزے کہ درو نہ آفتاب ست کہ دید

ترجمہ :- سارا جہاں اسی ذات یکتائی کی نشانی ہے۔ ورنہ دن ہو اور آفتاب نہ ہو یہ کس نے دیکھا؟

سید احمد عروج قادری قسط ۷

اسلامی تصوّف

۸۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ کسی ایک طاعت میں متعدد نیکیوں کی نیتیں کی جا سکتی ہیں اور ہر نیت پر ثواب مل سکتا ہے کیونکہ ہر نیکی کی نیت خود ایک حسنۃ ہے اور ہر حسنۃ پر کم سے کم دس گونہ اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مثلاً مسجد میں بیٹھنا ایک طاعت ہے اور اس میں متعدد نیتیں کی جا سکتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے بہت سی نیتوں کا ذکر کیا ہے میں یہاں چند نیتوں کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ کسی نماز یا جماعت کے بعد دوسری نماز با جماعت کا انتظار۔ نماز کے بعد دوسری [illegible] کے انتظار میں بیٹھنا بھی نماز ہی کے حکم میں ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت میں "رابطوا" [illegible] اد یہ ہے کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کیا جائے۔

۲۔ اعتکاف کی نیت (نفلی اعتکاف تھوڑی دیر کا بھی ہو سکتا ہے)

۳۔ یہ نیت کہ جب تک مسجد میں بیٹھے گا ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ اور آخرت کے انجام [illegible] و فکر کرتا رہے گا اور تمام دنیوی خیالات سے اپنے دماغ کو پاک رکھے گا۔

۴۔ یہ نیت کہ دین کے بارے میں اسے جو علم ہے وہ دوسروں کو سکھائے گا، معروف کی [illegible] ے گا اور منکر سے روکے گا۔ مثلاً بہت سے لوگ نماز صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ نزمی [illegible] تعدیلِ ارکان کی تعلیم دے گا اور نماز میں جلد بازی سے انھیں منع کرے گا۔

۵۔ اللہ کے ذکر میں مشغول رہے گا اور اگر وہاں اللہ کا ذکر ہو رہا ہو تو اسے دھیان سے سنے گا [illegible] سے نصیحت حاصل کرے گا۔

اسی طرح طاعت تو ایک ہوگی یعنی مسجد میں بیٹھنا لیکن ان متعدد نیکیوں کی نیتوں کی وجہ سے اجر میں بہت اضافہ ہوسکتا ہے۔

۹۔ پہلے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ حدیث نبویؐ "الاعمال بالنیۃ" میں اعمال سے طاعات و مباحات مراد ہیں ان سے گناہ کے کام مراد نہیں ہیں۔ کیونکہ کوئی معصیت اچھی نیت سے طاعت نہیں بن سکتی۔ اب یہاں یہ ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ نیت وہ چیز ہے کہ اس کی وجہ سے طاعات و عبادات، سیئات میں اور مباحات، طاعات و عبادات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص صدقات و خیرات میں نیت یہ کرے کہ لوگ اس کو سخی کہیں تو ایسا شخص خسرالدنیا والآخرہ کا مصداق ہوگا۔ دنیا کا نقصان تو یہ ہوگا کہ پیسے جیب سے نکل جائیں گے اور آخرت کا نقصان یہ ہوگا کہ وہ ثواب کے بجائے عذاب کا مستحق ہو جائے گا۔

مباحات (جائز چیزیں) کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ان سے نیت محض حظ نفس اور آرام و عافیت کی ہو تو نہ عقاب ہے نہ ثواب لیکن مباح چیزیں بھی بُری نیت سے معصیت اور اچھی نیت سے طاعت بن سکتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے۔

"ہر مباح کام میں کسی ایک نیت یا متعدد ایسی نیتوں کا احتمال ہوتا ہے جن کی وجہ سے وہ بہترین نیکیوں میں تبدیل ہوسکتا اور ان کے ذریعہ بلند درجات حاصل کیئے جاسکتے ہیں یہ کتنا بڑا نقصان ہے کہ انسان اس سے غافل ہو اور مباحات کا استعمال اس طرح کرے جیسے جانور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوشبو لگانا ایک امر مباح ہے جس سے انسان کی طبیعت خوش ہوتی ہے لیکن یہی کام قیامت میں سڑی ہوئی لاش سے زیادہ بدبو یا مشک سے زیادہ خوشبو میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ کوئی پوچھے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خوشبو کا استعمال ان مقاصد سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اپنے تمول پر فخر کا اظہار کیا جائے یا یہ کہ لوگ اس کے بارے

اس کی طرف مائل ہوں یا اسی طرح کی دوسری نیتیں اس مباح کام کو معصیت بنادیں گی اور قیامت میں ایسے شخص کے جسم سے مردار سے زیادہ بدبو پھوٹے گی۔ اور یہی کام مباح ان نیتوں سے بھی کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً جمعہ کے دن اتباعِ سنّت کی نیت یا مسجد کی تعظیم اور بیت اللہ کے احترام کی نیت یا اپنے قریب نماز پڑھنے والوں کو راحت پہنچانے اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کی نیت یا اس بات کا قصد و ارادہ کہ خوشبو کے استعمال سے دل و دماغ میں فرحت و انبساط کی کیفیت پیدا ہوتا کہ وہ دین کے اہم امور و مسائل پر اچھی طرح غور کر سکے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ خوشبو سے عقل بڑھ جاتی ہے ۔ یہ تمام نیتیں اس مباح کام کو طاعت بنا دیں گی اور قیامت میں ایسے شخص کے جسم سے مشک سے بہتر خوشبو پھیلے گی ۔ ان نیتوں اور مقاصد کا استحضار اسی شخص کو ہوتا ہے جس کے ذہن و دماغ پر آخرت کی تجارت اور طلبِ خیر کا خیال غالب ہو۔ اسی مثال پر ہر مباح کام کی تفصیل کی جا سکتی ہے (۱) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مباحات بھی حسنِ نیت کی وجہ سے طاعات و عبادات میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس طرح ایک مسلمان اگر چاہے تو اس کے چوبیں گھنٹے اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادات میں بسر ہو سکتے ہیں اور وہ بے حد و شمار اجر حاصل کر سکتا ہے ۔

۱۔ اسلامی تصوف میں استحضارِ نیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر نیک کام اور ہر جائز کام سے پہلے اس مقصد کو اپنے قلب و ذہن میں حاضر کر لیا جائے جسے حاصل کرنے کے لیے وہ کام کیا جا رہا ہو ،

حسنِ نیت کا ایک واقعہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

" امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ ایک مسکین نے حضرت عائشہ ام المومنینؓ سے کھانا مانگا۔ ان کے سامنے انگور کا ایک گچھا رکھا ہوا تھا انھوں

احیاء

نے ایک شخص سے کہا کہ اس میں سے ایک دانہ لے لو اور اس مسکین کو دے دو۔ وہ تعجب سے انھیں دیکھنے لگے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کیا تمھیں اس پر تعجب ہو رہا ہے تمھارا کیا خیال ہے انگور کے اس ایک دانے میں کتنے ذرات کے برابر وزن ہوگا؟ (۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس سوال سے اس شخص کو قرآن کی اس آیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھیں۔

"فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ"	پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا

حضرت عائشہ رض کا ایک انگور صدقہ کرنا اس بات کی عملی دلیل ہے کہ بہت قلیل شئے بھی صدقہ کی جا سکتی ہے۔

اور ان کا سوال اس بات کی دلیل ہے کہ جس وقت انھوں نے ایک انگور صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا اس وقت قرآن کی آیت اور ساتھ ہی آخرت ان کے دل میں حاضر تھی ۔۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

(۱) موطا امام ملک ج ۲ باب الصدقۃ بالشئی القلیل

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۶ سے آگے)

والدین کی معذوری کا خاتمہ ہو گیا بلکہ اُثاثہ جہیز کے لزوم اور اس ادائیگی سے نہ صرف والدین بلکہ خود لڑکیوں کی بعد از بیاہ مالی حیثیت بہتر ہو گئی اور اس طرح معاشرہ میں عورتوں کا احترام اور مقام بڑھ گیا اور ان اندیشوں کا امکان ہی نہ رہا جس سے زمانہ حاضر پریشان ہے ▲

جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ آنا ضروری ہے

(ادارہ)

انشئی القلیل

رفعت نواز
مقابل اسٹیٹ ہوم۔ گھاٹی
اورنگ آباد 431001

کچھ میر ہاشم کے بارے میں

برسوں پہلے میر ہاشم صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی میرے ساتھ محمود عشقی اور محمود الحسن حال درانی بھی تھے ہم لوگ نامدیڑ سے کسی کام کے سلسلے میں پربھنی گئے تھے محمود عشقی نے میر ہاشم سے ملنے کی بات کی تھی تو میری نگاہوں میں صبا کے مختلف شمارے آ گئے کہ میر ہاشم کا کلام صبا میں اکثر شائع ہوتا تھا اور ان کا نام میرے لیے نامانوس نہیں تھا اورنگ آباد میں بھی میں قاضی سلیم اور بشیر بھائی کی گفتگو میں ان کا نام اکثر سنا تھا۔ ایسا لگا کہ میر ہاشم کی شخصیت میرے لئے اجنبی نہیں ہے دوپہر کا وقت تھا سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر واقع میر ہاشم کے وکالت خانے میں پہنچ گئے۔ صاف ستھرا عمدہ فرنیچر سے آراستہ وکالت خانہ الماریوں میں سلیقے سے رکھی قانون کی کتابیں۔ ایک الماری کے شیشوں سے جھانکتی ادبی کتابیں میر ہاشم نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا خیریت پوچھی، لکھنے پڑھنے کے بارے میں پوچھا اور پھر کھو سے گئے۔ گہری سوچ میں گم ہو گئے محمود عشقی دلچسپ باتیں کرتے رہے اور وہ مسکرا کر ہوں، ہاں کرتے رہے، لگا کہ موصوف محتاط آدمی ہیں، سنتے زیادہ اور کہتے کم ہیں، چائے کی ٹرے آ گئی۔ چائے دانی پر مور کے پروں کی ٹی کوزی تھی ساتھ میں بسکٹ اور پاپڑ تھے۔ میر ہاشم نے پیالیوں میں چائے انڈیلی اور اصرار کر کے بسکٹ اور پاپڑ ملانے لگے چائے نوشی کے بعد محفل برخواست ہو گئی۔ انہوں نے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں لیکن ایسا لگا کہ کسی دوست سے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ کسی اجنبی سے پہلی بار ملنے کا احساس نہیں ہوا تھا بس اُس ملنے ہی میر صاحب دور رہ کر بھی میرے قریب رہنے کا احساس دلانے لگے۔ اس ملاقات کے کچھ مہینے بعد پربھنی

حضرت تراب الحق کے عرس کے سلسلے میں مشاعرہ ہوا کنوینر میر ہاشم تھے۔ فضیل جعفری اور محمود دھشتی کے ساتھ میں بھی پہنچ گیا تھا۔ وہاں سلیمان اریب، سلیمان خطیب، علامہ حیرت بدایونی، قاضی سلیم، بشر نواز، لطیف ساحل، ضیائی وغیرہ سے ملاقات ہوگئی۔ رہائش اور کھانے پینے کا بہترین انتظام تھا۔ مشاعرے میں کئی سو مدعو تھے ہزاروں سامعین تھے لیکن مشاعرہ گاہ میں بد نظمی نہیں تھی۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا اور رات کے تین بجے تک چلتا رہا۔ میر صاحب اچھے منتظم بھی ہیں اس بات کا انکشاف ہوا۔ باہر سے اتنے سارے شاعروں کو بلانا اور کسی شاعر کو شکایت کا موقع نہ دینا۔ ان کی ناز برداری کرنا، ان کی جائز اور ناجائز فرمائشوں کی تکمیل پیشانی پر بل لائے بنا کرنا ایک بہترین منتظم ہی کر سکتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے مشاعرے اکثر بد نظمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد متواتر تین سال عرس کے مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا اور میر صاحب کی انتظامی صلاحیت، سلیقہ مندی اور بے لوث خلوص کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ یوں تو سب ہی شعراء کی دلجوئی میر صاحب کرتے تھے لیکن سلیمان اریب مرحوم سے خصوصی تعلق خاطر کا اظہار ہوتا تھا ان کی ہر خواہش کی تکمیل بلا حیل حجت کرتے تھے اریب مرحوم کو بھی میر صاحب کی دوستی پر ناز تھا اریب مرحوم سے ہاشم صاحب کی والہانہ محبت کا اظہار ان کی نظم "یہ جھوٹ کس نے کہا" میں بخوبی ہوا ہے، ایسا خلوص، ایسی محبت وہی شخص رکھ سکتا ہے جو بے ریا ہو، جس کے ذہن میں تحفظات نہ ہوں، اس نظم میں میر ہاشم نے گویا دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے۔

تمہیں جدا ہوئے اک لمحہ بھی نہیں گذرا
تمہیں نہ دیکھے کئی اک جگ بھی جیسے بیت گیا

اس نظم کا آخری شعر تو اریب مرحوم سے میر صاحب کی محبت کی انتہا کو آشکار کرتا ہے۔

وہ آنسوؤں میں، ہنسی میں، دلوں میں، محفل میں ہے "اریب مرگیا" ہاشم یہ جھوٹ کس نے کہا

ان کی دوستی مفادات سے وابستہ دوستی نہیں تھی۔ اریب صاحب تو ایک ادبی رسالے کے مدیر تھے جو ہر ماہ پابندی سے نکلتا بھی نہیں تھا اور تعداد اشاعت بھی محدود تھی بھلا میر ہاشم صاحب کو اریب صاحب کا

فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ میر ہاشم صاحب کو صرف اپنے مرحوم ہی سے محبت نہیں تھی، ان کا خلوص، ان کی محبت ان کی دردمندی سب کے لئے ہے جہاں بحیثیت ایک باکمال شاعر ادبی حلقوں میں ان کی قدر کی جاتی ہے وہیں ایک عوامی رہنما کی حیثیت سے وہ پہچانے جاتے ہیں عرصۂ دراز تک وہ میونسپلٹی پر بھی کے صدر بھی چنے گئے اور شہر کو خوبصورت بنانے میں منہمک رہے طویل مدت تک وہ کسان مزدور پارٹی کے اہم رہنما رہے انہوں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر، اردگرد کے ماحول سے بے پرواہ ہوکر شاعری نہیں کی، الفاظ کے طوطا مینا نہیں بنائے، وہ تو عام آدمیوں کے ساتھ رہے ان کے حقوق کے حصول کے لئے لڑتے رہے تکالیف اٹھائیں مشکلات کا مقابلہ کیا۔ جلسے جلوسوں میں تقاریر کیں، بے کسوں کا، مجبوروں کا حوصلہ بڑھایا۔ سینہ گرم کیا مورچے نکالے سرکار کی نظر میں معتوب اور عوام کے محبوب رہے، میر ہاشم صرف شاعر ہی نہیں عوامی رہنما بھی ہیں لیکن انہوں نے شاعری کو نعرے بازی سے پرے رکھا یہ ان کا بڑا کمال ہے۔

گذشتہ چھبیس برسوں میں میر ہاشم صاحب سے تقاریب میں، ادبی جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں گھنٹوں ان کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ اس یکجائی سے میر ہاشم صاحب کو سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کی شخصیت کی جن صفات نے مجھ جیسے سینکڑوں کو ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے وہ ہیں، نرم خوئی، مروت، وضعداری، دردمندی، حاجت روائی، بے ریائی، سلیقہ شعاری اور شائستگی۔

حالات کے اتار چڑھاؤ اور ڈھلتی عمر نے ان کی شخصیت کی مندرجہ بالا خوبیوں پر زنگ نہیں چڑھایا بلکہ انہیں اور نکھار دیا ہے شہرت، عزت، عہدہ اور تمول نے انہیں اوچھا نہیں بنایا، چھبیس سال پہلے جیسے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں ورنہ اس رنگ بدلتی دنیا میں ان آنکھوں نے اچھے اچھوں کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا ہے ▲▲

ایس۔ شفیق
16-8-238/6/1
ملک پیٹ۔ حیدرآباد

صنفِ نازک کی شناخت

ابتدائے آفرینش سے معاشرے میں مرد اور عورت کا درجہ برابری اور ہمسری کا نہیں رہا ہے عورت کی صنفِ نازک کی حیثیت سے شناخت خود اس امر اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جسمانی اعتبار سے عورت مرد کے مقابلے میں کمزور واقع ہوئی ہے اور کاروبارِ زندگی میں اُس کا دائرہ عمل جداگانہ ہے محنت و مشقت، جنگ و جدل اور دوسرے دقت طلب کاموں سے اُسے باز رکھا گیا ہے گو ترقی پسند اور مہذب معاشرہ میں عورت کی ماں بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے تعظیم و تکریم کی گئی ہے اور ضمانت دی گئی ہے لیکن پسماندہ غیر ترقی یافتہ اور نسبتاً جاہل معاشروں میں عورت کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق تھی اور یہی وجہ ہے کہ اولاد کے معاملے میں لڑکوں کی پیدائش کو لڑکیوں کی پیدائش کے مقابلے میں زیادہ پسند اور خوشگوار واقعہ تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

اس غیر فطری اور ظالمانہ تفریق اور امتیاز کی بہت سی وجوہ ہیں جن میں بیشتر معاشی ہیں اور کچھ سماجی اور ذہنی۔ غریب طبقات میں لڑکی کا پیدا ہونا اس لئے ناگوار ہوتا ہے کہ بڑی ہو کر وہ گھر اور خاندان کی کمائی میں اضافہ نہیں کرے گی بلکہ اُس کی شادی بیاہ میں بے ہودہ رسوم و رواج کی بنا پر مالی بار عائد ہوگا اس کے برخلاف لڑکا خود کمانے کے قابل ہوگا کاروبار یا زراعت میں ہاتھ بٹائے گا اور موجودہ ناواجبی سماجی طریقوں کے تحت گھر میں ایک نئی بہو لائے گا بلکہ ساتھ ساتھ مال و دولت بھی۔ مگر تعجب تو اُس وقت ہوتا ہے جب کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی اس قسم کی غلط اور پسماندہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ غلط تصورات اور ذہنی پسماندگی ہوتی ہے اور وراثت کے غلط تصورات، قوانین و رسم

زمانہ قدیم میں عرب میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جاتا تھا خود ہندوستان میں نہ صرف اس قسم کی طفل کشی ہوتی تھی بلکہ پسماندہ طبقات اور علاقوں میں ابھی تک ہو رہی ہے۔

عورتوں کو صرف جسمانی اعتبار سے کمزور سمجھا جاتا رہا ہے مگر ذہنی اور دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کبھی شک و شبہ نہیں کیا گیا اور تعلیم یافتہ عورتیں نہ صرف ہمسری کا ثبوت پیش کر رہی ہیں بلکہ اپنی برتری کا لوہا منوا رہی ہیں۔ سعودی عرب میں آج کل جو امریکی فوجیں متعین ہیں ان میں عورتیں پائلٹ ٹرک ڈرائیور اور انجینئر کی حیثیت سے کارگزار ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک بشمول برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان خواتین وزیراعظم کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکی ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشی و ذہنی پسماندگی، پسماندہ، بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی دوبارہ شادی پر امتناع یا ایسی شادیوں کا فعل احسن نہ سمجھا جانا۔ وراثت اور ترکہ میں عورتوں کو حصہ نہ دیا جانا بہت ظلم و زیادتی و خرابی کا باعث بنا ہے اور ستی کی رسم اور خود سوزی کے واقعات کے پس پردہ یہی عوامل اور محرکات رہے ہیں۔

اخبار "ہندو" کے ۶ جنوری ۱۹۹۱ء کے سپلیمنٹ میں کلپنا شرما نے ایک سائنسی، تحقیق اور طبی ٹکنالوجی کے بے جا بلکہ غلط اور ظالمانہ استعمال کا ذکر کیا ہے رحم مادر سے چند آلات کے ذریعہ بآسانی کچھ مادہ یا مواد نکالا جاتا ہے جسے (Aminiotic fluid) کہا جاتا ہے اس مادہ یا مواد کے تجزیہ سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہونے والا بچہ یا بچی کہیں جسمانی طور پر معذور، مجہول لنگڑا لنگڑی تو نہیں پیدا ہوگی اور ایسا اندیشہ ہو تو وضع حمل کے ذریعہ نہ صرف والدین بلکہ معاشرہ کو بوجھ اور پریشانی سے بچایا جا سکتا ہے کیونکہ ایک معذور فرد نہ صرف خود تکلیف و پریشانی اٹھاتا ہے بلکہ خاندان اور معاشرہ پر خواہی نخواہی ایک بوجھ اور بار گراں بن جاتا ہے۔ اس حد تک یہ سائنسی تحقیقات اور ایجاد اچھا نہ تھی مگر ہو یہ رہا ہے کہ ضمناً اس تجزیہ سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہونے والی اولاد نر ہوگی یا مادہ اور پرانے فرسودہ جہل و ظلم کے پروردہ اشخاص اس تکنیک کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کو دوران حمل رحم مادر ہی میں ختم کر دیتے ہیں تاکہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"۔ ۱۹۸۸ء میں مہاراشٹرا

ایک قانون پاس ہوا ہے جس کے ذریعہ سے ہونے والے بچے یا بچی کی معذوری کا پتہ لگانے کے طریقہ کی اجازت دی گئی ہے اور اب جبکہ مرکزی حکومت اس قسم کا مرکزی قانون سارے ملک میں یکسانیت برتنے کی خاطر لانا چاہتی ہے یہ بحث اور اندیشہ رونما ہو گیا ہے کہ اس تکنیک کے ناجائز اور جابرانہ استعمال کو روکا جانا چاہیئے اور کس طرح روکا جا سکتا ہے۔

مہاراشٹر کے تجربہ سے تو یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ دراصل سماجی اصلاح کا مسئلہ ہے جیسا کہ بیوؤں کو نذر آتش کرنے اور ستی کی رسم اور خودسوزی کے مسائل ہیں اور بقول مضمون نگار جب تک ہندوستان اور دیگر پسماندہ ممالک میں خواتین کو مردوں کے مساوی نہیں قرار دیا جاتا اور انہیں بھی بنی نوع انسان کا فرد نہیں سمجھا جاتا۔ رحم مادر میں یا پیدائش کے فوری بعد لڑکیوں کی زندگی ختم کرنے کے بہیمانہ طریقوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

قدیم عرب میں لڑکیوں کو بار سمجھا جاتا تھا اور چونکہ رحم مادر میں جنس کی شناخت کی تکنیک معرض وجود میں نہیں آئی تھی اس لئے ولادت کے فوری بعد لڑکیوں کی زندگی ختم کی جاتی تھی پیغمبر اسلامؐ نے جہاں معاشرہ کی دوسری برائیوں کی اصلاح فرمائی اور عادات و عبادات و عقائد کو راہ راست دکھلائی وہیں اس اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ پہلے تو آپؐ نے یہ تبلادیا کہ مرد و عورت میں جسمانی اعتبار سے فرق ضرور ہے لیکن وہ کمتر درجہ کی مخلوق نہیں اور وراثت اور ترکہ میں عورت کا بھی حصہ ہے دوسرے یہ کہ آپؐ نے فرمایا کہ کسی گھر میں لڑکی کی ولادت اور خاص طور پر پہلی اولاد کا لڑکی ہونا اس گھر کے لئے باعث خیر و برکت ہوتا ہے شادی بیاہ میں بے جا رسومات اور لین دین پر اصرار کرنے کو منع فرمایا نکاح کو اپنی مرغوب سنت قرار دیا اور بشرط استطاعت (جسمانی، ذہنی و معاشی) چار بیویوں تک اجازت دی، بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے نکاح کی ترغیب خود اپنے عمل صالح سے واضح فرمادی اور اس طرح عورتوں کی معاشرہ میں نہ صرف عزت اور اہمیت بڑھ گئی بلکہ معاشرہ میں بدچلنی اور حرام کاری کی زیادتی کی کمی۔ لڑکیوں کا گھر بیٹھے رہنا، نکاح کرنے کے لئے کسی شخص کا آمادہ نہ ہونا اور بے جا مطالبات کے پورا کرنے

تبصرہ

تبصرہ کیلئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

ابرِ احسنی اور اصلاحِ سخن

مرتبہ: پروفیسر عنوان چشتی ۔ نعیم الدین رضوی

قیمت ۱۰۰ روپے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

تبصرہ نگار: ڈاکٹر جلال انجم

ادبی نقطۂ نظر سے اصلاحِ سخن کی روایت بہت اہم اور طاقتور روایت ہے اُردو شاعری کے ابتدائی دور ہی میں اس کا سراغ ملتا ہے شاہ حاتم کا تکیہ تو شعراء کا ایسا مرکز تھا جہاں علمی اور ادبی اظہارِ خیال کیا جاتا تھا یہ روایت خانِ آرزو، شاہ نصیر اور ذوق سے ہوتی ہوئی داغ کی شکل میں اپنی پوری توانائی کے ساتھ نظر آتی ہے اس روایت کو داغ کے شاگردوں نے کافی فروغ دیا۔ جن میں احسن مارہروی، نوح ناروی، بے خود دہلوی، سائل دہلوی، سیماب اکبرآبادی اور پنڈت بھورام جوش ملسیانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے حال ہی میں احسن مارہروی کے تلمیذِ خاص علامہ ابرِ احسنی گنوری نے اس فن کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ شاہ حاتم سے استادی شاگردی کا جو سلسلہ چلا تھا وہ ابرِ احسنی پر ملتا ہے ابرِ احسنی نے اصلاحِ سخن کے دائرے میں جو ورثہ چھوڑا ہے اس میں دبستانِ دہلی اور اسکول کا اثاثہ تو ہے ہی ان کی ذاتی ریاضت اور تجربوں کا علمی اور فنی سرمایہ بھی شامل ہے۔

"ابرِ احسنی اور اصلاحِ سخن" میں ایک طرف ابرِ احسنی کی سوانح اور ادبی نقطۂ نظر شامل ہے تو دوسری طرف داغ دہلوی کے نظریاتِ فن، اصلاح کا طریقہ اور ابرِ احسنی کے استاد احسن مارہروی کے نظریاتِ زبان و فن اور طریقۂ اصلاح بھی موجود ہیں۔ اس طرح یہ کتاب تین نسلوں یعنی داغ دہلوی، احسن مارہروی

آبراحسنی گنوری کے ادبی، لسانی اور فنی نظریات اور طریقۂ اصلاح کی دستاویز بن جاتی ہے آبراحسنی کا ادبی نقطۂ نظر وسیع اور لچکدار ہے انھوں نے لکھا ہے

" ادب ماحول کا تابع ہوتا ہے جس شاعر و ادیب کے زمانے میں جو ملکی اور سماجی حالات ہوں گے شاعر اور ادیب انھیں حالات پر روشنی ڈالے گا۔"

" میں جدید خیالات کے اظہار کا شعر میں شدت سے حامی ہوں۔ ہمارا ادب ترقی یافتہ نیا ادب ہے۔ کیونکہ ہم زمانے کے ساتھ چل رہے ہیں "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آبراحسنی کے ذہن کے دریچے تازہ ہوا کے لئے کھلے ہوئے تھے لیکن اظہار کی سطح پر وہ اُن تمام ضابطوں، اصولوں اور قرینوں کے قائل تھے جو اساتذۂ فن نے بتائے ہیں اس لئے انھوں نے اپنی اصلاحوں کی توجیہوں میں ان باتوں پر خاص طور پر زور دیا ہے اس کتاب میں پروفیسر عنوان چشتی نے آبراحسنی کے فن پر تجزیاتی انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اُن کے نظریۂ فن کو لسانی، عروضی اور فنی حصوں میں تقسیم کیا ہے صغیر احسنی نے آبراحسنی کی کتاب " اصلاح الاصلاح " کی تلخیص اور تجزیہ کیا ہے شارق میرٹھی ڈاکٹر تنویر چشتی اور انور مینائی نے آبراحسنی کی دو کتابوں (میری اصلاحیں حصہ اول و دوم) کا تجزیہ کیا ہے نعیم الدین رضوی نے آبراحسنی کی تین کتابوں کا بھرپور تعارف پیش کیا ہے۔ سیفی پریمی، عنوان چشتی اور کیلاش چندر ناز نے اپنے کلام پر آبراحسنی کی اصلاحوں کو توجیہات کے ساتھ پیش کیا ہے اور بہت اہم اور خیال انگیز فنی نکات سے بحث کی ہے اس کتاب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں شعر و فن کے اہم اور ضروری نکات پیش کیئے گئے ہیں۔

" آبراحسنی اور اصلاح سخن " ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اعلیٰ کاغذ پر آفسیٹ کے ذریعے شائع کی گئی ہے۔ رنگین ڈسٹ کور پر آبراحسنی اور جملہ لکھنے والوں کی تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

رؤف خیر
"بیت الخیر" رسالہ بازار، گولکنڈہ
حیدرآباد

چیلنج قبول کرنے والا شاعر؟

"وقفۂ خواب" پڑھتے ہوئے بارہا احساس ہوتا ہے کہ ثاقب اپنے آپ کو آزما رہے ہیں ایسا لگتا ہے وہ چیلنج کرنے اور چیلنج قبول کرنے کا مزہ لیتے ہیں۔ حیدرآباد کے چند اچھے شاعروں کے ساتھ وہ اٹھتے بیٹھتے رہے ہیں (ویسے بھی وہ بڑے گوشہ نشین شاعر ہیں) اور آج تو ان مرحومین کی عدم موجودگی نے ثاقب کو بہت تنہا کر دیا ہے۔

اریب و جامی و مخدوم و شاذ کی صورت
ملے نہ کوئی تو ثاقب یہ صحبتیں کیسی ؟

ثاقب نے ان مشہور و معروف شعراء کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر اپنے آپ کو آزمایا ہے اور اس چیلنج نے ان میں بڑی لکیر کھینچنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ ان کا مزاجِ شاہانہ کبھی مرعوب ہوتے نہیں پاتا۔ اریب و جامی و مخدوم و شاذ کے علاوہ انہوں نے فانی بدایونی کی غزل پر غزل کہی اور ایسا خوب صورت شعر نکالا۔

کہہ دے کوئی کلیوں سے کہ منہ بند ہی رکھیں
ہے جرم یہاں کوششِ اظہارِ تمنا

"وقفۂ خواب" کے مطالعہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ ثاقب قصۂ جدید و قدیم کو دلیل کم نظری ہی سمجھتے ہیں چنانچہ ان کا شعر محض شعر ہے اور ان کے ہاں جدت و کلاسیکیت اضافی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ ان کے بعض شعر ہر حیثیت سے دل کو چھو لینے والا ہے۔

تم ہو قائل یقیں نہیں آتا   شکل تو چارہ گر سی لگتی ہے

اتنے معمولی پیرایہ میں اتنی غیر معمولی بات کہہ جانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہی غیر مبہم انداز ان شعروں میں بھی ہے۔

عجیب شئے ہے جہاں میں مقامِ ناداری — نہ پاس ہم آتا ہے کوئی نہ دور جاتا ہے

غم ہے تو بس یہی ہے کہ خود سے نہیں ملے — ورنہ یہاں تو سب سے ملاقات ہو گئی

زندگی تیرے تعارف میں بڑی دیر لگی — ورنہ کچھ دن کے لئے میں تجھے مہماں رکھتا

فرصتِ ذات جو ملتی تو سجا کر میں بھی — طاقِ ارماں میں کئی خواب پریشاں رکھتا

میں اکثر اک ہجوم بے صدا میں کھو سا جاتا ہوں — نہ جانے کیوں تری آواز سی محسوس ہوتی ہے

یہاں "سی" ویسا ہی مزا دے رہا ہے جیسے میر کے ہاں مزا دیتا ہے۔

ثاقب کی خوبی یہ ہے کہ وہ روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید لب و لہجہ کے حامل بھی ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

روایتوں کے افق پر نئی کرن چمکی — نئے مزاج کی ثاقب غزل سناتا ہے

ثاقب کی لفظیات اکہرے پن کا شکار نہیں بلکہ دائرہ در دائرہ معنویت کی مظہر ہیں

مہمان کی آمد کا کہاں گھر کو پتہ ہے
دروازے نے دستک کا لہو چوس لیا ہے

وہی مکاں ہے وہی میں وہی گلی لیکن — نہیں وہ چاند سا چہرہ کسی دریچے پہ اب

محسوس کر سکو تو کرو زندگی کا حسن ؛ چھونے کی ان دنوں تو روایت نہیں رہی
خود کو نگاہِ دہر سے کیسے چھپائیے ؛ سر پر ردائے شب بھی سلامت نہیں رہی
اندر کی دھوپ چھاؤں میں پل کر بڑھے ہیں ہم ؛ باہر کے موسموں کی رفاقت نہیں رہی

سو بار دیکھنے سے بھی شاید یقیں نہ آئے
اتنا جھلس گیا ہے سراپا حیات کا

گلشن پرست اہل ہے روایت شکن نظر ... اس کے سوا بھی ہم پہ ہیں الزام آج کل

ثاقب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان نہایت سلیس ہے۔ وہ اپنے دور کے محاورے میں بات کرتے ہیں اور بوجھل تراکیب سے بھی وہ گریز کرتے ہیں۔ یہ کھرا لہجہ دل میں اُترتا جاتا ہے۔

نفس نفس پہ کوئی احتساب جیسا ہے ... تمہارے دور میں جینا عذاب جیسا ہے
ترے خیال کو چھوتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں ... ترا خیال تو بالکل گلاب جیسا ہے
لکھے ہوئے ہیں غم زندگی کے افسانے ... ہر ایک شخص کا چہرہ کتاب جیسا ہے
اُتر رہا ہے رگ و پے میں بجلیوں کی طرح ... کسی کا حسن تو ثاقب شراب جیسا ہے

ثاقب کی زبان اتنی قریبی لگتی ہے کہ ان کے اشعار سننے ہوئے سے لگتے ہیں۔ ایسی غزل کا اثرات سے بڑے بڑے شاعر نہ بچ سکے چنانچہ ثاقب نے کہا۔

وقت مہلت ضرور دیتا ہے ... غم اچانک ملا نہیں کرتے
پاسِ آدابِ شعر ہے ورنہ ... شعبدے ہم بھی کیا نہیں کرتے

بر آگے وہ یہ کہنے پر مجبور بھی ہوئے کہ ؎

ہ کہ شعبدے ہی راس آئے ... ایک اور تین پانچ تو بھی گن
ندگی ہم سے یوں ملی جیسے ... ہیٹ پہنے کھڑا ہو سٹالن

شاذ تمکنت نے کہا تھا کہ ؎

دکن میں شاذ اکیلا دکھائی دے

نہیں رہے تو ثاقب نے کہا ؎

ں میں بات چلی ہے کچھ اس طرح ... ثاقب دیار شعر میں تنہا دکھائی دے

کو استادی کا دعویٰ کبھی نہیں رہا وہ جب شعر کہنے پہ آتے ہیں تو ڈوب کر کہتے ہیں (اور سر نکالیں تو) ضروری نہیں کہ ہر سیپ گوہر آبدار لیے ہوئے ہی ہو۔ مگر اس۔

کے حوصلے کا پتہ تو چلتا ہے۔

وفا کے شہر سے گزرو تو یہ بھی دیکھتے جاؤ — جھلس گئی ہیں ہوا سے شباہتیں کیسی

قبائے تنگ سے چنگاریاں سی چھنتی ہیں — بدن کے لوچ میں ساون کی یہ رُتیں کیسی

اِس طرح تیری یاد کے دامن کو تھام کر — کانٹوں کے راستے پہ کہاں تک کوئی چلے

اب اے شبِ فراق بتا تو ہی کیا کریں — مدت سے ان کی یاد ملی ہے نہ وہ ملے

اک عمر بیت گئی خارزارِ ہستی میں — لہو سے اپنے گلستاں کوئی سجائے ہوئے

ہم اپنے ساتھ ہیں اک وقفۂ تھکن کی طرح
بدن کے دشت ما کی طے ہوں مسافتیں کیسی

کارِ سنگلاخ بہت ہے یہ سخن فہمی عشق — یوں سمجھ لو کہ ہے پتھر کو ہوا پر رکھنا

ثاقب دراصل غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے جوہر غزل ہی میں چمکتے ہیں۔ جہاں تک نظموں کا معاملہ ہے ایسا لگتا ہے بیشتر قطعات پر عنوانات دے دیئے گئے ہیں۔ کچھ آزاد نظمیں ہیں جن میں ثاقب کی لفظیات تو ہیں مگر یہ نظمیں ان کی غزلوں سے آگے نہ جا سکیں۔

"حصۂ فردیات" کے نام سے آخر میں چیدہ چیدہ اشعار بھی شامل ہیں۔

اس وقفۂ خواب سے وہ گزریں تو خدا کرے ان کے ہاتھوں میں اک روشن کتابِ سحر ہو۔

کیونکہ بقول ثاقب ؎

عارضی فرصتیں ہیں یہ نیندیں
وقفۂ خواب دیر پا بھی نہیں

محمد عبدالہادی خاں
۲-۲۰-۶۱۵ بارہ گلی
حسینی علم ۔ حیدرآباد

ہندوستان کی تہذیبی تاریخ اور درباری نظام

ہندوستان کی معاشرتی تاریخ کا تسلسل ہزاروں سال قدیم کڑیوں سے جڑا ہوا ہے تہذیبی توارث کے رنگا رنگ سلسلہ میں ہمیں متنوع جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں نیگریٹ 'دراوڑ' آرین' مُسلم اور برٹش ادوار میں ہندوستانی سماجی نظام مختلف پہلو بدلتا رہا تاہم اس ملک کی گنگا جمنی تہذیبی انفرادیت ہمیشہ برقرار رہی۔ یہ اور بات ہے کہ راعی اور رعایا' راجہ و پرجا' حاکم و محکوم کے علامتی تغیرات نے بعض دفعہ خوشگوار اور بعض دفعہ نامناسب حالات بھی پیدا کردیئے اس کے باوجود ہندوستانی سماج اپنے ورثہ اور اپنی قدروں سے کبھی بھی بے اعتنائی برت نہ سکا یہی سبب ہے کہ عامتہ الناس اور طبقہ حکومت میں ہمیشہ تال میل، تعلق اور ربط وضبط قائم رہ سکا اور یہی بات ہے ملک کی قدیم ترین سماجی و تہذیبی تاریخ میں تسلسل کا باعث بن سکی۔

اگرچہ کہ قدیم شواہد سے یہ بات عیاں ہوچکی ہے کہ آرین قوم کی آمد سے پہلے بھی ہندوستانی معاشرہ ایک مکمل اور منضبط حیثیت سے ترقی پذیر تھا اس دور میں بھی ایک مکمل سماجی اور سیاسی نظام موجود تھا مگر جب وسط ایشیا سے آریائی اقوام کے مہذب گروہ جوق در جوق ملک میں داخل ہوئے تو انھوں نے اس ملک میں ایک نئے حکومتی نظام، نئے سیاسی آئین اور سماجی اصولوں پر ایسے سماج کی تشکیل دی جس میں بہ اعتبار پیشہ درجہ بندی کے ذریعہ سماجی ڈھانچہ کو تقویت پہنچائی گئی۔

اس سماجی نظام میں طبقہ حکمران کو جو اہمیت اور فوقیت حاصل تھی وہ دیگر ملکوں کے نظام حکومت سے مختلف نہ تھی۔ البتہ ہندوستان میں مذہبی گروہ کی بالادستی حکمرانوں پر بھی مانی جاتی تھی یہ بات دوسرے مقامات پر شاذونادر ہی نظر آتی تھی لگ بھگ چار ہزار سال ہندوستان اس مخصوص سماجی نظام میں جکڑا رہا۔ یکسانیت نے شاید پورے ملک کو بے زارکن حالات کا شکار بنا دیا تھا ان حالات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی ہندوستانی سماج کو ناگوار نہ تھی چنانچہ آرین قبائل کے ورود کے چار ہزار برس بعد جب مسلمانوں نے اس ملک کا رخ کیا تو سکندر و اشوک کی خونریزیوں کے برخلاف معمولی سی جدوجہد نے ان کے لئے ملک کے دروازے کھول دیئے۔ مقامی باشندے برضا و رغبت نئے حکمرانوں کو تیقنِ اطاعت دینے لگے۔ یہ ایک طرح کا منفی ردِعمل تھا بہرحال نوسو برس پہلے سرزمین ہند میں اسلامی بادشاہت کی داغ بیل پڑی۔ اس کا سہرا سلطان شہاب الدین غوری کے سر جاتا ہے اگرچہ کہ محمد غوری سے بیشتر محمود غزنوی نے متعدد مرتبہ یہاں قدم جمانے کی کوشش کی مگر اس کی وسیع سلطنت کی دیکھ بھال کے لئے اس کا یہاں تک جانا سیاسی اعتبار سے ممکن نہ تھا پھر بھی ملک کے شمال مغربی حصہ پر اسی کا تسلط دوسو سال تک قائم رہا۔

ادھر محمد غوری نے ہندوستان جنت نشان کو جس نظامِ حکومت، معاشرتی آداب، سماجی ڈھانچہ سے متعارف کروایا اس نے گویا پورے ملک کو اس تبدیلی کا والہ و شیدا بنا دیا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستانی سماج کے مزاج کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس خوبی کے ساتھ سیاسی آئین مرتب کیا جس میں فاتحین کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں کو حکومت اور نظم و نسق میں مناسب جگہ دی گئی۔ بادشاہی دربار میں سماج کے تمام طبقات کو نمائندگی دی گئی اس طرح ایک دل پذیر رنگا رنگی کے ساتھ بادشاہی دربار کو زیب و زینت بخشی گئی۔ مسلم بادشاہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن مالوف قرار دے کر اس کی ترقی، خوشحالی اور عوام کی بھلائی و بہبودی کے جس قدر خدمات انجام دی ہیں وہ [illegible] ملک کی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہیں۔

ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کی خصوصیات میں درباری نظام اور تہذیبی اقدار کا ارتقاء
، ذکر ہے خاندانِ غوری، آل تغلق، مغل دربار نے اپنے اثر آفرین نقوش کے ذریعہ تاریخ
ں حد تک سنوارا اور سجایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے مسلم حکمرانوں میں توارث کا رجحان بلاشبہ
ان و روم کے تصورات کی دین ہے جب کہ اسلام کے نظامِ حکومت میں اس کی کوئی گنجائش نہ تھی۔
رت کے عملاً خاتمہ کا سبب دراصل یہی توارث کا نظام تھا۔ بہرحال جب اسلامی جمہوریت نے
یت کا لبادہ اوڑھ لیا تب ہی سے موروثی سیاسی کشاکش، آپسی چپقلش، فتنہ و فساد، جوڑ توڑ کا
بی مزاج پھلنے پھولنے لگا تاہم اصولِ جانشینی میں کلانیت کو اولیت اور بعض دفعہ عہدداران
ت میں صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھا جاتا لیکن زیادہ زور اور اہمیت کلانیت کو ہی حاصل ہوتی مسلم
دستوں میں یہی رواج جاری رہا۔

ہندوستان میں مکمل مسلم بادشاہت کا دور کم و بیش ساڑھے چھ سو سال تک رہا بعد ازاں مختلف
ربوں کی خود مختاری اور مرکز سے عدم رابطہ نے کئی چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم کردیں جو برائے نام دہلی
وفادار تھیں ان میں صوبہ دکن ریاست حیدرآباد کا موقف ایک حد تک جداگانہ تھا دربار کے
خاتمہ تک سلطنت دکن کسی نہ کسی طرح دہلی سے وابستہ رہی بعد میں بالکلیہ آزادانہ اور خود مختارانہ حیثیت
سے کام کرنے لگی۔ صوبہ دکن کے حاکم سپہ سالار چین قلیچ خان کے بعد ان کے ورثاء نے یہاں باضابطہ
داخلی اختیارات کے ساتھ نظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیا اور سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد رکھی۔

آصفجاہی خاندان کے سات نامور حکمرانوں میں نواب میر عثمان علی خان انفرادی شان و
ت، رعب و داب، جاہ و جلال، سطوت و وجاہت، علم و حکمت اور فضل و کمال میں
مثال حیثیت رکھتے ہیں۔ نواب میر عثمان علی خان جنھیں آصفِ سابع سے یاد کیا جاتا ہے
ش نصیب حکمران تھے جنھیں سلطنت کے فروغ و ترقی استحکام کے ضمن میں رعایا کی بے پناہ
، اور عقیدت حاصل تھی اور بدنصیب حکمران: اس لحاظ سے تھے کہ انھیں کے دور میں

شاداب
پانی کی فراہمی کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہے۔

اس بات کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے ابتدائی تعلیم کے نظام کو بڑھاوا دینے کے لئے مرکز کے زیرِ انتظام مختلف اسکیمات کو روبہ عمل لایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مختلف پروگرام جیسے آپریشن بلیک بورڈ، اساتذہ کا تربیتی پروگرام اور جاریہ غیر رواجی روایتی تعلیمی پروگراموں کو مضبوط بنانے کی اسکیمیں وغیرہ شامل ہیں۔

آپریشن بلیک بورڈ اسکیم کے اغراض و مقاصد میں تحتانوی مدارس کے لئے درکار بنیادی سہولتوں میں بہتری پیدا کرنا ہے جن میں سرکاری مدرسے، بلدیات کے تحت چلائے جانے والے مدرسوں کے علاوہ سبھی مسلمہ مدرسے بھی شامل ہیں اور اس سلسلے میں ایک مدرسے سے مربوط کی جا سکے۔ تین اہم ضروریات کی تکمیل پر زور دیا جا رہا ہے یعنی ایک ایسی عمارت کی فراہمی کی جا سکے جو کم از کم دو بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ہو ہر مدرسے میں کم از کم دو ٹیچرز کے علاوہ تعلیمی ضروریات کے لئے درکار اشیاء کی فراہمی وغیرہ کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس طرح اس پروگرام کے تحت گذشتہ تین سالوں کے عرصہ میں 57٪ تحتانوی مدارس میں کام ہوا ہے۔

غیر رسمی تعلیمی پروگرام (NFE) پر بھی نظر ثانی کی گئی اس میں ایسی تنظیمی لچک پیدا کی گئی ہے کہ نصاب مطابقت پیدا کرتے ہوئے سیکھنے والے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر اس کی کارکردگی میں تنوع پیدا کیا۔ اس کے ادارہ انتظامیہ کو غیر مرکوز کرتے ہوئے اس پروگرام کو مزید مضبوط بنایا گیا ہے۔ ملک میں اساتذہ کے تربیتی نظام کو مضبوط بنانے کے لئے ایک تین نکاتی فارمولا پر عمل کیا جا رہا ہے جن میں سالانہ تقریباً ۵ لاکھ اساتذہ کو ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو ابھارنے میں مدد دینے کے لئے ماس اورینٹیشن پروگرام کے تحت تربیت دی
۱ جاتی ہے۔ تقریباً ۲۰۰ ضلع کی سطح پر اساتذہ کے چلائے جانے والے تعلیمی تربیتی اداروں کی تربیت نو کی
۲ جا رہی ہے اور یہ کام ان کے موجودہ ابتدائی تعلیم کے اساتذہ کے تربیتی اداروں کا درجہ بڑھانے یا پھر ضرورت ہو تو ایسے نئے اداروں کے قیام کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے اور ثانوی اساتذہ کے تربیتی ادارا جات کو
۳ مضبوط بنایا جا رہا ہے۔ با صلاحیت بچوں کی خصوصاً دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی عصری
۴ تعلیم کے لئے حکومت کے تحت ہر ضلع میں نوودیالیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ملک بھر میں تا حال ۲۶۲ نوودیالیہ قا

کئے جاچکے ہیں جو ۲۲ ریاستوں اور ۷ مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں چلائے جا رہے ہیں کسی بھی مخصوص ضلع میں درجہ فہرست ذاتوں وقبائل کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ان ذات اور قبائل سے تعلق رکھنے والے بچوں کو تحفظات بھی فراہم کیئے جا رہے ہیں اور اس سلسلے میں یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ کوئی بھی ضلع میں یہ تحفظات قومی تحفظات کے اوسط سے کم نہیں ہونا چاہیئے ۔

ان خطوط پر تیار کی گئی فہرستوں کے تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ درج فہرست ذاتوں و قبائل بالترتیب ۷ر۱۸ اور ۲ر۱۱ ہے جبکہ قومی اوسط ۱۵ اور ۵ر۷ فیصد ہے ۔ ۴۰ فیصد طالب علموں کا تعلق ان خاندانوں سے ہے جو غریبی کی نچلی سطح سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ کل تعداد کا ۲۷ فیصد لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ملک میں خواندگی کا فیصد ۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۱ء کے درمیان دوگنے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے آبادی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ناخواندہ افراد کی تعداد ۳۰۰ ملین سے بڑھ کر ۴۳۷ ملین ہو گئی ۔ اس کی ایک وجہ جہاں بے ہنگم بڑھتی ہوئی آبادی ہے وہیں ابتدا میں تو تعلیم کو عام کرنے میں ناکامی بھی دوسرا سبب ہے کل ناخواندہ آبادی کا ۷۵ فیصد خواہش پر مشتمل ہے جبکہ درج فہرست اقوام قبائل کے درمیان خواندگی کی شرح اور بھی نچلی سطح پر ہے ۔ نیشنل لیٹریسی مشن کے تحت ۱۹۹۰ء ـ ۹۵ تک ۱۵ تا ۳۵ سال عمر کے گروپ کے ۸۰ ملین بالغوں کو فعال طور پر خواندہ بنانے کا پروگرام ہے اور اس سلسلے میں خصوصی پراجکٹس کئی ریاستوں میں شروع بھی کئے جا چکے ہیں ۔

گجرات میں "ساکشرتا ابھیان" کے نام سے گجرات ودیاپیٹھ نے یکم مئی ۱۹۸۸ء کو ۳۵ لاکھ ناخواندہ بنانے کا کام مہم کے طور پر شروع کیا ہے یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس میں سماج کے سبھی طبقات عملی طور پر شریک ہیں اس طرح کا ایک پروگرام کرناٹک کے ۱۷۵ کے منجملہ ۲۰ تعلقہ جات میں بھی نومبر ۱۹۸۸ء میں شروع کیا گیا جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے تقریباً ۴۰۰۰ افراد نے رضاکارانہ طور پر ۴ لاکھ ناخواندہ بالغوں کو پڑھایا اس طرح کی مہم میں اب دیگر ۵ تعلقہ جات کو شامل بھی کیا گیا ہے مغربی بنگال میں ایک رضاکار تنظیم "بنگلیا ساکشرتا پرچار سمیتی" بنائی گئی ہے جو ساری ریاست میں خواندگی کے لئے چلائی جانے والی

[redacted]

لیزی اور ریاستوں حکومتوں کی مہم میں معاون ادارہ کا کام کرسکتی کیرالا میں ایک عوامی مہم اور ارناکلیم ضلع کو مکمل طور پر خواندہ بنانے کے لئے ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء کو شروع کی گئی تھی یہ ضلع اب سارے ملک میں اس اعتبار سے پہلے نمبر پر ہے کہ یہاں بالغوں کی ناخواندگی کو مکمل طور پر ختم کردیا گیا ہے۔ ارناکلیم ضلع کی تقلید میں اکشر اکیرالم کے نام سے مکمل خواندگی کی تحریک ۱ ریاست کے دیگر باقی اضلاع میں بھی چلائی جارہی ہے درحقیقت خواندگی بین الاقوامی سال ۱۹۹۰ء کے دوران خواندگی کے لئے مانگ کو بے نظیر طور پر پورا کرلی ہیں عوامی تہذیبی وثقافتی ذرائع ابلاغ و ترسیل نے بھی بڑی امداد دی۔

ہمارے تعلیمی نظام میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں نصاب کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جبکہ فنی تعلیم کے مواقع کم ہیں تعلیم سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی خاطر اس بات پر توجہ دی جارہی ہے کہ نصابی تعلیم سے ہٹ کر ہمہ جہتی فنی تعلیم کا ثانوی سطح پر آغاز کیا جاسکے۔ فروری ۱۹۸۸ء میں ثانوی تعلیم میں فنی تعلیم کے مشین کے قیام سے متعلق مرکز کے زیر انتظام ایک اسکیم مرتب کی گئی ہے جس کے مطابق مرکزی حکومت کی طرف سے ریاستی حکومتوں کو مالی امداد فراہم کی جاسکے گی تاکہ فنی تعلیم کے کورس کو مدرسں میں جمع دو سطح والی جماعتوں میں شروع کیا جاسکے۔

اس اسکیم کے کئی اجزاء ہیں جن میں فنی تعلیم کے لئے مختلف علاقوں کا سروے کرنا بھی شامل ہے تاکہ فنی تعلیم کے مختلف کورسس کو ان علاقوں میں مقامی ضرورتوں کے پیش نظر متعارف کیا جاسکے، اساتذہ کی تربیت کی جاسکے اور عملی تربیت کے مواقع فراہم ہوسکیں۔ اب تک ۲۷۰۰ سے زائد ایسے مدرسے فنی اور پیشہ ورانہ تربیت کے مختلف کورسس کے ساتھ ۲۵ ریاستوں میں شروع کئے جاچکے ہیں سماجی ومعاشی نیز صنعتی اور تکنیکی تبدیلیاں قومی فروغ کے لئے طرز تعلیم میں بھی تبدیلی متقاضی ہوئی ہیں۔

قومی ترقیاتی منصوبوں کو حقیقی روپ دینے کے لئے تعلیم کو روایتی حیثیت سے ترجیح دی جانی چاہئے تاکہ سارے ہندوستان میں ایک تحریک کے طور پر قبول کرسکیں اور اس سلسلے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو امداد سہولیات فراہم کرنے میں ایک حصہ ادا کرنا ہوگا۔

اے آر نندا

مردم شماری

ہندوستانی مردم شماری کا ادارہ دنیا بھر میں بہتر انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ چلائے جانے والے بڑے اداروں میں سے ایک ہے کیونکہ اس ادارے کو عالمی سطح پر اس کی اہمیت اور وسعت کے اعتبار سے تسلیم کیا گیا ہے ہندوستان دنیا بھر کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جہاں مربوط پیمانے پر مردم شماری کا کام جاری ہے ہمارے ملک میں مردم شماری کا کام پہلے پہل ۱۸۷۲ء میں ہوا تھا جبکہ دوسری مرتبہ ۱۸۸۱ء میں یہ کام ہوا اور پھر اس کے بعد سے مردم شماری کا کام یہاں پر دس سال میں ایک بار پابندی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

اس مرتبہ پچھلے دس سال میں بڑھنے والی آبادی کی مردم شماری کا آغاز ۹ فروری سے ۵ مارچ ۱۹۹۱ء کی مدت کے دوران کیا جائے گا ہمارے ملک میں مردم شماری کا یہ ۱۳واں لمبا مرحلہ ہوگا۔ جس کا تعین یکم مارچ کی صبح سے کیا جائے گا۔

مردم شماری کی یہ ساری کارروائی مردم شماری سے متعلق قانون بابتہ ۱۹۴۸ء کے تحت ہوگی۔ اور اس قانون کے تحت ہر اس شخص کو جسے مردم شماری کا کام سونپا جائے پر ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ اس فرض کو پوری وفاداری کے ساتھ انجام دے۔ عوام کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ شمار کنندہ کے تمام سوالات کے مکمل اور صحیح صحیح جوابات دیں۔ ان فراہم شدہ اطلاعات کو کسی اور دوسرے مقصد کے لئے استعمال کرنا قانوناً جرم قرار دیا گیا ہے یہ قانون اس بات کی بھی طمانیت دیتا ہے کہ مردم شماری کے سلسلے میں حاصل شدہ اطلاعات کو صیغۂ راز میں رکھا جائے گا اور کسی فرد واحد کی شناخت کے

سلسلے میں ان اطلاعات سے استفادہ نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی مردم شماری کے سلسلے میں تیار کی جانے والی فہرستوں میں شامل اطلاعات کو ثبوت کے طور پر کسی عدالت کے روبرو پیش کیا جا سکے گا۔ سوائے ایک صورت میں کہ فرد جرم خود قانونِ مردم شماری کی خلاف ورزی کے سلسلے میں عائد کی گئی ہو۔

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی فہرستوں کو اُس طریقۂ کار کے بموجب جو کہ اعدادوشمار کے مجاز افراد کی پہلی کانفرنس کے دوران طے کئے گئے تھے اور جس کا انعقاد ۱۸ تا ۲۰ اپریل ۱۹۸۸ء کو ہندوستان کے رجسٹرار جنرل کے دفتر کے زیرِ اہتمام عمل میں آیا تھا، ماہرین کی جانچ کے لئے پیش کیا جائے گا۔ اِن ماہرین میں مرکزی وزارتوں، ریاستی حکومتوں، تحقیقاتی اداروں اور مختلف جامعات سے متعلقہ افراد شامل ہیں۔

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کو قطعیت دینے کے سلسلے میں ماہرین کی اُن آراء اور تجربات کو بھی پیشِ نظر رکھا جا رہا ہے جو کہ حکومت کو مرکزی اور ریاستی سطح پر لاحق ہونے والی ضرورتوں سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں اقوامِ متحدہ کی سفارشات اور پچھلے تجربات اور اُن نتائج پر بھی غور ہوگا جو کہ ابتدائی جانچ کے طور پر مردم شماری کی اڈوائزری کمیٹی کے اجلاس بابتہ نومبر ۱۹۸۸ء اور مئی، جون ۱۹۸۹ء کے دوران حاصل ہوئے۔

خانہ شماری کے کام کو جو کہ اصل مردم شماری کا پہلا مرحلہ ہے ستمبر ۱۹۹۰ء کے ختم تک ہی تکمیل کر لیا گیا اور اس سلسلے میں سکونتی اور غیر سکونتی دونوں ہی اقسام کے کوئی مکان کلی طور پر یا پھر جزوی طور پر سکونتی اغراض کے لئے استعمال ہو رہا تھا تو اس میں رہنے والوں کی تفصیلات بھی حاصل کر لی گئیں۔ اہلِ خانہ کی شناختی تفصیلات کے سلسلے میں صدرِ خاندان کے نام اور اُس کی جنس کے اندراج کے علاوہ خصوصی طور پر یہ بات بھی ریکارڈ کی گئی کہ آیا اُس کا تعلق درج فہرست ذاتوں قبائل سے ہے یا نہیں۔ اس سوال سے ہٹ کر کہ آیا اہلِ خانہ کا یہ مکان ذاتی ہے یا کرایہ کا، خانہ شماری میں یہ بات بھی درج کی گئی کہ وہ مکان کتنے سکونتی کمروں پر مشتمل ہے اور پینے کے پانی کی

سربراہی گھر میں ہے یا باہر سے حاصل کرنا پڑتا ہے برقی سربراہی اور بیت الخلاء کی سہولتوں سے متعلق سوالات بھی کیئے گئے۔ اہل خانہ کس قسم کا ایندھن استعمال کرتے ہیں اس سلسلے میں بھی تفصیلات حاصل کی گئیں اگر اہل خانہ اس مکان ہی میں یا پھر اس مکان سے باہر کھلے حصہ میں کسی کاروبار سے منسلک ہیں تو ایک دوسری فہرست انٹرپرائس لسٹ کے نام سے تیار کی گئی اور اس طرح مرکزی اعداد وشمار کے ادارہ کے تحت تیسری معاشی مردم شماری کے ایک حصہ کا کام پورا ہوا۔

مردم شماری کا دوسرا مرحلہ جوکہ بہت ہی اہم ہے آبادی کا شمار ہے حقیقی طور پر مردم شماری کا اصل کام ۹ فروری سے شروع ہوگا اور ۲۸ فروری ۱۹۹۱ء تک جاری رہے گا۔ اس کے دوران شمار کنندہ گان گھر گھر جائیں گے اور اعداد وشمار کے بارے میں انفرادی سیلپس تیار کریں گے۔ مردم شماری کا اختتام بے گھر افراد کی گنتی پہ ۲۸ فروری کی رات میں ہوگا پھر اس کے بعد اعادہ کے طور پر ایک تیز گشت ہوگی جو یکم مارچ تا ۵ مارچ تک عرصہ پر محیط ہوگی جس میں یکم مارچ تک آبادی کے حقیقی اعداد وشمار کو قطعیت دی جائے گی۔

آبادی کی گنتی کے دوران مردم شماری کرنے والے افراد ملک کے تمام حصوں کا احاطہ کریں گے اور ہر گھر میں موجود ہر فرد کی گنتی کریں گے وہ ان افراد کو بھی شمار کریں گے جو کشتیوں میں رہتے ہیں خصوصی ٹرینوں میں زیر سفر افراد کی گنتی بھی کی جائے گی۔

مردم شماری کا کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس قدر وسیع ہے کہ اس کام کی تکمیل کے لئے تقریباً ۸ر۱ ملین افراد کو متعین کیا گیا ہے جن میں سوپر وائزرس اور دیگر عملہ کے افراد بھی شامل ہیں۔

مردم شماری کے بنیادی اعداد وشمار کی خبریں جوکہ اس اصل مردم شماری کے دوران زیر گشت آئیں گی گھروں کی فہرستوں اور افراد کی فہرستوں پر مشتمل ہوں گی افراد کی فہرستوں میں جو تفصیلات دی جائیں گی ان میں افراد کی سماجی ثقافتی اور معاشی حالت کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں گی اس اس فہرست میں نقل مقام سے متعلق معلومات بھی فراہم کی جائیں گی۔

پوسٹ گریجویٹ ڈگری اور ٹیکنیکل ڈگری کے حامل افراد کے لئے شمار کنندہ ایک علیٰحدہ

فہرست خانہ پوری کے لئے متعلقہ افراد کے حوالے کرے گا یہ کام PCSIR کونسل آف سائنٹفک اور انڈسٹریل ریسرچ کی ایماء پر کیا جا رہا ہے۔

ان فہرستوں کو شمار کنندہ کی دوسری گشت کے دوران تکمیل کر کے واپس کرنا ہو گا یا پھر ڈاک کے ذریعہ کونسل آف سائنٹفک اور انڈسٹریل ریسرچ کو روانہ کرنا ہو گا جس کے بعد میں اس ادارہ کے تحت ان فہرستوں کی تنقیح کی جائے گی۔

انفرادی سلیپ کے لئے جو سوال نامہ ترتیب دیا گیا ہے اس میں فرد کی معاشی مصروفیات کو بطور خاص اہمیت دی گئی ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے دوران ان سوال ناموں کو بہت احتیاط کے ساتھ مرتب کیا گیا تاکہ ہر فرد کی بنیادی مصروفیت کے علاوہ اس کی دیگر ثانوی مصروفیت کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا سکے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کو بھی انہی خطوط پر مرتب کیا گیا جس میں افراد کی معاشی نوعیت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کو اہمیت دی گئی ہے ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں نمایاں تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ افراد کی معاشی حیثیت کے متعلق سوال نامہ میں کام کی تلاش سے متعلق سوال کو صرف انہی افراد کے لئے مختص کر دیا گیا ہے جو حقیقی طور پر کام کی تلاش میں ہیں معاشی حیثیت سے متعلق سوال نامہ کو بھی اس لئے بھی اہمیت دی جا رہی ہے کہ ان سوالات سے جو اعداد و شمار جمع ہوں گے ان کی روشنی میں حکومت کو فراہمی روزگار سے متعلق پالیسی سازی میں مدد ملے گی۔

پہلی بار ۱۹۹۱ء کی مردم شماری ہی میں سابق فوجیوں، موجودہ وظیفہ یاب اور غیر وظیفہ یاب افراد کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں گی یہ کام وزارت دفاع کی ایماء پر کیا جا رہا ہے۔ مردم شماری کی فہرستوں میں شمار کنندگان افراد کے ناموں، صدر خاندان سے ان کے رشتے کی تفصیل جنس، عمر اور شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں معلومات کا اندراج گشت کے دوران ہی کریں گے اور ان معلومات کو بعد میں ہر ایک فرد سے متعلق علیٰحدہ سلپس پر نقل کیا جائے گا۔ اہل خانہ کی انفرادی اور اجتماعی فہرستیں تیار کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اجتماعی فہرستیں توجہ

(باقی سلسلہ صفحہ ۹۶ پر)

ڈاکٹر محبوب راہی
پی.او. بارسی ٹاکلی۔
ڈسٹرکٹ۔ آکولہ 444401

غزلیں

پیکرِ سنگ و آہن جیسا تنا کھڑا ہوں ویسے تو
اندر ٹوٹا پھوٹا ہوں سالم لگتا ہوں ویسے تو

کل گمنامی کی گہری کھائی میں بھی گر سکتا ہوں میں
شہرت کی اونچی چوٹی پر آج کھڑا ہوں ویسے تو

اپنے بدن کی قید سے لیکن چھٹکارا ناممکن ہے
باہر کی ساری دیواریں توڑ چکا ہوں ویسے تو

پھر بھی ایک کسک سی ہے جو رہ رہ کر تڑپاتی ہے
زخم پرانے، بیتی باتیں بھول چکا ہوں ویسے تو

دنیا بھر کے ہنگاموں کا مرکز سمجھا جاتا ہوں
دنیا بھر کے ہنگاموں سے بے پروا ہوں ویسے تو

جو تاریکی میرے اپنے اندر تھی سو قائم ہے
گلیوں گلیوں چاند ستارے بانٹ رہا ہوں ویسے تو

راہی کاش اک اچھا شوہر اچھا باپ بھی بن پاتا
لوگوں کی نظروں میں اک شاعر اچھا ہوں ویسے تو

زندگی بکھری پڑی ہے دھجیوں کی شکل میں .. جوڑنا ہے بہر صورت اس کو سینا ہے مجھے
مثل کندن آگ میں تپ کر نکھر اٹھتا ہوں میں .. کرب سہہ کر زیست کرنے کا قرینہ ہے مجھے
مفلسی ہی اک وراثت ہے مرے اجداد کی .. یعنی جو صبر و توکل ہے خزینہ ہے مجھے
اپنے اپنے دیکھنے اور سوچنے کا ڈھنگ ہے .. سنگ کہتے ہو جسے تم آبگینہ ہے مجھے
عرش اعظم تک رسائی کی نہیں راہی طلب .. بہتر از خلد بریں ارض مدینہ ہے مجھے

ا کرنا پڑتا ہے جہیز کی رقم میں بھی شائد اضافہ ہو جائے گا دو تین دانت بچی کے باہر بھی آجائیں تو
یم کی تمارے سے مرد ڈاکر ایک لائن میں لا کر دولہے میاں کو چن لے سکتے ہیں یہ صرف دانت سازی کا کرشمہ ہے
کوئی ضعیف آدمی منہ کھولے تو دو تین دانت مشکل سے پائے جاتے ہیں منہ میں اور وہ بھی کاجل کے
) ۔ اُس میں بھی بے ترتیبی ۔ بات کرتے وقت لعاب کی بارش ۔ آواز میں لرزش ۔ کُس کُس کی آواز ۔
اوقات مصنوعی دانت رہیں تو سیٹی کی آواز ۔ نمکین غذا کھانے کی خواہش لیکن چبا نہیں سکتے ۔ بچوں
ۂ وہ سامان کھیل ہیں ۔ نانی، دادی، نانا، دادا اپنے پُرکھوں کے سامنے دانت دکھلاتے ہوئے رہ
ہیں ۔ مصنوعی دانت تو مالدار لوگ سونے چاندی، سیرامیک سے بنوا لیتے ہیں ۔

رنج، صدمہ، غم میں دانت کا دخل ہے تعجب کا اظہار، پریشانی کی خبر سے فرد منہ کھول دیتا ہے وہ بھی
ر، پورے دانت کی نمائش ہوتی ہے نفسیاتی پیچیدگیوں ہوں تو منہ بند ہونے نہیں پاتا ۔
، آنسو بہہ جائیں تو لب بند ہوتے ہیں اور دانت دکھ نہیں پاتے ۔ قسم قسم کے دانت، چمکیلے، نوکیلے
ے، چپٹے، سفید، صاف، شفاف چہرہ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں بشرطیکہ پرورش
لور پر فرد کر پائیں ورنہ حلیہ بگاڑنے میں پیش پیش رہ پاتے ہیں ۔

غرض دانت ہمارے لیے عطیہ ہی نہیں بلکہ نگینہ ہے ۔ خزانہ ہے شرکت ہے اس کا ادب میں
یت میں، تمدن میں، تہذیب میں، خلوص میں بھی اس کا دخل ہے ۔ ملنسار بھی ہے، سفیر بھی ہے
تے کار بھی ہے، عالمی سطح پر دانت کا جشن منانے کی گنجائش بھی ہے کیونکہ ہر ایک فرد میں دانت
دیا ہوا ہے ۔ فرد کی خدمت میں مصروف ہے ۔ اس کی برکت سے ہر ایک فیض یاب ہو رہا ہے

مُرمُرے کی پوٹلی کو سوراخ کرتے ہیں۔ الماری میں گھس جاتے تو کشمیری ساڑھی، کچی ورم ساڑی یا دھرمادم ساڑی کا لحاظ نہیں کرتے۔ مساوات کی زندہ مثال ہے چوہے کے دانت۔ بسکٹ کا پوڈا رکھ دیجئے۔ چوہا ایک مرتبہ چکر کاٹ کر دوسری مرتبہ پوڑے کو کترنا شروع کر دیتا ہے اِش اِش کرنے پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ چوہوں میں دُبلے چوہے، چھوٹے چوہے، بونے چوہے، موٹے چوہے، شیطانی چوہے، کھیتی چوہے شامل ہیں اُن کے دانت بھی تناسب جسامت کے لحاظ سے اور نقصان کرنے میں ہمیشہ بیشی کی طرف اشارہ کرتے ہیں زراعت کے محکمہ میں تو چوہے کو مارنے کے لئے دوائیں، بسہ تھ کنٹرول کے تدابیر الگ، روک تھام کے اقدامات پر کافی مواد تیار کیا جاتا ہے چوہے کے دانت کسان کے لئے یم راج کی طرح ہیں انسان قد میں بڑا ہے لیکن چوہے کے سامنے تو اس کی مات ہے۔ نیند میں عورتوں کی پلک تک نوچنے میں، چکنے میں چوہے تیسز رہتے ہیں۔

سائنس کے سمندر میں اگر ہم غوطہ لگائیں تو دانت کی کہانی کچھ اور ہے جبڑا سخت ہوتے ہی گرتے پڑتے ہی دانت نکل آتے ہیں شیر خور کے دانت جھڑ کر مستقل دانت آتے ہیں چیر پھاڑ۔ نگلنے، نوچنے، کترنے، چبانے کے دانت سے صنف کی پہچان بھی ہے مگرمچھ کے دانت تو نہایت ہی طاقتور۔ دشمن پر ایک وار جو کر دیا تو ایکدم شکار صاف۔ پانی میں شکار کو غرقاب کر دیتا ہے مردہ کو نوچ نوچ کر کھا جاتا ہے [illegible] خدا نخواستہ منہ کھولدیا تو ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے شکار۔ راجہ ہو یا کسان، چور ہو یا مزدور [illegible] ہو یا لیڈر سب برابر ہیں اُس کے سامنے۔ دو تین دن تک رشتہ داروں تک کا پتہ بھی نہیں ہوتا [illegible] کس طرح ہوئی۔ لاش کے ٹکڑے گر مل گئے تو رسومات ادا کیے جاتے ہیں۔

سانپ کے دانت تو ماشاءاللہ! سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن انسان اس کا نام سنتے [illegible] ہی پریشان ہوکر مارنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اُسی ہیبت میں ڈس دیتا ہے سانپ۔ زہریلے [illegible] اگر ہوں تو نشانات زخمی پر پیوست ہو جاتے ہیں۔ زہر اگر اُگلا تو سمجھو خدا کو پیارا ہوگیا۔ ڈاکٹر علاج [illegible] سے تو قبر میں جانے میں تاخیر ہے۔

ہاتھی کے دانت تو کھانے کے اور دکھانے کے اور" نامور محاورہ ہے۔ دکھاوے کے دانت ہزاروں روپے میں بیچے جاتے ہیں۔ خریدے جاتے ہیں۔ چوری چھپے لے جاتے ہیں۔ سرقہ بھی کر لیتے ہیں۔ بکس بنائے جاتے ہیں۔ قالین بنائے جاتے ہیں۔ ہاتھی میں دو بڑے دانتوں (ٹسکس) کے درمیان سونڈ ایک عجیب مظاہرہ ہے۔ یہ ایک شاہانہ آن ہے ان کی تلاش کے لئے شکاری چوری چھپے گھنے جنگلوں میں گھس جاتے ہیں۔ ماضی میں تو راجہ مہاراجہ بڑے ہی فخر سے ہاتھی کے دانت سے گہنے بنواتے تھے۔ بیرونی ممالک میں کافی مانگ تھی اب تو سالار جنگ میوزیم میں ہم دیکھ پا رہے ہیں۔ کبھی کوئی معزز مہمان اعلیٰ سطح پہ ملک کا دورہ کرے تو آخر میں تحفہ کے طور پر ہاتھی کے دانت کا بنا ہوا کوئی ماڈل دیتے ہیں۔ دانت ایک سفیر کا کام کرتا ہے ملک کی نشانی ہے ساتھ ہی ساتھ پریشانی بھی یہ ہے کہ ہاتھیوں کی تعداد میں کمی ہوتی جا رہی ہے دیش میں اور ودیش میں بھی۔

شیر تو جنگل کا بادشاہ ہے شکاری تو ہوشیار نہ رہ پائے تو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے ایک پنجہ مارتا ہے ذرا بھی پرواہ نہیں اُس کے دانت کو۔ خواہ وہ پروفیسر ہو یا کامگار، کاشتکار ہو یا عہدہ دار، ڈاکو ہو یا قاتل۔ ٹھسم ٹھسا ہی پڑتا ہے۔ رائفل کے بناء تو ٹرشن کر ہی نہیں سکتا۔ بھیڑ بکری کو تحفہ کے طور پر دے کر مچان سے نشانہ لگانے کے بعد اطمینان کر لیتے ہی اعلان فخر سے کرتا ہے کہ "شیر کا شکار کیا ہے" زخمی شکار کو کھانے میں دانت کے کمال ہی زیادہ۔ کبھی آپ زو پارک میں شیر یا ببر کو منہ کھولتے ہوتے دیکھیں تو دانت خواب میں نظر آنے لگیں گے۔ منتر پھونکنا پڑتا ہے۔ تعویذ، گنڈا مالا کا انتظام کر لینا پڑتا ہے چھوٹے بڑوں کو۔

اللہ میاں نے پرندوں کو دانت نہیں دیا ورنہ خوبصورتی میں فرق آ جاتا تھا۔ مور اپنے پنکھ پھیلا کر ناچتی ہے خوشگوار موسم کی تمہید ہوتی ہے۔ موسیقار کو، گویّے کو خاص راگ پیش کرنے کا سماں ہوتا ہے۔ خوشحالی کی خبو ہوتی ہے۔ خدانخواستہ دانت اگر نکل آتے موروں میں تو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ کچھوا بھی دانت سے دانت سے معذور ہے لمبی عمر ہے اُس کی۔

ماں آٹھ نو مہینوں کے گذرتے ہی جب ٹیڑھے مضبوط ہو کر دو دانت نکل آتے ہی کرتوت
تے کرتے ہیں۔ منہ میں انگلی رکھتے ہی دبا تے ہیں۔ کترنے کی عادت سی ہوتی ہے۔ چوسنے میں
دونوں لے نکلنے کی کوشش ماں کی ممتا کا اظہار الگ۔ بڑے ہوتے ہیں شیر دانت کے بجائے
ت نکل آتے ہیں بتیس کی تعداد میں صاف رکھیں تو ہا ضمہ میں چستی۔ غلیظ رکھیں تو منہ کو دستی ہے
تا ہے۔ ہنسنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دانت دکھائے بغیر، دانت دکھاتے ہوئے ہنسی۔
تے ہوئے ہنسنا، تعجب کا اظہار دانت کے ہی چمتکار ہیں۔ دانت میں کیڑے پڑنے پر دندان ساز
انا پڑتا ہے وہ تو منہ میں دوا ڈال کر زور سے کھینچ دیتا ہے منہ پھول جاتا ہے۔ دو تین دن آرام
منہ برابر ہو جاتا ہے۔

قل داڑھ تو عقلمند کو، نا اہل کو، ناکارہ کو، بے وقوف کو، جاہل کو بھی نکل آتا ہے عقل تو
ذ وقت بے بلا کا درد ہوتا ہے۔ مٹھائیاں زیادہ کھائیں تو دانتوں میں عصر ئیے بیٹھ جاتے ہیں۔
ل افزائش کرتے ہیں درد دینے میں محو ہو جاتے ہیں یکے بعد دیگرے نکال دینا پڑتا ہے۔
منوئیوں کی سینچائی، فصل کی کاشت اور پھل پھول کی طرح پرورش دانتوں کی دنیا میں۔
ٹی۔وی پر اشتہار بازی میں دانت کا بھی دخل ہے صاف دانت دکھلا کر ٹوتھ پیسٹ کی کینوا سنگ
ہیں فور ہانس ہو یا کالگیٹ، سبا کا ہو یا وزڈم ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ برش کی فروخت ہوتی جاتی
دونوں کی عجیب ترکیب و استعمال سے دانت کی پرورش کا انتظام ہوتا ہے فلمی ستاروں کے نئے
ہمارے سامنے دانتوں کی خاطر ہی ہیں اس طرح دانت ایک سرمایہ ہے اسعد اہے، ہتھیار ہے۔
ہے سرمایہ سازی کا، سماج میں ایک ہیرو کی طرح ہے دانت۔ ایک طرح سے دانت ذریعہ معاش بھی ہے۔

شادی سے پہلے جوڑے کے انتخاب میں بھی دانت کا ہاتھ ہے۔ رول ہے۔ دولہے کو ہنسنے کو کہا جائے
دانت اگر نکل آئیں تو بس آپ ہی سمجھ لیجئے کیا کیفیت ہوگی! بچی کو دیکھنے کے لئے بیچے والے آئیں
ربات کرنے کے لئے کہیں۔ مگر بچی کے دانتوں کی نمائش ہوئی تو رشتہ طے ہو جانے میں مشکل کا

ڈاکٹر کے بھگتہ وتسل راؤ
2-2-1144/1/1
پوسٹ آفس لین یخلہ کنٹہ
حیدرآباد 44

دانت

دانت کی ایک سوانح ہے اس کا خلاصہ ہے نسل در نسل جانوروں میں' انسان میں دانت نکل آتے ہیں نشو نما ہوتے ہیں اور جھڑ جاتے ہیں۔ دانت کے الگ بھانت ہیں ہاتھی کے دانت بڑے ہیں تو چوہے کے چھوٹے دانت' گھونس کے دانت ہیں تو شیر و ببر کے خونخوار دانت' چمکیلے دانت ہیں تو نوکیلے دانت کی کمی نہیں' کائنات کے انواع ہیں۔ چیرنے کے دانت' پھاڑنے کے دانت' نوچنے کے دانت الگ الگ ہیں۔ خونخوار درندوں کے دانت بھیانک ہیں تو فلمی ستاروں کے ہنس مکھ دانت ہزاروں لاکھوں روپے کمانے میں کام آتے ہیں ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اس جہاں میں دانت کی مانگ زیادہ ہے بول بالا ہے. چرچا ہے' شہرت ہے ڈھنڈورا ہے۔ باجہ ہے ساتھ ہی ساتھ چمچہ گیری کا ہے۔

جانور ہو یا انسان اس کی پہچان دانت سے کی جاتی ہے چٹانوں پر انسانی ڈھانچوں کے' جانوروں کے نشانات میں دانت بھی ہیں۔ ان ٹکڑوں کو دوربین سے دیکھنے کے بعد خوردبین سے عمر ناپتے ہیں۔ اس کو چھوڑ کر دانت کو سمجھاتے ہیں ایک ٹکڑا مل گیا حل نکل گیا عمر بھر کی کامیابی ہو گئی۔ ریزہ گری بھی کی جاتی ہے اس کی۔ جبڑے الگ ہونے پر دانت الگ ہونا یقینی ہے جبڑے جبڑے ہوئے ہوں تو دانت بند اندر کی طرف۔ کیا کرشمہ ہے دانت کا ؟ آنکھ' ناک' کان پر اس کی فوقیت ہے۔

چوہے کے دانت دیکھیے۔ بیس تیس دانت آسانی سے اوپر اور نیچے الگ الگ' کترنے کے بلا کے طاقتور ہوتے ہیں۔ پی وی سی تار کو کاٹ کر پھینک دیتے ہیں' سراب میں اہم مثل کو' ناکارہ کاغذ کو [illegible] کون کر سکتا ہے

زینت شفیع

قوم کے معمار

صدیوں سے بھارت میں اساتذہ کو سماج میں ایک احترام کا درجہ حاصل رہا ہے انھوں نے نہ صرف بچوں کو تدریسی علم دیا بلکہ اقدار پر مبنی اس تعلیم کو پھیلانے میں مدد دی جو کہ ہماری ثقافت و تہذیب کا ایک اہم جزو ہے۔ بدلتی ہوئی اقدار نیز طلبا میں پھیلی ہوئی بے چینی کو مدنظر رکھتے ہوئے اساتذہ کی ذمہ داری نہ صرف طلباء کو ترغیب دینے کی نظر سے بڑھ گئی ہے بلکہ ان کی صحیح رہنمائی کے ذریعہ ان کی صلاحیتوں کو ایک صحیح سمت میں لگانا بھی ان کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ ایسی سمت جو کہ ملک کے بہترین مفاد میں ہو۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ استاد اور شاگرد کی اس پرانی روایت "گو بھیسمندہ" کیا جائے جو اساتذہ کے تئیں احترام و عزت کے جذبے کو بڑھاوا دیتی ہے۔

کسی بھی قسم کی اصلاح کے لئے خواہ وہ سماجی ہو یا تعلیمی اساتذہ، جدید پروگراموں کے ذریعہ طلبا کو فعال بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کے لیے بھی مناسب جدت کاری کے ذریعہ، ماحول کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

تعلیم کی ۱۹۸۶ء کی قومی پالیسی میں اساتذہ کے معمار قوم کی حیثیت سے ان کے کردار کو سراہتے ہوئے اس بات کو یقینی بنانے کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اساتذہ کو ایک خاطر خواہ حیثیت، سہولیات اور پیشہ وارانہ امداد برابر ملتی رہے۔

تعلیم کے کاز کے تئیں ان کے غیر معمولی تعاون اور خدمات کے اعتراف کے طور پر ملک بھر میں ہر برس ۵ ستمبر کو یوم اساتذہ کی شکل میں منایا جاتا ہے اور اسی دن مشہور و معروف ' فلسفی ' دستور ساز، سیاستداں اور ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر ایس رادھاکرشنن کی سالگرہ بھی ہوتی ہے

ہر برس یوم اساتذہ کے موقع پر صدر جمہوریۂ ہند ' کچھ اساتذہ کو ان کی نمایاں کارکردگی اور خدمات کے لئے انعامات سے نوازتے ہیں ۔ ان اساتذہ میں بنیادی سطح تعلیم سے تعلق رکھنے والے خواتین اور مرد اساتذہ دونوں ہی شامل ہیں ۱۹۸۷ء سے نقد رقم انعام کی بڑھا کر 2500 سے 5000 روپے کر دی گئی ہے۔ ۱۹۸۸ء ۔ ۸۹ سے ریلویز کی وزارت نے نیشنل ایوارڈ حاصل کرنے والے اساتذہ کے لئے سکنڈ کلاس کے درجے کے کرایے میں پچاس فی صد رعایت دی ہے ۔ اس کے علاوہ کچھ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں کچھ دیگر فوائد مثلاً ایڈیشنل انکریمنٹ اور سروس میں توسیع بھی ایوارڈ یافتہ اساتذہ کو دی جا رہی ہیں ۔

پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کے تقریباً ۴۵ لاکھ اساتذہ بنیادی سہولیات و سامان کی کمی کے باوجود بہتر سے بہتر کارکردگی پیش کرنے کے لئے جد و جہد کرتے ہیں زیادہ تر اساتذہ کو اپنے آپ کو نئے رجحانات ' تعلیمی شعبے میں رونما ہونے والے تبدیلیوں اور ترقی سے واقف کرانے کا بھی بہت کم موقع مل پاتا ہے اس کے علاوہ سکنڈری اور ہائیر سکنڈری سطح کے نصابی مواد کی تالیف عام طور پر سینیئر سطح کے ماہرین تعلیم انجام دیتے ہیں کلاس روم کے اساتذہ خصوصاً دیہی علاقوں و چھوٹے قصبوں کے اساتذہ کو تازہ ترین رسائل کو دیکھنے کا موقع کم ہی مل پاتا ہے اور انہیں کسی قسم کا دوسرا معاون حصہ یا ہدایتی مواد بھی فراہم نہیں کرایا جاتا ۔ اس طرح اساتذہ کی جانکاری کا بیشتر انحصار نصابی کتب پر ہی ہوتا ہے ۔ اس کے پیش نظر اساتذہ کو سروس میں رہتے ہوئے تعلیم (تربیت) فراہم کرنا بہت مناسب ہے ساتھ ہی پانچ برسوں کی ان کی خدمات کے دوران کم از کم ایکبار تدریس کے جدید طریقوں میں ان کے علم کو جدید ترین بنانے کے لئے مختلف تربیتی پروگرام مرتب کیے جانے ضروری ہیں ۔

اساتذہ کی جدید کاری کے پروگرام عام جدیدکاری کورسیز پر مشتمل ہونے چاہئیں جن سے اساتذہ میں تدریس کے طریقوں میں اسکول کے نصاب کی ضروریات کے پیش نظر تبدیلیاں لانے کی جانب عام بیداری پیدا کی جاسکے خصوصی مضامین کے میدان مثلاً سائنس، حساب، سماجی علوم، علمی تجربوں، آرٹ، کی تعلیم اور صحت و جسمانی تعلیم وغیرہ کے معاملے میں جدید کاری فراہم کرانے کے ساتھ ساتھ سلسلے وار اور بامعنی، نشو و نما نیز امتحانات سے متعلق مختلف اصلاحی پہلوؤں سے متعلق نئی تکنیک کا آغاز کیا جانا چاہیئے۔

تعلیم کے موضوع پر قومی پالیسی کے منصوبہ عمل کے مطابق ۱۹۸۶ء سے ہر برس تقریباً پانچ لاکھ اساتذہ کو ۱۰ روزہ کیمپوں میں جدید تربیت فراہم کرائی گئی ہے۔ ملک ... ضلع کی سطح پر تعلیمی ... تربیت کے تقریباً ۴۰۰ ادارے (ڈی آئی ای ٹی) قائم کئے جارہے ہیں۔ ۲۵۰ سکنڈری سطح کے اساتذہ تربیتی اداروں کو مستحکم بنانے کی تجویز ہے اوران میں سے ۵۰ اداروں کو تعلیم کے جدید مطالع کے اداروں کی شکل میں بدلنے کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے ذریعہ تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کونسلوں (ایس سی ای آر ٹی) کو مستحکم بنانے کی کوشش پہلے ہی شروع کر دی گئی ہیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تعلیم کے یونیورسٹیوں کے شعبوں کے قیام و استحکام کے لئے بھی کام کرنا شروع کر دیا ہے دیگر تعلیمی ساز و سامان کے علاوہ ان کوششوں کے ذریعہ اساتذہ کو وسائل سے متعلق افراد، اہم افراد و اساتذہ کو تعلیم دینے والے افراد کو باقاعدہ ملازمت کے دوران تعلیم کی سہولیات دستیاب ہوں گی۔

اساتذہ کی تربیت کی اسکیم دیگر مرکزی اسکیموں میں بھی شامل ہے ان اسکیموں میں پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں تعلیم میں پیشہ ورانہ عنصر کی شمولیت، سائنس کی تعلیم کے معیار میں تبدیلی، اسکولوں میں ماحولیاتی تعلیم، معذور بچوں کے لئے مربوط تعلیم، غیر رسمی تعلیم اور تعلیم بالغان وغیرہ کی اسکیمیں بھی شامل ہیں۔ آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے دوران ایسی کوشش جاری رہیں گی تاکہ ان اساتذہ کو جنہیں ملازمت کے دوران تعلیمی تربیت کے پروگراموں میں حصہ لینے کا کبھی موقع نہیں ملا ہے۔ ایسے اساتذہ کی بہت بڑی تعداد ہے جنہیں تعلیمی تربیت کے پروگراموں میں حصہ لینے کی سہولیات دستیاب ہوں گی

درس و تدریس کے معیار میں بہتری پیدا کرنے کے لئے ۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران اساتذہ کی

تعلیم کی از سر نو تشکیل و تنظیم کی ایک مرکزی اسکیم شروع کی گئی تاکہ اسکولوں، تعلیم بالغاں اور غیر رسمی تعلیم کے سسٹم کو مضبوط بنانے کے لئے موثر تربیت اور جامعاتی امداد فراہم کی جا سکے۔ اس اسکیم کے تحت ۹۰-۱۹۸۹ء تک بڑے پیمانے پر ہر سال تقریباً ۵ لاکھ اسکول اساتذہ کو درس و تدریس کے میدان میں تجدیدی تربیت دی گئی ہے تاکہ انھیں ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی کے خصوصی نکات سے واقف کرایا جا سکے اور ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت میں بہتری پیدا کی جا سکے۔

ابتدائی درجات کے اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے موجودہ اداروں کا درجہ بلند کرکے یا جہاں ضروری ہوا ایسے نئے ادارے قائم کرکے ضلعی سطح پر تعلیم و تربیت کے ۲۰۰ ادارے قائم کئے گئے ہیں تاکہ ضلع کی سطح پر ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کے سسٹموں کو مضبوط بنانے کے لئے مکمل جامعاتی اور تربیتی امداد مہیا ہو سکے۔ [illegible] اسکولوں کے اساتذہ کی تعلیم کے تقریباً ۲۵ اداروں کو مستحکم بنانا، ان میں سے ۵ اداروں کو تعلیم کے میدان میں جدید ترین مطالعہ کے اداروں میں بدلنا اور تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کونسلوں کو مستحکم بنانا جیسی سرگرمیاں بڑے پیمانے کے تجدیدی پروگرام کے تحت آتی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے [illegible] تعلیم کے شعبوں کے قیام و استحکام کی بھی تجویز ہے۔

بڑے پیمانے پر اسکول اساتذہ کی تجدیدی تربیت کے پروگرام کے تحت سال ۹۰-۱۹۸۹ء کے آخر تک ۲ لاکھ ۴۰ ہزار اساتذہ کو تربیت دی گئی۔ اسی دوران تعلیم و تربیت کے ضلعی سطح کے اداروں [illegible] اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے کالجوں اور تعلیم کے میدان میں جدید ترین مطالعے کے اداروں کی تعداد بڑھ کر ۲۲۸ ہو گئی ہے۔

بڑے پیمانے پر اساتذہ کی تجدیدی تربیت کے پروگرام کے ذریعہ ۱۹۸۶ء میں ایک [illegible] کیا گیا۔ اس [illegible] تجربہ کے تحت اساتذہ کی تربیت میں ذرائع ابلاغ کے کردار کا جائزہ لیا گیا۔ اساتذہ کی تربیت کے ان دس روزہ پروگراموں کی کامیاب تکمیل کے بعد تعلیمی ٹکنالوجی کے مرکز (سی آئی ای ٹی) اور چھ ریاستوں میں قائم تعلیمی ٹکنالوجی کے ریاستی اداروں (ایس آئی ای ٹی) نے [illegible] ویڈیو کیسٹ تیار کئے ہیں۔

(باقی سلسلہ صفحہ ۴۲ پر)

قاضی انصار
قاضی پورہ ۔ کھنڈوا 450001

غزلیں

دن میں میرے اندر رات — آپ سے ہے باہر رات
جوں توں کرکے کاٹا دن — پھر آ پہنچی سر پر رات
آج کسی کی خیر نہیں — نکلی ہے بن ٹھن کر رات
دن جیسے سنگلاخ زمیں — بنجر بنجر ہر ہر رات
کیسے کیسے سپنے تھے — آنکھ میں میری اکثر رات
من جائے گی دیوالی — دیپ جلائے آکر رات

مت بدل تیور انصار
کھا جائے گی ٹھوکر رات

✱

سوچتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیا لے گئی : زندگی، زندگی کی ادا لے گئی
بات کرنا بھی جن سے گوارا نہیں : میں کہاں تھا کہاں التجا لے گئی
پتہ پتہ بجانے لگا تالیاں : ساری بستی کے چھپر ہوا لے گئی
رنگ قوس قزح میں جو انصار تھے : خوشنما ایک تتلی چرا لے گئی

جی ڈی چندن

ملک میں بھوڑے انقلاب کی شروعات

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے مکانات کی تعمیر کا مسئلہ ایک بہت ہی عظیم مسئلہ ہے ایک اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ کے دہے کے شروع میں ملک میں دو کروڑ 33 لاکھ رہائشی یونٹوں کی کمی تھی اور سرکاری اندازے کے مطابق آبادی میں مزید اضافے کے پیش نظر ۲۰۰۰ یعنی اس صدی کے آخر تک ملک کو چھ کروڑ ۴۶ لاکھ نئے رہائشی یونٹوں کی ضرورت ہوگی۔

ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے زبردست سرمایے کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں اندازہ یہ ہے کہ اگر قیمتیں مستحکم رہیں جو ۱۹۸۵ء میں تھیں تو یہ سرمایہ تقریباً ۱۹ کھرب روپے ہونا چاہیئے۔ اس رقم میں تعمیرات کے کام کے بنیادی ڈھانچے اور خدمتوں کی رقم شامل نہیں اور اگر اس میں سے ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۰ء کے تشکیل ہونے والے سرمایے کی تخمینی رقم خارج کر دی جائے تو ۱۹۸۵ء کی قیمتوں کی بنیاد پر ۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۰ء کی مدت کے لئے تقریباً ۱۴ کھرب روپے کی ضرورت ہوگی۔ ان امور کی اطلاع مکانات کی قومی پالیسی کی دستاویز کے اس مسودے میں دی گئی ہے جو اس سال جون میں ملک کے سامنے پیش کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس سرمایے کی فراہمی پر سنجیدہ اور فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آٹھویں پلان میں جو ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء کی مدت ہے مکانات کے شعبے کے لئے ۴ کھرب ۷ ارب ۹۴ کروڑ روپے کی رقم تجویز کی گئی ہے جسے مالیات فراہم کرنے والے مختلف سرکاری اداروں سے حاصل کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ لیکن

سرمائے کے علاوہ ہمیں اس سامان کی صورت کا بھی جائزہ لینا ہوگا جو ہمیں مکانات کی تعمیر کے لئے درکار ہوگا قومی پالیسی کی دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ آٹھویں پلان کے مجوزہ ۲ کروڑ ۱۸ لاکھ رہائشی یونٹوں کی تعمیر کے لئے ملک کو عمارتی سامان کی مختلف اشیاء کی جس قدر ضرورت ہوگی ان میں سے ان اشیاء کی موجودہ پیداوار یا دستیابی کے حساب سے ایک کروڑ ۷۰ لاکھ ٹن سیمنٹ، ۴۰ لاکھ ٹن فولاد ۵۴ ارب ۸۹ کروڑ ۸۰ لاکھ اینٹیں اور ایک کروڑ ۴۰ لاکھ مربع میٹر عمارتی لکڑی کی کمی ہوگی۔

اس سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ مکانات کی تعمیر کے مجوزہ پروگرام کی تکمیل کے لئے ملک کو مہنگے اور [illegible] ٹکنالوجی اور زیادہ تر مقامی طور پر مل جانے والے کم قیمت عمارتی سامان سے کام لینا چاہئیے۔ نظر ثانی کا یہ اندازہ ہے [illegible] ہے کہ ہمارے اس مسئلے کا بیشتر تعلق ان لوگوں سے ہے جو دیہات میں رہتے ہیں یا گندی بستیوں میں ہیں تو اقتصادی طور پر کمزور ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مکانات کا معاملہ ایک ریاستی معاملہ ہے اور مرکزی حکومت پر مکانات کی سماجی اسکیموں کی مستعد تعمیل کے سیاق میں مشترکہ پروگرام اور طریق کار سے متعلق پالیسی بنانے کی ذمہ داری ہے اس میں ان اسکیموں پر اسے خصوصی توجہ دینا ہوتی ہے جو بیس نکاتی پروگرام کے تحت سماج کے کمزور طبقوں کی اصلاح و فلاح کے لئے ہیں۔

اس باب میں ہمارے دو اداروں نے بہت قابل کام کیا ہے ان میں سے ایک نیشنل بلڈنگ [illegible] اور [illegible] ڈیولپمنٹ کارپوریشن ہے جسے مختصر طور پر ھڈکو کہا جاتا ہے اس نے کم خرچ مکانوں کی تعمیر میں نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس ادارے نے ایسی ٹکنالوجی تیار کی ہے جس کی مدد سے مقامی طور پر مل جانے والے سستے سامان [illegible] روپے میں ایک رہائشی یونٹ تیار ہو سکتا ہے۔ اس ٹکنالوجی کی مدد سے ۲۰۰ اور ۲۵۰ روپے فی مربع فٹ کی روایتی لاگت میں پچاس فیصد کی کمی کی جا سکتی ہے اور ۱۰۰ اور ۱۲۵ روپے فی مربع فٹ کے خرچ سے اچھے مکان بنائے جا سکتے ہیں۔ اس میں سیمنٹ کنکریٹ، فولاد اور پتھروں کے

بجائے بھٹے کی پکی اینٹوں، خالص چونے کے مسالے، سرخی، ریت، فرش پر چیپس کی بجائے رنگیلی دیہاتی ٹائلوں، لکڑی یا لوہے کے روشن دانوں کی بجائے اینٹوں کی جالی کے ڈیزائنوں اور سیڑھیوں میں فولاد کی بجائے بانس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ان طریقوں کی وضاحت کے لئے ملک میں کئی مقامات پر ہاؤسنگ گائیڈنس سنٹر قائم کئے گئے ہیں۔ نئی دہلی میں یہ مرکز سرائے کالے خاں، نظام الدین میں کام کررہا ہے۔

اس ٹکنالوجی سے پچھلے چار پانچ سال سے جنوب کی ریاستوں میں بہت کام لیا جا رہا ہے اور یہ وہاں کے دیہاتی علاقوں میں بہت کامیاب ثابت ہو رہی ہے جیسا کہ جناب کیرالا، کرناٹک، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش میں بیسیوں دیہات میں کم خرچ مکانات کے پراجیکٹوں کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان دیہات میں ایک ایسا خاموش انقلاب پرورش پا رہا ہے جس کے پراجیکٹوں کی ارزانی اور طریق عمل کی آسانی اسے بہت جلد ملک کے دوسرے حصوں میں بھی مقبولیت عطا کردے گی۔

ان پراجیکٹوں کی پشت پر ایک ستر سالہ بزرگ، نقشہ نویس مسٹر لاری بیکر ہیں جو ۱۹۴۵ء میں ہندوستان کی ریاست اترپردیش میں کچھ تعمیراتی مشاورت کے لئے آئے تھے اور پھر اسی ملک کے ہوکر رہ گئے۔

لاری بیکر نے اپنی ٹکنالوجی سے ہندوستان میں درجنوں نئی بلڈنگیں بنائی ہیں۔

۱۹۶۴ء میں لاری بیکر کیرالا مستقل ہوگئے اور وہاں ان کی ٹکنالوجی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ ۱۹۸۹ء میں انھیں ہندوستان کی شہریت مل گئی اور اس سال انھیں پدم شری کا اعزاز بھی دیا گیا۔

یوسف جمال، مالیگاؤں

اردو گھر مالیگاؤں کا شاندار مشاعرۂ عام

مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء کی شب میں ۱۰ بجے اردو گھر مالیگاؤں میں نیشنل کلچرل گروپ (انجمن اردو گھر الانصار سوسائٹی۔ حبیب بال سیوا ٹرسٹ) کی جانب سے ایک شاندار مشاعرۂ عام منعقد کیا گیا جس کی صدارت بی ٹی ہائی اسکول کے سینیئر ٹیچر مبشر احمد انصاری صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر انیس بوستانی نے انجام دیئے۔

ابتداء میں جناب یوسف جمال نے اردو گھر کے پروگراموں کا اجمالی جائزہ پیش کیا اور آئے ہوئے مہمانوں اور شعرائے کرام کا پُرجوش انداز میں خیر مقدم کیا۔

پروگرام کے ابتداء میں جناب بدرالدین بادل نے نعتِ پاک کا نذرانہ پیش کیا بعد ازاں مدعو شعرائے کرام نے اپنے اپنے کلام سے نوازا۔ شعراء حضرات کی فہرست حسب ذیل ہے۔

اثر صدیقی، فاروق عشرت، حبیب شاکر، یوسف جمال، بدرالدین بادل، شبیر احمد ماہر، ریاض صہبا عبدالباری طالب، جمیل عارفی، ہمی عرفان گورکھپوری، شعبان کنول، صفیہ الہ آبادی اور ڈاکٹر انیس بوستانی ان تمام شعراء نے اردو گھر کو اپنی فکر و خیال سے منور کر دیا۔ خوب جی بھر کر داد بٹورے اور سامعین کو پوری طرح محظوظ کرتے رہے۔

پروگرام کے درمیان تمام شعراء حضرات اور اردو گھر میں تشریف لائے ہوئے مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی اور یہیں سے مشاعرے میں اور بھی گرمی آگئی۔ سامعین حضرات اتنے ہمہ تن گوش تھے کہ اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے بالآخر صدر صاحب کی اجازت سے قدوسہ دور کے

بجو آغاز کا اعلان کرنا پڑا۔ دوسرے دور میں سب سے پہلے یوسف جمال نے اپنی غزل سنائی اور اپنے ہر شعر
ثنا پہ داد وصول کی۔ اثر صدیقی، ریاض صہبا، فہمی عرفانی، نصیر الہ آبادی اور شعبان کنول نے بھی مشاعرہ
بجو لوٹ لیا۔ دوسرے دور میں بدر الدین بادل اور شبیر ماہر کو بار بار سنا گیا۔ جی بھر کر داد دی اور
گیا مشاعرہ گاہ کو لالہ زار بنا دیا۔

مشاعرے کے دوسرے دور کے اختتام پر جناب یوسف جمال نے تمام شعرائے کرام اور مدعوئین
مہمانانِ خصوصی صدر موصوف اور سامعین کرام کا پُر خلوص انداز میں شکریہ ادا کیا۔ اور ادارہ کے
روح رواں ڈاکٹر انصاری کی طرف سے بھی تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا گیا اور صدر صاحب کی اجازت
سے آج کے مشاعرے کا اختتام کا اعلان کیا گیا، اور شعراء حضرات کو اور صدر کے علاوہ دیگر معززین
کو ریفریشمنٹ کے لئے روک لیا گیا۔

ریفریشمنٹ کے درمیان ڈاکٹر انصاری صاحب نے اردو گھر کے آئندہ پروگراموں کو شعراء حضرات
کے سامنے رکھا۔ اثر صدیقی صاحب نے بڑے مفید مشورے دیئے اور کہا کہ ماہانہ شعری نشست کا
اہتمام جمعہ کے روز رکھا جائے اور ان کی نوعیت کو بدلتے ہوئے مثلاً طرحی، غیر طرحی، نعتیہ، منقبتی
اور اسی طرح کے دوسرے پروگرام منعقد کیا جانا چاہیئے۔ رات ۱۲ بجے پروگرام کا خاتمہ کیا گیا۔

بقیہ

ر تیار کرنے کے لئے افراد کو دی جا سکیں گی جبکہ انفرادی فہرستوں سے جدول تیار کرنے کا کام کمپیوٹر کی مدد
ے سے کیا جا سکے گا۔

ہ ہے مردم شماری کے کام کی منظم پیمانے پر تکمیل کے لئے مرکزی حکومت تمام ریاستی حکومتیں اور مرکز کے
ن دیکھیے۔ زیر انتظام علاقے سبھی مصروف ہیں سنہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی فہرستیں اور ان کی خانہ پوری سے متعلق
ب دی سی تا ہدایات وغیرہ کا مختلف علاقائی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔
چیند لمحوں، د

عزیز بھارتی (صدر مرکز ادب)
3-723 - ۱۱ ملے پلی حیدرآباد اے پی

نظم

دھرتی ہماری کل تلک آکاش جیسی تھی
دھرتی پہ کل تلک چاند تارے جگمگاتے تھے
کوچوں کی رونق دیکھنے کی چیز ہوتی تھی
دنوں کی کھڑکیاں دروازے سرِ شام مسکراتے تھے

ہمارے رتجگے اس شہر میں مشہور تھے کل تک
کہیں تھی شعر گوئی اور کہیں تھے قہقہے جاری
کبھی تو چاندنی راتوں میں سڑکیں رقص کرتی تھیں
کوئی بھی مشغلہ ہوتا نہ تھا احساس پر بھاری

۔۔ شام ہوتے ہی گھروں میں بند ہوتے ہیں
ا ۔۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہوتی ہے
۔۔ کے ۔ نالوں میں جب بھی ہوتا ہے کوئی کھٹکا
۔۔ تھاتے ہیں سب اور خوف سے مُنی بھی روتی ہے

ہر اک محفل میں سناٹا ہر اک محفل میں خاموشی
رباعی آہ بھرتی ہے غزل کی آنکھ پُرنم ہے
نظر کس کی لگی جانے ہمارے شہر کو یا رب
جہاں تھی زندگی رقصاں وہیں پہ آج ماتم ہے

مرزا غفار بیگ آثر
کوٹھی قدسیہ باغ۔ جاورہ
ایم پی

جی لیا جائے

ثبوت اپنی صفائی میں کیا دیا جائے
کسی کو ضد ہو کسی سے تو کیا کیا جائے

بلا سے کچھ بھی ہو ضبطِ الم کیا جائے
زبان نہ ملنے تو ہونٹوں کو سی لیا جائے

جوابِ نخوتِ صحرا کو یوں دیا جائے
ہو چاک داماں تو کانٹوں سے سی لیا جائے

سوال یہ کہ مرے بھی کوئی تو کیا حاصل
جواب یہ کہ جئے بھی تو کیوں جیا جائے

ہمارے ضبط پہ تنقید ہو مگر پہلے
ہمارے حال میں دو دن ہی جی لیا جائے

حیات میری وہ بے فیض و بے آثر جیسے
کسی چراغ کو دن میں جلا دیا جائے

ماریہ فگن کچھ ایسے، مرے مہربان رہے
جیسے کسی مکان میں کوئی سائباں رہے

ضد برق سے، نہیں یہ انا کا سوال ہے
کل جس جگہ جلا تھا وہیں آشیاں رہے

مجھ سے ثبوتِ برق و شرر مانگتے ہو اب
گلشن میں چار تنکوں کا کب تک دھواں رہے

آہیں کچھ ایسی دل پہ مسلط رہیں، آثر
جیسے کسی چراغ کی لو پر دھواں رہے

غزل

مومن خاں شوقؔ معتمد مرکز ادب
اشرف ویلا ۱۱-۳-۲۲
ملے پلی - حیدرآباد

یہ کیسی آگ ہے، کیسا دھواں ہے
جہاں میں ہر طرف آہ و فغاں ہے

نہ چھیڑو بھولی بسری داستاں کو
کہ اس میں آپ کی بھی داستاں ہے

پڑی ہے اُن کو اپنی محفلوں کی!
مرے پیشِ نظر کارِ جہاں ہے

نہ چھوڑو ساتھ میرا اے غموں تم
ابھی تو حوصلہ میرا جواں ہے

تمہارے دم سے ہیں، سارے نظارے
اگر تم ہی نہ ہو کیا گلستاں ہے

ملی اُن چاہی چیزیں زندگی میں
جسے ہم ڈھونڈتے ہیں وہ کہاں ہے

نہ جانے کون سی ہے مصلحت یہ
کہ وہ نامہرباں اب مہرباں ہے

ڈراؤ امتحانوں سے نہ ہم کو
ہماری زندگی خود امتحاں ہے

...رق سے اے شوقؔ ہر پل ÷ رہو ہشیار کہ وہ بدگماں ہے

غزلیں

محمود شریف محمود (بی اے عثمانیہ)
شریک معتمد مرکز ادب ۔ ملے پلی۔ حیدرآباد

وہ ہندو ہے نہ مسلم ہے، اُسے نسبت ہے شیطاں سے
رچائی جس نے ہاتھوں میں ہے مہندی خونِ انساں سے
بتاؤ خونِ ناحق کی اجازت دی تو کس نے دی
سبق اس کا ملا ہم کو نہ گیتا سے نہ قرآں سے
بظاہر رہبر و محسن، مگر در پردہ قاتل ہے
خدایا اپنے بندوں کو بچانا ایسے حیواں سے
ہوا محمود وہ مقتل، کبھی جو صحنِ گلشن تھا
فسادوں نے جہاں کھیلی ہے ہولی خونِ انساں سے

٭ ٭ ٭

بالوں کا کہاں نام و نشاں ہے
جدھر دیکھو اندھیرا ہے دھنواں ہے
ان ہر ہر قدم ہے ایک الجھن
ہر اک لمحہ نیا اک امتحاں ہے
ہر ــ دھر ڈالو نظر ہے موت رقصاں
پریشاں زندگی کا کارواں ہے
ہیں، بال پر چھل ہیں نظروں میں خنجر
ہوس کی بھوک چہروں سے عیاں ہے
رقہ ہونا کش کرسیوں کی رہبروں میں
لہو جنتا کا سڑک پر رواں ہے
ونِ زندگی سہتے ہیں سب کو
کہاں ہے وہ کہاں ہے وہ کہاں ہے
ی محمود جو جنت نشاں تھا
ارے کیا یہ وہی ہندوستاں ہے

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
کٹرہ پیر دل خاں۔
اٹاوہ - ۲۰۶۰۰۱ - یوپی

وہ پرندہ جو آسمان میں تھا — غالباً آخری اڑان میں تھا
ہر طرف پتھروں کے پہرے تھے — زلزلہ کانچ کے مکان میں تھا
ندگی کوہ نور تھی لیکن! — آدمی کوئلے کی کان میں تھا
رہ تیرگی پرستوں کا — چاند تاروں کی داستان میں تھا
ش کوئی شکار مل جاتا — آخری تیر بس کمان میں تھا
یتوں میں بپا تھے ہنگامے — راز مقتل ہر اک مکان میں تھا

آخری تیر

چنگاری جو بھڑکی آدمی کی چھاؤں میں
آگ کے طوفاں اٹھیں گے زندگی کی چھاؤں میں
رات کی پریوں کی آنکھیں آفتابی ہو گئیں
دھوپ کے سپنے جو دیکھے چاندنی کی چھاؤں میں
عالم بیچارگی میں جی رہا ہے آدمی
سینکڑوں غم ڈس رہے ہیں زندگی کی چھاؤں میں
ہوش مندوں کو ابھی شاید یہ اندازہ نہیں
منزلِ دار و رسن ہے بیخودی کی چھاؤں میں
انجمن در انجمن ہے تیرگی چھائی ہوئی
کونسا جادو ہے جالے روشنی کی چھاؤں میں
راز یہ کہتا ہے ہم سے رہگزاروں کا عتاب
قافلے لٹتے رہیں گے رہبری کی چھاؤں میں

غزلیں

محمود شریف محمود (بی اے عثمانیہ)
شریک معتمد مرکز ادب ۔ ملے پلی ۔ حیدر آباد

وہ ہندو ہے نہ مسلم ہے، اُسے نسبت ہے شیطاں سے
رچائی جس نے ہاتھوں میں ہے مہندی خونِ انساں سے

بتاؤ خونِ ناحق کی اجازت دی تو کس نے دی
سبق اس کا ملا ہم کو نہ گیتا سے نہ قرآں سے

بظاہر رہبر و محسن، مگر در پردہ قاتل ہے
خدایا اپنے بندوں کو بچانا ایسے حیواں سے

ہوا محمود وہ مقتل، کبھی جو صحنِ گلشن تھا
فسادوں نے جہاں کھیلی ہے ہولی خونِ انساں سے

❀ ❀ ❀

الوں کا کہاں نام و نشاں ہے　　جدھر دیکھو اندھیرا ہے دھنواں ہے
ہر ہر قدم ہے ایک اُلجھن　　ہر اک لمحہ نیا اک امتحاں ہے
رڈالو نظر ہے موت رقصاں　　پریشاں زندگی کا کارواں ہے
ل پہ پھول ہیں نظروں میں خنجر　　ہوس کی بھوک چہروں سے عیاں ہے
ش کرسیوں کی رہبروں میں　　لہو جنتا کا سڑک پر رواں ہے
نِ زندگی کہتے ہیں سب کو　　کہاں ہے وہ کہاں ہے وہ کہاں ہے
محمود جو جنت نشاں تھا　　ارے کیا یہ وہی ہندوستاں ہے

شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

کٹرہ پیر دل خاں -
اٹاوہ - 206001 - یوپی

وہ پرندہ جو آسمان میں تھا — غالباً آخری اڑان میں تھا
ہر طرف پتھروں کے پہرے تھے — زلزلہ کانچ کے مکان میں تھا
زندگی کوہ نور تھی لیکن! — آدمی کوئلے کی کان میں تھا
تذکرہ تیرگی پرستوں کا — چاند تاروں کی داستان میں تھا
کاش کوئی شکار مل جاتا — آخری تیر بس کمان میں تھا
بستیوں میں بپا تھے ہنگامے — رازؔ مقتل ہر اک مکان میں تھا

ایک چنگاری جو بھڑکی آدمی کی چھاؤں میں
آگ کے طوفاں اٹھیں گے زندگی کی چھاؤں میں
رات کی پریوں کی آنکھیں آفتابی ہو گئیں
دھوپ کے سپنے جو دیکھے چاندنی کی چھاؤں میں
عالمِ بیچارگی میں جی رہا ہے آدمی
سینکڑوں غم ڈس رہے ہیں زندگی کی چھاؤں میں
ہوش مندوں کو ابھی شاید یہ اندازہ نہیں
منزلِ دار و رسن ہے بیخودی کی چھاؤں میں
انجمن در انجمن ہے تیرگی چھائی ہوئی
کونسا جادو ہے جانے روشنی کی چھاؤں میں
رازؔ یہ کہتا ہے ہم سے رہگزاروں کا عتاب
قافلے لٹتے رہیں گے رہبری کی چھاؤں میں

اسد اللہ خاں اسدؔ
پردیسی پورہ - کھنڈوہ - 450001

کم ظرف کے میں ظرف کو یوں تولتا رہا
میں چپ رہا حریف مرا بولتا رہا
اُس بے عمل کو اپنے نسب پہ غرور تھا
اعمال کا ترازو عمل تولتا رہا
غالبؔ کی طرح حافظہ اپنا بھی تیز تھا
اک شعر لکھا ایک گرہ کھولتا رہا
طوفانِ زندگی میں اسدؔ ناؤ کی طرح
لہروں پہ عزم کی یونہی سدا ڈولتا رہا

غزلیں

وہ چہرہ ذہن سے جاتا نہیں ہے
کہاں دیکھا ہے یاد آتا نہیں ہے
کسی نے کان اس کے بھر دیئے ہیں
ہمارے گھر وہ اب آتا نہیں ہے
ذرا دیکھو تو یہ حیوانِ ناطق!
کیئے پہ اپنے شرماتا نہیں ہے
نہ ہو مغموم گمشدگیٔ دل سے
جو کچھ کھوتا نہیں پاتا نہیں ہے
رگوں میں خونِ ابراہیم رقصاں
اسدؔ شعلوں سے گھبراتا نہیں ہے

لہ
تر
نظر
پھول
سیوں
رگی سے
جو جنت

ادبی لطیفے

* ایک مشاعرہ فراق کے بعد سامعین کی طرف سے ایک نوجوان شاعر زبیر رضوی کا کلام سننے کی فرمائش کی گئی۔
مشاعرے کے سکریٹری نے زبیر کو مائیک پر بلایا تو زبیر نے نہایت نیازمندی سے جھجکتے ہوئے کہا "قبلہ فراق کے بعد میں اپنے شعر کیونکر پڑھ سکتا ہوں۔
فراق نے یہ سن کر بے ساختگی سے کہا
واہ میاں۔ تم اگر میرے بعد پیدا ہو سکتے ہو تو میرے بعد شعر کیوں نہیں سنا سکتے"!!

* مولانا گرامی اسلامیہ کالج لاہور کے ایک مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے مشاعرے میں ایک بیچارہ نوجوان کوئی ایسا مصرع پڑھ بیٹھا جس میں لفظ "کی" تین چار مرتبہ استعمال ہوا تھا
"صبح کی تنویر کی کیفیت نہ پوچھ"
یکایک مولانا گرامی کرسی صدارت سے اٹھے اور شاعر کی طرف ہاتھ اٹھا کر پکارے
"واہ تیری کی کی، کی کی، کی کی، کی

* تقسیم ہند کے موقعہ پر حاجی لق لق نے اخبار "زمیندار" کے مزاحیہ کالموں میں چند شعراء کی نقل مکانی کا ذکر کرتے ہوئے "یادرفتگان" کے عنوان سے کچھ شعر لکھے۔
جن میں تلوک چند محروم اور ان کے نامور فرزند جگن ناتھ آزاد کے نام بھی تھے
اس پر تلوک چند محروم نے حاجی لق لق کو جواباً یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔

لقلقا! خوش رکھے خدا تجھ کو ٭ پاک لوگوں کے درمیان ہی سہی
شکر ہے یاد تو کیا ہم کو ٭ از راہ یادِ رفتگان ہی سہی



ایکتا پریڈ
ہمارے مرد، عورتیں اور بچے،
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی،
بودھ، جین، پارسی ......
مشرق سے، مغرب سے، شمال سے، جنوب سے
ملک کے چاروں کونوں سے ہزاروں کی تعداد
میں یوم جمہوریہ کی تقریبات میں حصہ لینے
آئے ہیں۔

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

Rs 6/-

جلد (۸) شمارہ (۴) اپریل ۱۹۹۱ء حیدرآباد

زرِ تعاون :----------

ہندوستان	سالانہ 65 روپے	۲ سال 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک	// 200 ″	// 360 ″	// 3700 ″
امریکہ	// 40 ڈالر	// 70 ڈالر	// 700 ڈالر
انگلستان	// 25 پونڈ	// 45 پونڈ	// 400 پونڈ
پاکستان	// 175 پاکستانی روپے	// 300 پاکستانی روپے	// 3000 پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ ؟

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈہلز، حیدرآباد

** ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان سے چھپواکر دفتر "شاداب"

147 .5 [illegible]

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

علماء ربانی

بدعت:۔ کسی ایسی چیز جس کو اللہ و رسول نے دین میں شامل نہیں کیا ہے اور اس کا حکم نہیں دیا دین میں شامل کر لینا اور اس کا ایک جز بنا دینا اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لئے کرنا اور اس کی کسی خود ساختہ یا اصطلاح شکل اور وضع کئے ہوئے شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی حکم کی پابندی کی جاتی ہے' بدعت ہے۔

شرک و کفر (جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے) اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہے اور شرک و کفر اگر اسلام کے مقابلہ میں خارج کی چیزیں ہیں تو بدعت دین الہی کے اندر شریعت انسانی کی تشکیل ہے جو اندر اندر نشو و نما پاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات (اگر اس کو آزادی کے ساتھ نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے) اصل شریعت کے دو چند سہ چند ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ شریعت الہی کی ساری جگہ اور انسان کے سارے وقت کو گھیر لیتی ہے اس شریعت کی فقہ الگ ہے اس کے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات مستقل ہیں اور بعض اوقات تعداد میں شریعت الہی کے احکام سے کہیں زیادہ۔

بدعت سب سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ تشریع (قانون سازی) اللہ کا حق ہے کسی چیز کو قانونی حیثیت دینا اس کی پابندی ضروری قرار دینا۔ یہ منصب صرف شارع (اللہ) کا ہے انسانی قانون سازی' اسی منصب الہی کے خلاف بغاوت ہے اسی لئے قانون ساز انسان کو قرآن طاغوت کہتا ہے۔

يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ

لیکن کسی چیز کو دین و شرع قرار دینا اور اس کو کسی خاص شکل اور شرائط کے ساتھ قربت اور اجر و ثواب کا ذریعہ قرار دینا تو اس سے بھی بڑھ کر بات ہے یہ تو شریعت سازی ہوئی اور قرآن کہتا ہے کہ دین و شرع قرار دینا اللہ ہی کا کام ہے شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (شوریٰ ۔ ع ۲) تمہارے لئے دین کی وہی راہ مقرر کی جس حضرت نوح کو حکم دیا تھا اور ہم نے آپ کی طرف حکم بھیجا۔

اہل عرب نے جب اپنی طرف سے تحلیل و تحریم کا کام شروع کیا اور مستقل احکام جاری کیے تو قرآن نے ان پر یہی جرح کی:

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ

(شوریٰ ع ۳)

کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لئے ایسا دین بنایا جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا تھا۔

یہ اللہ کی اجازت کے بغیر دینی قانون سازی کیا تھی۔ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَن نَّشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِم بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ (انعام ع ۱۶)

اور انھوں نے کہا کہ یہ مویشی اور کھیتی ممنوع ہے اس کو صرف وہی کھائیں گے جن کو ہم اپنے خیال کے مطابق اور یہ مویشی ہیں جن کی پیٹھ پر چڑھنا منع ہے اور کچھ مویشی جن کے ذبح پر ا کا نام نہیں لیتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے اللہ ان کے اس جھوٹ کی ان کو سزا دے گا۔

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ (انعام ع ۱۶)

اور انھوں نے کہا کہ ان مویشیوں کے جو کچھ پیٹ میں ہے وہ ہمارے مردوں ہی کے کھانے کے لئے ہے اور ہماری عورتوں کے لئے حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں اللہ کو ایسی باتیں بنانے کی سزا دے گا وہ حکمت والا اور خبردار ہے۔

عرب کے ان شریعت سازوں کا یہ جرم جس کو قرآن "افترا" کہتا ہے، کیا تھا؟ یہی کہ انھوں بلا کسی آسمانی سند اور وحی کے محض اپنے اتفاق رائے اور اصطلاح سے ایک چیز کو ایک کے لئے (؟) اور دوسرے کے لئے حرام کر دیا اور اس کے لئے ایسے قواعد وضوابط، احکام اور اصول تو کئے جن کا کوئی آسمانی ماخذ نہ تھا اور پھر ان کی ایسی پابندی کی اور دوسروں سے کرائی جیسی خبروں کی شریعتوں اور احکام الٰہی کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو سخت گنہگار سمجھا جائے اور ملزم اور مطعون ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی جرم قرآن نے بیان کیا ہے۔

اِتَّخَذُوٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ع ۵)

انھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کو چھوڑ کر خدا ٹھہرا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم کے سامنے اس آیت کی یہی تفسیر کی کہ عیسائی علماء و مشائخ نے جس چیز کو ان کے لئے حلال یا حرام قرار دے دیا انھوں نے بے چوں و چرا اس کو مان لیا اور ان کو مستقل شارع قرار دے دیا۔

درحقیقت تحلیل و تحریم میں اور کسی چیز کو بلا دلیل شرعی فرض و واجب قرار دے دینے اور کسی خاص شکل اور آداب و شرائط کے ساتھ کار ثواب و ذریعۂ تقرب الی اللہ قرار دینے میں کوئی اصولی فرق نہیں دونوں "شرع مالم یاذن به الله" کے حکم میں آتے ہیں

بدعت۔ دوسری جس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے وہ یہ کہ شریعت مکمل ہو چکی ہے جس کا تعین ہونا تھا اس کا تعین ہو گیا ایک انسان کی نجات کے لئے جتنے اعمال ضروری ہیں اور تقرب الی اللہ کے لئے جتنے وسائل تھے ان سب کی وضاحت کر دی گئی اور دین کی تکمیل بنہ کر دی گئی اب جو

نیا سکہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (مائدہ ع ۱)

میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو بطور دین کے تمہارے لئے پسند کیا۔

تکمیل نعمت کے یہ خلاف ہے کہ دین شریعت کا ایک بڑا حصہ مشتبہ اور غیر متعین چھوڑ دیا جائے اور مدتوں تک مسلمان اس کے دریافت سے غافل اور اس کے ثواب سے محروم رہیں خصوصاً خیر القرون کے وہ لوگ جو اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کے مخاطب اول تھے اور پھر صدیوں کے بعد اس کا انکشاف اور تعین ہو۔

اس شریعت میں جو شخص بھی کوئی نیا اضافہ کرتا ہے اور کسی خارج از دین بات کو دین کا جز قرار دیتا ہے کسی ایسی چیز کا اہتمام کرتا ہے جس کا اللہ کے رسولؐ نے اہتمام نہیں کیا یا تقرب الی اللہ کے کسی نئے ذریعہ کا انکشاف کرتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ دین میں یہ کمی رہ گئی تھی جس کو اب پورا کیا جا رہا ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ رسالت پر بڑا الزام ہے جن کو حکم تھا کہ:۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ (مائدہ ع ۱۰)

اے پیغمبر! پہونچا دو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا اور اگر ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہونچایا۔

امام مالکؒ نے کیا خوب فرمایا،

مَنْ اَبْتدع فی الاسلام بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم اَنَّ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالۃ فان اللہ سبحانہ یقول اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ فما

یکن یومئذٍ دینا فلا یکون الیوم دینا

جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کی اور اس کو اچھا سمجھتا ہے وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) پیغام پہونچانے میں خیانت کی اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں
ہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ پس جو بات عہد رسالت میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں
کتا ۔

شریعت منزل من اللہ کی ایک خصوصیت اس کی سہولت اور اس کا ہر ایک کے لئے ہر زمانہ میں قابل عمل
نا ہے اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر ہے اس کو انسانوں کی فطری کمزوری، ان کے مصالح اور ان کے مختلف و
فاوت حالات کا پورا علم ہے اس کے ساتھ وہ رؤف و رحیم (بے حد مہربان اور شفیق) بھی ہے اس
محیط اور شفقت بے پایاں کی بناء پر اس نے انسانوں کے لئے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ نہایت آسان
ریعت نازل کی، احکام شریعت میں ان کی کمزوریوں، مشکلات اور کوتاہیوں کا پورا لحاظ رکھا اور
ان کی قوت اور وسعت اور زمان و مکان کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ان کے لئے ایک عالمگیر اور ابدی
انون مقرر فرمایا، اس کا ارشاد ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ ۔ ع ۴۰)

اللہ کسی کو اس کی گنجائش سے بڑھ کر مجبور نہیں کرتا۔

يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا (نساء ع ۵)

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے بار کو ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج ع ۱۰)

تم پر اللہ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ
عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ ع ۱۶)

تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آیا جس پر تمہاری تکلیف شاق ہے تمہاری اس کو بڑی فکر

ہے ایمان والوں پر نہایت شفیق و مہربان ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شریعت کے متعلق فرمایا۔

بعثت بالحنیفۃ السمحۃ ان ھذا الدین یسر

مجھے نہایت سیدھے سادے آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا۔ بے شک یہ دین آسان ہے

امت کی مشقت کا آپ کو اتنا خیال تھا کہ فرمایا۔

لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوٰۃ۔

اگر مجھے اپنی امت کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنا فرض

قرار دیدیتا۔

لیکن دین کی یہ سہولت اور خدا کی طرف سے اس بات کی ضمانت اسی وقت تک ہے جب کہ اللہ شارع ہے اور شریعت اسی کی ہے لیکن جب انسان شارع بن جائے اور وہ شریعت الہی میں مداخلت اور اضافہ شروع کر دے تو پھر دین کی سہولت باقی نہیں رہ سکتی، نہ انسان کا علم ہے نہ وہ مختلف انسانوں کی ضروریات مصالح اور زمان و مکان کے اختلافات کا لحاظ رکھ سکتا ہے، نہ اس کو اپنے بنی نوع پر وہ شفقت ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو دین خالص ہونے کی صورت میں ہر ایک کے لئے قابل عمل اور سہل ہو جاتا ہے، وہ ان بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافوں کے بعد اس قدر پر پیچ اور طویل ہو جاتا ہے کہ اس پر پورے طور پر عمل کرنا رفتہ رفتہ ناممکن ہو جاتا ہے لوگوں کو کسر شکستہ اور حیلہ جوئیوں کی عادت پڑ جاتی ہے اور بہت سے لوگ ایسے مذہب کو اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں، مذاہب کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب کی بکثرت نوبت اور الحاد و لامذہبیت کا آغاز عموماً ان لامتناہی بدعات کے بعد ہوا جن کی پابندی ایک متوسط درجے کے انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہو گئی تھی اور ان کا پابند رہ کر کسی اور کام کا نہیں رہ سکتا تھا قرون وسطیٰ میں بھی علم و عمل کی بغاوت

سی مذہبی نظام کے خلاف تھی جس سے اصل مسیحی مذہب کو برائے نسبت بھی نہ تھی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ الٰہی دین و شریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالمگیر یکسانی ہے یہ یکسانی زمانوں کے لحاظ سے بھی ہے اور مکانوں کے لحاظ سے بھی' اللہ چونکہ "رب المشرقین ورب المغربین ہے" وہ زمان و مکان کے حدود و قیود سے بالاتر ہے اس لئے اس کی شریعت میں کامل یکسانی پائی جاتی ہے اس کی آخری شریعت جس کی تکمیل آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہو چکی ہے آفتاب کی طرح سب کے لئے ایک اور زمین و آسمان کی طرح سب کے لئے یکساں ہے اس کی شکل جو قرن اول میں تھی وہی شکل چودھویں صدی ہجری میں بھی ہے وہ جیسی اور جتنی مشرق والوں کے لئے ہے ویسی ہی اور اتنی ہی مغرب والوں کے لئے بھی جو قواعد و احکام' عبادت کے جو اشکال اور تقرب الی اللہ کی جو متعین شکلیں اہلِ عرب کے لئے تھیں وہی اہلِ ہندوستان کے لئے بھی اسی لئے اگر دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کے فرائضِ اسلام کے ادا کرنے میں اور مسجدیں عبادت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی نہ اس کے لئے کسی مقامی ہدایت نامہ کی اور رہبری کی ضرورت ہوگی اس کو دینی حیثیت سے کوئی اجنبیت اور مسافرت محسوس نہیں ہوگی علاوہ مقتدی ہونے کے وہ اگر صاحبِ علم ہے تو ہر جگہ امام بن سکتا ہے اور ہر جگہ فتویٰ دے سکتا ہے۔

لیکن بدعات کا یہ خاصہ نہیں' ان میں یکسانی اور وحدت نہیں ہوتی ان میں زمان و مکان کا پرتو ہوتا ہے وہ ہر جگہ کے مقامی سانچہ اور ملکی یا شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں اور خاص تاریخی و مقامی اسباب اور ماحول میں بنتی ہیں ان کو تمام عالم اسلامی میں رواج نہیں دیا جا سکتا نہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کا علم ہونا ضروری ہے علم ہونے کے بعد ضروری نہیں کہ وہ سب ان کو قبول کرلیں' اس لئے ہندوستان کی بدعات مصر کی بدعات سے مختلف ہیں اور ایران کو شام کی بدعات میں کوئی اشتراک نہیں' ملکوں سے گذر کر بعض اوقات شہر شہر کی بدعات مختلف ہوتی ہیں ایک شہر کے مسلمانوں کو دوسرے شہر کی مخصوص بدعات کا علم نہیں ہوتا یہ بات بڑھتے بڑھتے محلوں اور

گھروں تک پہونچ سکتی ہے اور گھر گھر کا دین مختلف ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تمام دوسری شریعتوں اور مذاہب کا عبرتناک انجام تھا یہودیت اور عیسائیت مسخ شدہ اور محرف شکل میں موجود تھی اس لئے آپ نے شریعت اسلامی کو اپنی حقیقی شکل اور اصلی مقدار میں رکھنے کی پوری کوشش فرمائی اور اس کے لئے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں آپ نے اپنے جانشینوں کو بدعت سے بچنے اور سنت کی حفاظت کی بڑی تاکید سے تلقین کی۔ آپ نے فرمایا:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد

جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد ہے۔

ایاکم والبدعۃ فان کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔

بدعت سے بچو اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی

اور یہ حکیمانہ پیشگوئی بھی فرمائی،

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع بھا مثلھا من السنۃ

جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت اٹھ جاتی ہے۔

آپ کے براہ راست جانشین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس وصیت کی پوری تعمیل کی اور بدعات کے بارے میں کسی قسم کی رواداری اور کمزوری روا نہیں رکھی، ان کے انکارِ بدعات کے واقعات ملاحظہ ہوں اگر کوئی شخص بدعات کے حقیقی مفاسد اور محافظت شریعت کی حکمت اور اسرار سے واقف نہ ہو تو ان کو تشدد اور غلو پر محمول کرے گا لیکن اگر کوئی شخص مذاہب کی تاریخ سے واقف ہے تو وہ ان حضرات کے تفقہ اور حکمت دین کی داد دے گا کہ اگر کوئی دوسری نسل میں مذہب کی شکل کی حفاظت نہ کی جاتی تو وہ باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

صحابہ کرام کے بعد آئمہ و فقہاء اسلام نے علی الاعلان ... [illegible]

کا ثبوت دیا جو انبیاء کرام کے جانشینوں کے شایانِ شان ہے' انھوں نے ہمیشہ اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی مبتدعین کا علمی و عملی مقاطعہ کیا اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول اور ان کے علمبرداروں کو وقیع اور باوقار بننے سے روکنے کی کوشش کی اور ان کو اہلِ علم کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے گرا دیا۔

بالخصوص فقہاء حنفیہ نے جو شدید احتساب کیا اور جس باریک بینی اور نکتہ فہمی کے ساتھ اپنے زمانہ کے بعض بظاہر معمولی مبتدعانہ اعمال و رسوم کی مخالفت کی اور شریعت کی حفاظت اور سنت و بدعت کے امتیاز کے لئے جو حکیمانہ انتظامات اور فقہی احتیاطیں کیں وہ ان کی اصول دین سے گہری واقفیت اور ان کے تفقہ کی بہترین مثالیں ہیں۔

جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ بدعات عوام اور خوش عقیدہ شائقین دین کے لئے کیسی مقناطیسی کشش رکھتی ہیں اور کس سرعت کے ساتھ رواج و مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں وہ ان علماء اسلام کی ہمت و دلیری اور کامیابی کی داد دیں گے جن کی کوششوں اور اظہار حق سے بعض بعض بدعات کا بالکل سدباب ہو گیا اور اب ان کا فقہ کی بعض کتابوں یا تمدن کی بعض تاریخوں میں ذکر آتا ہے بعض بدعات جو باقی رہ گئیں ان کا بدعت ہونا بھی مشتبہ نہیں رہا اور ایک جماعت ہمیشہ ان کی مخالفت کرتی رہی اور اب بھی کرتی ہے۔

ان مخالفین بدعت اور حامیین سنت کو اپنے زمانہ کے عوام یا خواص کا عوام سے اسی طرح جامد اور روایت پرست وغیرہ کے خطابات ملے جس طرح ہر زمانہ کے مذاقِ عام اور رواجِ عام کے خلاف کہنے والوں اور کرنے والوں کو ملا کرتے ہیں۔

مایقال لک الّا ما قد قیل للرّسول من قبلک ۔۔

اُردو کی بقاء کے لئے اب لازم ہے کہ ہر اُردو داں کم از کم ایک کو اُردو سکھائے۔

سید احمد عروج قادری قسط ۸

اسلامی تصوف

اخلاص :- عربی لغت میں اخلاص کسی چیز کو دوسری ایسی تمام چیزوں سے جو اس کو مکدر اور خراب کرنے والی ہوں، پاک صاف کرنے کو کہتے ہیں پاک صاف ہونے کے بعد وہ چیز خالص کہی جاتی ہے قرآن کریم میں بھی خالص کا لفظ لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے سورۃ النحل آیت ۶۶ میں ہے

ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار یعنی گوبر اور خون کے ہر شائبے اور ہر آمیزش سے پاک صاف دودھ پلاتے ہیں ـــــ خالص کا لفظ "خاص" کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

قرآن میں ہے۔

اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لیے خالص (خاص) ہے اور ہماری عورتوں پر حرام۔ (الانعام: ۱۲۹)

قرآن میں استخلاص کا لفظ بھی خاص اور مخصوص کے معنی میں آیا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي۔ (یوسف: ۵۴) { بادشاہ نے کہا انھیں میرے پاس لاؤ تاکہ ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں۔

یعنی اجعلہ النفسی (تفسیر مظہری) یعنی میں ان کو اپنے لیے خاص کر لوں۔

اپنے لئے خاص کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ملک مصر میں جو کام دراصل میرے کرنے کا ہے میں ان کے سپرد کر دوں۔

شرعی اصطلاح میں اخلاص، تمام عقائد اور عبادات و طاعات کو شرک و کفر و نفاق ہر طرح کی دنیوی اغراض کی آمیزشوں، ملاوٹوں اور کھوٹ سے پاک صاف کرنے کا نام ہے۔ م عقائد و اعمال کے عند اللہ مقبولیت کا دارومدار اخلاص ہی پر ہے اخلاص کی ضد، اشراک ریک کرنا) اور منافقت ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان مخلصانہ نہ ہو تو وہ ی کام کا نہیں اور اگر کوئی عمل صالح دنیوی اغراض سے پاک نہ ہو تو وہ عند اللہ مقبول نہیں ہر ہے جب کہ ایمان اور کسی عمل خیر کا شرعاً اعتبار ہی نہ ہو تو تصوف میں کسی مقام و حال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصوف میں اخلاص کو وہی اہمیت حاصل ہے د قرآن و احادیث میں اسے دی گئی ہے۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری شرح رسالہ قشیریہ ں لکھتے ہیں۔

"اخلاص کا سبب، بندے کا یہ علم ہے کہ وہ ہر ایسے عمل میں جو دنیا اور آخرت دونوں جگہ نفع بخش ہو، اللہ کا محتاج ہے اور اخلاص کا ثمرہ اللہ کے عقاب و عتاب سے سلامتی اور جنتوں میں بلند درجات کا حصول ہے"

اس شرح کے محشی استاذ مصطفےٰ عروسی نے لکھا ہے۔

"اخلاص مقبولیت ایمان کی روح ہے یہ مقصد تک پہنچنے کے سب سے بڑے اسباب میں سے ایک سبب اور سعادت ابدی کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے کیونکہ اسی سے رب کائنات کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کا جو بندہ اخلاص سے متصف ہے وہ اہل عنایات میں ہے اور اسے سب سے بڑی کرامت عطا کر دی گئی ہے"

ایک بزرگ نے کہا ہے۔

"اعمال صورتیں ہیں اور ان کی روح اخلاص ہے"۔

امام قشیری اور شیخ الاسلام زکریا انصاری، نیز امام غزالی نے اخلاص کی فرضیت و اہمیت کے ثبوت میں چند آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں یہاں آیتوں کے حوالوں کے ساتھ ان کے ترجمے نقل کرتا ہوں۔

۱۔ یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے ۝ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر دیں ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا

(النساء: ۱۴۵، ۱۴۶)

۲۔ (اے محمدؐ) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے ۝ خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔ (الزمر: ۲، ۳)

۳۔ پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔

(الکہف آخری آیت)

۴۔ اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔ (البینۃ)

سورۃ النساء کی آیت ۱۴۵ میں منافقین کی سخت ترین سزا بیان کرنے کے بعد کہا گیا کہ سزا سے ان میں سے وہی لوگ بچ سکیں گے اور مومنین مخلصین کی جماعت میں شامل ہوں گے جن میں چار باتیں پائی جائیں۔ توبہ، اصلاح، اعتصام باللہ، اخلاص۔ نفاق اور تمام برے

سے توبہ کریں۔ دینِ اسلام کی ڈوری مضبوطی سے تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کردیں۔ ان چار باتوں یں آخری بات اخلاص، اسلامی تصوف کا حاصل اور آخرت میں بلند درجات کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ سورۂ زمر کی آیت ۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے کریں۔ یہی حکم تمام انبیاء کرام، ان پر ایمان لانے والوں اور تمام فرماں بردار بندوں کو دیا گیا ہے یہی بات سورہ البینۃ میں کہی گئی ہے۔

دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ اس حکم میں "دین" کے معنیٰ اللہ کی اطاعت، فرماں برداری اور غلامی کے ہیں۔ دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی عبادت، (بندگی) کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے بلکہ اسی کی پرستش، اس کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے اور یہ سب کچھ شائبہ شرک وریا سے پاک ہو، اللہ کی تمام عبادتوں اور اطاعتوں کا مقصد صرف اس کی رضا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا ہو

سورہ الکہف کی آخری آیت کی شانِ نزول یہ ہے۔

طاؤس ؒ، ابن عباس رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں میدانِ جہاد میں کھڑا ہوتا ہوں، اس سے اللہ کی رضا چاہتا ہوں، ساتھ ہی یہ بھی پسند کرتا ہوں کہ میدانِ جہاد میں میرے مقام اور میری جدوجہد کو لوگ دیکھیں۔ آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ یہ آیت فمن کان یرجو لقاء ربہ نازل ہوئی۔

(تفسیر مظہری ۶۹ بحوالہ حاکم فی المستدرک و صححہ علی شرط الشیخین)

اس حدیث سے اس حدیثِ قدسی کی تائید ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے لیئے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ دوسرے کو شریک کیا تو میں اس کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑ دوں گا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ میں اس سے بری ہوں وہ عمل اسی کے لئے ہے جس کے لیئے وہ کیا گیا (مشکوۃ کتاب الرقاق بحوالہ مسلم)

کسی نیک کام میں اگر یہ غرض بھی شامل کر دی جائے کہ لوگ اسے دیکھیں اور تعریف کریں تو وہ مخلصانہ باقی نہیں رہتا۔ اس میں ریا ر داخل ہو جاتی ہے جسے اس صحیح حدیث میں شرک قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے۔

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا

یا روح اللہ، اللہ کے لیئے مخلص کون ہے؟

انھوں نے جواب دیا جو صرف اللہ کے لیئے عمل کرے یہاں تک کہ وہ یہ بھی پسند نہ کرے کہ لوگ اس عمل پر اس کی تعریف کریں (تفسیر مظہری بحوالہ ابن ابی شیبہ واحمد ۲ صفحہ ۴۵) باقی

فارم ۴ تحت ضابطہ ۸

تختہ بابتہ ملکیت وغیرہ برائے ماہنامہ شاداب حیدرآباد (اے پی)

مقام اشاعت : دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد (اے پی)

اوقات اشاعت : ماہانہ

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور مالک کا نام اور پتہ اور قومیت } محمد قمر الدین صابری 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد

میں محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کی حد تک درست ہیں۔

محمد قمر الدین صابری یکم مارچ ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی

روزہ

اسلامی شریعت میں انسان کی نجات و کامیابی کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایمان اور عمل صالح۔ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار قرآن مجید نے اس حقیقت کو بارہا مختلف آیات میں پیش کیا ہے۔

"والعصر اِنّ الانسان لفی خسر اِلّا الّذین آمنوا وعملوا الصّالحات"

ترجمہ: پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ یعنی انسانی فلاح و کامیابی کا دارومدار نسل اور قومیت میں نہیں ہے بلکہ صرف ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ عمل صالح کا مفہوم بہت وسیع ہے اس کے اندر انسانی اعمال خیر کی تمام جزئیات شامل ہیں جن کے لئے ہم عبادات کی اصطلاح ستعمال کرتے ہیں۔ عبادت کے لفظی معنی تو عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور یت اسلامی میں خدا کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا او س کے احکام کو بجا لانے کو کہتے ہیں یعنی عبودیت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلا سرا نام ہے۔ اسلامی عبادات کے چار فرائض نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ نے عبادات کڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کو ان چار عبادتوں میں تقسیم کردیا ہے۔

(۱) بندوں کے وہ تمام اعمال جن کا تعلق خالق اور مخلوق سے ہے اس کا نام نماز ہے

(۲) وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کر
ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے۔

(۳) ایثار و قربانی ضبط نفس کی سرخی روزہ ہے۔

(۴) ملت ابراہیمی کی برادری اور عالمی اخوت کی تشکیل و تنظیم کا عنوان حج ہے

ان چاروں عبادات کے انفرادی اثرات و فوائد اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ ان عبادات کا تعلق براہ راست انسانی سماج سے بھی بہت گہرا اور دور رس ہے۔

نماز جو بالکل انسان اور خدا کے درمیان راز و نیاز اور عرض حال ہے جو بے قرار روح کی تسکین، پریشان حال، دل کی تشفی، فطرت کی آواز، زندگی کا حاصل اور ہر کا خلاصہ ہے اس کی بھی تاثیر قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

ان الصلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر

کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ زکوٰۃ کا مقصد باہم ہمدردی ایک دوست کی مدد و اعانت ایثار اور مال کی محبت سے شیشہ دل کو محفوظ رکھنا ہے نماز حقوق اللہ ہے تو زکوٰۃ حقوق عباد میں شامل ہے، حج تسلیم و رضا صبر و شکر کے جذبات کا دوسرا نام جس کی بنیاد قربانی ہے جہاں انسان خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کی تصویر بن جاتا ہے حج خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات، خواہشات، آرزوں کو قربان کر دینے اور فنا کر دینے کا نام ہے اور خدا کے سامنے اپنے ہر ارادہ اور مرضی کو معدوم کر دینے کا اعلان ہے اور جانوروں کی ظاہری قربانی اسی اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اسی حقیقت کا ظل مجاز ہے یہی ملت ابراہیمی اور حقیقی اسلام ہے۔

روزہ :۔ جس کو قرآن نے اپنی زبان میں صبر بھی کہا ہے جس کے معنی ضبط نفس صبر و تحمل، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں اسلامی اصطلاح میں نفسانی خواہشات اور

سے اپنے آپ کو روکنے، حرص و ہوا کے ڈگمگاتے والے موقعوں پر اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنے کا نام روزہ ہے۔

علماء کے نزدیک باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کو محفوظ رکھنا بھی روزہ کی حقیقت میں داخل ہے اس دنیا میں انسانی المیہ کا جائزہ تبلاتا ہے کہ وہ اس عالم آب و گل میں مختلف ضرورتوں کا محتاج اور پابند ہے اس کا ہر ارادہ و حرکت اسی غرض اور ضرورت کا رہین منت ہے لیکن ان ضرورتوں اور اغراض کی حقیقت کیا ہے۔ ہمارے دلوں میں آرزوؤں کا ایک ڈھیر ہے، تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے روزہ درحقیقت انہیں غیر ضروری خواہشات، تمناؤں اور ضرورتوں کی نفی کرتا ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں تقویٰ کہا گیا ہے یعنی روزہ کی تاثیر اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس سے انسان کے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا تقویٰ ہے تقویٰ دل کی اس کیفیت کا بھی نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی ہے اور نیک باتوں کی طرف بے تابانہ تڑپ پیدا ہوتی ہے روزہ کا مقصد اور اس کی افادیت یہی ہے کہ انسانوں کے اندر یہی کیفیت اور جذبہ پیدا ہو۔

اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزوں کے فرض ہونے میں ۔ خاص نکتہ یہ ہے کہ بارہ مہینوں میں ایک مہینہ اس طرح گذارنا چاہیئے کہ دن رات ۔ ایک وقت کا کھانا کھایئے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج ۔ر ۔ب بھائی کو کھلا دیجئے۔

روزہ کے فدیہ اور کفارہ سے متعلق جتنے بھی احکام ہیں ان میں روزہ کے بدلہ ۔ یبوں کو کھانا کھلانا ہے۔ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات اور غریبوں کے ساتھ حسن سلوک ۔ بھی عبارت ہے روزہ ہی فاقہ کی اذیت، بھوک و پیاس کا احساس دلاتا ہے اور ایک انس

کو دوسرے انسان کی ان تکالیف کی طرف متوجہ کرتا ہے اور انسان کو مدد و اعانت کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ روزہ انسان کی انہیں اندرونی احساس کو زندہ کرتا ہے۔ ایثار و ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے بخاری شریف کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت بادِ رواں کی طرح ہوتی تھی اسی سنت کا اثر ہے کہ آج تک اس مہینہ میں غریبوں، فقیروں، محتاجوں کی امداد و اعانت کا سلسلہ جاری ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی نے فرمایا کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام نہ چھوڑے تو خدا کو ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے جو روزہ رکھے اس کو چاہیئے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کرے اور نہ ہی غصہ کرے اگر کوئی اس سے لڑے اور گالی دے تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں"

بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو"

صحابہؓ نے دریافت کیا سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا "جھوٹ اور غیبت سے"۔

ان تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں بلکہ دل، روح، جذبات کو قابو میں رکھنے کا بھی نام ہے اور جس کے مثبت اثرات سے سماج اور سوسائٹی بھی متاثر ہوتی ہے۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

عالم عربی کیلئے سب سے بڑا خطرہ

اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اولین قیادت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم میں عربوں کو منتخب فرمایا اور جس طرح بنی اسرائیل کے لئے فرمایا گیا تھا

"وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ" (سورۃ الدخان)

اور بے شک ہم نے اپنے علم کی بنا پر اقوام عالم میں سے ان کا انتخاب کیا۔

اسی طرح نبی عربی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ارشاد ہوا

"اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (سورۃ الانعام)

"اللہ بہتر جانتا ہے کس کے سپرد کرے اپنی پیغامبری"

اس انتخاب کے وجوہ اور اسباب کیا تھے اور وہ کیا صفات وخصوصیات تھیں جن کی بنا پر عربوں کو یہ شرف بخشا گیا۔ یہ عرصہ سے محققین اور اہل نظر کا موضوع چلا آرہا ہے اور حق یہ ہے کہ دور اول کے عربوں نے اسلام کے مزاج کو سمجھنے، اس کی تعلیمات کو صحیح اور مکمل طریقہ پر اخذ کرنے اس کے خلاف ہر چیز سے بے تعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرنے اسلام کی اشاعت کے لئے اپنے بے مثال جوش اور بے نظیر قربانی، اس کی روح اور اس کی نفسیات کی حفاظت میں غیر معمولی احتیاط اور امانت داری اور عقلوں کو مطمئن کرنے اور قلوب کو مسخر کرنے میں حیرت انگیز کامیابیوں سے اس انتخاب کے لئے اپنی اہلیت اور استحقاق کو پوری طرح ثابت کر دیا۔

اللہ نے عربوں اور اسلام کے درمیان ایک غیر فانی رشتہ قائم کر دیا اور ہر ایک کے مستقبل

کو دعوت سے وابستہ فرمادیا۔ اب عربوں کو اسلام کے سوا کسی اور چیز سے عزت و سرفرازی حاصل نہیں ہو سکتی اور اسلام اپنی صحیح شکل و صورت اور پورے اعتدال و توازن کے ساتھ اسی وقت تک ظاہر ہوا جب تک عرب اس دعوت کے حامل اور علم بردار رہے۔

عربوں اور اسلام کے درمیان اس رشتہ کی استواری اور پائیداری کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت خیال اور اہتمام تھا۔ آپ نے جزیرۃ العرب کو اسی مقصد سے اس کا اصلی مرکز اور پایۂ تخت بنایا اور اس بات کی پوری فکر کی کہ وہاں امن و سکون کی فضاء برقرار رہے اور وہ مضبوطی کے ساتھ اس راستہ پر قائم رہیں۔ اس لئے کہ دارالسلطنت اور مرکز قیادت کو ہمیشہ انتشار، بے یقینی اور کشمکش سے پاک رہنا چاہیئے، اس کے لئے آپ نے بہت سے دور رس احکام دیئے، اپنے اصحاب کرام سے اس کے لئے عہد و پیمان لئے اور بہت سی حکیمانہ وصیتیں فرمائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وصیت فرمائی تھی کہ " لَا یَجْتَمِعُ بِجَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ دِیْنَانِ"

ترجمہ " جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں"

عربوں میں قومیت کی تحریک کے اولین قائد و علم بردار بعض مسیحی فضلاء تھے جن کا ترکوں سے عقیدہ و مذہب اور اخوتِ اسلامی کا کوئی رشتہ نہ تھا وہ اس مغربی ثقافت کے حامل تھے جس کی بنیاد ہی قومی عظمت و قوم پرستی کے جذبہ پر ہے اس وقت اس تحریک کے لیڈر ڈاکٹر فارس نمر، شیخ ابراہیم الیازجی اور استاذ نجیب الخاذوری لبنانی عیسائی تھے۔

اس کے بعد قومیت کے اس مغربی مفہوم کا زمانہ آیا جو ایک مستقل فکر اور فلسفہ ہے اور اس میں وہ ساری حمیّت و حرارت اور شعائر و مقدسات پائے جاتے ہیں جو مذہب کے ساتھ مخصوص ہیں لبنانی مسلمان فاضل علی ناصر الدین اپنی مقبولِ عام کتاب قضیۃ العرب میں لکھتے ہیں:

عربوں کا مسئلہ ایک مومن آزاد فطرت، عاقل، شریف، صالح، صاف دل خود دار اور بلند نظر عرب کے نزدیک ایمان کے مسئلہ سے کم نہیں، وطن پر ایمان وطن کے لئے ٹھیک اسی طرح جس طرح اللہ پر ایمان، اللہ کے لئے ہو سکتا ہے اور بس"

عربوں کے مسئلہ اور اس کے مقاصد و مضمرات کے متعلق لکھتے ہیں۔

" وہ یعنی (عربی قومیت) جہالت، افلاس، بیماری، ظلم نا انصافی اور ہر قسم کی بے عنوانی اور عصبیت عربیہ کے سوا ہر عصبیت کا مقابلہ کرے گی جو دین و سیاست کی تفریق کی قائل ہے وہ اہل دین کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے گی، ایک عسکر کے لئے اس کی تعلیم یہ ہوگی کہ وہ جہاں بھی ہو دو چیزوں کے لئے پورا تعصب برتے، ایک اپنی قومیت کے لئے ایک حق و صداقت کے لئے"

یہی مصنف "العروبہ" یعنی عربیت کی تشریح کرتے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں کہتا ہے

" قومیت عربیہ پر راسخ ایمان رکھنے والے ہم عرب قوم پرستوں کے نزدیک "عروبہ" بجائے خود ایک دین ہے اس لئے وہ اسلام اور مسیحیت دونوں سے پہلے اس دنیا میں موجود ہے اگرچہ وہ آسمانی مذاہب کے اخلاق و معاملات اور فضائل کا خود بھی حامل و داعی ہے۔"

یہی بات عمر فاخوری نے عرصہ ہوا اپنی کتاب "کیف ینھض العرب؟" (عرب کیسے ترقی کر سکتے ہیں؟) میں کہی تھی۔

" عرب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے، جب تک کہ عربیت اور عربی اصول ان کا مذہب نہ بن جائے گا اور وہ اس کے لئے اتنے غیرت مند حساس اور پرجوش نہ ہوں گے جتنے مسلمان نبی کریمؐ کے قرآن مجید کے لئے، عیسائی اور کیتھولک رحم دل مسیحؑ کی انجیل کے لئے پروٹسٹنٹ لوتھر کی اصلاحی تعلیمات کے لئے اور

فرانس کے انقلابی روسو کے جمہوری اصولوں کے لئے ہیں اور اس کے لئے ایسا تعصب نہ برتیں گے جس کا مظاہرہ سینٹ پیٹر کی دعوت پر صلیبیوں نے کیا تھا۔"

درحقیقت عرب مسلمان مشرقِ وسطیٰ کی اس چھوٹی سی مگر زیرک، ہوشمند غیر مسلم اقلیت کی سازش کا شکار ہوئے ہیں جس کا مستقبل صرف عربی قومیت کی بقا و ترقی سے وابستہ ہے! جو صرف اسی راستہ سے عالم عربی کی قیادت حاصل کر سکتی ہے اور اس کو اس عالم اسلام سے منقطع کر سکتی ہے جس کا اس اقلیت کے ساتھ دینی عقائد اور تاریخ کا کوئی رشتہ نہیں ہے اس بار کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ میشل عفلق[1] (۱ے پروفیسر میشل عفلق بعث پارٹی کے بانی اور سربراہ تھے وہ اصلاً شامی عیسائی تھے مگر عمر کے آخری حصہ میں وہ عراق منتقل ہو گئے یا بلا لئے گئے اور احترام اور اعتماد کے ساتھ رہے، ان کی موت سے پہلے اسلام قبول کرنے کی روایت غالباً سیاسی مصلحت سے مشہور کی گئی، بقول ایک عرب فاضل کے کہ وہ انتقال کے بعد مسلمان ہوئے) جو عیسائی ہیں، بعث پارٹی کے سربراہ اور مشرقِ وسطیٰ میں عرب قوم پرستی کی تحریک کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکر مانے جاتے ہیں۔

غیر مسلم مفکرین نے اس فلسفۂ قومیت کو جس چابک دستی اور ذہانت سے مرتب کیا ہے اور اس میں جس طرح علمی (سائنٹفک) انداز فکر پیدا کیا گیا ہے اور اس میں ایک عرب تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے (جو احساس برتری کے نشے سے سرشار ہے) جو کشش پائی جاتی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہو گا جو میشل عفلق کی کتاب "فی سبیل البعث"[2] (۲ے اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ مصر کی قومیت ، عربیہ کے مفکر و زعماء بھی ان کے خوشہ چیں اور ان کے بعض طفیلی مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں) سے اخذ کئے گئے ہیں جس کو اس تحریک دعوت کا صحیفہ کہنا صحیح ہو گا۔

"اسلام کو فتح یاب اور غالب ہونے میں جو اتنی تاخیر ہوئی وہ دراصل اس وجہ سے تھی کہ عرب اپنی ذاتی کوشش اور جد و جہد اور خود اپنے وجود اور دنیا کے باہمی

تجربات اور امتحانات کے نتیجہ میں اور بہت سی آزمائشوں اور تکلیفوں امید
و ناامیدی اور کامیابی و ناکامی کے بعد حقیقت تک پہونچ جائیں، یعنی ایمان
خود ان کے اندر سے پیدا ہو اور وہ ایمان تجربہ سے ملا ہو، زندگی کی گہرائیوں
سے وابستہ حقیقی ایمان بن سکے، اس لحاظ سے اسلام ایک عربی تحریک تھا
اور اس کے معنی عربیت کی تجدید و تکمیل"

اس لئے وہ معنی جس کو اس اہم تاریخی دور میں اور ترقی و تغیر کے اس اہم
تاریخی دور میں اسلام آشکارا کر رہا ہے یہ ہے کہ ساری قوتیں عربوں کی
طاقت بڑھانے اور ان کو ترقی دینے پر صرف کی جائیں اور یہ ساری قوتیں عربوں
قومیت کے دائرہ کے اندر محصور ہوں۔"

صدر صدام حسین کا تعلق شروع سے مشہور قوم پرست عرب تحریک البعث العربی سے رہا ہے جس کے صدر شامی عیسائی پروفیسر میشل عفلق مذکور تھے، جنھوں نے زندگی کے آخری دن عراق ہی میں گزارے اور حال میں ان کا انتقال ہوا، اس تحریک کا آغاز ۱۹۴۳ء سے ہوا اور ۱۹۴۷ء میں ارتقار اور عروج کے مرحلہ پر پہونچی اس تحریک کا بنیادی مقصد اور فلسفہ یہ ہے کہ 'عرب بذات خود ایک وحدت (اکائی) ہیں۔ ان کے درمیان جو دینی' اعتقادی، ثقافتی اور سیاسی امتیازات ہیں وہ سب مصنوعی اور عارضی ہیں جو عرب احساس قومیت کی بیداری کے بعد خود بخود زائل ہو جائیں گے" اس تحریک و جماعت کا نعرہ اور دستور العمل ہے کہ "العرب أمة واحدة ذات رسالة خالدة (عرب ایک مستقل واحد امت ہیں جو ایک دائمی پیغام رکھتے ہیں) یہ تحریک عربوں کو ماقبل اسلام دور (جاہلیت عربیہ) کی طرف لے جانا چاہتی ہے جب نہ ان کے پاس دنیا دین آیا تھا اور نہ آنحضرت ؐ کے ذریعہ نیا پیغام اور شریعت ان کو ملی تھی یہ تحریک دور جاہلیت کے سورماؤں اور ان مشہور شخصیتوں کو اپنا ہیرو سمجھتی ہے جن کا عربی جاہلی شاعری اور تاریخ میں عظمت کے ساتھ نام آیا ہے اور ان پر فخر کرنے اور ان کے

نام کو زندہ رکھنے کی تلقین کرتی ہے اس کے ارکان نے اسلام سے مستغنی ہو کر اپنی زندگی کے لئے ایک نیا اصول اور فلسفۂ حیات وضع کیا ہے جو آزاد قومیت عربیہ اور سیاسی و مادی اغراض سے میل کھاتا ہے اس کے پورے دستور میں کہیں اسلام کا نام نہیں آیا۔ اہل نظر اور واقفین حال کے نزدیک یہ صلیبی مسیحی تحریک کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ اور عربوں کا رشتہ اسلام سے کاٹنے کی ایک گہری سازش ہے جس کے اثرات شام کے جیسے شاندار اسلامی تاریخ رکھنے والے ملک میں حافظ الاسد کی موجودہ حکومت کے زیر سایہ (جس کا بعث پارٹی ہی سے تعلق ہے) دیکھے جا سکتے ہیں جہاں بے تکلف مسجدیں گرائی گئیں، اہل دین اور اہل اسلم کو ملک چھوڑ کر باہر جانا پڑا اور اسلام پسند تحریکوں اور جماعتوں پر پابندی عائد کی گئی، اور اسی کے آثار کویت میں بھی نمایاں ہونے لگے ہیں اور اسی کا خطرہ ہر اس ملک میں ہے جو خدا نخواستہ اس کے زیر اقتدار ہو جائے۔

میشل عفلق اپنی مشہور کتاب "نضال البعث" میں رقمطراز ہیں

"عرب قوم ایک ثقافتی وحدت ہے اور اس کے فرزندان کے درمیان تمام اختلافات و امتیازات سطحی اور بے اصل ہیں جو عربی وجدان کی بیداری کے ساتھ خود بخود زائل ہو جائیں گے

عرب قوم ایک ابدی پیغام کی حامل ہے جو تاریخ کے مختلف مرحلوں میں بدلتی ہوئی اور پختگی حاصل کرتی ہوئی نئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور انسانی اقدار کی تجدید بنی نوع انسان کی ترقی کی ہمت افزائی اور اقوام عالم میں تعاون و ہم آہنگی کی ہمت افزائی کرتا ہے[۱]"

([۱] نضال البعث / میشل عفلق ج ۱/ ۱۷۳)

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک عرب قوم ہیں لیکن بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ امت اسلامیہ کی وجہ سے تخلیق کی گئی ہے، اس سے تو پسماندہ دینی رجحت پرستی

(باقی صفحہ پر)

پنجاب وقف بورڈ

ایک قابلِ تقلید نمونہ

پنجاب وقف بورڈ شمالی ہندوستان کے سب سے بڑے فلاحی ادارہ کی صورت میں رونما ہے گزشتہ دو برسوں کے دوران اس کی آمدنی ایک کروڑ سے بڑھ کر تین کروڑ روپیہ سے بھی یادہ ہوگئی ہے وسائل میں اضافہ کے ساتھ بورڈ نے پرانے منصوبوں کی توسیع کے علاوہ بہت سے مختلف نئے منصوبے بھی شروع کئے ہیں، بورڈ نے کافی تعداد میں فوقانیہ اسکول (ہائی اسکول) ائم کئے اور ایک ہائی اسکول کو ترقی دے کر ہائیر سکینڈری کی حیثیت دے دی ہے۔ بہت سے جونیر سکولوں کو ترقی دی گئی ہے اور اس حلقہ کے پسماندہ علاقوں میں کثیر تعداد میں پرائمری اسکول ھولے گئے ہیں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بورڈ نے کافی تعداد میں پیشہ وارانہ تربیتی مراکز قائم کیئے ہیں جن میں سے چار مرکز صرف لڑکیوں کے لیئے مختص ہیں۔ علاقہ کے متفرق مقامات پر بورڈ نے سات کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر بھی قائم کیے ہیں تاکہ ان سے غریب اور ذہین طلبا رفائدہ حاصل کر سکیں۔ بورڈ کی وافر اور متواتر امداد سے چلنے والے کثیر التعداد دینی مکاتب نے جونیر ہائی اسکول کی سطح تک کے سرکاری نصابات کی تدریس کا بھی آغاز کیا ہے تاکہ ان کے طلبار اپنے دورِ تعلیم کے کسی حصہ میں حسب خواہش عام تعلیمی سرگرمیوں میں بھی شامل ہو سکیں۔ ٹی وی اور وی سی آر جیسے جدید ذرائع ابلاغ کی سمعی اور بصری سہولیات کی فراہمی سے بھی ان دینی مکاتب نے اپنے معیار تعلیم کو بلند کیا ہے ضلع جھنانگر کے قصبہ پیپلی عاجریہ کے دینی مکتب میں ویلڈنگ اور الیکٹریشین جیسے چھ پیشہ ورانہ تربیتی کورسوں کے علاوہ کمپیوٹر ٹریننگ کا بھی ایک مختصر مدتی کورس

جاری ہے۔

ان مکتبوں کے علاوہ اس علاقہ کی چار سو سے زیادہ مساجد کے آئمہ کرام مقامی لڑکوں اور بالغوں کو بھی درس دیتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بورڈ اس علاقہ کی عام خواندگی کے لئے ہر ممکن مساعی کر رہا ہے بورڈ کی آمدنی کا کافی بڑا حصہ غریب طلبا کو وظائف دیئے جانے پر صرف ہوتا ہے ان وظائف کے علاوہ کثیر تعداد میں بیواؤں اور ناداروں کو بھی ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔

ان فلاحی اقدامات کے سبب بورڈ پر عوام کا اعتماد قائم ہوا ہے جس سے تقریباً چار سال کے وقفہ کے بعد بہت سے نئے اوقاف کا قیام (گزشتہ دو سال کے دوران عمل میں آیا۔ علاوہ ازیں کثیر تعداد میں عمارت دوکانیں اور شاپنگ کامپلکس وغیرہ تعمیر کر کے بورڈ نے اپنی آمدنی کے ذرائع کو محفوظ کر لیا ہے کیوں کہ ان نئے وسائل سے بورڈ کو معقول آمدنی ہوتی ہے۔ بورڈ نے ملازمین کی تنخواہوں پر ہونے والے اخراجات ۲۰ فی صد سے بھی زیادہ کم کر دیئے ہیں جبکہ تعلیمی اور مذہبی امور پر اخراجات کا اضافہ ہوا ہے۔

بورڈ کی مذکورہ بالا کارگزاری ایک ابتدا ہے بورڈ کے پاس آمدنی اور عملی اقدامات میں اضافہ کے کافی ذرائع ہیں اس علاقہ کی ہمہ گیر ترقی کے لئے بورڈ علاقہ کے عوام کی تعلیمی اور سماجی معاشی ترقی کا ایک ڈھانچہ قائم کر رہا ہے۔ حکومت نے ایک انجینئرنگ کالج اور ایک حرفتی تربیتی مرکز کھولنے کے متعلق بورڈ کے منصوبہ کو منظوری دے دی ہے جس کے جملہ اخراجات بورڈ برداشت کرے گا۔

اُمید رکھنی چاہیئے کہ ہم ان عظیم مردوں اور خواتین کی خواہشات کو پورا کر سکیں گے جنھوں نے غریبوں اور ناداروں کی بہتری، بہبود اور مفاد کے لئے کبھی یہ اوقاف قائم کیئے تھے۔ ▬ ▬ (افکار ملی' دہلی سے ماخوذ)

ابراہیم اختر
یوسف کالونی
نئی روڈ۔ پربھنی ۴۳۱۴۰۱ (ایم ایس)

اُردو اور قومی تعلیمی پالیسی

دستورِ ہند اس اعتبار سے دساتیرِ عالم میں منفرد ہے کہ اس میں ہندوستان میں رہنے والی اقلیتوں کو ان کے تعلیمی، سماجی اور مذہبی اور لسانی تشخص اور تحفظ کے واضح ضمانت دی گئی ہے مرحوم شری ایشونت راؤ چوہان نے کسی موقع پر کہا تھا کہ ہندوستان ہندوستان اقلیتوں کا ملک ہے ان کے اس بیان میں بڑا اہم نکتہ پوشیدہ ہے ہندوستان شناخت دراصل اقلیتوں کے جائز حقوق کی پذیرائی میں مضمر ہے دستور کے نفاذ کے بعد سے آج تک ہندوستان کی اقلیتوں پر خاص طور سے اُردو اقلیت نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے اسبابات کا جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دستوری مراعات کا تقدس بڑی حد تک مجروح ہوا ہے ۴۳ سال کے عرصہ میں اُردو کو اس کی اپنی دو گونگی نسلیں تحفہ میں ملی ہیں۔ اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اُردو والوں کو اپنی زبان کے تحفظ کا ادراک نہیں ہو پایا ہے ایک جانب دستوری مراعات کے حصول کے لئے سرکاری ایوانوں کی بھول بھلیوں میں اپنی شناخت کھودی۔ تعمیری خطوط پر اپنے طور پر تعلیمی اداروں کے قیام کے تعلق سے سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ کوئی بھی قوم نا مساعد حالات کا شکار ہو کر غور و فکر کی صلاحیت کھو دے تو وہ اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کی تقسیم کے المیہ نے اُردو کے لئے سرزمین تنگ کردی۔ لسانی عصبیت کا جنون بے اعتماد سیاست کے منفی تسلسل کا نقطۂ عروج ہوتا ہے اور اُردو کا گلا گھونٹنے میں اس عنصر نے اہم رول ادا کیا ہے

سیکولر ہندوستان میں اُردو کو کھلی فضاء میں سانس لینے کا موقع ملنا چاہیئے تھا یہی وجہ ہے کہ اُردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی وجہ سے جمہوری اقدار عدم استحکام کے المیہ سے دوچار ہوگئیں۔

اب جب کہ اُردو کے لئے فضاء سازگار ہورہی ہے ہمیں نئے سرے سے اُردو کے مسئلہ کا جائزہ لے کر تعمیری جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا۔ عملی اور ٹھوس اقدامات اپنے طور پر خود کرنے ہوں گے اب تک ہم نے اُردو کے لئے سہولتیں مانگنے میں کافی وقت ضائع کردیا ہے۔ روشنی کی تلاش میں اب زیادہ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی چیلنج بن کر ہمارے سامنے کھڑی ہے اس پالیسی کو وضع کیئے ہوئے تقریباً چار سال کا عرصہ ہورہا ہے لیکن اُردو حلقہ کے کسی گوشہ سے بھی اس تعلق سے کوئی حرکت نظر نہیں آتی ۔ آج بھی ہم مانگنے کی عادت سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں اور سرکاری یا نیم سرکاری اسکولوں میں اُردو جماعتوں کے قیام کے لئے پر زور جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں بجائے اس کے کہ اپنے طور پر تعلیمی اداروں کے قیام کے لئے سارے ملک میں جدوجہد کا آغاز کرتے جیسا کہ بہار اشٹرا کی اُردو اقلیت نے اس سلسلہ میں ایک مثال قائم کی ہے نئی تعلیمی پالیسی دستاویز میں حکومت نے چند اہم فیصلوں کو درج کرتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی کا تعین کردیا ہے کچھ تجاویز حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ نئی پالیسی کے تحت نئے مدارس کھولنے کے لئے ایسی بستیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں کی قابلِ لحاظ اقلیتوں کا معیارِ تعلیم پسماندہ ہے ۔

۲۔ پسماندہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی طالبات کے لئے اسکول اور ہاسٹل کھولنے کے لئے خاص توجہ مبذول کی جائے گی۔

۳۔ ایسے کاریگروں کے بچے جو پسماندہ اقلیتوں سے تعلق رکھتے ہوں ۔ ان کے تحفظ کے لئے صنعتی ٹریننگ مدارس میں ۱۰ فیصد نشستیں محفوظ کیئے جائے گا

ان مراعات کے پس منظر میں اُردو اقلیت کے لئے دیہ کا تعین کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

ہم نے ان ضمانتوں سے اپنے آپ کو ابھی تک ہم آہنگ نہیں کیا ہے۔ اُردو حلقوں میں اس تعلق سے ہیں کوئی صدا ئے درا سنائی نہیں دیتی۔ اب بھی ہم بنیادی مسائل سے جڑے ہوئے نہیں ہیں جن کا راست تعلق اُردو کی بقا سے ہے۔ ایسے فروعی مسائل جیسے سرکاری دفاتر میں اُردو درخواستیں دینے کی سہولت یا پھر دلی ' بہار او اُتر پردیش بھیجے جانے والے خطوط پر پتے اُردو میں لکھنے پر ہماری توجہ مرکوز ہے یہاں میں پھر مہاراشٹر اکی مثال دینا مناسب سمجھتا ہوں جہاں بہار اور اُتر پردیش کے بعد اُردو والوں کی آبادی ہے۔ مہاراشٹرا کے اُردو والوں نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ سرکاری اعزاض کے لئے ان کی اُردو میں دی ہوئی درخواستیں قبول کی جائیں۔ ووٹر لسٹ اور سرکاری جریدہ اُردو میں بھی شائع کیا جائے۔ ریلوے اور بس اسٹیشنوں پر اُردو میں تختیاں آویزاں کی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ برخلاف اس کے اُردو والے یہاں آئے دن اپنے تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں یہی وجہ ہے کہ مہاراشٹرا میں اُردو تعلیم کے خانگی مدارس کی تعداد دوسری کسی بھی ریاست سے زیادہ ہے۔

ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اپنے مطالبات کی پذیرائی کے سلسلہ میں پیش آنے والی قانونی ' انتظامی اور ٹیکنیکل موانعات کا گہرائی سے جائیزہ نہیں لیتے کہ آیا ہمارے مطالبات حکومت کے لئے قابلِ عمل بھی ہیں یا نہیں۔ مثلاً خطوط پر اُردو میں پتے لکھنے کے سوال کو ہی لیجئے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حکومت کو ملک کے کئی ڈاک گھر میں اُردو والوں کا تقرر کرنا پڑے گا ظاہر ہے اس سے غیر اُردو والوں کے تقررات کو روکنا پڑے گا۔ تقررات کے ضمن میں پسماندہ طبقات کے لئے جو اصول وضع کئے گئے ہیں ان میں ترمیم کرنی پڑے گی اس سے تقررات کا پورا نظام ہی متاثر ہو جائے گا کوئی بھی حکومت اس طرح کا رسک نہیں لے سکتی۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے مسائل کا ازسرِ نو جائیزہ لے کر اپنے لائحہ عمل کا تعین کریں۔ غیر ضروری مسائل میں اپنے آپ کو اُلجھانے سے احتراز کریں اور ایسے وعدے جو ایفا نہ ہوسکیں ان پر تکیہ کرنا چھوڑ دیں

نئی تعلیمی پالیسی کے تحت دی گئی مراعات اُردو والوں کے لئے صدائے جرس ہے۔ لیکن اُردو دنیا میں اس متعلق سے سرد مہری پائی جاتی ہے۔ اُردو ذرائع ابلاغ نے خاطر خواہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اگر وہ اپنے تشہیری ذرائع کو کام میں لاکر اُردو عوام کو اس پالیسی کے حسن و قبح سے واقف کرواتے تو اُردو کے مسائل کی پذیرائی کے لئے نئی سمتوں کا تعین کرنے میں بڑی مدد ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو کے بہت سے حلقے اس پالیسی سے واقف نہیں ہیں کہیں کوئی ہلچل نہیں بس سکوت ہی سکوت ہے گجرال کمیٹی کے نفاذ کے سلسلہ میں قائم کی گئی ماہرین کی کمیٹی نے پتہ نہیں اس حلقہ تعلیمی پالیسی سے کہاں تک استفادہ کیا ہے اور کیا سفارشات پیش کی ہیں اس کی اشاعت کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ کمیٹی کی تجاویز کہاں تک اُردو کو انصاف دلانے میں ممد و معاون ہو سکیں گی۔

جمہوری ہندوستان میں اُردو کو اس کا مستحقہ مقام اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک ہم فروعی مسائل پر اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے اپنے طور پر خود اُردو تعلیم کے فروغ کے لئے تعمیری اور مثبت اقدامات نہیں اٹھاتے۔ ملک کے جن علاقوں میں اُردو اقلیت رہتی ہے وہاں نئی تعلیمی پالیسی سے استفادہ کرتے ہوئے اُردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول اور کالجس قائم نہیں کئے جاتے اس سے اُردو کے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لئے روزگار کی طمانیت بھی حاصل ہو گی۔
عزم مصمم اور ارادہ کی پختگی ہو تو جہد مسلسل کے سامنے راستے کی رکاوٹ کو دور ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

پروفیسر مقبول احمد
۹۲ پارک اسٹریٹ، کلکتہ، مغربی بنگال

تعلیم اس کی بنیادی ضرورت اور نصاب تعلیم

تعلیم کا سلسلہ روز پیدائش سے شروع ہو کر تا حیات چلتا رہتا ہے شاید پہلی تعلیم رحم مادری میں جب بچے کی ابتدائی نشو و نما کے بعد قوت احساس پیدا ہوتا ہے جب ہی سے شروع ہو جاتی ہے بچہ اپنے ماحول کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے ہر وہ چیز جو ماں پر اثر انداز ہوتی ہے اس کا عکس شکم مادر میں بچے پر بھی پڑتا ہے جو کہ بچے پر آئندہ زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے

نوزائیدہ بچے کی پہلی معلمہ اس کی ماں ہے اور تربیت کا پہلا گہوارہ اپنا گھر ہے اور بعد میں اس کے رشتہ دار اور خاص طور سے قریبی رشتے دار اور پھر محلہ والے محلے کا ماحول، اپنے اس کے شروع کے ساتھی، اسکول اور اسکول کے دوست و احباب اس کی تربیت و تعلیم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تعلیم کی ضرورت زندگی کو سنوارنے، اخلاقی حدود کے اندر گزارنے، روحانی تسکین اور تحقیقی کاموں کے لئے ضروری ہے اس کی ضرورت حصول رزق اور دنیاوی کاموں کے لئے بھی ضروری ہے تعلیم اور رزق کا کافی بڑی حد تک ایک دوسرے پر انحصار ہے۔

اگر تعلیم کو حصول رزق کے لئے حاصل کیا جائے تو یہ روپیہ پیدا کرنے کی ٹکسال

تو بن سکتی ہے مگر انسانی ارتقار، روحانی پرورش اور اخلاقی بلندی کے لئے بالکل بیکار ہے اگر زندگی کا مقصد کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہی ہو تو اس کے لئے ایسی تعلیم کافی ہے۔

بہ الفاظ دیگر تربیت و تعلیم کی ابتدائی بنیاد پر گھر اور گھر والوں کا اثر کافی اہم ہے او دیر پا۔ اگر یہ ناقص ہو گئی تو پوری دیوار ہی خراب اور کمزور اور عمارت ناقص اور کج ہ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے گھر والوں کا اخلاق بلند کریں، حلال و حرام کا خیال رکھیں، خود کو سنواریں اور گھر کا ماحول ٹھیک کریں تاکہ بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت درست ہو سکے۔

اس لئے مذہب کا ایک اہم رول ہے مذہب ہمارے کردار کو بلند کرتا ہے ہم؛ سچائی، ایمان داری، خوف خدا، رواداری، صبر و استقامت پیدا کرتا ہے لہٰذا ہمارے گھروں کا ماحول صاف اور صحیح طور پر مذہبی ہونا لازمی ہے۔

ابتدائی مرحلوں کے بعد اسکول، کالج، یونیورسٹی اور دارالعلوم ہمارے تعلیمی ڈھانچ میں ایک اور اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ ہماری باقاعدہ FORMAL تعلیم کا دور ہے اس دو میں بھی مذہب کا وہی کردار قائم اور جاری و ساری رہنا ضروری ہے۔

انگریزوں نے جو تعلیمی اصول اور ڈھانچہ بنایا تھا وہ چند معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ابھی تک جاری و ساری ہے ان کے مقاصد اپنے محکموں میں کارندے اور کارگزار پیدا کر اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو فروغ دینا اور اس کا بول بالا کرنا اور ہندوستانی جسم ا قلب میں یورپی ذہن و فکر پیدا کرنا تھا یہاں تک کہ ہندوستانی اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی فکر و ملت سے خود متنفر ہو جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخ کو غلط ا سے اور توڑ موڑ کر ایک سوچی سمجھی تدبیر کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا کہ ہندوستان مختلف مذہبوں کے ماننے والوں میں نفرت پیدا ہو اور اس کو نصابی کتابوں میں

کر دیا گیا تاکہ ایک مستقل تصادم کی راہ کھل جائے۔ اس میں انگریز پوری طرح کامیاب رہے۔

حصولِ آزادی کے بعد اب ضروری ہے کہ ایک نئے انداز فکر سے اپنی ہندوستانی تہذیب مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کی تہذیب، ان کی مختلف زبانوں کی فروغ و ترقی اور مذہبی رواداری کو نصب العین بناکر اپنا تعلیمی نصاب بنائیں تاکہ اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی قدریں اجاگر ہوسکیں اور ساتھ تمام وہ مضامین جو ترقی قومی اور انسانی ارتقاء میں ہماری معاون ہوں، اچھی طرح پڑھایا جائے۔

ایسا کرنے کے لئے ایسے معلموں کی ضرورت ہوگی جن کا خود اپنا مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی معیار بلند ہو اور ایسے معلموں کو پیدا کرنے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے مگر ضروری ہے۔

حصولِ رزق کے لئے تعلیمی ڈھانچے کا مقصد نہ صرف رزق ہو بلکہ اس کے علاوہ قومی ترقی، قومی ہمدردی اور علوم سائنس کی ترقی اور ریسرچ کا لگاؤ ضروری ہے۔

ایسی تعلیم کی صحیح بنیاد، ارتقاء اور تکمیل کے لئے وقت کی ضرورت ہے بار بار کمیشن بیٹھانے، بار بار نصاب کی تبدیلی سے نقصان زیادہ اور فائدہ کم ہوتا ہے۔

اس کی سخت ضرورت ہے کہ گزشتہ کمیشنوں کی رپورٹوں ماہرینِ تعلیم کے خیالات ایک وسیع سوال نامے (COMPREHENSIVE QUESTION) کے جوابوں کا مرقع جو کہ بنیادی تعلیم اداروں، اسکولوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے اساتذہ اور درمیانی تعلیمی اداروں سے کر دارالعلوم کی سطح تک کے بھیجا جائے، سامنے رکھا جائے اور ان کو دیکھ کر ایک تعلیمی ڈھانچہ اور نصاب تیار کیا جائے جب یہ تیار ہو جائے تو پھر اہل الرائے اشخاص کے پاس بھیج کر ان کے تبصروں پر غور کرنے کے بعد آخری مسودہ اور نصاب تیار کیا جائے۔ سیاست اور سیاسی لیڈروں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے

یہ ایک بے حد مفید دستاویز ہوگا اور ان کی صرف جزوی تبدیلی اگر ضرورت ہوئی تو وقتاً فوقتاً کی جا سکتی ہے ایک دفعہ نصاب بن جاتا تو اس کی نقل ہر ہندوستانی زبان میں لکھوائی اور اشاعت کا انتظام کرسکے۔ ڈاکٹر وارث علی ہر رفاہ

صابرہ خاتون
لیکچرر طبعیات ویمنس کالج اے ایم یو علی گڑھ

سائنس ڈائری

طاقتور روشنی کی دھار

شکاگو یونیورسٹی کے طبعیات دانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے سطح زمین سے ٹکرانے والی سورج کی روشنی کو چھان کر قدرے تیز روشنی کی دھار تیار کی ہے۔ سائینسی جریدہ "نیچر" میں شائع خط میں ٹیم کے ممبر داوے کک (DAVE. COOK) نے لکھا ہے کہ ہم پورے نظام شمسی میں سب سے زیادہ شدت (INTENSILY) کی روشنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اس تجربے میں ایک عام دوربین کا استعمال کیا گیا ہے جس میں ۴۲ سینٹی میٹر کا آئینہ نصب تھا۔ اس کے ذریعے سورج کی روشنی ۳۹ انچ قطر میں ایک گز کے فاصلے پر ایک دھبے کی شکل میں مرکوز کر لی گئی اس طرح روشنی محدود طور پر گاڑھی ہو گئی۔ بعد ازاں یاقوت کا ایک روا استعمال کیا گیا جس کا مقصد روشنی کو چھاننا تھا۔ یہ روا ایک تکون کی شکل کا تھا جس کا ایک سرا جہاں سے روشنی داخل ہوئی چوڑا تھا اور دوسرا جہاں سے روشنی منعکس ہو کر باہر نکل نسبتاً پتلا تھا اس تکون کے ذریعے مذکورہ بالا روشنی ۰۰۴ر انچ قطر کی دھار (BEAM) میں تبدیل کر لی گئی۔ اس روشنی کی دھار کی شدت سورج کی عام روشنی کے بمقابلہ ۸۴۰۰۰ گنا اور سورج سطح پر پائی جانے والی روشنی سے ۷۲ فی صد تیز ہے یعنی سورج کی سطح پر روشنی کی شدت ۶۳ واٹ فی مربع ملی میٹر ہے جب کہ اس مصنوعی روشنی کی شدت ۷۲ واٹ فی مربع ملی میٹر ہے

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ تجربہ سورج کے ذریعے چلنے والا لیزر - SOLAR PUMPED LASER بنانے کا پہلا قدم ثابت ہو۔ یعنی اگر تیار شدہ روشنی لیزر سے گزاری جائے تو اس سے بعید باریک ایک مقررہ لہر لمبائی WAVE LENGTH کی روشنی کی دھار نکل سکے گی اور اس قسم کا لیزر سیاروں تک رسل ورسائل کے کام آسکے گا۔ کچھ خاص مادے جن کی ہیئت STATE تبدیل کرنے کے لئے کافی درجۂ حرارت درکار ہوتا ہے بآسانی تبدیل کیے جا سکیں گے۔ ضرر رساں مادہ WASTE برباد کرنے کا کام بھی اس سے لیا جا سکے گا اس مادہ پر بالا بنفشی لیزر ULTRA VOILET LASER ڈالتے ہی چیز جل کر خاک ہو جائے گی یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ خطرناک کیمیاوی مادے اس لیزر کے ذریعے مفید مادوں میں تبدیل کیے جا سکیں گے۔

انگلیوں کے نشانات پہچاننے کی مشین :-

۱۹۷۰ء کی دہائی میں — DONG BOBFREE — اور FOSTER

MAN نے انگلیوں کے نشانات FINERPRINRTS پہچاننے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کا اصول یہ ہے کہ جب کسی پیڈ کے ورق پر کچھ لکھا جاتا ہے تو اس سے بعد والے صفحہ پر اس لکھائی کے دباؤ سے نشانات پڑ جاتے ہیں بعد والے صفحہ پر الیکٹروا سٹیٹک تجزیے سے یہ پہچانا جا سکتا ہے کہ پہلے ورق پر کیا لکھا گیا تھا اس طریقے کو الیکٹروا سٹیٹک دستاویزی تجزیہ ELECTROSTATIC DOCUMENT ANALYSI یا (ESDA) کہا جاتا ہے جو اچانک لندن کے پرنٹنگ کالج میں ڈانگ فاسٹر اور باب فری مین نے ایجاد کیا۔

لہٰذا یہ ESDA کا تجزیہ ایک اہم عدالتی آلہ بن گیا ہے جسے کچہریوں اور پولیس کی تجربہ گاہوں میں متواتر استعمال کیا جا رہا ہے جس کے ذریعے ان لوگوں کو پہچانا جاتا ہے جنہوں نے بموں کی دھمکی دی ہو یا استعمال کرنے والے خطوط لکھے ہوں یا بہی کھاتے کے اوراق میں کوئی فریب کیا ہو۔

اس تجزیے کے ذریعے وہ نشانات صاف نظر آنے لگتے ہیں جو اتنے ہلکے اور دھندلے

ہوتے ہیں ان کو دیکھنا یا پہچاننا ممکن ہوتا ہے EDSA لکھے ہوئے خط کے بعد والے ورق کا خورد بینی DISTURBANCE حاصل کر لیتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے پہلے والے صفحہ پر کیا لکھا گیا تھا۔

جس دستاویز کا مشاہدہ کرنا ہوتا ہے اسے ایک چپٹی دھات کی پلیٹ پر ہوا نکال کر مضبوطی سے رکھ دیا جاتا ہے باریک پلاسٹک کی جھلی FILM اس کے اوپر رکھ دی جاتی ہے ... ۵ وولٹ کی برقی رو اس جھلی کی سطح سے گزاری جاتی ہے جہاں لکھائی کے نشانات ہوتے ہیں وہاں چارج زیادہ کیا ہو جاتا ہے جو چارج سے چپک کر کے ایک گہرا نقش چھوڑ جاتا۔ اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس سے پیشتر کیا لکھا گیا تھا۔

اس نتیجہ کو محفوظ کرنے کے لئے ایک لیس دار ADHESIVE پلاسٹک کی ایک چادر اوپر کی طرف رکھ دیتے ہیں پھر اصل دستاویز ہٹالی جاتی ہے یا اگر ضرورت ہو تو دوبارہ کر دیکھا جا سکتا ہے۔

دس سال سے EDSA کچہریوں میں ثبوت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے ۱۹۷۸ء فاسٹر اور فری مین نے EDSA مشین بنانے کی اپنی فیکٹری کھول لی ہے وہ اب تک پوری دنیا ...۶۰ مشینیں فروخت کر چکے ہیں جن میں سے ۲۴ صرف انگلستان میں پولیس کے شعبہ جات نے خریدی ہیں اور بہت کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔

زمین کے اندر دیکھنے کی دوربین :-

جرمنی میں ارضیاتی تحقیق کے متعلق اولوالعزم اور حوصلہ مندانہ پروجیکٹ کا آغاز ہوا ہے جس میں زمین کے اندر ۱۰۰۰ میٹر (یعنی ۳۲۸۰۰) گہرا سوراخ کیا جا رہا ہے۔

اس پروجیکٹ کا نام NINTALES TIEF BOHRIK T.A

پروگرام ہے یعنی براعظم کا گہری کھدائی کا پروگرام۔ جس کا خاص مقصد ارضیاتی سائنسی معلومات فراہم کرنا ہے۔

مغربی جرمنی کے تحقیق کے وزیر نے اس پروجیکٹ پر خرچ کا تخمینہ تقریباً ۴۳۰ کروڑ ڈالر لگایا ہے یہ سوراخ زمین کے اندر دیکھنے کے لئے ایک دوربین کی حیثیت رکھے گا جس سے زلزلے اور آتش فشاں وغیرہ کے متعلق نئے انکشافات ہونے کی اُمید ہے علاوہ ازیں معدنیات ہائڈروکاربن اور GES THERMAL پانی کے بارے میں بھی معلومات مہیا کی جاسکیں گی۔

K.T.B کی کھدائی کا آغاز ستمبر ۱۹۸۷ء میں NUREMBERG سے ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوا یہ سوراخ ۱۰,۰۰۰ میٹر تک پہنچ پایا تھا کہ ۱۹۸۹ء میں کھدائی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

فی الحال جرمنی کی تقریباً ۱۰۰ یونیورسٹیوں کے ماہرین ارضیات K.T.B پروگرام میں شامل ہیں اور وہاں سے نکالے گئے نمونے کا تجزیہ کیا جارہا ہے اب ارادہ یہ ہے کہ ایک دوسرا سوراخ ۔ ۲ کلومیٹر کے فاصلے پر کھودا جائے تاکہ پہلے سوراخ والی تحقیق کی توثیق کی جاسکے۔

ڈاکٹر THOMAS WOLRE نے ایک سیاح کو وہ جگہ دکھاتے ہوئے کہا K.T.B کا واحد مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا نمونہ تیار کیا جائے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ زمین کی پرتوں کی بناوٹ کس قسم کی ہے کھدائی کرنے سے پہلے اس جگہ کاشت ہوا کرتی تھی اس جگہ کی تحقیق کرکے سارے علمی پہلوؤں پر غور وخوض اور مشاہدہ کرکے یہ معلوم ہوا کہ یہاں چٹانیں بننے کا عمل بالکل انوکھا ہے جو سطح زمین کے کافی قریب سرگرم عمل ہے۔

اس جگہ تحقیقی تجربہ گاہیں بنا دی گئی ہیں جن میں ماہرین ارضیات ORE SAMPLES کی مختلف النوع تحقیق سے ۳۵۰۰ میٹر گہرائی سے نکالا گیا ہے اس تحقیقی کام میں گاما شعاعوں کی طیف شناسی SPECTRO SCOPY ارضی کیمیاوی GEO CHEMICAL تجزیہ، برق مقناطیسی پیمائش، حرارتی اور زلزلے سے متعلق مطالعہ اور گیس کی انحراف پیمائی GAS SPECTROMETRY وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر WOLRE کا کہنا ہے کہ سب DATA ایک ساتھ دیکھنے پر زمین کی اندرونی بناوٹ بلکا سا خاکہ ضرور بن جائے گا پھر اس DATA کا مقابلہ دوسرے سوراخ کے DATA سے کرنے کے بعد کسوٹی

نیجہ پر پہنچا جا سکے گا۔

اس پروجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ یہ سوراخ کم از کم ۱۰،۰۰۰ میٹر گہرا ہو۔ حالانکہ
سخت روے دار چٹانیں ہیں۔ جہاں (GRANITE) اور ابرق تشکیل پذیر ہیں اس پروج
کے مینجر نے سوراخ کی کھدائی کو ۱۹۹۶ء تک پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے بعد ازاں یہ طے کیا
گا کہ آیا یہ سوراخ اور گہرا یعنی ...۱۴ میٹر تک کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

جس قدر یہ مقصد سائنسی اہمیت کا حامل ہے اتنا ہی اہم یہ جاننا ہے کہ کھدائی
ٹکنالوجی کتنی معیاری (SOPHISTICATED) ہونی چاہیئے اس پروجیکٹ کی زمین دو
کھدائی کمپنی میں چار فرمیں (FIRMS) شریک ہیں جو ایسی جگہ مقیم ہیں جہاں جرمنی کا سار
اور گیس بنانے والے کارخانے آباد ہیں۔

اس کھدائی کا سب سے بڑا مرحلہ یہ ہے کہ جیسے جیسے نیچے کی طرف بڑھ رہے ہیں گرمی ا
شدت بڑھ رہی ہے اور سائنسی آلات ..۳ ڈگری سیلیس یا اس سے کچھ زیادہ تک ہی کام کر
دوسرا مسئلہ سوراخ کے عمودی (VERTICAL) ہونے کا ہے تاکہ کھدائی کرنے والی نلیہ
پر کھنچاؤ اور تناؤ کم سے کم پڑے (PILOT HOLE) کی کھدائی کے دوران جب بھی چٹانیں آتی
کھدائی کرنے والا پائپ چٹانوں کے ٹیڑھے میڑھے ہونے کے سبب جھک جاتا تھا اس مشکل
حل تلاش کرنے کے لئے تحقیق جاری ہے اور یہ سوچا جا رہا ہے کہ ایک خودکار پانی سے چلنے
والی سوراخ کرنے کی مشین SELF GOIDING HYDRAULIC DRILL HEAD بنائی
جس میں SENSORS لگے ہوں تاکہ جب بھی وہ اپنی جگہ سے ٹیڑھا ہو اسے سیدھا کیا جائے
بین الاقوامی سطح پر سوراخ کا منتظر نہ صرف سائنسداں طبقہ ہے بلکہ سوراخ کر
والے انجینئر صاحبان بھی یہ جاننے کے مشتاق ہیں کہ اس پروجیکٹ میں کتنا سخت ظروف
(HARD WARE) استعمال کیا گیا ہے جس میں اتنا گہرا سوراخ ممکن ہو سکا HOLE
کے لئے عام ۹۴ میٹر لمبی سوراخ کرنے کی مشین استعمال کی گئی تھی لیکن اب ۸۳ میٹر

کی جائے گی جس میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں اور نئے نئے آلات لگائے گئے ہیں۔

اس بات کا خاص خیال رکھا جارہا ہے کہ اس پورے عمل میں کم سے کم وقت ضائع ہو۔ جتنا سوراخ گہرا ہوتا جائے گا اتنا ہی ان چیزوں کو باہر نکالنے اور دوبارہ لگانے میں وقت زیادہ لگے گا اس وقت کو بچانے کے لئے سوراخ کرنے والی مشین میں ۴ ملی میٹر لمبی تراش کی نلی (DRILL STRING PAPE SECTION) کا استعمال کیا جائے گا جب کہ اس سے قبل معمولی ۲۷ میٹر تراش کی نلی استعمال ہوتی تھی زمین دوز سوراخ کرنے والی مشین (SUPER DEEP - DRILLRING) عوامی بجلی کے تعاون سے چل رہی ہے اور اسی بجلی سے کمپیوٹر بھی لگا دیئے گئے ہیں۔ مسٹر JATHO کا کہنا ہے کہ جب ہم کافی نیچے پہنچیں گے تو کھدائی کا کام اور مشکل ہو جائے گا کیونکہ نیچے کافی سخت چٹانوں کو توڑنا ہوگا۔ لہٰذا اس وقت زیادہ بجلی درکار ہوگی اور کمپیوٹر نہیں چل سکیں گے۔

پروجیکٹ شروع ہونے سے پہلے کا مطالعہ یہ پیشن گوئی کر رہا ہے کہ زمین دوز سوراخ کرنے والے مشین میں مختلف تبدیلیاں کرنے سے ۳۲۰ دن کے کام کرنے کا وقفہ بچ جائے گا جس سے خرچ بھی بچے گا لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عملاً طور پر دس کلومیٹر لمبے پتھریلے راستے دو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سوراخ ہو سکے گا یا نہیں۔

پروجیکٹ کے بعد سے جرمنی دنیا کے ان چند ملکوں میں شامل ہو گیا ہے جو زمین کی پرت کا مطالعہ کرنے کی کوشاں ہیں۔ روس میں کولا جزیرہ نما میں ۱۲۰۰۰ میٹر تک کھد ہو چکی ہے امریکہ میں سمندر میں کھدائی کا پروگرام بنا رہا ہے لیکن بین الاقوامی سائنسی دلچسپی فی الوقت جرمنی کی گہرے کھدائی کے پروگرام کی جانب مرکوز ہے جیسے پایہ تکمیل تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے اور کتنی اور پریشانیاں ابھی اس راہ میں حائل ہوں گی۔

[خط] تحریر میں پڑھنے والا کمپیوٹر:- کچھ ہی برس پہلے کی بات ہے جب کمپیوٹر کا سائز بڑا اور کام کرنے کی رفتار عموماً کم ہوا

لیکن جیسے جیسے استعمال عام ہوتا گیا ان کا سائز مختصر اور کام کرنے کی رفتار تیز ہوتی گئی ان (KEY BOARDS) اتنے چھوٹے بننے لگے کہ انسانی ہاتھ ان کو آسانی سے استعمال بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ کمپنیاں CALCULATOR کے بٹن کے برابر (KEY BOARDS) بنانے لگیں اور دیگر کچھ کا اعتراض تھا کہ (KEY BOARDS) یکسر ختم کر دیئے جانے چاہئیں۔ کیونکہ ٹائپ سے نابلد ان کمپیوٹروں سے بہت خائف نظر آتے تھے۔

مصنوعی SAFTWARE کی ذکاوت INTELLIGENCE نے دورِ حاضر میں کو بھی تبدیلی ممکن بنا دی ہے پہلے اس قسم کے طریقے موجود تھے جن سے ٹائپ کی ہوئی عبارت پڑھ جا سکتی تھی لیکن اس دور میں ہزاروں قسم کی لکھی ہوئی عبارات کمپیوٹر کی مدد سے بآسانی پڑھی جا سکتی ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے الیکٹرانک طریقہ سے مختلف علامات (SYMBOLS) الفاظ مشین میں بھر دیئے جاتے ہیں پھر لکھی ہوئی عبارت کو مشین اپنے جمع شدہ الفاظ سے موازنہ کرتی ہے اور جن کو قریب تر پاتی ہے پڑھ لیتی ہے

بجائے الفاظ اور بٹنوں کے دبانے کے استعمال کرنے والا شخص یا تو اپنے ہاتھ سے ایک الیکٹرانک پین کی مدد سے لکھتا ہے یا مشین کو وہ الفاظ پہچاننے کی ہدایات دے جاتی ہیں پہلے سے مشین کو یادداشت میں محفوظ کر دیئے گئے ہوں۔ جب مشین ہاتھ کی لکھائی پڑھتی ہے۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آیا وہ صحیح پڑھ رہی ہے یا نہیں۔ پڑھنے کے بعد وہ کمپیوٹر کے مطابق اس کو تبدیل کر دیتی ہے جسے اسٹور کیا جا سکتا ہے منتقل کر سکتے ہیں اور نظر ثانی بھی کر سکتے ہیں۔

امریکا کی ایک کمپنی نے انگریزی زبان پہچاننے کی مشین ایجاد کی جاپان کی CONON SONY کمپنیوں نے جاپانی زبان پہچاننے کی مشین تیار کی ہے فی الحال ان مشینوں کی قیمت بہت ہے دو کلو CRRD کی مشین کی قیمت تین ہزار ڈالر ہے SONY کی مشین جس کا وزن ۱٫۳ ہے ۱۳۵۰ ڈالر کی ہے گو کہ ۱۹۸۷ء میں ان مشینوں کی خرید و فروخت بہت کم ہے لیکن [illegible] بہت مانگ ہوگی کیونکہ اس کے آدھے

ٹربنیر KEY BOARDS کے ہوں گے۔ حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مشینیں بازار میں کتنی جگہ بنا پائیں گی گو عوام کی توجہ ان مشینوں کی جانب مبذول ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ مشینوں میں ہاتھ کی لکھائی پہچاننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

علامات پہچاننے CHARACTOR RECOGNITION کا طریقہ جاپانیوں کے لیے موں اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ان کے رسم الخط میں ہزاروں قسم کی علامات موجود ہیں اور جن کے لئے اتنے زیادہ KEY BOARDS نہیں بنائے جا سکتے تھے لہذا انھوں نے ساری علامات یوٹر کی یادداشت MEMORY میں محفوظ کر دیں جس سے اب کمپیوٹر جاپانی زبان پڑھ سکتا ہے NEC کا کہنا ہے اس کا سسٹم ۲۵۳۵ مختلف علامات پہچان سکتا ہے لیکن ہاتھ کی لکھائی ونکہ ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لیئے علامات پہچاننے کا دارومدار اس بات پر منحصر ہے کہ کتنا صاف لکھا گیا ہے۔

گاہے گاہے پولیس افسران حادثات کی رپورٹ لکھنے میں اب ان مشینوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ریل کے کارخانوں میں کام کرنے والے ریل کے ڈبوں کو گننے اور ان کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا کام پہلے کاغذ اور قلم کی مدد سے کرتے تھے جواب کمپیوٹر کی مدد سے فوراً ہو جاتا ہے۔ تاجر حضرات بھی میٹنگ کی روداد لکھنے میں یہی مشینیں استعمال کرتے ہیں۔ ایک جاپانی TOMOSHI HIRA YAMA کا کہنا ہے کہ اگر یہ مشینیں ٹیلی فون سے لگا دی جائیں تو ہر شخص کے نجی استعمال میں آ سکیں گی۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے ٹرین کی برتھ، ہوٹل کے کمرے محفوظ کیئے جا سکیں گے اور الیکٹرانک میل بھیجا جا سکے گا۔

فی الحال ہوائی اڈے کے کنٹرول روم اور جہاز کے پائلٹ کے درمیان رابطہ ٹیلی فون کی مدد سے قائم ہوتا ہے جب کہ ان کمپیوٹروں کی مدد سے لکھ کر بات کی جا سکے گی اور ہزاروں لوگ ہوائی جہاز میں بیٹھے بیٹھے بذریعہ کمپیوٹر بات کر سکیں گے۔

کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ایک سفری (PORTABLE) کمپیوٹر ہم کو نفس

کے اقتدار سے آزاد کردے گا یہ ہم کو ہر اُس کام کے بارے میں آگاہ کرتا رہے گا جو ہم کو کرنا
۱۹۸۰ء کے اوائل میں کمپیوٹر کے MACINTOSH ماڈل نے بازار میں آتے ہی بو
کردی۔ اس میں الکٹرانک علامات ICONS کی مدد سے مشین سے بات چیت کی جا سکتی
اسی سمت ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اب کمپیوٹر PORTABLE بننے لگے۔ TOP
کمپیوٹر بنانے والوں نے KEY BOARDS لگانے کا سلسلہ سرے سے ختم کر دیا جس سے تا
قانون داں اور دیگر پیشہ ور حضرات کو پین یا پنسل کی جگہ کمپیوٹر استعمال کرنا زیادہ سہل ہو
WANG تجربہ گاہوں میں اس قسم کے کمپیوٹر بنائے گئے ہیں جن میں کوئی بھی شخص ایک
STYLUS کی مدد سے کمپیوٹر کے افق پردہ پر پوری کمپیوٹر فائل پڑھ سکتا ہے جس میں
چارٹ وغیرہ اس طرح نظر آتے ہیں گویا کسی شخص نے انھیں پہلے سے لکھ کر رکھ دیا ہو۔

فی الحال کمپیوٹر داں طبقہ کے سامنے یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ کمپیوٹر کی طرح انسانی آواز
شروع کردے تاکہ کمپیوٹر آواز سنے اور فوراً اسے لکھ دے گوکہ یہ مرحلہ نظریاتی نقطۂ نگا
آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اسے حقیقت کا جامہ پہنانے میں ابھی وقت لگ جائے گا کیو
ہر شخص کا لہجہ، تلفظ اور بول چال مختلف ہوتی ہے کچھ لوگ اس طرح بولتے ہیں کہ حروف
دوسرے سے مل کر صاف طور سے سمجھ میں نہیں آتے۔ لہذا یہ ٹکنالوجی کے لئے زیادہ مشکل
چیلنج ہے اگر ایسا ممکن ہو سکا تو آج کی الکٹرانک دنیا میں زبردست انقلاب رونما ہوگا
سے لاکھوں لوگ مستفید ہوں گے۔ ▲▲

(باقی سلسلہ ص ۳۶ سے آگے)

کی منطق کو تقویت ملے گی اور اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ ہم کسی دینی جماعت کی تشکیل کر ر
حالانکہ ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے بلکہ شاہراہ حیات کی تبدیلی اور نئی تعمیر میں عرب ہو فیصلہ
پارٹی کا اصل طریقہ ہے۔ ▲▲

اکٹر کے بھگت وتسل راؤ
1/1144-2-2
ٹ آفس لین۔ شیو نلہ گٹہ
یدرآباد 44

ہتھوڑی

کوئی اس امر سے ناواقف تو نہیں کہ انسان کچھ حد تک بندر سے ملتا جلتا ہے یہ جنگلوں میں غاروں میں ندی نالوں کے آس پاس گھاس پھوس سے ڈھانپ لے کر رہا کرتا تھا، سائنسداں، مورخ کتابوں کے ڈھیر کھڑے کر دیتے ہیں اس سلسلہ میں ہمیں صبر ہو تو ایک آدھ ورق اُلٹنے سے معلوم ہوتا ہے چٹانوں پتھر سے اوزار بنائے اس نے۔ تیر بھی بنایا۔ بھالا بھی بنایا۔ جنگلی جانوروں کا بھی شکار کیا چیر پھاڑ کر وہ جانوروں کا گوشت نوچ لیتا تھا پانی تو پیٹ بھر کر پی لیتا تھا ہر طرف ہی پانی تھا اس کے لئے۔ آج کل کی طرح میلی گنگا نہیں، بدبودار جمنا نہیں، کیچڑ پگلی نہیں موسی نہیں۔ کرڑی کا ویری نہیں، چلو بھئی تہذیب جمتی گئی ترقی دیکھی گئی کچھ اوزار نے لگا دھات سے وہ بھی لوہے سے۔ مورخین اُسے دورِ لوہا کہتے ہیں زراعت کرنے رہائش ہوئی۔ دانا پانی کا سوال تھا پسینہ بہاتے گیا کچھ مرتے گئے۔ کچھ مارے گئے۔ آگے بڑھتے انسانوں کے قافلے۔ ریگستان بنا بھی تو قافلوں سے، غرض افزائش ہوتی گئی۔ سوال تو یہ ہے تاریخ پہلے انسان پہلے۔ مرغی انڈے کا سوال ہے۔ دادا پر دادا سے چل آ رہی ہے۔ بحث۔ مرغیاں بھی کٹ گئیں۔ انڈے بھی کھاتے جا رہے ہیں چائے کے پیچھے، طعام کے پیچھے کئی ختم ہو گئے ہیں لیکن بحث کا سلسلہ جاری ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ عنوان ہتھوڑی ہے اور مار رہے ہیں ڈینگ کچھ الگ ملاحظہ کیجئے تہذیب انسانیت کا یونان ہو یا ہندوستان، مصر ہو یا روما، ہڑپہ ہو یا موہنجو دارو

ہر جگہ سے ہتھوڑی کے بیل نکلے ہوں گے شاعروں نے تو ڈھیر کے ڈھیر اشعار تہذیب کے اوپر رکھ دیئے ہوں گے شکاری کے لئے پیشہ ور کے لئے برتن ساز کے لئے ایک ہتھیار بنا لیا بنی نوع انساز درانتی بھی ہتھوڑی کی بڑی بہن ہے اب سے چالیس سال پہلے لوگ ڈرتے تھے ان دونوں سے۔ خاص پارٹی کا نشان رہا ہے درانتی اور ایکھ۔ اس کے ساتھ اوپر ستارہ، درانتی میں ہتھوڑی پیوست تو الگ الگ پارٹیاں۔ لیکن سالہا سال سے پیشوؤں کے ہتھیار تھے۔ اوزار تھے۔ جب سے یہ ہتھیار کپڑوں پر چھاپے گئے تو حقوق کا سوال سامنے آیا۔ مہم شروع ہوئی۔ اپنے دیش میں نشانیوں کی کمی نہیں کپڑے کی تو کمی نہیں۔ روٹی، کپڑا، مکان کا سوال اب نہیں رہ پاتا ہے۔ ہم میں سوچ تو سمندر سی ہے۔ محنت کی کیا ضرورت۔ لہالب لب سے نکلتا جاتا ہے، خیالوں کا انبار، فلسفہ کی بیک، بات کرنا ہی تو ہمارا حق ہے ہمارا دستور ہے۔

ہتھوڑی کی طرف آئیے۔ آخر میں "ی" ہونے سے مونث سمجھی جاتی ہے لیکن کام ہیرو کا ہے سردار کا ہے، مجاہد کا ہے، میرِ کارواں کا ہے۔ سالار کا ہے۔ شیر ہے۔ ڈھیر کر دیتا ہے علامت بھی ہے مردانگی کا۔ پتھر بھی پھوڑ سکتے ہیں اور سر بھی۔ گھوڑے کے نعل چڑھاؤ، پیچ کا چور کرو، زیور بناؤ، فرش بچھاؤ، دیوار پر کیلے ٹھوکو۔ ہنڈی کے پہیے پر لوہے کا حلقہ چڑھاؤ وہی گرم گرم، کاریگر کے پاس ہتھوڑی برابر موجود۔

پہاڑ، چٹان بارود لگانے کے بعد ڈھیر کر دیئے جاتے ہیں ہتھوڑی سے۔ پتھر سے لکڑ، بڑا کنکر، اوسط کنکر، ریتیلی کنکر سب ہتھوڑی کے ہی کرشمے ہیں۔ محنت کش طبقہ کی، آدرش کی، برتن ساز کی، کسان کی۔ کاریگر کی نشانی ہے کوئی وزیر یا ماہر اس کا ذکر کئے بغیر تقریر کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے تو وزارت ہی الگ، چاہے ریاستی سطح پہ ہو یا مرکزی سطح۔ مزدور کے ساتھ بہرحال زیادہ پیوست ہے ہتھوڑی۔

لوہے کا ٹکڑا عرضی طور پر ایک لکڑی کا ٹکڑا عمودی طور پر لیکن کہا جاتا ہے ہتھوڑی دونوں کو الگ کرو کچھ نہیں۔ ہاتھ لگاؤ۔ فٹ کرو بن گئی ہتھوڑی۔ ہر حکومت میں اس کی اداکاری

شاداب

امراجیت ہو یا جمہوریت۔ سماج سدھارک بھی ہے ہتھوڑی۔ دیکھئے اس کا کمال۔ اپریل ۹۱ء

کہیں جلسہ ہو رہا ہے۔ جلوس نکالا جا رہا ہے شادی بیاہ ہے پارٹی ہے چرچہ برابر ہوتا ہے ہتھوڑی کا۔ بغیر خاکہ کے کام کر پاتی ہے سرکار رد ہو جائے ایسی پارٹیوں میں بات چیت کے دوران میں۔ لوبیت کا دوسرا نام ہتھوڑی ہے نا اس کو عمل میں لانے والے کو ہتھوڑی مار کہتے ہیں کئی طرح کے ہتھوڑی مار ہیں سو رہا ہیں تو چور بھی ہیں ہے نا۔ ماہرین ہیں تو سیاست داں بھی ہیں سماجی کارکن ہیں تو ہر طریقہ کے پیشہ ور ہیں۔ لیکن ان کے اوقات الگ الگ' کام کاج الگ فن سازی کے ریت نرالے۔ کیفیت تو یہ ہے کہ ہتھوڑی مار وار کرتے چلے جاتے ہیں لوگ ہتھوڑی سوزی کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں کوئی چالان کرنے والا نہیں یہ نمائندیا نہ ہتھوڑی مار کو۔ اس کا تو مایا جال ہے اس جگت میں۔

ایک مثال جلسہ کی لیجئے۔ کسانوں میں فصل اگانے کے لئے بیجوں کی تقسیم۔ صدر جلسہ ایک ماہر۔ پلیٹ فارم مل گیا۔ بھاشن شروع ہوا۔ بیج کی ساخت' پال پوس' خاندان کی تاریخ' تخم ریزی' ذخیرہ سازی' اکری ساٹ سے لایا گیا یا آئی اے آر آئی سے گھنٹہ گزر گیا۔ رُکنے کا نام نہیں پلیٹ فارم سے لوگ جلسہ میں کھسر پھسر کرنا شروع کر دیئے سگریٹ بیڑی جلانے کے لئے شامیانے کے باہر آ گئے۔ پان کھانے والوں کا الگ ہجوم' مرمرے کھانے والے الگ' مرچیوں کا الگ بیوپار' امرت انجن زندہ طلسمات کی الگ بکری دیکھتے ہتھوڑی کے وار جم جانے سے کیا بیوپار چلتا ہے کسی کو فاقہ کشی کی نوبت نہیں۔ معاشی ذرائع فراہم ہو جا رہے ہیں۔ ہتھوڑی کا اعزاز دینا ہے۔ تہنیتی جلسہ بھی کر سکتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں ہتھوڑی مار کی تعداد گنجان ہے استاد کا لفظ پرانا ہو چلا ہے سبق کا ایک جملہ پڑھانا۔ قصے' کہانیاں' سیاست کا چرچہ بھرپور۔ بچوں پر بھی ہتھوڑی کے مار۔ تھانہ میں رپورٹ درج کرانے کے لئے مار کے یا وار کے نشان دیکھ تو نہیں سکتے۔ دیدار ہتھوڑی ہوتا ہے سہنے والوں کا۔ چند طلبا و طالبات سہہ نہیں سکتے تو دو دروازوں سے نکل پڑتے ہیں برآمدہ میں کھلی ہوا کے لئے۔

ہتھوڑی کے وار سے آکسیجن کی کمی ہوتی ہے حال ہی میں بیرونی ممالک میں ماہرین نے ہتھوڑی کے وار سے پہلے اور بعد کے حالات کا تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے۔ مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔

ہتھوڑی کی پہچان جلدی ہو جاتی ہے کسی جلسہ میں لوگ بیٹھتے ہیں تو پہلے صف کے لوگ تو قید ہو جاتے ہیں اس کے وار کے لئے بیٹھ جاتے ہیں خلوص کے خاطر، ادب کے ناطے بے چینی کے باوجود مجبور نظر آتے ہیں بیچ والے تو پریشان باہر نکلنے کے لئے۔ آخری صف والے تو ہتھوڑی سے درہ پاتے ہیں چائے کافی پی لیتے ہیں لڈو، پیڑے کھا لیتے ہیں سگریٹ جلاتے ہیں زردہ کے ن کی بکری ہوتی ہے قہقہہ لگاتے ہیں۔

عمر کا فرق رہے تو ہتھوڑی کا اثر کچھ کم ہوتا ہے مثلاً کوئی مذہبی جلسہ ہو رہا ہے یا جی یا سیاسی۔ احتجاج بھی ہو۔ کچھ لوگ وقف ہو جاتے ہیں مقرر کے وار ہتھوڑی کے لئے۔ وہ ماملہ ہیں، شیدا ہیں، پجاری ہیں، سیوک ہیں خدمت گار ہیں مجذوب ہیں ہتھوڑی کے۔ جلسہ بعد وہ وارث، ٹھیکہ دار، مالک نظر آتے ہیں ہتھوڑی کی دنیا کے باشندے ہیں۔ فلسفی کی طرح لر آتے ہیں۔ ایک ضخیم کتاب بھی مرتب کر سکتے ہیں طور و طریق کے۔ دل پر دماغ پر۔ بغیر شانی کے وار کا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیقی اداروں میں بھی اس کا رول ہے دخل ہے چیلہ ہو یا شاگرد، ماہر رہے یا محقق، استاد ہو یا پرستار، مہتمم ہو یا منتظم ہر ایک کے پاس مایہ اوزار ہتھوڑی ہے جادوگر ہے ہتھوڑی۔ مطلب یہ ہے کہ قلم بہ نام ہتھوڑی ہے کوئی دکھا مار ایک وار، گھنٹوں، مہینوں، سالوں مارتے چلے جاتے ہیں اس جادو سے نکل آنا مشـ کام ہے۔ پرانے طلباء کا "گٹ ٹو گیدر" ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں استاد ہتھـ مارتا تھا [illegible] گٹ لوٹ کہہ آتا تھا۔ بہرحال ہتھوڑی کی ایک تاریخ ہے سوانح [illegible] قابل ہے ریسرچ [illegible] ہتھوڑی کا دخل ہے [illegible] میں بھی ہتھوڑی کا دخل ہے [illegible]
[illegible]

مضمون نگار، نقاد، عالم، مدبر، ... رہ، لیڈر، ہر ایک کبھی نہ کبھی ہتھوڑی مار رہ پاتا ہے۔
اور اس کے وار بھی سہہ لینے کی طاقت، جرأت، قوت، صلاحیت ہوتی ہے قلمکاری میں یا تقریر ... میں
اس کی زیادتی ہوتی ہے تو آلودگی کے سوا کچھ نہیں۔ سراسیمگی کا سماں۔

ہتھوڑی مار پیسہ بھی کما پاتے ہیں مثلاً چارمینار کے پیچھے چاندی کے، ابرق کے ورق بنانے والے ایک پتھر سامنے رکھ پاتے ہیں نان کلچہ کھا لیتے۔ گلی میں بیٹھ شروع ہتھوڑی کے مار کا وار، گھنٹوں شور شرابا ٹھاق ٹھاق۔ بہروں کی گفتگو بھی نہیں ہو سکتی۔ ان اوراق کو پھولوں کے گچھوں میں راکھیوں میں پان میں ہم شوق کرتے ہیں لیکن ہتھوڑی مار کے نشان برابر آن میں موجود۔

غرض ہتھوڑی نشان ہے انسان کا۔ ہر ایک اس سے بہرے نہیں ایک منظر ہے اس کی عالمگیریت ہے گاؤں میں ہے تو کونٹی میں بھی۔ ہتھوڑی کے وار کا علاج بھی ماہرین ہر ملک میں کر پاتے ہیں سنا گیا ہے کہ جامعاتی سطح پر اس کی تعلیم کا انتظام کیا جانے والا ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ چند آشرم قائم کیے جانے والے ہیں باہر بورڈ رہے گا "ہتھوڑی مار آنے کی ممانعت ہے" ساتھ ساتھ ہتھوڑی کا ارتقاء، مار کو سہنے کے طور و طریق، اثرات، پھیلنے والے متعدی امراض، بچاؤ کے تدابیر کے لئے ادارے بھی قائم کیے جانے والے ہیں۔ منصوبہ بھی ہے کہ عالمی سطح پر ایک سمینار ہو "ہتھوڑی کی عالمگیریت پر"۔

زندگی جب تک اس کرہ پر ہے ہتھوڑی مار کی کمی نہیں۔ ہتھوڑی ساز رہنے تک موزی ہوتی جاتی ہے لیکن مرگھٹ کا حال نہیں رہ پاتا ہے۔ ادب کی ہتھوڑی ریشم کی طرح ملائم، مسکہ کی طرح نرم ہوتی ہے کبھی کبھار رام بام کی ضرورت ہوتی ہے اس کا رول مسلم ہے مگا سے ایوارڈ یا بھارت رتن نوبل پرائز دو یا پیز ... کلنگا ایوارڈ بخشو یا گیان پیٹھ ہتھوڑی کو پر بھی کچھ کم ہے۔ ہر ایک کے پاس کسی نہ کسی طرح سے موجود کام میں آنے آ کے لئے۔ عورت کے پاس رہے تو مونث، مرد کے پاس رہے تو مذکر ہے ہتھوڑی ہر ایک کا۔ ہم تو کہتے ہیں خدا حافظ ہتھوڑی۔

٭٭٭

سید فضل اللہ مکرم
۴۔۲۔۴۔۱۴، محبوب پورہ،
جگتیال (اے پی)

ذیابطیس کیا ہے؟

کریلا اور جامن کا استعمال مفید، میدہ، چاول، آلو نہایت مضر

روئے زمین پر آدم کے ساتھ خوشیاں بھی آئیں اور غم بھی، نعمتوں کا تحفہ بھی ساتھ تھا اور محنتوں کا حصہ بھی۔ بیماریاں بھی تھیں اور صحت بھی ـــــ ویسے انسان حالتِ مرض میں جس طرح خدا کو یاد کرتا ہے اس سے مدد مانگتا ہے اس طرح خوشحالی میں نہیں مانگتا گویا بیماریاں بھی نعمتِ خداوندی ہیں جس کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے پُر امید اور اس کی یاد میں غور رہتا ہے۔ ان بیماریوں میں " ذیابطیس " بہت معقول و عام ہے ترقی یافتہ ممالک میں اس کی شرح زیادہ ہے جدید دور میں اس موذی مرض نے وہ تباہی مچا رکھی ہے کہ اللہ اللہ۔

بنیادی طور پر ذیابطیس عربی لفظ ہے جس کا ماخذ یونانی لفظ DAI BAI MIMIN ہے جس کا مطلب درمیان سے گذر جانا ہے اور انگریزی زبان میں اس کو DAI BETES کہتے ہیں جس کے معانی ایسا حوض یا کنواں ہے جس میں ایک طرف سے پانی بھرتا جاتا ہے تو دوسری طرف خارج ہو جاتا ہے اور ذیابطیس کی کیفیت بھی ایسی ہی ہوتی ہے اِدھر مریض نے پیا اُدھر پیشاب بن کر نکلا ـ تاریخی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مصر میں تقریباً دو ہزار سال قبل EBERS PAPARUS میں اس بیماری کا تذکرہ ملتا ہے رومی طبیب میں ایرٹس نے اس بیماری کو ذیابطیس کا نام دیا۔ دوسری صدی عیسوی میں اس بیماری کا تذکرہ ہے چھٹی صدی عیسوی میں بھارتی وید شیو شرتھ نے اس کا ذکر " مدھومہ " یعنی میٹھا پیشاب کے نام

تے میں جناب عرب حکیم بوعلی سینا FENUGREEK ، EUPAN ، WORM SEED نامی مختلف جڑی بوٹیوں سے اس کا علاج کیا کرتا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں ڈوبنس نے پیشاب میں شکر کی موجودگی کو ثابت کیا۔ اٹھارویں صدی میں اس بیماری کا تعلق لبلبہ PANCREAS سے ثابت ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں بینٹنگ اینڈ بیسٹ نے انسولین کو دریافت کیا اور نوبل انعام کا حقدار ٹھہرا۔ ۱۹۵۵ء میں TOLLISTAMIDI کی دریافت گولیوں کی شکل میں دوسرا اہم قدم تھا۔

ہمارے جسم میں معدے کے پیچھے ایک غدود ہوتا ہے جسے لبلبہ یعنی PANCREAS کہتے ہیں اس کے خلیئے انسولین خارج کرتے ہیں یہ INSULIN خون کے اندر شکر کو توانائی میں بدلتا ہے اور زائد شکر جگر اور رگ پٹھوں میں GLYCHOGIN کی صورت میں جمع کرتی ہے اگر اسی نقص کی وجہ سے انسولین صحیح مقدار میں خون میں شامل نہ ہو تو شکر جسم میں اچھی طرح جذب نہیں ہوتی جس کے نتیجہ میں زائد شکر پیشاب کے ذریعہ خارج ہوتی ہے یا خون میں اسکی مقدار بڑھ جاتی ہے اسی کو ذیابطیس کہتے ہیں یہ مرض جسم کے ہر حصے کو متاثر کرتا ہے اس بیماری کے خصوصی نشانے دل و دماغ، گردے، آنکھیں، شریانیں اور نسیں ہیں یہ توارثی بھی ہو سکتا ہے عام طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے ایک کو ذیابطیس ہو تو اولاد میں سے ایک بچے کو یہ مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ اگر دونوں والدین اس مرض میں مبتلا ہوں تو چار بچوں میں سے تین کو اس مرض کا لاحق ہونا ممکن ہے۔

علامات مرض یہ ہیں کہ مریض کو بار بار پیاس لگتی ہے پیشاب کی زیادتی ہوتی ہے اور اس کو روکنا ناممکن سا ہو جاتا ہے اور اس کے رنگ و بو میں فرق آنے لگتا ہے منہ اور حلق خشک ہونے کے ساتھ ساتھ جلد بھی خشک اور کھردری ہو جاتی ہے اور جلد کی بیماریاں شروع ہونے لگتی ہیں قبض کی شکایت، جوڑوں میں درد، بینائی میں تیزی سے کمی، دن بدن کمزوری کا عارضہ کا فروغ ہوتا ہے اور غیر ضروری مایوسی و افسردگی چھانے لگتی ہے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے یوخان نے ذیابطیس کی دو بڑی قسمیں بتائی ہیں۔

ایک ذیابطیس سادہ، جس میں پیشاب کی رنگت صاف رہتی ہے لیکن مقدار میں اضافہ ہوتا ہے اس میں شکر نہیں ہوتی، ہاضمہ خراب رہتا ہے اور کمزوری بڑھتی جاتی ہے۔

دوسری قسم ذیابطیس شکری ہے اس مرض میں پیشاب مقدار میں زیادہ اور شکر کے ساتھ آتا ہے اور بار بار آتا ہے جلد خشک ہو جاتی ہے پیاس شدت کی لگتی ہے اور کوئی زخم وغیرہ ہو جائے تو وہ آسانی سے مندمل نہیں ہوتا۔ پنڈلیوں میں چیونٹیاں رینگتی لگتی ہیں ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے مریض لاغر اور کمزور ہونے لگتا ہے اگر اس کا علاج فوری طور پر نہ ہو تو نتائج انتہائی خطرناک ہو سکتے ہیں۔

عام طور پر چالیس تا پچاس سال کی عمر کے افراد اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں اس عمر میں بیماری معمولی درجہ کی ہوتی ہے اور قابو پانے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں ذیابطیس کی روک تھام میں کئی مسائل درپیش ہیں یہ مرض لوگوں میں دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے آج کل ذیابطیس جیسے موذی مرض میں مبتلا لوگوں میں کئی ایک دوسری بیماریاں لاحق ہو رہی ہیں جیسے DIABETE COMA، ہارٹ اٹیک، گردوں کا کام بند کر دینا اور GANGRINE وغیرہ، جس کی وجہ سے (۳۰) تا (۴۰) فیصد اموات واقع ہو رہی ہیں صرف DIAETECOMA سے مرنے والوں کا تناسب ۲۴٪ ہے اس کے علاوہ اس بیماری کا علاج تقریباً پوری عمر کرنا پڑتا ہے اکثریت اپنی عزبت کے سبب، علاج کی طویل مدت اور قیمت کو برداشت نہیں کر سکتی، ان کی حالت اطمینان بخش نہیں ہوتی اور شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں پیشاب کی جانچ کے عصری طریقے اور بر وقت ادویات کا پہونچنا آج بھی مشکل نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۵۵ء میں بمبئی میں ایک انجمن ذیابطیس اسوسی ایشن آف انڈیا قائم کی گئی تاکہ ذیابطیس کے بارے میں عوام میں شعور پیدا کیا جا سکے اور اس مرض کے صحیح علاج کو بتایا جا سکے۔ اس اسوسی ایشن کے تحت اب تک کئی ایک لکچرز سیمنار، سمپوزیم وغیرہ منعقد ہوئے اور تحقیق کام کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

کسی بھی بیماری کی سب سے بڑی دوا پرہیز ہے ذیابطیس جیسے موذی مرض کو پرہیز کے ذریعہ بہت حد تک قابو میں کیا جا سکتا ہے ڈاکٹر سے مشورہ اور ادویہ کے استعمال کے علاوہ کچھ گھریلو نسخے بھی ہیں جن کے استعمال سے ذیابطیس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

غذائی پروٹینز یعنی گوشت، انڈا وغیرہ کی مقدار زیادہ ہونا چاہیئے۔ دودھ خصوصاً بکری کا بہت مفید ثابت ہوگا کاربوہائیڈریٹس کی مقدار کم اور معالج کی ہدایت کے مطابق ہو بالکل ہی ختم نہ کیا جائے کیوں کہ میٹھا یکسر بند ہونے سے بدن میں چربی کی مقدار زیادہ ہو جائے گی جو نقصان دہ ثابت ہوگی کریلے کو کچا کھانا بہت مفید ہے اگر یہ ممکن نہ ہو تو بغیر چھلکے بطور سالن پکا کر کھائیں۔ جامن کثرت سے استعمال کریں۔ اس کی گٹھلی بھی نعمت سے کم نہیں۔ موٹاپے اور ذیابطیس کا قریبی تعلق ہے چالیس سے پچاس فیصد مریض موٹاپے میں مبتلا ہوتے ہیں اس لیے وزن کو کم کرنے کے لئے مناسب ورزش کریں۔ مغزیات اور تازہ پھلوں کا استعمال نہایت مفید ہے۔ میٹھے پھلوں سے اجتناب کریں۔ میدہ یا میدے کی نان خطائیاں، مریض کے لئے مضر ہیں۔ مسور کی دال، چاول، آلو، بیگن، جیسی ثقیل اشیاء نقصان دہ ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل آوری اور پابندی سے دوائیوں کا استعمال ذیابطیس کو جڑ سے نکال پھینک سکتا ہے۔ یاد رکھیئے کسی بھی مرض کو معمولی نہ سمجھیں، لاپرواہی اور کاہلی سب سے بڑا مرض ہے اس سے پرہیز کریں۔

این۔ وٹھل
سکریٹری محکمہ الیکٹرانکس

الیکٹرانکس
ایک اُبھرتی ہوئی صنعت

الیکٹرانکس ٹکنالوجی معیشت کے تمام شعبوں میں داخل ہو گئے ہیں اس سے عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہے الیکٹرانکس سے جو اپنے جدید لائنوں پر تیار کیے گئے۔ پروسیس کنٹرول کے آلات، اعداد و شمار (ڈاٹا) حاصل کرنے والے سسٹموں، پیداواری عمل کی مناسب مشینی خودکاری (مشینیں) اور کمپیوٹر کے ذریعے تیار کیے جانے والے ڈیزائن پہ مبنی ہے موجودہ صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے اور صنعتی پیداواری قوت میں اضافہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے فضا میں، زمین پر، ریلوں اور سڑکوں پر سمندر در کارخانوں میں اور کانوں میں حفاظت کا انحصار آج بڑی حد تک الیکٹرانک ٹکنالوجی پر ہے بڑے پیمانے پر تعلیم دینے زرعی پیداواریت اور صحت و طب جیسے شعبوں میں بہتری کے الیکٹرانکس سے زبردست کام لیا جا سکتا ہے۔

گزشتہ دہائی میں بھارت نے الیکٹرانکس صنعت میں قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ ۸۵۔ ۱۹۸۰ء کے دوران اس کی مجموعی شرح ترقی ۲۵ فیصد رہی۔ ۹۰۔ ۱۹۸۵ء کے دوران یہ شرح ۳۵ فی صد رہی۔ مالی اعتبار سے الیکٹرانکس کی پیداوار ۸۵۔ ۱۹۸۴ء میں ۲۸۰۱۰۰ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۹۰۔ ۱۹۸۹ء میں ۹۲۱۰۰۰ لاکھ روپے ہو گئی۔

۹۰ ۔ ۱۹۸۵ء کے دوران الیکٹرانکس کے سیکٹر میں ۔۔۔۔ ۲۵و لاکھ روپئے کی سرمایہ
ی کی گئی یہ سرمایہ کاری مواصلات، کل پرزوں اور کمپیوٹروں کے بڑے پروجکٹوں
کی گئی ۔ بڑی مصنوعات میں رنگین پکچر ٹیوب، رنگین ٹی وی کے اجزار، پی سی بی، ای پی لے
بکس، ٹیلی فون کا سازوسامان، ترسیلی سازوسامان، الیکٹرانکس سوئچنگ نظام،
صلاتی ٹی وی اور ریڈیو نشریات کا سازوسامان، مائیکرو پروسیسر پر مبنی نظام
، صد چھوٹے اور مین فریم سسٹم وغیرہ شامل ہیں ۔

اس شعبہ کی پیداواری بنیاد بہت وسیع ہے اس وقت الیکٹرانکس تیار کرنے والی
۔ 2500 یونٹس ہیں ۔ یہ مرکزی سرکار گیارہ یونٹوں، ریاستی حکومت کے تحت سرکاری
سیکٹر کی ۵۵ یونٹوں، منظم نجی سیکٹر کی ۔۔۴ یونٹوں اور دو ہزار سے زائد چھوٹے درجے کی
صنعتوں پر مشتمل ہیں ۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں غیر اندراج شدہ چھوٹی یونٹیں ہیں جو
لیکٹرانک اجزاء کو جوڑکر صارفین کے لئے الیکٹرانکس اشیاء اور کل پرزے تیار کر رہی ہیں
۸۹ ۔ ۱۹۸۸ء کے دوران مجموعی پیداوار میں سرکاری سیکٹر کی یونٹوں کا حصہ تقریباً ۳۰ فی صد
رہا جبکہ چھوٹی صنعتوں کے شعبے کا تقریباً ۳۸ فی صد اور ۳۲ فی صد منظم نجی شعبہ کا رہا ۔

آئندہ برسوں میں یہ صنعت اس بات کی کوشش کرے گی کہ برآمدات کے ذریعہ
غیر ملکی زرمبادلہ سے آمدنی بڑھائی جائے ۔ بھارت سے الیکٹرانکس کی برآمدات ۸۵ ۔ ۱۹۸۴ء
میں پندرہ ہزار لاکھ روپے سے بڑھ کر ۹۰ ۔ ۱۹۸۹ء میں ۵۰۰ و ۸۶ لاکھ روپے ہو گئیں ۔
بھارتی اور ملکی دونوں طرح کے سازوسامان برآمد کرنے والوں کی تعداد تقریباً ۵۰ ہے
پچاس سے زائد ممالک کو یہ برآمدات کی جاتی ہیں بڑے پیمانے پر زیادہ تر سامان روس
امریکہ، کینیڈا، خلیجی ممالک، آفریقی ممالک مغربی ممالک یوروپ اور مشرقی یوروپ کے ممالک
کو برآمد کیا جاتا ہے ۔

گزشتہ پانچ برسوں میں دو خاص باتیں سامنے آئیں ۔ پہلی یہ کہ برآمدات کے بڑھ

(۸۷ فیصد) نجی سیکٹر کا رہا۔ دوسرے یہ کہ چار اہم شعبوں یعنی اجزاء، صنعتی الیکٹرانکس کمپیوٹر، بھاری اور ہلکے سازوسامان کی برآمدات بہت حوصلہ افزا رہی۔

ایک دہائی سے بھی کم عرصہ میں بھارت میں کمپیوٹر کے ہلکے سازوسامان کی صنعت نے ایک مستحکم مقام حاصل کر لیا ہے۔ تقریباً تمام شعبوں میں فنی مہارت پیدا کی گئی۔ بھارت کے ہلکے سازوسامان کی صنعتوں نے ۳۳ ممالک میں عالمی تنظیموں کے پروجکٹ مکمل کیئے۔ ہلکے سازوسامان کو بہتر بنانے میں معیار بلند کرنے اور ان کی برآمدات کو فروغ دینے کے لئے پونا اور بنگلور میں ٹکنالوجی پارک قائم کیئے گئے ہیں۔ ایسے مزید دس پارک قائم کرنے پر غور کیا جارہا ہے۔

بمبئی میں سانتا کروز برآمدات پروسسنگ زون کے قیام کا مقصد الیکٹرانکس کی برآمدات کرنے والوں کو عالمی سطح کا مقابلہ جاتی ماحول فراہم کرنا ہے اس کے علاوہ کاندلہ کوچین، مدراس، نوائیڈا اور فالٹا میں برآمدات کمشنر وسیلنگ ایڈ اشیاء اور خام مال وغیرہ کی درآمد کے معاملے میں بعض رعایتوں کے مجاز ہیں۔

آٹھویں منصوبے میں ایک ایسا ماحول تیار کرنا مقصود ہے کہ نہ صرف ترقی کی اعلیٰ سطح پر برقرار رہ سکے بلکہ بین الاقوامی لاگتوں اور قیمتوں کے برابر پیداوار کی سطح حاصل کی جائے۔ ۱۹۹۵ء تک اس صنعت کی کل پیداوار ۳۰ لاکھ روپے کی سطح تک پہونچ جائے گی جو کہ پچھلے منصوبے کے مقابلے ۲۷ فی صد زیادہ ہوگی۔ مختلف مصنوعات کی تیاری اور پیداوار کی لاگت میں کفایت، معیار میں بہتری اور درآمداتی حصے میں کمی لانا برآمدات بڑھانا بھی مقصود ہے۔

آٹھویں منصوبے کے دوران برآمدات کے شعبہ کی اہم حکمت عملی یہ ہوگی کہ جو مصنوعات معیار اور لاگت کے اعتبار سے عالمی سطح کی ہوں گی ان کا انتخاب کیا جائے۔ الیکٹرانک اشیاء کے اجزاء کے شعبہ میں جہاں مقامی مانگ کم ہوگی وہاں ان کی برآمدات کی ہمت

کی جائے گی برآمدات کا کل نشانہ تقریباً ۶۳۰۰ لاکھ روپے کیا گیا ہے۔

آٹھویں منصوبے کے ترجیحی شعبوں میں چھوٹے پیمانے کی جگہ منافع بخش یونٹوں کی جگہ اقتصادی طور پر فروغ پر سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنا، اندرون ملک تیار کیے گئے کل پرزوں وا جزاء اور ساز و سامان کی لاگت میں کمی لانا، پرزوں اور اجزاء تیار کرنے والی مقامی صنعت کو قیمتوں اور معیار کے لحاظ سے عالمی سطح پر مقابلہ کے لائق بنانا، صنعتوں میں تحقیق و ترقی کے کام کو مستحکم کر کے مقامی طور پر ٹکنالوجی اور پیداوار میں معاون آلات کی تیاری کرنا، چھوٹے الیکٹرانکس کی صنعت کو ترقی دینا، عالمی سطح پر مقابلے کی اہل کمپیوٹر صنعت کو ترقی دینا، اشیاء کی اندرون ملک تیاری کو مخصوص اسکیمیں تیار کرنا، مقامی طور پر تیار کیے جا رہے پیشہ ورانہ آلات، ساز و سامان اور سسٹموں کی منڈی کو وسیع کرنا شامل ہے۔

آئندہ برسوں میں اس صنعت کو مارکیٹ میں آنے کے لئے تیار کرنے اور اس کو عالمی مقابلے کے لائق بنانے کے لئے زبردست کوششیں کی جائیں گی۔ صنعتوں میں تحقیق و ترقی کی سرگرمیوں کو مستحکم کیا جائے گا اور اسے زیادہ عمل رسا بنایا جائے گا۔

مائیکرو الیکٹرانکس ایک اہم شعبہ ہے اس میدان میں حکومت نے غیر ملکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لئے اپنی پالیسی کو نرم کیا ہے۔ امید ہے کہ کمپیوٹر کے ہلکے ساز و سامان کی برآمدات ۷۵۰۰ لاکھ روپے کی موجودہ سطح سے بڑھ کر ستمبر ۱۹۹۱ء میں ۷۲۰۰ لاکھ روپے ہو جائے گی۔

ایک اور بڑا پروگرام تیار کیا گیا ہے جس کے تحت کمپیوٹر کے پیشہ ور عملے کے لئے ۶۲۵ لاکھ نوکریاں پیدا کرنا ہے۔ حال ہی میں حکومت نے ۴۰ لاکھ نوکریوں کی جو اسکیم شروع کی ہے اس ۶۲۵ لاکھ نوکریاں الیکٹرانک شعبہ میں ہوں گی۔ الیکٹرانکس ایک ابھرتی ہوئی صنعت ہے یہ تو ایک ابتدا ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں ▲

مغربی جرمنی، ناروے، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا ۱۵۰،۰۰۰ المونیم دھات برآمد کی۔

کمپنی نے سن ۹۰-۱۹۸۹ء کے دوران المونیا اور المونیم کی برآمدات کے ذریعہ ۹۶۰.۲ کروڑ روپیے کا ریکارڈ بیرونی زرمبادلہ حاصل کیا۔ دیگر الفاظ میں زائد المونیم دھات کی سربراہی اور درآمدات میں کمپنی کے ذریعہ نیلکو نے زرمبادلہ کو بچایا اسی مدت کے دوران ادائیگیوں کے توازن کے سلسلہ میں کمپنی نے ۷۰۵ کروڑ روپیے کا تعاون کیا۔

المونیم کی طلب اور رسد کے تفاوت کی خلیج کو کم کرنے کے سلسلہ میں نیلکو نے ۱۹۸۹ء کے دوران ڈیٹیلڈ پراجکٹ رپورٹ (ڈی۔پی۔آر) کی تیاری کے سلسلہ میں حکومت کی رضامندی حاصل کرلی تاکہ کمپنی کی پیداواری گنجائش میں اضافہ کیا جاسکے چنانچہ باکسائٹ کان کی موجودہ گنجائش کو سالانہ ۴،۸ ملین ٹن تک وسعت دی جائے گی اور المونیم پلانٹ کی گنجائش سالانہ ایک ملین ٹن تک بڑھادی جائے گی۔ پاور پلانٹ کی گنجائش بھی ۶۰ میگاواٹ کردی جائے گی۔ اس کے علاوہ کمپنی ۳۶،۰۰۰ ٹی پی اے المونیم رولڈ پراڈکٹس کی تیاری کے سلسلہ میں ایک یونٹ قائم کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ اس ضمن میں عنقریب حکومت کو تفصیلی رپورٹ پیش کی جائے گی۔

اڑیسہ میں روسی ٹکنالوجی کے تعاون سے المونیم سلیکن کچ دھات پراجکٹ کے قیام کا منصوبہ بھی کمپنی کے زیرغور ہے۔ کمپنی کی خام پیداواری نمونوں کی جانچ روسی تجربہ خانوں میں مکمل ہوچکی ہے۔

نیلکو ۲۰ کروڑ روپیے کی مالیت سے کچ دھات کی صفائی کے لیے ایک یونٹ کررہا ہے جس سے ۳۰،۰۰۰ ٹن پی اے المونیم کچ دھات سے علیحدہ کی جاسکے گی۔ یہ یونٹ سن ۱۹۹۲ء کے اختتام تک کام کرنا شروع کردے گا۔ **

سید آل رسول

غیر منظم محنت کشوں کی تنظیم نو

ملک کے محنت کش طبقات کا نوے فیصد حصہ غیر منظم شعبہ پر مشتمل ہے جب کہ اس طرح
ں خواتین محنت کشوں کی مقدار اکیانوے فیصد ہے۔ ان دونوں طبقات کی از سر نو تنظیم پر زور
ینے کے لیئے منصوبہ بند طریقہ پر ایسے اقدامات کیئے جا رہے ہیں جس سے نہ صرف بیروزگاری
رغربت کا خاتمہ ہو سکے بلکہ ان اقدامات پر مشغول شدہ سرمایہ اور بنیادی سہولتوں کے بہتر طور
ر استعمال سے کلی طور پر ملک کی معیشت کو سدھارنے میں بھی مدد مل سکے۔

اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ غیر منظم سیکٹر کی روایتی انداز میں سدھار کی
کوششوں ہی سے بیروزگاری اور غربت کے مسائل کچھ اور زیادہ گمبھیر ہو گئے مگر ساتھ ہی
ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منظم شعبہ کو حاصل ہونے والے فوائد ایک وسیع تر غیر منظم
محنت کش طبقات کی پہنچ سے باہر رہے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ غیر منظم محنت کشی طبقات
کی اب تک کوئی جامع تعریف نہیں کی جا سکتی ہے۔ اور اس شعبہ پر اسی وجہ سے کوئی
متعین پالیسی بھی مرتب نہیں کی جا سکی جس کے نتیجے میں نہ صرف اس موضوع پر حقیقی اعداد
و شمار ہی جمع کیئے جا سکے ہیں اور نہ ہی مناسب انداز میں سرمایہ کاری کا تیقن ہو سکا ہے۔
س سیکٹر میں جو کچھ کام ہو رہا ہے ان میں زیادہ تر نوعیت کے عوامل خود روزگار اسکیمات
مشتمل ہیں۔ روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں غیر منظم شعبہ ایک بڑا حصہ ادا کر رہا ہے اس
یہ میں روزگار کے مواقع میں روز افزوں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ لیکن عصری معیشت

کے فروغ کے باعث ہو سکتا ہے کہ اس شعبہ میں مواقع کی کمی ہو جائے چنانچہ دیکھا جا رہا ہے کہ خود روزگار اسکیمات سے استفادہ کرنے والے اکثر افراد اپنی مصروفیات کو بڑھانے کے بجائے موقتی اور ہنگامی اجرت پانے والے محنت کشوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔

غیر منظم شعبہ سے منسلک خواہش کے بارے میں یہاں خاص طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فنی مہارت میں کمی، آبا و اجداد کے طریقہ کار سے عدم واقفیت اور ارزانی کی بنا پر وہ مجبوریوں اور مشکلات کے باوجود رہتے ہیں یہ خواہش دیگر ہنرمند مثالی محنت کش طبقات کی طرح معاشی سرگرمیوں جیسے زراعت، جنگل بانی، گھریلو صنعتوں، تجارت یا پھر بڑے پیمانے کی صنعتوں سے منسلک ہیں لیکن ان میں صرف یہ فرق ہے کہ ان کا کام غیر مستحکم اور غیر محفوظ ہے۔

روزگار، بیروزگاری اور ناکافی روزگار جیسی مختلف اصطلاحیں موقتی مزدوری سرگرمیوں اور اجرت وضع کی گئی ہیں بامعنی ملازمت کی منصوبہ بندی محنت کش کی کاشت، خصوصیات اور اس کی سرگرمیوں کی ساخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے ... بنیاد پر استوار کی جانی چاہیئے۔

آٹھویں پنچ سالہ منصوبہ میں منفعت بخش روزگار کے مواقع کو اہمیت دی گئی ہے اس منصوبہ کے بنیادی خدوخال میں اس عنصر کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ روزگار کے سلسلے میں سرمایہ کاری کے طریقوں، بڑی معیشت اور مقامی حکمت عملیوں پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ پیداواری شعبوں میں بڑے پیمانے سے چھوٹے اور غیر منظم شعبوں کو سے ایک دوسرا اور اہم غیر ملازمتوں کے امکانات کے سلسلے میں دعوے کیا جاتا ہے غیر منظم شعبہ روزگار کی فراہمی اور پیداوار کے اضافے کے سلسلے میں نمایاں حصہ لے لیکن اس بات کو یقینی بنایا جانا چاہیے کہ ایک شعبہ سے دوسرے شعبوں میں تبدیلی

اور کام کے تحفظ کی شرائط کے لحاظ سے روزگار کے معیار کو اچھا پیدا نہ ہو سکے گا۔

روزگار کی فراہمی کی حکمت عملی کا انحصار صرف تیز اجرت، ملازمتوں کے مواقع کی فراہمی ہی کے ضامن نہیں بلکہ عوام کی ایک بڑی تعداد کو خود روزگاری کی اساس پر مواقع فراہم ہونا چاہئے اس کے علاوہ ایسے افراد جو پہلے ہی سے خود روزگاری سے منسلک ہوں ان کی آمدنی کی ذرائع بھی کم نہ ہونے پائیں اور وہ بے روزگاروں کے زمرہ میں شامل ہونے پائیں۔ ہونا یہ چاہیئے کہ افراد کو روزگار کی فراہمی اور وسیع منصوبہ بندی اور متعلق سطحوں پر وسائل کی بہتر طریقے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ سماجی اور معاشی فروغ کے لیئے ملازمت کی فراہمی سے متعلق منصوبہ بندی کو غیر مربوط منصوبہ بندی کا بدل اختیار کیا جانا چاہیئے غیر منظم شعبہ میں سماجی تحفظ اور ملازمت کے مواقع کے حصول کی خاطر مختلف کارآمد خطوط پر سوچا جانا چاہیئے تاکہ محنت کشوں کے مختلف گروپس کا احاطہ ممکن ہو سکے ملازمتوں کی فراہمی محنت کش طبقات اور پیداکنندگان کے سماجی تحفظ کے لیئے ایک عوامی کارپوریشن اور بورڈ جیسے کھادی و ولیج انڈسٹری کارپوریشن اور ہینڈلوم بورڈ کو ذمہ دار ٹھہرانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ پیداکنندگان اور مختلف پیشہ والے مزدوروں کے امداد باہمی ادارے قائم کیئے جانے چاہیئے۔ ایسے اقدام سے نہ صرف ان کے گروپ کے لیئے کاروباری صلاحیت پیدا ہوگی اس کے علاوہ ان کے پیداواری اثاثے تربیتی مہارت قرض تجارتی حیثیت میں بہتری پیدا کرے گی۔

محنت کشوں کے غیر منظم شعبے کو منظم کرنا ایک جداگانہ طرز عمل ہے۔ اس طریقہ کار روزگار کی سطحوں کی نشاندہی اور مختلف شعبوں میں روزگار کی فراہمی کے سلسلے بہتر منصوبہ بندی اور روزگار کی ضمانت میں مدد ملے گی۔

اختر الایمان

نظم
مشینی آدمی

اٹھاؤ ہاتھ کہ دستِ دعا بلند کریں
ہماری عمر کا اک اور دن تمام ہوا
خدا کا شکر بجا لائیں کہ آج کے دن بھی
نہ کوئی واقعہ گزرا نہ ایسا کام ہوا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحان ہوتا
اسی طرح سے کٹا منہ اندھیرے اٹھ بیٹھے
پیالی چائے کی پی، روزنامہ دیکھا ناشتہ پر
ثبوت بیٹھے بصیرت کا اپنی دیتے رہے
بخیر خوبی پلٹ آئے جب شام ہوئی
اور اگلے روز کا موہوم خوف دل میں لیے
ڈرے ڈرے سے ذرا بال پڑ نہ جائے کہیں
لیے دیے یونہی بستر پہ جا کے لیٹ رہے ۔۔

ماہنامہ حیدرآباد

شاداب

جلد (۸) شمارہ (۶) جون ۱۹۹۱ء حیدرآباد

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	65 روپے	۲ سال	120 روپے	تاحیات	1500 روپے
خلیجی ممالک	"	200 "	"	360 "	"	3700 "
امریکہ	"	40 ڈالر	"	70 ڈالر	"	700 ڈالر
انگلستان	"	25 پونڈ	"	45 پونڈ	"	400 پونڈ
پاکستان	"	175 پاکستانی روپے	"	300 پاکستانی روپے	"	3000 پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز ۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

قرآن کا مقصد

(مولانا ابوالکلام آزاد)

قرآن کہتا ہے دنیا میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو سب کی تعلیم یہی ہے کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لئے ہے۔ الگ الگ کر دینے کے لئے نہیں ہے بس ایک پروردگار عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی حمیت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المؤمنون ۵۲)

اور دیکھو یہ تمہاری اُمت فی الحقیقت ایک ہی اُمت ہے اور میں سب کا پروردگار ہوں پس (میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ) اور نافرمانی سے بچو۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا نے تمہیں ایک جامۂ انسانیت دیا تھا لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لیے اور رشتۂ انسانیت وحدت کی سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ اری نسلیں بہت سی ہیں اس لئے کہ تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو ارے وطن بہت سے بن گئے ہیں اس لئے اختلافِ وطن کے بعد ایک دوسرے سے لڑ رہے ہے۔ تمہاری قومیں بے شمار ہیں) اس لئے ہر ایک قوم دوسری سے دست و گریباں ہو رہی ہے ارے رنگ یکساں نہیں اور یہ بھی باہمی نفرت و غبار کا بڑا ذریعہ بن گیا ہے تمہاری بولیاں

مختلف ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کی بہت بڑی حجت بن گئی ہے پھر ان کے علاوہ امیر فقیر، نوکر و آقا، وضیع و شریف، ضعیف و قوی، ادنیٰ و اعلیٰ بے شمار اختلافات پیدا کر لئے گئے ہیں اور سب کا منشا یہی ہے ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی صورت میں بتلاؤ وہ رشتہ کونسا رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا از سر نو آباد ہو جائے۔

وہ (قرآن) کہتا ہے کہ صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمہارے خدا الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو تم سب کی بندگی و نیاز کے لئے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے۔ تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں ہو اور کسی حلقہ کے انسان ہو لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر نیاز جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام عارضی اختلافات مٹا دے گا تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے اور تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا ہے اور تم سب ایک ہی رب العلمین کی عیال ہو۔

(ماخوذ)

شاداب میں اشاعت کے لئے تخلیقات روانہ کرتے وقت

خوش خط، اختصار کو ملحوظ رکھیئے ● تخلیقات کا طبیدہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ ● جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ کا آنا ضروری ہے ● نمونے کی کاپی کے لئے ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ روانہ کیجئے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی　　تیسری اور آخری قسط

عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ

حضرت ابوہریرہؓ نے اس حقیقت کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابوالاعرج حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سواء کوئی معبود نہیں۔ اگر حضرت ابوبکرؓ خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔ اس بات کو انھوں نے دوبارہ سہ بارہ دُہرایا۔

یہ "فتنۂ ارتداد" کے بعد جزیرۃ العرب اور اس سے متصل اسلامی ملک اور مقاماتِ مقدسہ کے لئے کوئی خطرہ کوئی منصوبہ اور سازش اور کوئی عملی اقدام، صلیبی حملہ اور فلسطین اور بیت المقدس پر مغربی ملکوں اور طاقتوں کی یورش اور اقدار سے بڑھ کر نظر نہیں آتا جو پانچویں صدی ہجری کے آخر چار سو نوے ۴۹۰ ہجری سے شروع ہو کر چھٹی صدی کے آخیر (۵۸۳، ۱۱۸۷م) میں ختم ہوا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس یورش اور اقدام کا جس میں پورا یورپ اور مسیحی دنیا شریک تھی۔ نشانہ صرف مسجد اقصیٰ پر قبضہ اور فلسطین پر اقتدار ہی نہیں تھا اس کا نشانہ جزیرۃ العرب اور حرمین شریفین بھی تھے اور اس جنگ کے قائدین کی زبان سے مدینۂ طیبہ اور مدفنِ رسول کے بارے میں ایسی نیتوں اور ارادوں کا اظہار ہوتا تھا جن کو کوئی مسلمان قلم نقل بھی نہیں کر سکتا پھر فلسطین اور شام اور آس پاس کے ملکوں کا وہ حال تھا کہ وہ اس متحدہ مغربی

اقدام اور صلیبی حملہ کا مقابلہ کرنے کی لیاقت نہیں رکھتے تھے۔ مشہور انگریز مورخ سٹینلے لین پول لکھتا ہے۔

"صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی دھجیاں اڑا دیں گے۔"

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مقابلہ کرنے اور نہ صرف شام و فلسطین بلکہ جزیرۃ العرب کو اس وحشیانہ حملہ کا مقابلہ کرنے اور ان ناپاک ارادوں کو ناکام بنانے کے لئے الملک العادل نورالدین زنگی سلطانِ شام کو کھڑا کیا اور انھوں نے تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس کی بازیافت کے لئے اپنے کو "مامور من اللہ" سمجھا اور اس خدمتِ عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانا۔ انھوں نے اپنے حملوں سے تمام عیسائی ریاستوں پر دھاک بٹھا دی اور مصر کو صلیبیوں کے اقتدار سے نکال کر عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا لیکن بیت المقدس کی بازیابی اور صلیبیوں کو مکمل شکست دینے کی سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی قسمت میں تھی۔ سلطان نورالدین نے ۵۶۹ھ ۱۱۷۴ء کو انتقال کیا اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اس عظیم اور مقدس مہم کا چارج لیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل ہے اور وہ اس کا مستحق ہے کہ ہر مسلمان اس کا شکر گذار ہو اور اس کے لئے دُعا کرے وہ گویا اسی کام کے لئے پیدا ہوا تھا، اس کو جہاد کا عشق تھا وہ اس کے لئے سب سے بڑی لذتِ عیش اور اس کے روح کی غذا تھی اس کی دینی حمیت اپنے عروج کو پہونچی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب حطین کی فیصلہ کن جنگ کے بعد جو ۵۸۳ھ تا ۱۱۸۷ء کو ہوئی تھی، مفتوح سلاطینِ یورپ اور قائدین اس کے سامنے لائے گئے اس نے ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور خاطر کی، لیکن جب ریجی نالڈ خیمہ داخل ہوا تو سلطان نے اس سے کہا کہ "سن میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو مرتبہ کھائی تھی

مرتبہ تو اس وقت جب کہ تو نے مکہ و مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ تُو نے دھوکے اور دغابازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا ۔" یہ کہہ کر صلاح الدینؒ نے تلوار نکالی اور کہا کہ : لو ! میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں اور اس کی گردن اُڑا دی ، اس پر موجود بادشاہ اور قائدین لرز گئے ۔ اس نے ان سے کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں ۔ لیکن اس نے حد سے تجاوز کیا تھا اب جو کچھ گذر گیا گذر گیا ۔

قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے متحمل نہیں تھے ۔

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اُبل پڑا جس میں یورپ کے تقریباً تمام جنگ آزماؤں اور مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے ۔ قیصر فریڈرک ، رچرڈ شیر دل ، شاہان انگلستان ، فرانس ، صقلیہ ، آسٹریا ، برگنڈی ، فلانڈرز کے ڈیوک اور نائٹ اپنی ٹین پوش فوجوں کے ساتھ اُمنڈ آئے ، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا اور اس کے اعزہ اور چند حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے ۔ آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز اور خون آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے صلح ہوئی بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوح شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے ، سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگین تھا صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی (اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا) اس کے ہاتھوں مکمل ہوا ۔ وہ اپنا مقدس فریضہ ادا کر کے نہ صرف شام و فلسطین اور جزیرۃ العرب بلکہ عالم اسلام کو صلیبیوں (CRUSADERS) کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے کے بعد ۲۷ صفر ۵۸۹ء کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا وہ ایک درویش سیرت سلطان عابد و زاہد

اور سرتاپا مجاہد تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے اتنا مال بھی نہیں چھوڑا تھا کہ اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جا سکے۔ کفن کا انتظام اس کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز یا حلال ذریعہ سے کیا۔ زکوٰۃ اس پر کبھی فرض نہیں ہوئی۔ اس لیئے کہ اس نے اتنا کبھی پس انداز ہی نہیں کیا جس پر زکوٰۃ فرض ہو۔

حقیقت میں جزیرۃ العرب اور مقاماتِ مقدسہ ہی نہیں کسی اسلامی ملک پر صلیبی صہیونی اور کسی عسکری، فکری، لادینی حملے کا مقابلہ کرنے مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ، مسجد اقصیٰ کو واپس لینے اور اسلامی اقتدار و اقدار کے عہدِ زریں کے بازگشت کے لئے ایسی ہی سیرت و کردار، ایسے ہی عزم و جرارت اور ایسی ہی ایمانی طاقت کی ضرورت ہے اور آج عالم عربی میں اسی کا فقدان ہے اور عالم اسلامی کو اسی کی ضرورت ہے۔

وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا

۳۔ جزیرۃ العرب اور مقاماتِ مقدسہ کے لئے تاریخ اسلام اور تاریخ عرب میں تیسرے خطرے کا موقع جب آیا جب شریف مکہ شریف حسین نے خلافتِ عثمانیہ اور سلطنتِ ترکی سے بغاوت کی اور وہ اتحادیوں کے ساتھ مل گئے اور اس کا اندیشہ ہوا کہ اتحادیوں کا جزیرۃ العرب اور مقاماتِ مقدسہ پر کہیں تسلط اور نفوذ قائم نہ ہو جائے اور وہ اعتقادی اور فکری طور پر اس پر اثرانداز نہ ہوں لیکن اس اقدام کے خلاف عالمِ اسلام میں بالعموم اور برصغیر ہندوستان میں بالخصوص تحریکِ خلافت کے نام سے جو زبردست تحریک پیدا ہوئی اس نے ایک طرف اتحادیوں کو قدرے محتاط بنا دیا۔ دوسری طرف اس نے ملتِ اسلامیہ میں بالخصوص مسلمانانِ ہند میں مغربی اقتدار ہی نہیں مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ زندگی کے خلاف ایسا شدید ردِّ عمل پیدا کیا جس کی مثال دُور دُور اور دیر دیر تک نہیں ملتی، اس کو (جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے ہے) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسین صاحب قیام الدین، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ صاحب، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی شکل ایسے

قائد و زعیم، خطیب اور اہلِ قلم اور مجاہد و سپاہی مل گئے جنھوں نے مسلمانوں کی نئی نسل میں زندگی، بلند خیالی اور مغربی استعمار و تہذیب کے خلاف نفرت و بغاوت کی ایک روح پھونک دی۔ ادھر اتحادی بھی، دو دو عظیم جنگوں اور اندرونی مسائل میں ایسے منہمک ہوئے کہ ان کو کسی فوجی اقدام یا سیاسی و انتظامی تسلط کی فرصت نہیں ملی اور اس کو مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے ان پر صرف مغرب کے ذہنی اور تعلیمی تہذیبی اثرات ڈالنے اور ان ملکوں سے مالی و سیاسی استحصال پر قناعت کی۔

لیکن جو سب سے بڑا نامبارک واقعہ اور مغربی طاقتوں خاص طور پر برطانیہ کی طرف سے منحوس اقدام ہوا، وہ اسرائیل کا قیام اور فلسطین کے بیشتر حصہ پر یہودی حکومت اور مسجد اقصیٰ پر ان کی تولیت اور قبضہ کا افسوسناک واقعہ ہے جو نہ صرف عالم عربی بلکہ پورے عالم اسلام کے لئے ایک شرمناک واقعہ اور مستقبل کے لئے خطروں اور اندیشوں کا سرچشمہ ہے اس کی بڑی ذمہ داری عرب لیگ اور اس وقت کی آس پاس کی عرب حکومتوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے اس خطرہ اور مغربی طاقتوں کے عزائم اور اسرائیل اور یہودیت عالمیہ اور صیہونیت کے ارادوں، مقاصد اور پروگراموں کا مطالعہ نہیں کیا، وہ اس منحوس واقعہ کی سنگینی اور اس کے آئندہ خطرات کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

لیکن اس صورتحال کا مقابلہ کرنے اور اسرائیل کے وجود اور خطرہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پھر یک مردِ مومن ایک شیر دل مجاہد اور ایک مخلص قائد کی ضرورت ہے جو البطل الناصر لدین اللہ "سلطان صلاح الدین ایوبی" کا کردار ادا کرے اور ان کے نقش قدم پر چلے۔ یہ سیاسی بازی گروں اور قومیت عربیہ کے علمبرداروں کا کام نہیں ایک عرب مورخ و فاضل اور شاعر خیر الدین زرکلی نے امتِ اسلامیہ اور فلسطین کو خطاب کرکے کئی برس جو پہلے کہا تھا وہ آج بھی صادق ہے

ثانیۃ فینا	سہ ھو لحی صلاح الدین
أو شبہ حطینا	ویبدو ذی حطین

(اے اُمتِ مسلمہ ! اور اے فلسطین ! دوبارہ صلاح الدین کو میدان میں لا، اور حطین کی جنگ کو تازہ کر، یا اس سے ملتے جلتے کسی دوسرے فیصلہ کن معرکہ کو)

۴۔ اب اس وقت کی صورتِ حال یہ ہے کہ اندازہ ہوتا ہے کہ صلیبی عیسائیوں اور صہیونی یہودیوں نے گذشتہ تجربات کی روشنی میں اپنا طریقۂ جنگ (STRATEGY) بدل دیا ہے، انھوں نے جزیرۃ العرب اور پڑوسی عرب ملکوں پر براہِ راست اقدام کرنے اور فوجی و عسکری طاقت سے اس کو فتح کرنے کے بجائے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ وہ قومیتِ عربیہ کے علم برداروں، بالخصوص "البعث العربی" سے وابستگی اور شیفتگی رکھنے والے قائدین سے یہ کام لیں اور ان کے لئے ہیرو بننے اور عربوں، مسلمانوں اور بالخصوص فلسطینیوں کی امید گاہ مستقبل اور مرکزِ محبت و توجہ بننے کا سامان پیدا کریں، جس سے وہ اسلام کے اس مرکز میں داخل اور مؤثر بن کر عملاً کے ذہنی اور تہذیبی ارتداد، جاہلیتِ اولیٰ کی طرف بازگشت اور دین پر عقیدہ و عمل میں ضعف و تزلزل پیدا کر سکیں اور ہو سکے تو پھر ان کو ماقبل اور جاہلیتِ عربیہ کی طرف واپس لا سکیں، جس کا یہ مغربی اور مسیحی و یہودی قائدین و مفکرین صدیوں سے خواب دیکھ رہے ہیں یہ منصوبہ بڑا نازک و مخفی اور عمیق ہے اس کو سمجھنے کے لئے عالمِ اسلام اور عالمِ عربی کو ذہانت اور دُور بینی کی بھی ضرورت ہے اور دینی و ایمانی فراست کی بھی اور تاریخ کے عمیق و وسیع مطالعہ کی بھی، اللہ تعالیٰ اس نازک موقع پر ہمارے دینی و سیاسی قائدین فکری رہنماؤں، ابلاغِ عامہ کے ذرائع و صحافت پر اثر رکھنے والے اہلِ قلم اور خاص طور پر پُرجوش نوجوانوں کو اس کی ہمت اور توفیق دے کہ وہ مسیحی مغرب کے مخالف اسلام دانشوروں، اسرائیلی مفکرین کی سازش کو سمجھ لیں اور اس کا شکار نہ ہونے دیں اور اس آیت کو اپنا رہنما بنائیں :

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۔ ▲

بشیر

سید احمد عروج قادری　　قسط نمبر ۱

اسلامی تصوف / اخلاص

ریار و سُمعة :- مخلصانہ ایمان کے بعد ہی اعمال صالحہ کا سوال پیدا ہوتا ہے اور اعمال خیر کو ریار و سمعة سے بچائے بغیر اخلاص کا وجود ممکن نہیں ہے۔ اخلاص کو خراب کرنے والی چیزوں میں سب سے تباہ کن چیز ریار و سُمعة ہے۔ ریار کی حقیقت اور مفہوم یہ ہے کہ آدمی کام تو نیکی کا کرے لیکن مقصد یہ ہو کہ لوگ اسے دیکھیں، کام کی تعریف اور اس شخص کا احترام کریں اور سُمعة کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی نیکی کے کام اس ارادے سے کرے کہ لوگوں کے درمیان اسے نیک نامی، شہرت اور جاہ و منزلت حاصل ہوگی۔ ریار کبھی تو حقیقی نفاق سے پیدا ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی ان آیتوں میں ہے :

> پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔　　(الماعون ۴ تا ۷)

ان آیتوں میں عہد رسالت کے منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ نماز میں غفلت کرتے ہیں بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ نماز سے غفلت برتتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے نزدیک نماز کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ پڑھیں یا نہ پڑھیں ان کے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ وہ پڑھتے بھی ہیں تو دکھاوے کے لیے تاکہ لوگ ان کو مسلمان سمجھیں اور ان کا نفاق لوگوں سے مخفی رہے اور اسی بے ایمانی کی وجہ سے وہ اتنے بخیل ہیں کہ لوگوں کو ڈول، رسی، نمک، آگ جیسی معمولی چیزیں دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

" جو ریاکاری کرتے ہیں ۔ اس کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ وہ نمازیں محض دکھاوے کی پڑھتے ہیں اور دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ان کے تمام نیکی کے کام محض دکھاوے کے ہیں خواہ وہ نماز ہو یا کوئی دوسرا نیک کام ۔ منافقین کا یہ حال سورہ النساء آیت ۱۴۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے ۔

" یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں ۔"

اخلاص کے باب میں جس ریا و سمعہ کی گفتگو ہوتی ہے وہ یہ ریا و سمعہ نہیں ہے کیونکہ اس کا تو ایمان سے بھی کوئی تعلق نہیں ۔ اس باب میں جس ریا و سمعہ سے گفتگو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عبادت و اطاعت تو اللہ ہی کے لئے کی جائے لیکن اپنے قصد و ارادہ میں ریا و سمعہ کو بھی داخل کر دیا جائے ۔ مقصود صرف رضائے الٰہی اور آخرت کی کامیابی نہ ہو بلکہ یہ بھی ہو کہ لوگ دنیا میں تعریف کریں اور نیک نامی و شہرت اور جاہ و منزلت حاصل ہو یہی وہ ریا ہے جو اخلاص کے لئے تباہ کن ہے ۔ اس سے عبادت و اطاعت باعث ثواب ہونے کے بجائے موجب عذاب ہو جاتی ہے اسی ریاء و سمعہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے

" جندبؓ بن عبد اللہ البجلی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص (نیکی میں) شہرت چاہے گا اللہ اس کو رسوا کن تشہیر سے دوچار کرے گا اور جو دکھاوے کے لیئے نیکی کرے گا ، اللہ اس کی نیت لوگوں کے سامنے کھول دے گا ۔ (متفق علیہ)

امام بخاریؒ نے یہ حدیث کتاب الرقاق باب الریاء والسمعۃ میں اور امام مسلمؒ نے کتاب الزھد باب تحریم الریاء میں روایت کی ہے دوسرے محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں یہ حدیث لکھی ہے اس حدیث میں ریاء و سمعہ کی جو سزا بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ریاء کار کی نیت اور ارادے کا پردہ فاش کر دیا جائے گا اور وہ لوگوں کے درمیان بہت ذلیل ہوگا

دنیا میں اگر اس کے قصد وارادہ کا پردہ چاک نہ بھی ہو تو قیامت کے بھرے میدان میں ضرور فاش ہو گا۔ لوگ جان لیں گے اور دیکھ لیں گے اور دیکھ لیں گے کہ نیک اعمال کے لبادے میں ایک دنیاداراور ریاکار آدمی چھپا ہوا تھا۔ غیرت مند آدمی کے لئے بھرے مجمع میں رسوائی و ذلت بہت بڑی سزا ہے۔ ریاء کی قباحت بہت سی حدیثوں میں بیان کی گئی ہے میں یہاں چند اور حدیثوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"اللہ فرماتا ہے کہ جس نے میرے لیے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ دوسرے کو بھی شریک کیا تو میں اس کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑ دوں گا اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں اور وہ عمل اسی کے لیے ہے جس کے لیئے وہ کیا گیا ہے۔" (مشکوٰۃ کتاب الرقاق بحوالہ مسلم)

دوسرے کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ عمل کرنے والے کی غرض یہ بھی ہو کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس کی مدح وثناء کریں۔

۲۔ شدادؓ بن اوس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

جس نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔" (ایضاً بحوالہ مسند احمد)

۳۔ ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ہم لوگ دجال کا تذکرہ کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں وہ بات نہ بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیئے دجال سے زیادہ خوفناک ہے؟ ہم نے کہا ہاں یارسول اللہؐ! آپؐ نے فرمایا۔

وہ شرک خفی ہے کہ کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہو اور محض اس بناء پر کہ

کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے اپنی نماز میں اضافہ کر دے۔

(ایضاً بحوالہ ابن ماجہ)

نماز میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو رکعت نفل پڑھنی چاہتا تھا تو چار رکعتیں یا اس سے زیادہ پڑھے۔ شرک خفی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک مخفی، چھپا ہوا شرک ہے اس سے مومن مخلص کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔ بعض لوگ شرکِ خفی کو شرکِ خفیف یعنی ہلکا شرک سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے شرکِ جلی، کھلے ہوئے شرک سے بچنا آسان ہے لیکن "شرکِ خفی" چھپے ہوئے شرک سے بچنا مشکل ہے

۴۔ عمرؓ بن الخطاب، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"اس امت کے بارے میں مجھے ہر ایسے منافق سے اندیشہ ہے جس کی باتیں حکیمانہ اور عمل ظالمانہ ہو گا۔"

(ایضاً بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان)

۵۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کی پناہ مانگو جُبّ حزن سے۔" صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ جُبّ حزن کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

"جہنم کی ایک وادی ہے جس سے خود جہنم روزانہ ایک سو بار پناہ مانگتی ہے

دریافت کیا گیا یا رسول اللہؐ کون لوگ اس میں داخل ہوں گے؟

آپؐ نے فرمایا وہ علماء جن کے اعمال دکھاوے کے ہوں گے۔

(ترمذی ابواب الزہد باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ)

حقیقتِ اخلاص کی توضیح قرآن مجید میں:-

سورہ البقرہ کے آخری حصے میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم اور اس کی ترغیب دے کر یہ اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اور جو صدقہ دیا جاتا ہے اس میں اخلاص کو ختم کرنے والی چیزیں کیا ہیں۔ اخلاص کی حقیقت

جاننے کے لئے سورہ البقرہ رکوع ۳۶ اور ۳۷ کا مطالعہ کرنا چاہیئے ان دو رکوعوں میں مسلسل جو ہدایات دی گئی ہیں اور تمثیلات کے ذریعہ جو کچھ سمجھایا گیا ہے ان سے حقیقت اخلاص روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ہم یہاں ان تمام آیات کی تشریح نہیں کریں گے بلکہ صرف ان آیتوں کو پیش کریں گے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاص کو ختم کرنے والی چیزیں کیا ہیں۔

اخلاص کو ختم کرنے والی چیزوں میں دو کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے مَنّ اور اَذیٰ مَنّ کسی کو کچھ دے کر یا اس کے ساتھ کوئی حسنِ سلوک کر کے اس پر احسان جتانا اور اَذیٰ اس شخص کو تکلیف پہنچانے اور اس کی دل آزاری کرنے کو کہتے ہیں چونکہ عام طور پر یہ دونوں چیزیں یکے بعد دیگرے یا بیک وقت ظہور میں آتی ہیں اس لیئے قرآن میں ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے اس سلسلے کی آیات کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا اجر انھیں لوگوں کے لیے ہے جن کا صدقہ احسان جتانے اور دل آزاری کرنے کی آفت سے پاک ہو۔ فرمایا گیا۔

"جو لوگ اپنے مال، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ تکلیف پہنچاتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔"

(البقرہ : ۲۶۲)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کو صدقے دینے کا اجر اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس شخص پر نہ احسان جتایا جائے اور نہ اس کی دل آزاری کی جائے لیکن اس پر اکتفاء نہیں کیا گیا : آگے فرمایا گیا :

ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی درگزر، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ایذا رسانی ہو، اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے

(ایضاً ۲۶۳)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی سائل کو ایک میٹھے بول مثلاً یہ کہہ کر کہ اس وقت معاف کرد، واپس کر دینا اور اس کی کسی غصہ دلانے والی بات سے چشم پوشی کر لینا اس صدقہ خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد اس پر احسان داری اور اس کی دل آزاری ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دو آفتوں کے ساتھ خیرات بیکار ہے یہ آیت اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں پہ ختم ہوئی ہے۔ اللہ بے نیاز اور بُردبار ہے یہاں ان دو صفتوں کا ذکر یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اللہ تمہارے صدقہ وخیرات کا محتاج نہیں ہے کہ وہ تمہارے غیر مخلصانہ صدقے کو قبول کر لے وہ بے نیاز ہے اور تم پر اپنی ہر چیز میں اس کے نیاز مند اور حاجت مند ہو۔ نیز یہ کہ وہ علیم اور بُردبار ہے جو تمہاری بے شمار خطاؤں کو معاف کرتا رہتا ہے، وہ ایسے کم ظرف لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اس کے دیئے ہوئے مال پر اس کے کسی بندے کو کچھ دیں اور پھر اس پر احسان جتائیں۔ اپنی باتوں سے اسے تکلیف پہنچائیں اور کسی سائل کی ذرا سی تکلیف دہ بات کو بھی برداشت نہ کر سکیں۔ اس آیت میں بہت کچھ کہہ کر بھی اس پر اکتفا نہیں کیا گیا اور آگے صاف صاف یہ فرمایا گیا۔

"اے ایمان لانے والو۔ اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پہ ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پہ۔" (ایضاً ۲۶۴)

یہاں باطل کر دینے کے معنیٰ اکارت کرنے اور خاک میں ملا دینے کے ہیں اس آیت میں اخلاص کو ختم کر دینے والی ان دونوں چیزوں کو ریاء کے مماثل قرار دیا گیا ہے جس طرح ریاء سے اخلاص تباہ ہو جاتا ہے اسی طرح صدقہ دے کر احسان جتانے اور دل آزاری کرنے سے بھی اخلاص کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ریاء سے اور من واذیٰ سے صدقات کس طرح برباد ہو جاتے ہیں اس کو دو بہترین تمثیلوں سے واضح کیا گیا ہے۔

پہلی تمثیل ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہو اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے، ان کی کمائی میں سے

کچھ بھی ان کے پلّے نہیں پڑے گا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۔

(ایضاً ۲۶۴)

یہ احسان جتانے والے دکھ دینے والے اور ریاکاری کرنے والے شخص کی تمثیل ہے مولانا احسن اصلاحی لکھتے ہیں :

"ایسے شخص کی تمثیل اس کسان سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایک ایسی زمین پر بوئی جس کے نیچے سخت اور چکنی چٹان تھی، بارش کا جو ایک زور کا دونگڑا پڑا تو اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہہ گئی اور نیچے سے گنجے سر کے مانند چٹان نکل آئی۔ فرمایا کہ جس طرح اس محروم القسمت کسان کی ساری محنت رائیگاں چلی جاتی ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کی خیرات برباد ہو کر رہ جاتی ہے جو خیرات کرنے کے بعد احسان جتاتا اور دل آزاری کرتا ہے فرمایا کہ ایسے لوگ اپنی ساری خیر خیرات ضائع کر بیٹھتے ہیں اس کا کوئی حصہ بھی وہ بچا نہیں پاتے۔" (تدبر قرآن ج ا ص ۵۲۷)

صدقہ دینے کے بعد احسان جتانا اور دل آزاری کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہ دینے کا مقصد صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا نہ تھا بلکہ یہ تھا یا یہ بھی تھا کہ جس کو صدقہ دیا جا رہا ہے وہ صدقہ دینے والے کا احسان مند ہو، اُسے جُھک کر سلام کرے اور موقع پر صدقہ دینے والے کی خدمت سے بھی دریغ نہ کرے، لیکن جب اس کا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو لوگوں کے سامنے اس پر اپنے صدقے کا احسان جتا کر اور اسے ناشکرا کہہ کر اس کو تکلیف پہنچاتا۔ اس کی دل آزاری کرتا اور اس طرح اس پر اپنی مالداری اور برتری کی دھونس جماتا ہے۔

دوسری تمثیل :- کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور

باغ پر سموم کا ایک بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے ۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو ۔ (ایضاً ۲۶۶)

کتنی واضح، کتنی موثر اور کتنی دل آویز ہے یہ تمثیل، اگر اب بھی کوئی مسلمان اپنے نیک اعمال میں اخلاص پیدا نہیں کرتا تو اسے آخرت میں دیوالیہ ہونے سے کون روک سکتا ہے اوپر جو تمثیل پیش کی گئی تھی یہ اس کی مزید وضاحت ہے احادیث نبویؐ میں بھی احسان جتانے والوں کے لئے سخت وعید آئی ہوئی ہے ۔

"عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ جنت میں احسان جتانے والا اور ماں باپ کا نافرمان داخل نہیں ہوگا ۔

(مظہری بحوالہ نسائی و دارمی)

(باقی آئندہ)

نعیم چشتی
مدیر ماہنامہ "القمر" جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

صوفیانہ شاعری میں عشق کا تصور

دبستاں کے زیرِ اہتمام ۱۳ رمئی ۱۹۹۱ء کو اکیڈمک اسٹاف کالج جامعہ اسلامیہ میں ایک علمی اور ادبی جلسہ ہوا جس کی صدارت کے فرائض پروفیسر محمد عاقل (رکن مجلس عاملہ جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر سجاد سید نے انجام دیئے۔ اِس جلسے میں جن ادیبوں اور دانشوروں نے اظہارِ خیال کیا اُن میں پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر اقبال حسین خاں، پروفیسر شعیب اعظمی، ڈاکٹر اجمال اجملی، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی، ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم، ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی، ڈاکٹر بدرالدین الحافظ، ڈاکٹر قمر غفار ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر انور پاشا اور ڈاکٹر اختر حسین کاظمی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے ڈاکٹر احمد حسن کی کتاب "صوفیانہ شاعری میں عشق کا تصور" پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ یہ موضوع اگرچہ بہت پرانا ہے مگر اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر آج بھی قابلِ توجہ ہے یہ کتاب صوفیانہ شاعری کے حوالے سے عشق کے مختلف نظریات کا احاطہ کرتی ہے اس میں جاپانی، یونانی، چینی فلسفے کے ساتھ ہندوستانی فلسفوں ویدانت، اپنشد اور دیگر صحائف مثلاً قرآنی تصورات کو سامنے رکھ کر عشق کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی گئی ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی (قائم مقام) ڈین فیکلٹی آف ہیومنی ٹیز اینڈ لنگویجز) نے فرائض

کے نظریۂ تحلیلِ نفسی اور تصوّف کے نظریۂ وجود و شہود نیز ویدانت کے نقطۂ نظر سے "عشق" کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ وحدت الوجود میں انسان اور خدا کا رشتہ عینیت کا ہے، غیریت کا نہیں۔ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک خشیتِ الٰہی کا اور دوسرا حبِّ الٰہی کا۔ صوفیا نے عشق اور محبت کے راستے کو اپنایا مگر خشیت کی نفی نہیں کی۔ انھوں نے کہا کہ عشق خدا اور بندے کے رشتے کو مضبوط کرتا ہے آتما اور پرماتما کے تعلق کو شاداب اور پُرنور بناتا ہے انھوں نے انسانی زندگی میں عشق کی کارفرمائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ صوفیائے کرام وجودی ہوں یا شہودی دونوں کے نزدیک انسان کائنات میں مقدم، مقدس اور افضل و اعلیٰ ہے پروفیسر عنوان چشتی نے عشق کے متصوفانہ تصوّر کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ صوفی شعراء اَللہُ جَمِیلٌ و یُحِبُّ الجَمَالْ کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ عشق ایک پاکیزہ جذبہ ہے جس کا بوالہوسی سے کوئی تعلق نہیں ہے انھوں نے زیر بحث کتاب کے حوالے سے کہا کہ اِس میں نفسیات، جنسیات، انسانیت، مذہبیات اور متعدد فلسفوں کی روشنی میں عشق کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اِس لحاظ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک خیال انگیز کتاب ہے۔

پروفیسر اقبال حسین خاں ڈین فیکلٹی آف انجینئرنگ نے کہا کہ "عشق" کی کئی منزلیں ہوتی ہیں جن کو اُنس، محبت اور جنون کہا جاسکتا ہے۔ جنون کی منزل ہی عشق کی اعلیٰ منزل ہوتی ہے اس لیئے جذبۂ محبت اگر انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو عشق کہلاتا ہے۔ پروفیسر شعیب اعظمی (صدر شعبۂ فارسی) نے کہا کہ صوفیانہ شاعری میں عشق کا پاکیزہ تصور ملتا ہے جس میں بوالہوسی نہیں ہے متصوفانہ عشق کے ذریعہ خدا اور بندے کے رشتے کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے فارسی شعراء کے کلام سے صوفیانہ شاعری کی مثالیں پیش کرتے ہوئے عشق کے متصوفانہ تصورات کی تشریح کی انھوں نے مزید کہا کہ فارسی شاعری تصوف کے رنگ کی ابتدا ابوسعید ابوالخیر سے ہوئی ہے اُس نے اپنی رباعیوں میں عشق کے وہ تصوّرات پیش کیئے، جن سے خدا اور بندے کا رشتہ مضبوط

ہوتا ہے ڈاکٹر اجمل اجملی نے کہا کہ فارسی اور اردو شاعری میں عشق کے تصور کا فکری پس منظر اگر کوئی ادب فراہم کرتا ہے تو وہ تصوف ہے انھوں نے کہا کہ میں نے خانقاہی ماحول میں آنکھ کھولی۔ مگر میرا شعور ترقی پسند (مارکسی نظریات) کی روشنی میں پروان چڑھا۔ میں نے خانقاہ سے مارکسیت تک کا سفر عشق کی سچی مقصدیت کے سہارے طے کیا ہے "عشق" اگر صحت مند اور بامقصد ہو تو زندگی کی عظمت کا امین بن جاتا ہے ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی (صدر شعبۂ عربی) نے عشق کو ایک روحانی عمل قرار دیتے ہوئے کہا کہ صوفیانہ شاعری میں عشق کا تصور مادی عشق کے تصور سے بالکل الگ ہے صوفیانہ عشق کو تصوراتی عشق کہا جا سکتا ہے جس پر عمل کر خالق اور مخلوق کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے اس راہ پر گامزن ہو کر بندے اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔ بلکہ اس سے قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے عشق کو آگ کا دریا قرار دیا اور کہا کہ انسان کو عشقِ الٰہی کے راستے میں اس دریا کو عبور کرنا پڑتا ہے ڈاکٹر بدر الدین الحافظ (شعبۂ عربی) نے کہا کہ عشق کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے شعراء کے علامتی اظہارِ خیال کو سمجھنا ہوگا۔ اور صوفیائے کرام کے الفاظ اور ما فی الضمیر کو سمجھنے کے لیے ان کے اقوال کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے عشق کے تصورات کو سمجھنے کے لئے ان کے ملفوظات کی تہہ میں اترنا پڑے گا۔ ان حضرات نے عام طور پر مجاز کے پردے میں بیانِ حقیقت کیا ہے اس لیے اس اندازِ فکر اور طرزِ اظہار کو پوری طرح جاننا ہوگا۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (لکچرر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ عشق کا موضوع ایک ایسا اہم اور وسیع موضوع ہے جس پر بحث کبھی ختم نہیں ہوگی۔ "عشق" کے تصورات نے صوفیانہ شاعری میں نئے گل کھلائے ہیں۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی (لکچرر شعبۂ اردو جامعہ) نے کہا کہ صوفیانہ شاعری میں جذبۂ عشق کی کارفرمائی ہے متصوفانہ شاعری میں حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ اردو شعراء میں ولی۔ درد۔ میر تقی میر۔ غالب۔ امیر مینائی شاہ نیاز بریلوی۔ آسی غازی پوری۔ اصغر۔ فانی اور بیکس اکبرآبادی کی شاعری میں صوفیانہ عشق کا گہرا اثر ملتا ہے ڈاکٹر سید اختر حسن کاظمی (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی) نے مولانا رومؒ کے

تصورِ عشق سے بحث کی اور کہا کہ عشق کی ایک مخصوص کشش ہوتی ہے جو انسان کو ہر طرح کے دنیاوی تعلق سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انسان عشق کے ذریعے کمال اور عرفان کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ عشق سنگِ خارہ کو موم بنا دیتا ہے۔ انسان کو محدود دنیا سے نکال کر لامحدود وسعتوں میں لے جاتا ہے۔ انھوں نے مولانا رومؒ کی شاعری کے حوالے سے اپنے نظریئے کی وضاحت کی۔ نعیم چشتی (شعبۂ اردو، جامعہ) نے قرآنی آیات کے حوالے سے اپنے بیان میں کہا کہ کائنات کی تخلیق کا راز عشق و محبت ہے قرآن حمید میں آیا ہے کہ اِنّیِ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ ۝ زمین پر اللہ نے انسان کو نائب بنایا اور اشرف المخلوق کا تاجِ زریں پہنا دیا۔ اس ودیعت و فضیلت کے پس پردہ جذبۂ محبت کارفرما ہے۔

پروفیسر محمد عاقل نے مارکسی نقطۂ نظر سے تصوراتِ عشق کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مذاہب، فنونِ لطیفہ اور فلسفے سب زندگی سے فرار سکھاتے ہیں۔ انسان کو سائنسی تحقیقات، عقلیت اور استدلال کا سہارا لے کر زندگی کے نئے چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

⁂ ⁂ ⁂

(بقیہ سلسلہ ص ۳۹ سے آگے)

بچوں کے ادب کی حد تک مصنف کی یہ پہلی کوشش ہے اس سے پہلے "آنچل کے ستارے" نسوانی موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جسے قبولِ عام حاصل ہے۔ یقین ہے کہ بچوں کے لئے لکھے گئے یہ مضامین بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور انھیں بھی قبولِ عام حاصل ہوگا۔ کتاب کی قیمت (۸) کچھ زیادہ نہیں ہے اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ چھپی یہ کتاب اس قابل ہے کہ بچے اسے زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔

عطا عابدی

سید شہاب الدین سے انٹرویو

س: اب جب کہ سیاسی سرگرمیاں شباب پر ہیں اور تمام سیاسی پارٹیاں الکشن میں کامیابی کے لئے زبردست مہم چلا رہی ہیں آپ کے خیال میں کوئی ایسی پارٹی ہے جو مرکز میں اپنی حکومت بنا سکے گی ؟

ج : عام طور پر یہ خیال ہے کہ مرکز میں کسی کی غالب اکثریت نہیں آ سکے گی . لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ شاید جنتا دل اور نیشنل فرنٹ اگر یل کر چلیں (جیسا کہ ان کا ارادہ ہے) جس طرح انھوں نے اپنے مینی فیسٹو میں اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے مفادات کی حفاظت کرنے کا وعدہ کیا ہے اگر وہ اپنے امیدواروں کی فہرست میں بھی ان مظلوم اور محروم طبقوں کو مناسب نمائندگی دیں تو مجھے لگتا ہے کہ ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے کہ غالب اکثریت تو نہیں لیکن قطعی اکثریت انھیں حاصل ہو جائے گی۔

س: مناسب نمائندگی سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟

ج: مناسب نمائندگی سے میرا مطلب یہ ہے کہ صرف عددی تناسب سے کام نہیں چلے گا بلکہ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ جن حضرات کو کسی سماجی گروہ کی نمائندگی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے ان کا وزن کتنا ہے۔ ان پر ان کے طبقے کا اعتماد کتنا ہے ان کا اپنا سیاسی کردار کیا رہا ہے ان سے اس گروہ کے عوام نے کیسی امیدیں وابستہ کی ہیں یعنی صرف تعداد یا تناسب (QUANTITY) معیار نہ ہو بلکہ (QUALITY) کمیت و کیفیت بھی ہو اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ انھیں ایسے حلقوں سے کھڑا کیا

جا رہا ہے جہاں سے ان کے جیتنے کے امکانات بھی ہیں ورنہ یہ تماشا تو ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ ایرے غیرے نتھو خیرے کو ٹکٹ دے کر کوٹہ برابر کر دو اور ان کو ایسی جگہ سے کھڑا کر دو جہاں سے ان کے جیتنے کے امکانات ہی نہ ہوں۔ خالی سیٹ ہے دینے سے کیا پریشانی ہے لیکن اب عوام زیادہ باشعور ہو گئی ہے اور اس طرح کے حربے ان کی سمجھ میں آ گئے ہیں اگر یہ دو شرطیں پوری ہوں یعنی ایک یہ کہ مبنی فیصلہ سیکولر ہو۔ اس میں محروم طبقات کے مطالبات کی پوری نمائندگی ہو اور دوسری طرف ان کا قرار واقعی متناسب حصہ بھی ملے اور ایسے امیدوار بنائے جائیں جن کو اپنے طبقے کا اعتماد حاصل ہو اور ایسی جگہوں سے کھڑے کیے جائیں جہاں سے ان کے جیتنے کے امکانات ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ایک ایسی مکمل صورت بنے گی جس میں کہ اس سیاسی الائنس کو ہندوستان کے عوام کے بڑے حصے کا اعتماد حاصل ہوگا بلکہ پارلیمنٹ میں اکثریت بھی حاصل ہو گی۔

س: ایک مسلم قائد ہونے کی حیثیت سے آپ اس وقت مسلم ووٹرس کو کیا مشورہ دیں گے کہ وہ کس پارٹی کی حمایت کریں اور کیوں؟

ج: میں مسلم قائد ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن بہرحال میں نے ہندوستان کی تمام اقلیتوں کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل پر بھی میں نے کہا اور سنا ہے اور اس انداز سے کہا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ کسی بھی سطح کا جو طبقہ یا جو سماجی گروہ عددی کمی کے حساب سے ظلم اور محرومی کا شکار ہوتا ہے وہ اقلیت ہے اور اس اقلیت کے مفادات کی حفاظت کرنا سیاست کا آئین کا اور قانون کا فرض ہے۔ ملک کی صورت حال جو میرے سامنے ہے اس میں سب سے بڑا خطرہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ پورے ملک کو بڑھتی ہوئی جارحانہ فرقہ پرستی سے ہے اسے میں فاشزم سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہندو فاشزم کی لہر دیش کو توڑ کر رہے گی دیش کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی اور شاید خانہ جنگی میں مبتلا کر دے گی اور ظاہر ہے ہم ترقی کے اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے اور جو محروم طبقے ہیں وہ مزید محروم ہو جائیں گے اس لیے اس

کے خلاف لڑنا ہم سب کا فرض ہے اس الیکشن میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس بڑھتی ہوئی فاشزم کی علامت بحیثیت ایک سیاسی پارٹی کے بھارتیہ جنتا پارٹی ہے اس کی حیثیت کیسے کم کی جائے۔ پارلیمنٹ میں جو انھیں اچانک ۸۶ نشستیں مل گئی ہیں جس سے ان کے ارمان بہت بڑھ گئے ہیں ان کی ہمت بہت بڑھ گئی ہے اس کی کیسے تلافی کی جائے میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس بار اس کو ایک سیٹ بھی زیادہ ملی تو پھر انہیں کوئی نہیں روک سکتا ہے اور اس بار اگر ہم نے ان کو نیچے کر دیا۔ دو چار سیٹیں، دس بیس سیٹیں کم کر دیں تو ظاہر ہے ان کے پَر کتر جائیں گے ان کو اپنی حیثیت معلوم ہو جائے گی اس لئے میرا ہندوستان کے تمام سیکولر ووٹرس سے یہ کہنا ہے کہ اپنے اس حق کا بھرپور استعمال کیجئے اپنا ووٹ متحد ہو کر دیجئے۔ اپنا ووٹ ایسے سیکولر اُمیدوار کو دیجئے جو کہ بی جے پی کو آپ کے اپنے حلقے میں ہرا سکے بی جے پی تقریباً ہر جگہ سے کھڑی ہو رہی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جو بہترین امیدوار نظر آتا ہے وہ اپنے سماجی وزن کے اعتبار سے اتنی طاقت نہ رکھتا ہو کہ مسلمانوں کا ووٹ ملنے پر بھی وہ بی جے پی کو ہرا سکے تو مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی یوں طے کرنی ہوگی کہ ہمارا مقصد بی جے پی کو ہرانا ہے اس لئے قطع نظر پارٹی قطع نظر۔۔۔۔

س: قطع نظر اُمیدوار۔۔۔۔؟

ج: نہیں اُمیدوار کو سامنے رکھنا ہی ہے اُمیدوار تو سیکولر ہو۔ یہ نہیں ہو کہ جس کو ہم ووٹ دے رہے ہیں وہی ظالم ثابت ہو جائے۔ لیکن یہ کہ میں کوالیٹی کی بات کر رہا ہوں کہ کبھی کبھی بہترین امیدوار کے بجائے بہتر اُمیدوار کو ووٹ دے کر آپ بی جے پی کے اُمیدوار کو ہرا سکتے ہیں۔

س: ان علاقوں میں جہاں کہ بی جے پی کے اُمیدوار کھڑے ہوئے ہیں وہاں کچھ لوگ کانگریس کو بہتر سمجھ رہے ہوں گے، کچھ لوگ جنتا دل کو، کچھ لوگ جنتا دل ایس کو۔ یعنی ووٹ تقسیم ہو جائے گا اور۔۔۔۔

ج: اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ووٹ بٹنا نہیں چاہئے اور ووٹ مجتمع اور متحد ہو کر صرف

اس امیدوار کو پڑنا چاہیئے جو کہ بی جے پی کو ہرانے کی پوزیشن میں ہو۔

س ۔ بی جے پی کو ہرانے کے لیئے کیا کسی ایک پارٹی سے باوقار معاہدہ کرنے کا مسلم تنظیموں کی طرف سے کوئی امکان ہے؟

ج ۔ کسی مسلم تنظیم، کسی پارٹی یا کسی قائد کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ تمام مسلم ووٹوں کا سودا کر سکے اور نہ یہ کوئی کارآمد بات ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ایک ڈنڈے سے رگید اجا سکتا ہے اور کسی ایک پارٹی کے نام پہ جمع کیا جا سکتا ہے اسی لیئے میں حلقے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر ہمارا سیاسی مقصد طے ہے کہ ہمارا اولین فرض ہے بی جے پی کو ہرانا تو پھر یہ بات آسانی سے حلقے کی سطح پر طے کی جا سکتی ہے کہ ہمارے سامنے دس اُمیدوار ہیں مختلف پارٹیوں کے علاوہ آزاد اُمیدوار ہیں مسلم اور غیر مسلم امیدوار ہیں مگر سیاست اور مذہب سے قطع نظر ہو کر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کی کتنی طاقت ہے اور کس کی ایسی طاقت ہے کہ اس میں اگر مسلم ووٹ اجتماعی طور پہ مل جائے تو پھر وہ بی جے پی کو ہرا سکے۔ فوراً اس کا ساتھ دینا ہوگا۔

س : آپ نے کہا کہ کسی مسلم پارٹی یا مسلم قائد کی حیثیت کسی ایک سیاسی پارٹی سے باوقار معاہدے کی نہیں ہے لیکن امام بخاری صاحب اور وی پی سنگھ کے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں اس سلسلے میں.....

ج : دیکھیئے میں کسی کی شخصیت پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔ ہر پارٹی اپنا اپنا مفاد کھوج رہی ہے۔

س : کیا آپ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ اس الیکشن میں بی جے پی کی کامیابی کے زیادہ امکانات ہیں ؟

ج ۔ یقیناً چونکہ جتنے زیادہ اُمیدوار میدان میں ہوں گے اتنے ہی زیادہ بی جے پی کے امکانات روشن ہوں گے میری اپنی سمجھ یہ ہے کہ آمنے سامنے کی لڑائی میں بی جے پی کو ہر جگہ ہرایا جا سکتا ہے تکونی لڑائی میں بھی بی جے پی کو ہرایا جا سکتا ہے کم کیا جا سکتا ہے گھٹایا جا سکتا ہے لیکن

چوطرفہ لڑائی ہو یا پنچ طرفہ لڑائی ہو تو یقیناً بی جے پی کے جیتنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں کیوں کہ بی جے پی کے ووٹ کا تخمینہ میری نظر میں اس طرح ہے کہ اس الیکشن تک دس فیصد پختہ ووٹ ہندوستان میں ان کے تھے اور شاید مذہبی جذبات کو اُبھار کر اور رام کے نام پر وہ ووٹ بڑھا کر دس سے بیس فیصد کیئے جا سکتے ہیں۔ سب سے بہتر تو یہ ہوتا کہ اس وقت ملک کی تمام سیکولر پارٹیاں (جن میں آج بھی میں کانگریس کو گنتا ہوں) کانگریس ہے جنتا دل ہے جنتا دل ایس ہے اور بائیں بازو کی پارٹیاں ہیں یہ سب آج آپس میں متحد ہو کر بی جے پی کا مقابلہ کرتے لیکن سیاست تو امکانات کا نام ہے یہ ممکن نہیں ہے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو کم از کم جس حد تک بھی سیکولر طاقتیں متحد ہو سکیں ہونا چاہئے تاکہ امیدوار کم ہوں لیکن وہ مشورہ جو میں نے سیکولر ووٹروں کو دیا ہے خصوصاً مسلم ووٹروں کو دیا ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ کہ اگر تین امیدوار بھی ہیں تو آپ اس اُمیدوار کو تعاون دیں جو کہ بی جے پی کو ہرانے کی پوزیشن میں ہو۔ جس کا اپنا سیکولر کردار رہا ہو اور جس کی پارٹی کا اپنا سیکولر ریکارڈ ہو۔

س: اگر خدانخواستہ بی جے پی ایک بڑی طاقت بن کر سامنے آتی ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کے جان و مال اور دین و شریعت کو جو خطرات لاحق ہوں گے اس کا تدارک کیسے ہو سکتا ہے؟

ج: ظاہر ہے جب ہم پل پر پہنچیں گے تو پل پار کرنے کی سبیل کریں گے۔ ابھی تو مجھے یہ مطلع نظر نہیں آتا کہ بی جے پی کی حکومت بننے والی ہے میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ جب ہندو راشٹر دلیش میں قائم ہو گا اور سیکولر اسٹیٹ کی جب جڑیں کھود دی جائیں گی تو پھر ہندوستان میں خانہ جنگی کے امکانات روشن ہوں گے تشدد کو فروغ ملے گا لوگ اُمیدیں کھو دیں گے تو سوائے ہتھیار اُٹھانے کے ان کے سامنے کوئی چارہ نہیں رہ جائے گا تو اُس وقت' وقت اور حالات خود ہمارے لیے جواب پیدا کر دیں گے لیکن آج تو ہم ایک سیاسی حل تلاش کر رہے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آئین اور قانون کی عصمت کو برقرار رکھنا چاہیئے اور آج بھی مناسب سیاسی رویہ

اختیار کرنے سے بڑھتی ہوئی فاشزم کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

س، اس بار الیکشن میں انصاف پارٹی کیوں حصہ نہیں لے رہی ہے ؟

ج : انصاف پارٹی کے پاس وسائل نہیں ہیں کہ وہ انتخاب لڑ سکے۔ اس لیئے ہم جگہ جگہ اچھے امیدواروں کی حمایت کریں گے لیکن ہم اپنے بل پر سوائے کشن گنج کی سیٹ کے، جس کے بارے میں میں نے وہاں کی عوام سے پچھلی بار ایک وعدہ کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلی بار میرے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا اور مجھے جان بوجھ کر وہاں الیکشن لڑنے سے محروم کیا گیا۔ کشن گنج کے عوام کو اس کا صدمہ ہوا تھا۔ میں نے وہاں کی عوام کو یقین دلایا کہ میں آپ سے الگ نہیں ہوا میں آپ کا ہوں اور آپ کا رہوں گا اور جب بھی الیکشن ہوگا تو میں پھر سے یہیں سے لڑوں گا لیکن اس کے علاوہ ہمارے پاس وسائل نہیں ہیں کہ ہم کہیں اور سے بھی لڑ سکیں۔

س، آپ نے کشن گنج کے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ اگلے الیکشن میں وہیں سے لڑیں گے اور آپ نے کہا پھر وہیں سے کھڑے ہو رہے ہیں لیکن ایک اطلاع کے بموجب آپ کو منا مشتاق کے مقابلے میں جنتا دل والے مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ وہاں سے الیکشن نہ لڑیں اور اس کے عوض میں آپ کو راجیہ سبھا کا ممبر بنایا جائے گا ؟۔

ج : بہت سی باتیں ہو رہی ہیں لیکن سوال میرے راجیہ سبھا سے لڑنے نہ لڑنے کا نہیں وہ تو الگ سوال ہے۔ آج تو میرے سامنے جو مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ مجھے کشن گنج سے لڑنا ہے جنتا دل اگر میری مدد کرتی ہے فبہا ورنہ مدد کرے تو بھی مجھے لڑنا ہے۔

س، یعنی دونوں صورتوں میں کشن گنج سے ہی آپ لڑیں گے ؟

ج، جی ہاں !

س [illegible] مسلم لیگ [illegible] کانگریس میں جماعتی ہوئی اور پھر اتحاد ہوا۔ اس پر [illegible] ؟

[illegible] طلاق ہوتی ہے تین بار طلاق نہیں ہوئی [illegible] ہے کہ خود وہاں

جو فرنٹ ہے اس نے لیگ کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے۔ ڈوگمیٹزم۔ ڈوگمیٹزم کے شکار ہیں۔ بائیں بازو والے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ لیگ تو ہمارے لیے اچھوت ہے، میں نہیں مانتا۔ میں بھی اس رائے کا نہیں ہوں کہ لیگ کوئی فرقہ پرست جماعت ہے جو نکہ میں فرقہ پرستی کو تعبیر کرتا ہوں۔ اپنے مفادات کی حفاظت کرنے سے نہیں بلکہ دوسرے کے مفادات کی حفاظت جنگ کرنے سے۔ اور ان معنوں میں یقیناً مسلم لیگ فرقہ پرست جماعت نہیں ہے جب کہ بی جے پی یا شیو سینا فرقہ پرست جماعتیں ہیں۔ لیکن یہ بات شاید کمیونسٹوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور انھوں نے جب کانگریس سے ناطہ توڑا تو انھیں یہ امید تھی کہ انھیں ایک باوقار جگہ ملے گی۔ جب انھیں کوئی باوقار جگہ نہیں ملی تو پھر ظاہر ہے کہ سیاست کے میدان میں کچھ نہ کچھ تو معاہدے کرنے ہوتے ہیں اور مجھے یہ نہیں معلوم کہ کیا معاہدہ ہونے والا ہے۔ مجھ سے سلیمان سیٹھ صاحب نے یہ فرمایا کہ وہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کانگریس سے مینی فسیٹو میں مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں زیادہ واضح بات کہی جائے۔ (افکار سے ماخوذ)

عاصم شہنواز شبلی

مظفر حنفی، اپنے اشعار کے آئینے میں

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک مربوط، مسلسل اور ہم آہنگ صنفِ شاعری ہے اُردو غزل چونکہ فارسی کی مرہونِ منت ہے اس لئے اس میں فارسی غزل کے سارے اثرات پائے جاتے ہیں۔ غزل کا داخلیت سے گہرا تعلق ہے داخلیت اور تغزل لازم و ملزوم ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غزل میں سراسر داخلیت ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ داخلیت کی حقیقی بنیاد یہ ہے کہ خارجی تجربوں کو دل کے آتش کدے میں کندن بنا کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ صوری اور معنوی اعتبار سے اس پر تخلیقِ نو کا گمان ہو۔

اس طرح تجزیہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داخلیت اور خارجیت کی گہری ہم آہنگی سے اعلیٰ اور منفرد فن کی تخلیق ہوتی ہے ایک اور بات غور طلب ہے کہ دل کی دنیا میں جو جذبات و احساسات اُٹھتے ہیں وہ دیرپا دور رس، اثر انگیز اور فکر آمیز ہوتے ہیں کیونکہ ان جذبات و احساسات میں تصنع کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے اس میں سراسر آمد اور وارفتگی ہوتی ہے آورد نہیں۔ جذبہ کوئی برقی رو نہیں ہے جو آئی اور گزر گئی بلکہ اس میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور گہرائی و گیرائی بھی ساتھ ہی اس جذبے میں فکر و خیال کے عناصر شامل ہو

میں فنکارانہ طور پر ہوتا ہے۔

ہم جب مظفر حنفی کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سے نکتے ذہن میں صاف ہو جاتے ہیں۔ مظفر حنفی غزل کی جس روایت پر گامزن ہے وہ انہیں شاد عارفی سے ملی ہے شاد عارفی نے اُستاد کی حیثیت سے ان کی ذہنی و فکری تربیت کی اور انہیں ذہن اور فکر کی دولت سے مالا مال کیا۔ اس کے علاوہ مظفر حنفی کی خاندانی علمی و ادبی روایت بھی ہے ان روایتوں نے مل کر ان کے فکر و خیال کی تعمیر کی۔ مظفر حنفی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کو صرف جذب و کیف اور حال و خال کی کیفیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے وسیع تجربوں کے ان میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حسن و جمال پیدا کیا۔ غزل کی آن، بان کو برقرار رکھنے میں مظفر حنفی نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے انہوں نے غزل کو چاہا بھی ہے اور پوجا بھی۔ اس کے بدلے میں غزل نے بھی ان کو اپنایا ہے غزل اُن کے یہاں اپنی سادگی اور فطری رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ مظفر حنفی نے غزل میں وسعت اور ہم جہتی پیدا کی ہے غزل کو ایک نیا آہنگ اور نیا اسلوب عطا کرنے میں ان کا نام نمایاں ہے۔

مظفر حنفی کی غزلوں میں تکرار اور ربط ملتا ہے اور یہی خصوصیت ان کی شاعری کو انفرادیت بخشتی ہے ؎

بھنور بھی اک نیا انکشاف کرتا ہے ؛ کہ بلبلے کا سمندر طواف کرتا ہے

ایسے میں کیا پیا رہینتیا پانی میں کیا گلتی ریت
تو گہرے ساگر کا موتی میں ساحل کی چلتی ریت

سبھی دشمنوں کو جو پہچانتے ہم ۔ تو پھر اپنا خیمہ کہاں تانتے ہم

خدا حد بندی و محراب و منبر میں نہیں رہتا
ہمیں معلوم ہے بھگوان پتھر میں نہیں رہتا

یہ اشعار مظفر حنفی کی غزلوں کے منتخب مطالعے ہیں۔ ان سادے مطالعوں کا خصوصی

لب ولہجہ، آہنگ، اسلوب، شعور اور موضوع ہے۔ ان میں شروع سے آخر تک گہرا تسلسل ربط اور ہم آہنگی ہے مظفر حنفی کی ایسی غزلیں بہت کم ہیں جن میں تکرار اور انتشار نظر پایا جاتا ہو۔ ان کی بیشتر غزلوں میں خیال اور معنی کا ظاہری و باطنی ربط قائم رہتا ہے۔

مظفر حنفی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ انہوں نے تنقیدی مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں اور افسانے بھی۔ اس طرح ان کی شخصیت تہہ دار ہے لیکن شاعری ان کا پہلا مطمح خیال ہے۔

مظفر حنفی کی غزلوں کی اہم خصوصیات ان کی سادگی، سلاست، بانکپن، اچھوتا انداز، مخصوص تیور، بانکا لہجہ، تیکھا پن، ندرت پن اور فکری عناصر ہیں غرض کہ غور سے دیکھا جائے تو غزل کا مکمل ڈکشن مظفر حنفی کے یہاں انفرادی حیثیت میں ملتا ہے غزل پر ان کی گرفت بہت ہی مضبوط اور بھرپور ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مظفر حنفی غزل نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ غزل کو گویائی مل گئی ہے اور ان کی ذات غزل کے لئے گویا ایک میڈیم کی حیثیت رکھتی ہے۔

مظفر حنفی کی فکر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی نہیں ہے بلکہ سادگی، سلاست، زبان و بیان کی صفائی، الفاظ کے انتخاب، اسلوب کی شگفتگی، ہیئت کی روایت اور اظہار کی جدت ان کی غزل کے اہم عناصر ہیں اور یہ عناصر ان کے بڑے اور کامیاب شاعر ہونے پر دلالت کرتے ہیں مظفر ایک مخصوص فکر و نظر کے حامل ہیں انہوں نے عموماً فکر کو شعریت عطا کی ہے اور اشعار کے ذریعہ تغزل کی کسی نہ کسی خوبی کو اجاگر کیا ہے چونکہ ان کی غزل کا ڈکشن قطعی مکمل ہے اس لئے ہوتا ہے کہ ان کے وجدان اور تصورات خود بخود غزل میں ڈھل گئے ہیں اگرچہ ان کے اشعار کے الفاظ سیدھے سادے ہیں لیکن وقار، سلاست، فنی رکھ رکھاؤ اور بانکپن میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ ان کا لب و لہجہ بڑا بانکا اور تیکھا ہے ذیل میں چند اشعار پیش ہیں جو بظاہر

کو ایک نئی جہت سے روشناس کراتے ہیں ؎

آگا پیچھا سوچ مظفر اس محفل میں ایسی غزلیں
منہ پر سچ کہہ دینے والے اکثر دیوانے کہلائے

جانے بارات گزری کہ میت کوئی ۔ پھول بکھرا ہوا راستے بھر میں ہے

بھیج مظفر تیکھے شعر ۔۔ اُن کی خدمتِ عالی میں

اُس نے اپنے لئے چاندنی کھینچ لی
اور مجھ سے کہا عیش کر دھوپ میں

مجھ کو پاگل کہتے ہیں اس بستی کے سب ہی لوگ ۔۔ بانٹ رہا ہوں تارے تتلی شبنم اور گلاب

کچھ مظفر کا پتہ ہے دوستو
کس لئے، کیسے، کہاں مارا گیا

ایسے بے شمار اشعار آپ کو مظفر حنفی کی غزلوں میں نظر آئیں گے جن میں ایک مخصوص تیور تیکھا پن اور بھرپور قوت کا احساس ہوتا ہے انہوں نے غزل کے لب و لہجہ، اسلوب اور مزاج کو بدل کر اسے ایک نئی جہت اور ایک نئے اسلوب سے روشناس کرایا ہے ۔

مظفر حنفی کے یہاں بے شمار حسین دلکش اور پُراثر ترکیبیں ملتی ہیں ۔ ترکیبوں کے علاوہ منفرد لفظوں کا رکھاؤ بھی بہت فنکارانہ ہے ہر لحظہ بدلتی ہوئی رنگا رنگ زندگی کی مختلف کیفیتوں اور حالتوں کو ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے مختلف علامتوں کا سہارا لیا ہے اور دیگر رمز و کنایہ میں بھی شاعری کی ہے ؎

قرمزی ساری پہن کر اُس طرح سجتی ہے وہ
پھول اپنے سر کٹا دیں چاندنی قربان جائے

کس جگہ رہیے، کہاں دن کاٹیے کیا کیجئے
گاؤں میں کیچڑ بہت ہے شہر میں کم ہے ہوا

ہمیں اپنی کمزوریوں کا پتہ ہے
تمھیں، ہم فرشتہ سمجھ جانتے ہم

اب سمندر کی طرح پھیل کر رہنا یارو
ہم اڑے جاتے ہیں گمنام جزیروں کی طرف

مظفر حنفی کی غزلیات اور ان کے فن شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو معاشرے سے کبھی الگ نہ جانا۔ شاعری ان کے نزدیک فقط قصہ ہے بھی تو یوں کہ ذات اور کائنات ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ ذات کے پردے میں انہوں نے دل کا جو ماجرا بھی بیان کیا ہے اور دنیا کا بھی۔

مظفر حنفی کی غزلوں کا ایک اہم پہلو ان کے طنزیہ اشعار کی شکل میں بالخصوص مقطعوں میں ابھار کے سامنے آیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کا اظہار بڑی دیانت داری کے ساتھ کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے ان اشعار کے ذریعہ ایک نئے شعری اسلوب اور اس کے امکانات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے مظفر حنفی نے اپنے طرز اظہار میں استعاروں اور ترکیبوں کے استعمال سے غزلوں کو ایک خاص فنی بلندی اور فکری گہرائی و گیرائی عطا کی ہے۔ انہوں نے جذبۂ احساس اور تخیل فکر کو ایک مربوط اور ہم آہنگ شعری پیکر عطا کیا ہے

نئی قدروں پہ فرسودہ عقیدے طنز کرتے ہیں
مبارک ہو مظفر کہ چیونٹی کے پر نکل آئے

فلسفہ اور تغزل نہیں ہے نہ ہو - بات مظہر بھی کلامِ مظفر میں ہے

ملا ہے گر و تغزل مری غزل میں نہیں
جدید لہجہ گھٹن کو تو صاف کرتا ہے

میرا ہی ایک شعر مظفر - تنہا لاکھوں پہ بھاری ہے

جناب مظفر حنفی کو اپنی جدیدیت پر فخر ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری [illegible] فن کا [illegible] مظفر حنفی جیسے [illegible] اور مزاج کا تعین [illegible] غزل گو میں ان کی اپنی ایک الف [illegible]

وہ اپنی شاعری کو روایات کی چار دیواری میں محصور نہیں کرتے۔

مظفر حنفی نے بھی محبت کی ہے۔ ان کے یہاں بھی محبوب کا سراپا ملتا ہے لیکن عشق و محبت شاعر کے پیروں کی بیڑی نہیں۔ محبت اس میں فرار اور قنوطیت پیدا نہیں کرتی۔ معاملات حسن و عشق میں بھی ایک توازن اور اعتدال ہے اظہار عشق کے انداز میں انفرادیت پیدا ہو گئی ہے مظفر عشق کی کسک محسوس کرتے ہوئے بھی سپردگی کی منزل میں داخل ہونا کی ہمت نہیں کرتے اور منزل عشق کی سرحد تک پہونچ کر واپس آجاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے

لڑکیاں پھول چن رہی ہوں گی ✤ باغ میں اور ایک ہنگامہ

دھڑکتا ہے قلم آہستہ بولو ✤ اُگا ہے چاند جذبے کے اُفق پر

مرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ✤ کھلی چھت پہ کل چاند ٹہلا کیا

چاند اپنی داستاں کہتا رہا ✤ رات بھر سنتے رہے ہم آنکھ سے

تو مجھے خواب مرا دیتا جا ✤ سارے خطے میں تجھے لوٹا دوں گا

ان اشعار میں تشبیہہ۔ ایک نیا انداز ہے جو قاری کو اپنی طرف راغب کر لیتا ہے قاری ان اشعار کو صرف اپنے محسوسات ہی کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی عقل و خرد کو بروئے کار لاکر ان کی گہرائی تک پہونچنے کی کوشش کرتی ہے ان اشعار میں جذبے کے سوز و ساز نے تخیل کو پیدا کیا ہے اور اس کو پرواز بھی عطا کی ہے سب سے اہم فنی تقاضہ یہ ہے کہ انسانی جذبات بے لگام گھوڑے کی طرح نہ بن جائیں۔ ایک اچھے شاعر کے یہاں جذبات کی دھنک بہت روشنی ہوتی ہے اور ان جذبات کی آنچ اور آہنگ میں بھی فرق ہوتا ہے جب ہم مظفر حنفی کی غزلوں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ رائے پیش کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی کہ ان کے یہاں لے کا توازن بدرجہ اتم موجود ہے

مظفر حنفی نے تخلیقی کرب کا طویل سفر طے کرنے کے بعد ہی اپنی غزلوں میں فکر کی سوز کی بلندی اور تجربہ کی پختگی پیدا کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم انہیں تاجدارِ غزل

مومن خان شوق
اشرف ولا۔ ۳-۳-۲۳۷، اسلے پلی
حیدرآباد

تبصرہ

ماہنامہ "قومی زبان" اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا

قومی یکجہتی نمبر

ماہنامہ "قومی زبان" اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا ترجمان ہے۔ یہ ماہنامہ ایک عرصہ سے
شائع نہیں ہو رہا تھا حالانکہ یہ رسالہ وقت کی اہم ضرورت اور اُردو ادب کے فروغ اور استحکام کے
لئے ایک اہم حصہ ہے جس میں اکیڈیمی کے کاموں کا جائزہ، دانشوروں، ادیبوں، شاعروں
اور صحافیوں کی تخلیقات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایک خوش آئند دور کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ پھر سے اُردو اکیڈیمی آندھرا
کے زیر اہتمام "قومی زبان" کی اشاعت کا آغاز "قومی یکجہتی نمبر" سے ہوا ہے جس کا سہرا موجودہ
صدر اکیڈیمی جناب محمد جلیل پاشاہ صاحب کے سر ہے زیر نظر قومی یکجہتی نمبر جناب عابدہ
جناب شجاعت علی شجیع کی ادارت میں فروری ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے جس کا دلکش
فن خوشنویسی کے ماہر استاد جناب محمد غوث خان اور ماہر خوشنویس جناب محمود سلیم
[illegible] منظر عام پر آچکا ہے۔
یہ شمارہ [illegible] یکجہتی نمبر ۶۴ صفحات پر شائع کیا گیا ہے سرورق کو
[illegible] جناب [illegible] جلیل [illegible] صاحب اور صدر اکیڈیمی جناب
[illegible] آغاز [illegible] قومی زبان کے نہ شائع ہونے کی وجوہات
[illegible] اس کی اشا

منے کے عزم کا ارادہ ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ حرفِ آغاز کے بعد قومی زبان کے قومی
ی اشاعت پر ممتاز سیاسی رہنماؤں کے بیانات جن میں قابلِ ذکر نائب صدر ہند جناب
ی شرما، چیف منسٹر آندھرا پردیش جناب ین جناردھن ریڈی، صدر آندھرا پردیش
ناب وی ہنمنت راؤ اور دیگر شامل ہیں۔ آگے جناب محمد جلیل پاشاہ کا تعارف بقلم
ف الدین سلیم مختصر مگر معلوماتی تحریر ہے اس کے بعد قومی یکجہتی کے موضوع پر مختلف عنوانات
ضامین اور نظمیں ممتاز ادیب، صحافی اور شعراء کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں جن کے مطالعہ
یکجہتی کی حقیقت، اہمیت اور اس کی ضرورت اُجاگر ہو جاتی ہے۔

ڈ جگن ناتھ آزاد صاحب نے "قومی یکجہتی میں اردو کا حصہ" تفصیلی جائزہ دلکش انداز میں
نیا ہے۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے "قومی یکجہتی کیا ہے" کے زیرِ عنوان مفید اور سیر حاصل
یش کرتے ہوئے انھوں نے ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی اس بات
، کیا ہے کہ" نعرے لگانے سے کسی شخص کی ذاتی وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا بلکہ ہم
سر بلند رکھنا چاہیئے" یعنی یکجہتی کا منشا قوم میں احساسِ بیداری کا پیدا کرنا اور
ند بات کو مہمیز کرنا ہے جس سے ملک و قوم کا نام بلند ہو سکے۔" پروفیسر رشید الدین خان
ن سیکولرازم اور فرقہ پرستی" جناب محمد رضی الدین معظم کا مضمون "قومی یکجہتی کا فروغ اور
استحکام" نہایت معیاری اور معلوماتی مقالے ہیں۔ مختصراً ہم سب کی ہمیشہ یہی کوشش
چاہیئے کہ قوم کے مفاد عامہ سے متعلق فکر یہ ہم آہنگی کو فروغ دیں عوام میں حب الوطنی کا
پیدا کریں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا جھگڑنا بند کر کے ہمیشہ ملک اور قوم کی بقاء اور
ترقی باہمی کے کام کریں۔ پیار و محبت سے رہیں" قومی یکجہتی کے نقیب" مولانا محمد علی بقلم
دل صدیقی۔ "قومی یکجہتی کے علمبردار" بہادر یار جنگ بقلم جناب بی ریڈی۔ راما راؤ بڑے
مضامین ہیں۔ جن میں دو جیالے وطن پرستوں کی زندگی اور قومی یکجہتی کے بارے میں
ردگی سے ان کے گرانقدر خیالات کو قلمبند کیا گیا ہے راحت سلطانہ صاحبہ کا لکھا نظیر اکبرآبادی

(قومی یکجہتی کا شاعر) اچھا اور معیاری ہے۔

حصۂ نظم میں "ہم پیار سکھانے والے ہیں" احمد فراز "صدائے وقت" ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید "جانور اور انسان" جناب شجاعت علی شجیع "مروتوں کے شہر میں" مومن خاں شوق اور "ہم سب ایک ہیں" للیتا دیوی ضیاء صاحبہ معیاری اور قابلِ مطالعہ ہیں جس کے ذریعہ قومی یکجہتی کو فروغ ملتا ہے۔

آخر میں اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی سرگرمیاں (رپورٹ) جناب حسن فرخ اور "اُردو اکیڈیمی کا اُردو ریسرچ سنٹر" ایک جائزہ محمد حمید الظفر بھی شامل ہے جو کافی معلوماتی ہیں بہر حال یہ نمبر قابلِ مطالعہ ہے۔

اس قومی یکجہتی نمبر کے مطالعہ کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ جس کی قیمت ۳ روپے رکھی گئی ہے واقعی ہی اس پُر آشوب دور میں بہت ہی کم اور واجبی ہے اس لئے میں اُردو نواز، اُردو دوستوں، مدرسوں کے اساتذہ اور قارئین سے یہ کہوں گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کے خریدار بنیں اور اُردو کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کریں۔ اکیڈیمی کے ارباب سے گزارش ہے کہ اس رسالہ کو ہر ماہ پابندی سے شائع کریں۔ اور ہر قلمکار کو معاوضہ بھی پیش کریں۔ اور اکیڈیمی کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ شہر اور ریاست کی علمی، ادبی و تعلیمی سرگرمیوں پر "اُردو نامہ" بھی شامل ہو تو اچھا رہے گا ■■

تبصرہ نگار: م.ق.ص

روشن ستارے

مصنف : عبدالعزیز عرفان

"روشن ستارے" ہر عمر کے بچوں کے لئے مضامین اور کہانیوں کا مجموعہ، جناب عبدالعزیز عرفان کی دوسری تصنیف ہے (۵۲) صفحوں کی اس مختصر کتاب میں (۱۹) صفحات، مصنف کی پہلی تصنیف پر تبصروں اور موجودہ تصنیف کے پیش لفظ، تاثرات اور نیک خواہشات کی نذر ہو گئے ہیں۔ باقی (۳۳) صفحات بچوں کے بارے میں مضامین اور کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ یہ مضامین بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں۔ بچوں کی نفسیات کا خیال رکھا گیا ہے زبان سادہ اور عام فہم استعمال کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے مگر مضامین پڑھنے سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے مضامین کچھ اور مفصل ہوتے، ان میں مزید گہرائی اور گیرائی ہوتی تو بچوں پر ذہنی اور قلبی تاثرات اور زیادہ گہرے ہوتے۔ تمام مضامین اصلاحی پہلو لئے ہوئے ہیں ساتھ ہی سائنس ٹکنالوجی کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی جاتیں تو بچے انہیں پڑھ کر موجودہ دور میں بہتر زندگی گذارنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر پاتے۔ صرف ایک مضمون ٹی وی کے بارے میں ہے اس میں بھی ٹی وی کے بارے میں بتانے کی بجائے ٹی وی کے پروگراموں پر اظہار خیال کیا گیا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ مضامین بمبئی کے ایک مقبول عام روزنامے "اردو ٹائمز" کے بچوں کے کالم "گل بوٹے" میں شائع ہو چکے ہیں اور روزنامہ کی محدود جگہ کے پیش نظر۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ مختصر مگر مفید ہیں اصلاحی مقصد سے لکھے گئے ہیں۔

پروفیسر سید اقبال

بستر میں پیشاب

ایسا اکثر ہوتا ہے کہ صبح صبح والدین اپنے کسی ننھے صاحبزادے پر سخت ناراض ہوجاتے ہیں اور ڈانٹ پھٹکار کا سلسلہ ناشتے تک چلتا رہتا ہے اس سارے قضیئے میں ننھے میاں کا قصور صرف اتنا ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے بستر میں پیشاب کرنے کی حماقت کر ڈالی ہے اس جھگڑے میں حضرت شوہر اپنی بیگم پر خوب جھلاتے ہیں کہ محترمہ نے رات ننھے میاں کو پیشاب کیوں نہیں کروایا مگر اپنی جھلاہٹ میں یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر وہ بھی تو اپنے لاڈلے کو پیشاب کروا کے سلا سکتے تھے آخر یہ ذمہ داری صرف ماں ہی پر کیوں ڈالی جائے بہرحال اب ننھے میاں نے پیشاب کر ہی ڈالا ہے تو سوائے بستر دھلوانے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ لہذا اب بستر دھلنے دے دیا جاتا ہے اور ننھے میاں سب بھول بھال کر اسکول کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں ان کی امی جان بھی اس حادثے کو بھلا کر باورچی خانے میں گھس جاتی ہیں۔ رہے ابا میاں تو وہ بھی اسے ایک معمولی سا واقعہ سمجھ کر اپنے دفتر ہو لیتے ہیں۔

لیکن یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ اسے معمولی واقعہ سمجھنا بچوں سے ناانصافی کے مترادف ہے ہم چاہے اسے بچوں کے معمولات میں سے گردانیں مگر یہ بچوں میں ایک غیر معمولی تبدیلی کے اثرات کا پتہ دیتا ہے اور تبدیلی مختلف وجوہات کے سبب ہو سکتی ہے۔

بچوں کی اس بیماری ENURETICS کی بنیادی وجہ والدین کی بچوں سے لاپرواہی ہے ظاہر ہے کہ کوئی ماں باپ اپنے بچوں سے لاپرواہی کے الزام کو ہرگز قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں گے

کیوں کہ ہر ماں باپ کی حتی المقدور کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان کے جگر گوشوں کو دنیا کی بہترین نعمتوں سے مالا مال کر دیا جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے اکثر والدین اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ بچوں کو بہترین کپڑے پہنا کر اور عمدہ کھانے کھلا کر ہم نے ان کی ساری ضروریات پوری کر دی ہے پھر یہ آئس کریم کی صورت میں ہو یا مٹھائی کی صورت میں اگر قسمت سے اچھے اسکول میں داخلہ بھی کروا دیا تو پھر ساری ذمہ داری سے فراغت ہو گئی۔ ان کی عادتوں کا خیال، کھانے کے اوقات کی اور بیت الخلاء کے معمولات کی تربیت ہمیں تربیت ہی نہیں لگتی بلکہ ہم تو یہ کہہ کر ٹال جاتے ہیں کہ ابھی تو بچہ ہے دھیرے دھیرے خود سیکھ جائے گا TOILET ٹریننگ کی کمی کمسن بچوں میں جسمانی طور پر اتنی بے ترتیبی پیدا کر دیتا ہے وہ بے چارے بستر پر پیشاب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کبھی کبھار والدین "موروثی مرض" کا نام دے کر اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں نتیجے میں معصوم بچہ ایک لمبے عرصہ تک اس بیماری میں گرفتار رہتا ہے۔

اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ننھے میاں جو ابھی تک گھر کی اکلوتی اولاد ہوا کرتے تھے گھر میں دوسری اولاد کے نزول کے سبب اچانک اپنے اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گھر والے اب پہلے جیسی اہمیت نہیں دیتے لہذا دوبارہ توجہ حاصل کرنے کے لئے وہ بستر خراب کرنے لگتے ہیں ابتدائی دنوں میں بچوں میں یہ نفسیاتی مرض عام طور پر پایا جاتا ہے یہاں والدین مجبور ہوتے ہیں ظاہر ہے نوزائیدہ کچھ زیادہ توجہ کا فطری طور پر مستحق بھی ہوتا ہے چونکہ وہ کلی طور پر ماں کے رحم و کرم پر ہے اس لئے ان دنوں میں اس کا خیال نہیں رکھا جاتا تو اس کی صحت بھی بگڑ سکتی لہذا نہ چاہتے ہوئے بھی ننھے میاں عدم توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں

اس ضمن میں ماہر نفسیات ایک اور وجہ کا بھی ذکر کرتے ہیں اکثر ایسا ہوا ہے کہ والدین نے کسی بات پر بچے کو خوب ڈانٹا یا ان کی غلطیوں پر سخت گیر قسم کی ماں دن بھر نکتہ چینی کرتی رہی تو اس بے چارے کی بیچ تو بگڑ ہی گئی تھی اس تشنج اور ذہنی کھینچاؤ کی کیفیت میں بلیڈر (ن) بھی بگڑ جاتا ہے اور نیند کے لمحات میں بھی وہ کیفیت باقی رہتی ہے عام طور پر ان گھرانوں میں جہاں بدقسمتی سے والدین کی علیحدگی کا مسئلہ چل رہا ہو یا گھر میں مستقل جھگڑے کا ماحول

پیدا ہو گیا ہو ایسے گھرانوں میں معصوم بچے بھی ذہنی پریشانی میں گرفتار ہو جاتے ہیں ابتدائی دنوں میں جب کہ وہ پوری طرح خود کفیل بھی نہیں اگر انہیں غیر محفوظ ماحول میسر آجائے یا وہ چاروں طرف سے ذہنی حملوں کا نشانہ بنتے رہیں تو ان کا ذہنی سکون سرے سے غارت ہو جاتا ہے یہ بچوں ہی پر کیا موقوف ہے بڑوں پر بھی ایسی کیفیت گذرے تو وہ بھی ذہنی امراض کا شکار ہو جائیں غرض کہ کم عمری میں ذہنی اطمینان کی کیفیت جو اہل خانہ کے باہمی تعلقات کے سبب ہی بچوں میں پیدا ہو سکتی ہے اگر کسی سبب نہ پیدا ہو تو بچے احتجاجاً بستر خراب کرنے کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں مثلاً ان بچوں کو جنہیں والدین نے بورڈنگ اسکول میں بھیجنے کی دھمکی دے رکھی ہے آیا بھیج چکے ہیں وہ گھر کی محفوظ چہار دیواری سے دوری کے تصور سے ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور کچھ حالتوں میں والدین سے انتقام کی یہ صورت بھی پیدا کر لیتے ہیں کبھی ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقلی خاندان میں کسی چاہنے والے کی موت یا والدین کا آپس میں شدید اختلاف بھی بچوں کو ذہنی طور سے بری طرح ماؤف کر دیتا ہے اور یہ اعصابی خرابی بالآخر نیند میں پیشاب کرنے کا باعث بنتی ہے۔

آج کل ہمارے گھروں میں ٹیلی ویژن اور ویڈیو فلمیں دیکھنا معمول بن گیا ہے اور فلمیں دیکھتے وقت عمر کی تخصیص نہیں ہوتی ہر چھوٹا بڑا اسکرین سے چپکا رہتا ہے اور فلمیں بھی ہر نوع کی دیکھی جاتی ہیں لہذا کوئی کم عمر بچہ غلطی سے کسی قسم کا ڈراونا منظر دیکھ لے تو یہ تاثر اس کے اعصاب پر غالب آجاتا ہے بعض اوقات رات میں اچانک تیز بارش، بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کا کڑکنا بھی بچوں کی نیند اچاٹ کر دیتا ہے اور معصوم ذہنوں پر یہ غیر معمولی واقعات منفی اثرات ڈالتے ہیں نتیجے میں خوف زدہ بچے سے نیند میں پیشاب خطا کر جاتا ہے کبھی یہی بچے جنات اور بھوتوں کی بحر سن لیں یا کسی کتاب سے کوئی ڈرا دینے والا واقعہ پڑھ لیں تو ان کے ذہنوں میں ایک عجب قسم کا ہیجان شروع ہو جاتا ہے اور پھر یہ سنسان مقامات پر جانے سے ڈرنے لگتے ہیں اور اندھیرے کمرے میں داخل ہونے سے کتراتے ہیں لہذا کچھ حالتوں میں اس ذہنی کیفیت کا نتیجہ بستر کے گیلے پن میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔

چونکہ بچوں کی چھوٹی سی دنیا میں اسکول اہم ترین رول ادا کرتا ہے اس لئے اساتذہ کا مزاج اور اسکول کا ماحول ان کی ذہنی صحت پر خاصا اثر انداز ہوتا ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں بچے اساتذہ کو والدین کے روپ میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اگر یہی اساتذہ انھیں بھری کلاس میں ڈانٹ دیں یا سخت قسم کی سزا دے ڈالیں تو بچہ ذہنی طور پر بری طرح ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح سکول میں اگر دو چار شریر قسم کے لڑکے اسے اپنی شرارتوں کا نشانہ بنائے رکھیں تو یہ بھی اس کے لئے جذباتی طور پر حادثہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے کبھی کچھ مضامین کا مشکل لگنا اسباق کا سمجھ میں نہ آنا یا امتحان کا خوف وغیرہ بھی ایک ذہنی دھچکا بن جاتا ہے اور ردعمل کے طور پر نیند میں وہ اپنی شکست کا اظہار کر بیٹھتا ہے۔

اب اس کا شرمندگی سے بھرپور شکست کو والدین اپنی فتح قرار دیں یا سرے سے بیماری ہی نہ سمجھیں تو یہ والدین کی نادانی ہی کہی جا سکتی ہے۔ بنیادی طور پر مرض بچوں میں خود اعتمادی کے فقدان کا بھی غماز ہے اگر انہیں حسن سلوک کی بھوار سے شرابور کر دیا جائے تو ڈھیر سارے امراض خود بخود ان کی شخصیات سے بہہ جائیں گے مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں بچوں کے مسائل سمجھنے میں کوئی خاص زحمت نہیں اٹھائی جاتی نہ وقت نکال کر ان سے گفتگو کی جاتی ہے نہ ان کے ساتھ کھیلا جاتا ہے اور نہ انہیں اپنے قیمتی اوقات میں سے تھوڑا سا وقت دیا جاتا ہے بہت پریشان ہوئے تو فوراً مقامی ڈاکٹر سے رجوع کر لیا اور ایک بار پھر بے فکر ہو گئے سچ تو یہ ہے کہ اس مرض میں ڈاکٹر بھی بچے کو خود اعتمادی عطا کرنے کے لئے ہلکی پھلکی دوائیں تجویز کرتے ہیں ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچے کے مثانے کی کمزوری کو دور کیا جائے اور اعصابی تھکن کا علاج ہو۔

یورپ میں بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے (خصوصاً اس مرض میں) ڈاکٹر ایک کیلنڈر نما چارٹ تجویز کرتے ہیں۔ بچے کو اس کی من پسند مٹھائی یا آئسکریم دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے جس کے بعد بچہ دھیرے دھیرے اپنے پر کنٹرول کرنے لگتا ہے اس دوران ماں باپ اس کی TOILET عادت کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں تاکہ کسی طور اُسے ذہنی اور جذباتی سانحات سے دوچار ہونا پڑے ▲

عزیز بھارتی
ملے پلی۔ حیدرآباد

راجیو گاندھی کے قتل پر ...

ازل سے
ظلمتوں نے
روشنی کے قتل کی
ہر بار سازش کی
بظاہر روشنی کا
قتل بھی ہوتا رہا
لیکن ؟
نہ ٹوٹا سلسلہ پھر بھی
محبت کی کرن
سو سو اندھیرے چیر کر
آتی رہی، آتی رہے گی بھی۔
کبھی گاندھی، کبھی اندرا
اور اب راجیو جی نے
دی ہے قربانی

یہ قربانی یقیناً
رنگ لائے گی
فضائے دہر پہ
پرچم محبت کا
اخوت کا
رواداری کا
اِک دن
سرسرائے گا
اندھیرے منہ چھپائیں گے
کسی اندھے کنوئیں میں
ایک دن وہ
ڈوب جائیں گے

مومن خان شوق
اشرف ولا۔ ۲۳۔۳۔۱۱
ملے پلی۔ حیدر آباد ۱ے

امر رہے گا نام ترا

(عظیم رہنما راجیو گاندھی کی ناگہانی موت پر)

عظیم راہ نما، باوقار شخصیت
وہ جس کا نام تھا راجیو گاندھی
عجیب سانحہ اندرا کے بعد قتل کا ہے
وہ جس نے ملک کو ہر گام پر ترقی دی
وہ جس نے دیس کی عظمت کو چار چاند لگائے
وہ جس نے پیار و محبت کی فصل کاٹی تھی

اب اُس کے قتل پہ چھائی ہوئی اُداسی ہے
جدھر بھی دیکھئے ہر آنکھ میں نمی سی ہے
دِلوں کی بزم میں لگتا ہے کچھ کمی سی ہے

ہزار بار تری عظمتوں کو مرا سلام
امر رہے گا اے راجیو گاندھی ترا نام ●

ناصر کرنولی، لکچرر
۳-۴- بی بلاک اکبر ٹاورس جدید ملک پیٹ
حیدرآباد ۳۶

گلشن کی خیر ہو

(راجیو گاندھی کے قتل کی خبر سے متاثر ہو کر)

خوشبو برہنہ سر ہے
پریشاں سب ہے تازگی
نم دیدہ خار و خس میں المناک رنگ و بو
ہر لمحہ غم زدہ ہے
ہر اک پل اداس اداس
غم گلستاں کا آج ہے ناقابلِ قیاس
صدیوں کے سلسلوں کی
شگفتہ روایتیں
اخلاق کی خلوص کی چاہت عادتیں
انسانیت نواز مقدس علامتیں
تاریخ کے شعور کی روشن قیادتیں
بکھریں گی اس طرح سے کسی کو خبر نہ تھی
انجام پہ وطن کے کسی کی نظر نہ تھی
وہ اک کلی وقارِ گلستاں کہیں جسے

موسم کا حسن جانِ بہاراں کہیں جسے
ورثے میں جس کو
حبِ وطن کی مہک ملی
جمہوریت کا رنگ سیکولر چمک ملی
چشم زدن میں شاخ سے ایسے جدا ہوئی
صحنِ چمن میں جیسے قیامت بپا ہوئی
خوشبو کی موت کب ہوئی
پھولوں کے قتل سے
سچ ہے کہ بخش دیتا ہے
خود ساز ٹوٹ کر
کانوں میں گونجتی ہوئی آواز کو دوام
گلچیں قدم قدم پہ ہے
گلشن کی خیر ہو
لٹتا ہوا چراغ ہے دامن کی خیر ہو

قطب شاہ
سکریٹری بزم اُردو۔
ریجنل پراویڈنٹ فنڈ آفس۔
برکت پورہ۔حیدر آباد

عقیدت کے پھول

(سابق وزیراعظم مرحوم راجیو گاندھی کے سوگ میں)

وہ لال تھا جو سو گیا خوابوں کی میٹھی سیج پر
یہ دشمنوں نے کیا کیا اندرا کے نیک لال پر
وہ لال تھا جو سو گیا
خوابوں کی میٹھی سیج پر

وہ خواب ٹوٹ گیا ہے اب جو ہندوستاں نے دیکھا تھا
بے چین چپہ چپہ ہو گیا راجیو کے انتقال پر
وہ لال تھا جو سو گیا
خوابوں کی میٹھی سیج پر

ہر آنکھ اشک بار ہے راجیو تمہاری موت پر
عقیدت کا پھول چڑھ گیا جسدِ خاکی نہرو کی آل پر
وہ لال تھا جو سو گیا
خوابوں کی میٹھی سیج پر

٭ ٭ ٭

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید
شانتی نگر۔ حیدرآباد

آہ "راجیو"

امن کی آج سخت حاجت ہے
شانتی کی بڑی ضرورت ہے
غمِ راجیو ہے غمِ دوراں
دل میں ہم سب کے دردِ فرقت ہے

★

دیش بھارت کے سرفراز کہیں ہیں ہم لوگ
امنِ عالم کے محبت کے امیں ہیں ہم لوگ
ہم اہنسا کے پجاری ہیں یہ ہنسا کیسی
دیکھ کر منظرِ خوں چیں بجبیں ہیں ہم لوگ

☆

ڈاکٹر رزاق اثر
گلبرگہ

تعزیتی قطعات

اُٹھے جو سوالات ترے قتل کے پیچھے
نفرت کی ملی بات ترے قتل کے پیچھے
اس قتل سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے
فاشسٹ کا ہے ہاتھ ترے قتل کے پیچھے

★

جمہور کا ہے قتل ہوا، دیکھیے ذرا
یہ قتل راجیو کا نہیں سوچیے ذرا
نفرت سے نفرتیں ہی بڑھیں گی جہاں میں
فاشسٹ کو شکست یہاں دیجیے ذرا

☆

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۸ شمارہ ۷ جولائی ۱۹۹۱ء حیدرآباد

زرِ تعاون

ہندستان	سالانہ	65 روپے	۲ سال	120 روپے	تاحیات	1500 روپے
خلیجی ممالک	″	200 ″	″	360 ″	″	٥٠٠ آر ″
امریکہ	″	40 ڈالر	″	75 ڈالر	″	700 ڈالر
انگلستان	″	25 پونڈ	″	45 پونڈ	″	400 پونڈ
پاکستان	″	175 روپے	″	300 روپے	″	3000 پونڈ

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے

بک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی

... ۱۱۰۰۱ء

فہرست

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

قرآنِ کریم دعوت و ہدایت

قرآن کریم ہدایت و دعوت کی کتاب ہے اور احکام و شریعت کی بھی کتاب ہے لیکن اس کے اندر دعوت و ہدایت کا پہلو دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے، شریعت و احکام کی اہمیت سے انکار نہیں، اس کی عظمت سر آنکھوں پر لیکن سوال اولیت و اہمیت کا ہے، کون سا پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور کس کو اولیت حاصل ہے اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو میرا حقیر مطالعہ یہ ہے کہ شریعت و احکام کے مقابلہ میں دعوت و ہدایت کا پہلو قرآن کریم میں غالب ہے، کیونکہ ایمان کی بنیاد ہدایت پر ہے اور تبلیغ پر اس ایمان کے حصول کا دارومدار ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دوسرے تمام مضامین و مقاصد پر ہدایت و دعوت کا عنصر قرآنِ کریم میں نمایاں طور پر غالب ہے۔

قرآن کریم نے دعوت و تبلیغ کے کیا اصول بتائے ہیں؟ وہ کیا ضابطے ہیں جن کی پابندی کرنے کا قرآن نے حکم دیا ہے؟ کیا قرآن کریم میں ہمیں تبلیغ و دعوت کے متعین قوانین اور اس کے بے لچک حدود بتائے گئے ہیں۔

میرا خیال ہے دعوت کے طریقِ کار کو قانون و ضابطہ کی زبان میں نہیں بیان کیا گیا ہے اور یہ ایسا کرنا قرین مصلحت اور مقتضائے حکمت تھا۔ دعوت و تبلیغ کا انداز ماحول اور گرد و پیش کے حالات، مخاطبین کے طبائع اور دین کے مصالح کے

مطابق متعین ہوتا ہے۔

چونکہ دعوت کو صورتحال کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور "صورتِ حال" ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اس لیئے دعوت کے کام میں "حاضر کلامی" اور "حاضر دماغی" دونوں کی ضرورت ہے، مزید یہ کہ دعوت پیش کرنے والوں کو انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اور اس کی دکھتی رگوں اور سوسائٹی کے کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھ کر بتانا ہوتا ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مبلغ کو یہ بات کرنی چاہیئے، یہ نہیں کرنی چاہیئے، اور یہ کام کرنا چاہیئے اور یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کو ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیئے اور لوگوں کے سامنے دعوت کو اس طرح پیش کرنا چاہیئے، اس کے یہ حدود و ضوابط ہیں، خواہ وہ قوانین کے مرکزی خطوط (OUTLINE) ہوں کیونکہ ہر بدلے ہوئے معاشرے اور تبدیل شدہ صورتِ حال سے اس کو نمٹنا ہوتا ہے۔

اگر قوانین و ضوابط میں اس کو جکڑ دیا جائے تو وہی حال ہوگا جو ایک صاحب کو اپنے ملازم کے ساتھ پیش آیا تھا، جو ایک لطیفہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ کسی صاحب نے ایک ملازم رکھا، ملازم ضرورت سے زیادہ "قانونی" واقع ہوا تھا، اس نے مطالبہ کیا کہ مجھے میرے فرائض بتا اور نوٹ کرادیئے جائیں، چنانچہ ایک فہرست تیار ہوئی کہ فلاں وقت بازار سے سودا لانا ہے، فلاں وقت گھر صاف کرنا ہے، فلاں وقت یہ کام کرنا اور فلاں وقت وہ کام کرنا ہوگا۔ ملازم نے ان خدمات پر اپنے آپ کو مامور سمجھا جن کی تفصیل اس کی فہرست میں درج تھی، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک بار وہ صاحب جنھوں نے ملازم رکھا تھا، گھوڑے سے پر سوار تھے، وہ اترنا چاہتے تھے، پاؤں رکاب میں پھنس گیا، اور ان کی جان پر بن گئی، اب گھوڑا بھاگ رہا ہے اور یہ گھسٹتے ہوئے جا رہے ہیں، اسی حال میں ملازم پر نظر پڑی چیخ کر آواز دی کہ جلد آ اور میری ... ملو ... سکھلوں کہ آیا یہ خدمت بھی

میرے فرائض میں ہے یا نہیں؟ اس وقت جبکہ آقا کی جان جارہی ہے، اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں ہے، ملازم نے اپنے اصول و ضوابط پر عمل کیا اور آقا کی ضابطہ پرستی کی نذر ہو گئے اور ملازم ان کے کچھ کام نہ آیا۔ عربوں کو اللہ تعالیٰ نے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی بڑی صلاحیت بخشی ہے اور ان کے اندر فطرۃً سلامت روی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ خوب شعر ہے ؎

اذا کنت فی حاجۃ مرسلا　..　فأرسل حکیما ولا توصہ

یعنی اگر تمھیں کسی کام سے کوئی آدمی کہیں بھیجنا پڑے تو اس کے لئے ایک عقیل و فہیم آدمی کا انتخاب کرو اور اس کو (تفصیلی) ہدایتیں نہ دو، کیونکہ وہ خود اپنی سمجھ سے موقع محل کی مناسبت دیکھ کر وہ کام کرے گا جو تمھارے حقیقی منشاء کے مطابق ہوگا۔

دعوتِ دین بہت نازک کام ہے اور اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اس کے کچھ حدود مکانی ہیں، اور کچھ زمانی اور دونوں انتہائی وسیع اور پھیلے ہوئے زمانے کے لحاظ سے دیکھئے تو اس کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ کسی پیغمبر نے دعوت کا آغاز کیا یا غیر پیغمبر نے اس دعوت کی ابتداء کی اور اس کی انتہا کوئی بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اس کا مقام (مکانی حدود) بھی متعین نہیں کیا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ داعی مشرق میں ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مغرب میں ہو یا مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق منتقل ہو جائے۔ لہٰذا اگر صرف اہلِ مشرق کو سمجھانے کا طریقہ اس کو معلوم ہے تو مغرب میں وہ افہام و تفہیم کا کام انجام نہیں دے سکتا اور اگر وہ صرف اہلِ مغرب کے طبائع اور نفسیات سے واقف ہے تو مشرق میں اس کی دعوت برمحل اور بارآور نہیں ہوگی۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دعوت کے طریقِ کار کے حدود مقرر نہیں کئے اور یہ کام داعی کی قوتِ تمیز اور عقلِ سلیم پر چھوڑ دیا ہے۔ اس بات کا فیصلہ کہ کب اور کس وقت کون سا طریق کار اختیار کیا جائے اس کی طرف خود داعی

کا ذوق اور عقیدہ رہنمائی کرے گا اور اس کی دینی فکر جو اس کے احساسات و اعصاب پر حکمراں ہے، وہ خود طریق کار کا انتخاب کرلے گی، قرآن کریم نے صرف ایک وسیع حصار قائم کردیا ہے جس کے اندر دعوت دین کی پوری روح (اپرٹ) سماگئی ہے، وہ آیت یہ ہے۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (النحل ۱۲۵)

(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمھارا پروردگار اس سے خوب واقف ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں انھیں بھی خوب جانتا ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے دونوں باتیں پوری طرح عیاں ہیں، ایک داعی الی اللہ کو کتنی آزادی ہے اور کس درجہ پابندی ہے کہاں تک وہ جا سکتا ہے اور کس حد سے آگے قدم بڑھانا ممنوع ہے، جہاں تک دعوت کی وسعت اور داعی کی آزادی کا تعلق ہے وہ اس تعبیر سے واضح ہے کہ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ (بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایمان کی طرف دعوت دو یا صحیح اور سچے عقیدہ کی طرف بلاؤ، یا نماز قائم کرنے کی ترغیب دو انسانیت کے احترام کی تلقین کرو، یہ نہیں کہا گیا مگر یہ تمام باتیں "سَبِيلِ رَبِّكَ" میں سمٹ آئی ہیں، اس لفظ نے فکر و عمل کے آفاق کھول دیئے ہیں، اس میں دو کردیا ن سماوی، بشری ضروریات، انسانی زندگی میں پیش آنے والی حاجتیں سب داخل ہیں، "اُدْعُ" (بلاؤ) کا لفظ بھی کس درجہ معانی پر حاوی ہے اس میں نہ اس کی قید ہے کہ وعظ و تقریر کے ذریعہ بلاؤ نہ یہ کہ ..... وعظ و تلقین ہی کا ذریعہ اختیار کرو، یہ لفظ "اُدْ

تمام معانی اپنے جلو میں رکھتا ہے اور حسب موقع داعی دعوت کا فرض کبھی پند و نصائح سے کبھی وعظ و تقریر سے اور کبھی تحریر اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ادا کر سکتا ہے اور بلانے کا ہر وہ وسیلہ اختیار کر سکتا ہے جو مشروع ہو، موثر اور نافع ہو پھر فرمایا "سَبِيْلِ رَبِّكَ" اپنے رب کے رستے (کی طرف) اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں جس میں اتنی جامعیت اور وسعت، گہرائی اور گیرائی بیک وقت موجود ہو۔

"حکمت" کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے، دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے، اسی طرح "موعظت" بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے "حسنہ" کا لفظ بھی لامحدود معانی پر مشتمل ہے قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے۔ ایجاز و اختصار بھی ہے اور بیان و شرح بھی۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل ۱۲۵)

(اے پیغمبر! اپنے پروردگار کے رستے کی طرف دانش اور نیک نصیحت سے بلاؤ)

یہ آیت کریمہ بعثت محمدی سے پیشتر کے سب سے بڑے داعی الی اللہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں نازل ہوئی ہے، یہ پورا تذکرہ اس طرح ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ط وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ط اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ط وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (النحل ۱۲۰-۱۲۳)

بے شک (ابراہیم) (لوگوں کے) امام اور خدا کے فرماں بردار تھے جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں نہ تھے اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اور خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں

ہوں گے پھر ہم نے تمھاری طرف وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیم کی پیروی اختیار کرو جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا۔

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ" الخ لہٰذا یہ آیت کریمہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید سے مربوط ہے حضرت ابراہیمؑ کی ذات سے دعوتِ حق کا کیا تعلق ہے اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ کے ضمن میں اس آیت کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی دعوت میں اسی طریقِ کار کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے، اور یہ کہ آپ کی دعوت "حکمت و موعظت حسنہ" کے اصول پر کاربند تھی۔

قرآن کریم نے دعوت کے لیے واقعات بیان کرنے اور مثالیں دینے کا اسلوب اختیار کیا ہے، دوسرے وسائل دعوت کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ زود اثر اور دلنشین ہے اور مقصد کے حصول میں یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوا ہے۔ ایک طرف قرآن کریم نے اگر تفصیلی ضابطے اور قانونی باریکیاں بتانے کو ضروری نہیں سمجھا ہے تو دوسری طرف اس خلاء کو (اگر اس خلاء کو سمجھا جائے جو درحقیقت خلا نہیں ہے) انبیاء کرام کی سیرت اور ان کے مواعظ اور دعوت پر مکالموں سے پُر کیا ہے، یہ نمونے دلوں پر اثر اندازی کی بے انتہا قوت رکھتے ہیں، ذہن و قلب پر ان کا سحر کی مانند اثر ہوتا ہے کیونکہ عملی نمونوں کا جو اثر ہوتا ہے وہ کسی دوسرے وسائل دعوت کا نہیں ہو سکتا، منطقی، نفسیاتی، علم کلام کے انداز کے جدلی اصول، دعوتِ دین کے لیے کارآمد عناصر نہیں ثابت ہوئے ہیں، تمام آسمانی صحیفوں نے شروع سے آخر تک عملی نمونوں پر اعتماد کیا ہے۔ یہ نمونے اور مثالیں ادبی شہ پارے ہیں جو دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

ان میں سے اکثر واقعات چار برگزیدہ پیغمبروں سے ماخوذ ہیں، وہ انبیاء کرام

حضرت ابراہیمؑ، دوسرے حضرت یوسف علیہ السلام، تیسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آخر میں خاتم الانبیاء والرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

دعوت کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ ہے جس کو قرآن نے فراموش نہیں کیا ہے وہ یہ کہ دعوت کا کام صرف انبیاء کرام تک محدود نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ ہم کہاں اور اللہ کے پیغمبر کہاں، وہ لوگ اللہ کی نوازش خاص سے بہرہ مند تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور وحی سے نوازا تھا، روح القدس سے ان کی تائید وتقویت کا انتظام فرمایا گیا تھا، ہم عاجز بندے کس طرح ان برگزیدہ انبیاء کرام کی نقل کر سکتے ہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس سبب سے ایک مثال ایسے شخص کی دی ہے جو نبی نہیں تھا اور نہ پیغمبروں کے ممتاز اور جلیل القدر ہم نشینوں میں تھا، ایک مومن تھا، فرعون کی قوم کا فرد تھا۔ قرآن کریم نے صرف اس قدر بتایا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ (المومن ۲۸)

اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن شخص نے (جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتا تھا) کہا یعنی اس کے حالات اور ماحول نے اس کو دین کے اعلان کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ خواہ وہ ایمان قوت کے لحاظ سے جس قدر بھی بلند رہا ہو مگر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی طرح یا حضرت ابو ذرؓ کی طرح اپنے ایمان کا اظہار نہ کر سکا، لیکن وہ مومن تھے اور اپنے ایمان کو اب تک چھپائے ہوئے تھے انھوں نے اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ نہیں کی اور ایک دوست، خیر خواہ اور اپنے دوستوں اور بھائیوں کا بہی خواہ بنکر انھوں نے دعوت دین کا فرض انجام دیا، ایک صاحب ادراک و بصیرت داعی کے لئے اس واقعہ میں ایک نمونہ ہے۔

وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ (النساء ۹۵)

اور اللہ نے ان دونوں طبقوں کے لئے بہتر نعمتوں کے وعدے کئے ہیں

کتابِ حیات

قرآن اللہ تعالیٰ کی سب سے عظیم کتاب ہے۔ ایک مثالی تمدن کے قیا
کے لئے اس کتاب میں موجود اصول وضوابط ہر عہد کے انسان کے لئے رہبری کا
یک صالح معاشرے کے اوصاف اس کتاب رشد وہدایت میں موجود ہیں۔ و
گ جو ایک صالح معاشرہ قائم کرتے ہیں ان کی خصوصیات سے بھی اس کتاب برا
س آگاہی بخشی گئی ہے۔ اسی لئے اس کتاب کو کتاب ہدایت بھی کہا جاتا ہے
ہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں، آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلعم
ا زبانی ان کے اخلاقی اوصاف بھی اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں۔

دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے کہ شریعت محض ساری
یں اسی ہیں ادائی کے کرنے یا نہ کرنے پر نجات کا انحصار ہے۔ لیکن اسلام
قرآن کی صورت میں مکمل اور اکمل دین دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ
اپنے اس دین کو 'الاسلام' کے نام سے تعبیر کیا۔ جس کے معنی اطاعت کرنے
ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعت حق
طرف انسانوں کو دعوت دی جائے، ایک ایسی دعوت جو ہر گام پر زندگی
بین تر بنا دے 'ور جس کی اساس قرآن حکیم پر ہو۔

قرآنی تعلیمات کا مقصود یہ ہے کہ انسان خیر کے فروغ کے لئے اپنے پورے وجود
بیت وتہذیب کرے۔ اپنے فکر وعمل کو یوں سنوارے کہ دونوں ایک وحدت بن
ں۔ کتاب الٰہی مکمل ہدایت ہے۔ ایک واضح دستور حیات ہے جو تمام
ی اور معاشرتی، انفرادی اور اجتماعی مسئلوں کی تمام ضرورتوں کی کفالت کرتا
۔ اسے پڑھنا، اسکی تلاوت کرنا، اس کی سورتوں اور آیتوں کو سمجھنا اور ان سے
نادہ کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری بھی ہے اور فرض بھی۔

پیش کردہ: عابد القادر صفی عنہٗ

مسلم کا نظریۂ زندگی

اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان کا نظریۂ زندگی کیا ہونا چاہیئے تو ہمیں اولاً یہ جاننا ہوگا کہ مسلما
کس کو کہتے ہیں۔ جس شخص نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دیا وہ مسلمان ہے، جس۔
اپنے اوپر سے اپنا سارا اختیار ختم کرکے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں کوئی کام ایسا نہیں کروں گا جو اللہ کی مرضی
خلاف ہو، تمام کاموں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی و احکام کے مطابق چلوں گا اور تمام
کاموں میں اس بات کا خیال رکھوں گا اللہ اور اس کے رسولؐ کی کوئی خلاف ورزی نہ ہو۔ جب
نقطۂ نظر لے کر آدمی چلتا ہے تو مسلمان کہلاتا ہے۔ جب وہ اس نقطۂ نظر کا حامل ہوجاتا
تو پھر اس پوری کائنات کے بارے میں اس کا رویہ مختلف ہوجاتا ہے۔ کائنات کے بارے
میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات اس کی نہیں، اور اس کائنات میں جتنی چیزیں ہیں یہ سب
اس کی نہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے، اور جو کچھ اللہ نے ہمیں دیا ہے یہ
امانت کے طور پر دیا ہے اور ہم نے اسے اس طرح استعمال کرنا ہے جس طرح کہ دینے والے
ہمیں حکم دیا ہے۔ اگر میرے پاس

اگر میرے پاس زندگی ہے اور اس زندگی کی بدولت میرے پاس قوتیں ہیں، میں دیکھ سکتا
میں سن سکتا ہوں، میں بول سکتا ہوں، میں پکڑ سکتا ہوں، میں چھو سکتا ہوں، میں کوئی بھی
کام کرسکتا ہوں، کوئی بھی ذہنی اور فکری کام کرسکتا ہوں تو یہ ساری صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی دی ہو
ہیں۔ اس لئے ان صلاحیتوں کو میں اس طرح بروئے کار لاؤں گا جیسے اللہ تعالیٰ کا حکم ہو۔
اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے مال و دولت عطا کیا ہے تو میں اس کو اسی طرح استعمال کروں گا جیسے
کہ اس کا حکم ہے اور ان راستوں میں نہیں لگاؤں گا جن راستوں سے اس نے مجھے روکا ہے
اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد دی ہے تو میں اولاد کی تربیت اس طریقے سے کروں گا جیسے کہ مجھے
اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اولاد کو ان کاموں پر نہیں لگاؤں گا جن سے اس نے روکا ہے۔ اسی طرح
کائنات کے بارے میں اس کا رویہ یکسر بدل جاتا ہے اور وہ اس نظریہ کا حامل ہوجاتا ہے
جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے یہ اس کی امانت ہے اور پھر اس کے نظریۂ زندگی میں یہ بات
آتی ہے کہ وہ ہر کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے اور اسے اتو

مکمل چھوٹ نہیں ہے کہ وہ جو چاہے کرے ۔ وہ ہر کام اپنی خواہش کے مطابق کر سکتا ہے بشرطیکہ ہر کام کرنے سے پہلے اسے یہ سوچنا ہوگا اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ میرے ہر کام کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے، میں جو گفتگو کرتا ہوں وہ لکھی جاتی ہے، ہاتھوں یا بدن کے کسی بھی عضو سے میں کوئی کام کرتا ہوں وہ لکھا جاتا ہے اور اس سب کا ریکارڈ ہوتا ہے اور یہ سارا ریکارڈ ایک دن پیش کیا جائے گا، بھری کتاب لکھی لکھائی میرے سامنے آجائے گی اور مجھے ایک ایک بات کی Justification دینی ہوگی، ایک ایک بات کا جواز مہیا کرنا ہوگا کہ میں نے یہ کام کیوں کیا ۔ یہ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اس کا کیا جواز تھا اور یہ بتانا ہوگا کہ کیا میں نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا ہے یا اس کی خلاف ورزی میں کیا ہے ۔ اور پھر آدمی کے نظریے میں یہ بات بھی شامل ہو جاتی ہے کہ اگر میں نے اللہ کے حکم کے مطابق کام کیا ہے، اپنی زندگی اس کے حکم کے مطابق گزاری ہے تو مجھے اس کا Reward ملے گا، اس کا انعام ملے گا، مجھے آخرت میں ایسی زندگی ملے گی جو سکون اور اطمینان کی ہوگی، جو راحت کی اور نعمتوں کی زندگی ہوگی، اور اگر میں نے یہ زندگی اس کے حکم کے خلاف گزاری تو مجھے آخرت میں سزا بھگتنی ہوگی اور مجھے ایک ایک بات کا جواب دینا ہوگا کہ میں نے اس کی خلاف ورزی کیوں کی اور مجھے وہاں ایسی زندگی گزارنا ہوگی کہ جو گزارنی شاید میری ہمت میں نہ ہوگی ۔

یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ جب ہم کلمہ پڑھتے ہیں تو یہ سب باتیں اس ایک کلمے میں آجاتی ہیں ۔ اسی لئے علامہ اقبال کہتے ہیں :

اگر گویم مسلمانم بہ لرزم   کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

کہ میں اگر یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو کانپ جاتا ہوں، اس لئے کہ لا الٰہ کی مشکلات میرے سامنے آجاتی ہیں کہ لا الٰہ صرف ایک کلمہ نہیں ہے کہ جو میں نے کہہ دیا اور بس وہ بات مکمل ہو گئی ۔ اگر یہ صرف زبان سے کہہ دینے والی بات ہوتی تو شاید مشرکین مکہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتنی بڑی مخالفت کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی یہ ہلکا پھلکا کلمہ پڑھنا تو کوئی مشکل نہیں ہے جیسا کہ ہم شب و روز پڑھتے ہیں اور ہمارے اندر کوئی تبدیلی نہیں آتی ۔ لیکن مکہ کے مشرک یہ جانتے تھے کہ یہ کلمہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں، نہ میری جان اپنی جان ہے، نہ میرے اعضا میرے اپنے اعضا ہیں، نہ میری قوتیں میری اپنی قوتیں ہیں، نہ میرا مال میرا اپنا مال ہے،

نہ میری اولاد میری اپنی اولاد ہے، غرض کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں یہ کہہ سکوں کہ یہ میرا ہے اور اس پر مجھے مکمل اختیار ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کا ہے اور میں ایک آلہ کار ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کہے گا مجھے اپنے تمام معاملات کو اسی طرح چلانا ہے اور آدمی اس طرح جب کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کو دیکھتا ہے تو یقیناً لا الٰہ الا اللہ اسے کائنات کی بھاری چیز نظر آتی ہے بہت سب سے بھاری چیز یہی ہے کہ آدمی لا الٰہ الا اللہ پر یقین رکھے جس کے بعد آدمی کا مکمل طور پر زندگی کے بارے میں طرزِ عمل اور رویہ بدل جاتا ہے۔

آپ نے ایک حدیث شریف سنی ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کے نامۂ اعمال قیامت کے دن کھلے رہے ہوں گے اور اس کے نامۂ اعمال میں برائیاں ہی برائیاں ہوں گی اور جب وہ برائیاں ایک پلڑے میں رکھی جائیں گی تو وہ پلڑا بہت نیچے ہو جائے گا۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ آئے گا اور وہ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا اور وہ دوسرا پلڑا اس چھوٹے سے پرزے سے اتنا جھک جائے گا کہ وہ بہت سی برائیاں ہلکی رہ جائیں گی۔ لوگ حیرت سے دیکھیں گے کہ یہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے دوسرے پلڑے میں اتنا بوجھ بڑھ گیا۔ لوگ دیکھیں گے کہ وہ ہوگا لا الٰہ الا اللہ۔ گویا حضور صلعم نے تمثیلاً یہ سمجھایا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ اتنی وزنی چیز ہے کہ صرف اس ایک کلمہ کی وجہ سے سب کچھ بدل جاتا ہے۔ انسان وہ انسان نہیں رہتا جو لا الٰہ الا اللہ سے پہلے تھا۔ اگر ہم اس بات کو اس ساری سوچ کو سامنے رکھ کر لا الٰہ الا اللہ پڑھیں تو ایک مسلمان کی حیثیت سے ہماری زندگی کے بارے میں ہمارا رویہ ہمارا طرزِ عمل سب متعین ہو جاتا ہے اور پھر صحیح معنی میں ایک مسلمان، مسلمان ہو جاتا ہے

قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین ۝ کہ میری عبادتیں اور میری بدنی عبادتیں اور مالی عبادتیں اور میرا جینا مرنا سب ہی اس اللہ کے لئے ہے۔ یعنی انسان اپنی پوری موت وحیات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں دے دے، پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تو یہی مسلمان لیے خاص کی زندگی ہے۔

(واحد کریم۔ عبدالقادر غفر اللہ لہٗ)

سید احمد عروج قادری قسط (۱۱)

اسلامی تصوّف

اخلاص کو ختم کرنے والی تیسری چیز

تیسری چیز یہ ہے کہ آدمی اچھا اور عمدہ مال موجود ہونے کے باوجود اللہ کی راہ میں بالقصد ردی اور خراب مال خرچ کرے۔

اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو، جس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے پر تو آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تم کو لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ (ایضاً ۲۶۷)

اس آیت میں "خبیث" کا لفظ ردی اور گھٹیا مال کے لیے استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ایسا گھٹیا مال جو تمھیں لینا پڑے تو دل پر جبر کیے بغیر تم اس کو قبول نہ کرو اسے اللہ کی راہ میں نہ دو، اللہ کی راہ میں ایسا مال دینا حد درجہ کی دناوت اور کم ظرفی ہے تمھیں سڑی گا ئے برہمن کو دان کرنے کی روش اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ البتہ اگر کسی کے پاس حلال کی کمائی کا گھٹیا مال ہی ہو اور اچھا مال موجود نہ ہو تو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا درست ہے یہاں جس بات کو اخلاص کے خلاف قرار دیا گیا

ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اچھے مال کو اپنے لیے بچا کر رکھے اور اللہ کی راہ میں دینے کے لیے گھٹیا مال اور ردّی مال ہی منتخب کرے۔

سورہ الدہر میں ابرار یعنی اللہ کے فرماں بردار، وفادار اور نیکوکار بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

"اور اللہ کی محبّت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ہم تمھیں خالص اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔" (الدہر: ۸ تا ۱۰)

یہ اخلاص کا وہ درجہ ہے جو ابرار یعنی اللہ کے وفادار اور اس کی محبّت میں سرشار بندوں کو نصیب ہوتا ہے۔

"قیدی" عام ہے مسلم ہو یا کافر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ جس کے پاس کوئی قیدی رہے وہ اُس سے اچھا برتاؤ کرے، اس حکم کی تعمیل میں صحابۂ کرام میں سے جن لوگوں کے پاس قیدی تھے وہ اُن کو اپنے سے بہتر کھانا کھلاتے تھے۔

یہ جو بات کہی گئی کہ "ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے" اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے یہ حاشیہ لکھا ہے۔

"ہم تو اخلاص کے ساتھ کھلانے پلانے کے بعد بھی ڈرتے ہیں کہ دیکھئے ہمارا عمل مقبول ہوا یا نہیں، مبادا اخلاص میں کمی رہ گئی ہو اور اُلٹا منہ پر مارا جائے۔"

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حاجت مندوں کی مدد کر کے ان کے شکریہ چاہنا بھی اخلاص کے منافی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی اخلاص کی حقیقت پوری طرح

واضح ہو گئی ہے۔ ریاء و سمو کے بارے میں چند احادیث کے ترجمے اوپر پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہاں چند اور حدیثوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے لوگوں کے لیے ہیں، ایک شخص کے لیے وہ باعثِ اجر، ایک شخص کے لیے وہ ستر (حجاب) اور ایک شخص کے لیے وہ موجب عذاب ہوتے ہیں وہ باعثِ اجر اس شخص کے لیے ہیں جس نے انھیں جہاد فی سبیل اللہ کے قصد سے پالا ہے۔ اس نے انھیں کسی چراگاہ یا باغ میں لمبی دوڑی سے باندھا، اپنی لمبی رسی میں وہ جو کچھ کرتے ہیں (کھانا پینا، چلنا پھرنا) وہ سب اس شخص کے لیے حسنات (نیکیاں) بن جاتے ہیں اور اگر وہ اپنی رسیاں توڑ ڈالیں اور اس مقام سے کچھ دور تک دوڑ لگائیں تو ان کے قدموں کے نشانات اور ان کی لیدیں اس شخص کے لیے نیکیوں میں شمار کی جائیں گی اور اگر وہ کسی نہر پر جا کر جب کہ ان کے مالک نے اس کا ارادہ بھی نہ کیا ہو پانی پیئں تو پانی کے گھونٹ بھی اس شخص کے لیے نیکیاں بن جائیں گے اور ایک وہ شخص ہے جس نے انھیں استغنا حاصل کرنے اور اس ارادے سے پال رکھا ہے کہ لوگوں سے کچھ مانگنا نہ پڑے پھر یہ کہ وہ ان کی گردنوں اور پیٹھوں کا حق ادا کرنا بھی نہ بھولا ہو (یعنی ان کی زکواۃ ادا کی ہو اور لوگوں کو عاریۃً سواری کے لیے دیا ہو) تو وہ گھوڑے اس شخص کے لیے ستر (پردہ) ہیں —— اور ایک وہ شخص ہے جس نے انھیں فخر ریا اور اہلِ اسلام کی دشمنی کی نیت سے باندھ رکھا ہے تو وہ گھوڑے اس کے لیے گناہ اور موجبِ سزا ہیں — یہ حدیث بخاری کی کتاب "الجہاد" اور کتاب "التفسیر" میں اور موطاؔ امام مالک کی کتاب "الرقاق" میں ہے۔ اس نے اخلاص کو غیر اخلاص سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے قصد اور ارادے سے جو تیاری بھی کی جائے گی خواہ وہ گھوڑے پالنے کی شکل میں ہو یا اس زمانے میں جدید آلاتِ جنگ اور سامانِ حمل ونقل کی شکل میں، وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلصانہ شمار ہو گی اور اس کا اجر

س وسعت کے ساتھ ملے گا جس کا ایک نقشہ اس حدیث میں کھینچا گیا ہے۔

دوسرے شخص کی نیت چونکہ محض اپنے فقر کو مخفی رکھنا اور لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچنا ہے جو ایک مباح کام ہے اس پر نہ ثواب ہے نہ عذاب۔ بہتر کے معنی یہ ہیں کہ وہ گھوڑے اس شخص کی اصل حالت کے لیے پردہ ہیں۔

تیسرے شخص نے ایسی چیزوں کا ارادہ کیا ہے جو گناہ ہیں اس لیے وہ مستحقِ سزا ہے۔ تین شخصوں کی الگ الگ نیتیں بیان کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے لیے مخلصانہ نیت کو بالکل ممتاز کر دیا ہے۔ اس حدیث کا مطالعہ قرآن کی آیتِ ذیل کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔

" اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا، پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔ (الانفال: ۶۰)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا یارسول اللہ کوئی آدمی ایسا ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ متاعِ دُنیا میں سے کوئی متاع (سامان) حاصل کرنا چاہتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔

(مشکوٰۃ کتاب الجہاد بحوالہ ابوداؤد)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کے قصد سے جہاد کرنا مخلصانہ نہیں ہے۔ یہ ارادہ اخلاص کے خلاف ہے۔ ▲

(باقی آئندہ)

خصائص سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

پروفیسر چوہدری محمد اشرف قادری

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مکہ کے معزز و متمول کپڑے کے تاجر ابو قحافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر اُم الخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن مبارک سے ۵۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں ۲ سال ۴ ماہ چھوٹے تھے اور آٹھویں پشت میں آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب مبارک میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مرّہ

کلاب — تیم

قصی — سعد

عبد مناف — کعب

ہاشم — عمرو

عبد المطلب — عامر

عبد اللہ — عثمان ابو قحافہ

سید الکونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم — سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ آپ کو بڑے ناز و نعم میں پالا گیا۔ پورے خاندان کی بھرپور توجہ اور بے پایاں محبت کا مرکز تھے۔ بچپن ہی سے آپ کا دامن ہر قسم کی معصیت سے پاک تھا۔ بے حیائی، فحش گوئی اور شراب نوشی سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ بت پرستی کو بہت برا سمجھتے تھے۔ انتہائی دیانتداری، راست بازی اور معاملہ فہمی کی وجہ سے معزز ترین قریش انہیں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھنے لگے۔ خداداد ذہانت، عقل و فراست کی بناء پر بیس سال کی عمر میں ہی کاروبارِ تجارت آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ بہترین اوصاف اور اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بڑی شہرت حاصل ہونے لگی۔ اہلِ مکہ خون بہا کی بڑی بڑی رقمیں اور اپنی امانتیں آپ رضی اللہ عنہ کے پاس جمع کرانے لگے۔ ان بے شمار خوبیوں نے آپ کو اعلانِ نبوت سے قبل ہی دامنِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنی دوستی اور رفاقت کے لیے پسند فرمایا۔ اور پھر یہ رفاقت تا زیست قائم۔ سیرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے جہاں ہم انہیں "رفیقِ غار" کے اعزاز سے بہرہ ور دیکھتے ہیں وہاں بعد از وفات "رفیقِ مزار" ہونے کی عظیم سعادت سے بھی آپ رضی اللہ عنہ سرفراز دکھائی دیتے ہیں۔

آپ رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مطہرہ میں کچھ خصائص ایسے نظر آتے ہیں جو پوری ملتِ اسلامیہ میں آپ کو امتیازی حیثیت بخشتے ہیں۔

ان خصائص نے آپ کی شخصیت کو وہ نمایاں اور خصوصی شرف عطا کر دیا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے بعد نہ اب تک کسی کو حاصل ہو سکا ہے اور نہ تاقیامت کسی کو حاصل ہو سکے گا۔ پوری امتِ مسلمہ پر حاصل ان امتیازات نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو "بعد از نبی" کے عظیم ترین مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔

مسلم اوّل: جب سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا تو سیدنا صدیق اکبر

رضی اللہ عنہ بغرضِ تجارت یمن گئے ہوئے تھے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس لوٹے تو سردارانِ قریش ابوجہل، عُتبہ اور شیبہ انہیں ملنے کے لیے آئے اور دورانِ گفتگو تازہ خبر کے طور پر آپ کو بتایا کہ "ابوطالب کے یتیم بچے محمد بن عبداللہ نے نبی ہونے کا دعویٰ کردیا ہے ہم تمہاری واپسی کے منتظر تھے تاکہ اُس کی روک تھام کا کوئی پروگرام مرتب کیا جاسکے"۔ یہ سُن کر یوں معلوم ہوا کہ گویا یہ اڑتیس [۳۸] سالہ نوجوان اس خوشخبری کا پہلے ہی سے منتظر تھا۔ اپنے محبوب دوست کو ملنے کے لیے اس کے دل میں آتشِ اشتیاق بھڑک اُٹھی، سردارانِ قریش کو رخصت کیا خود بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر کلمۂ شہادت پڑھا اور دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہو گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر خود فرمایا "میں نے جس شخص کے سامنے اسلام پیش کیا اس میں ایک قسم کی جھجک اور تردد و فکر ضرور پائی سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کہ جس وقت میں نے اسلام ان کے سامنے پیش کیا انہوں نے بے جھجک اسے قبول کرلیا"۔ اس طرح آزاد مردوں میں اسلام قبول کرنے کی اوّلیت آپ کو نصیب ہوئی۔

مُصَدِّقِ اوّل : کُفارِ مکہ ایک جگہ بیٹھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کے خلاف زہر افشانی کرنے کے بعد مسکنِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رُخ کرتے ہیں اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جاکر کہتے ہیں " کہ تمہارا نبی تو عجیب و غریب باتیں کرنے لگا ہے وہ کہتا ہے کہ میں راتوں رات آسمان کی سیر کرکے مکہ میں واپس آگیا" ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ سُن کر حیرانگی سے پُوچھا۔ "کیا تم سے یہ باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں انہوں نے کہی ہیں" اس پر زبانِ صدیق بلا تامل پکار اُٹھی "اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں" یوں مُصدِّقِ اوّل ہونے کا شرف بھی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہی حصہ میں آیا۔

رفاقتِ سفر کا اعزاز : سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ صبح وشام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لے جاتے ایک روز خلافِ عادت دوپہر کے وقت چلچلاتی دھوپ میں تشریف لے گئے سرِ مبارک کو تمازت سے بچانے کے لیے چادر سے ڈھانپ رکھا تھا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی فراست سے سمجھ گئے کہ آپ کا نا وقت تشریف لانا بے وجہ نہیں ہو سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ ابوبکر رب ذوالجلال کی طرف سے مکہ کو چھوڑنے کی اجازت آگئی ہے یہ سن کر حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حبیب رضی اللہ عنہ نے ملتجیانہ نگاہوں سے رُخِ انور کی طرف تکتے ہوئے عرض کی "والصحابۃ یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم" میری رفاقت یا رسول اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا" رفاقت کی بھی اجازت ہے" رفاقتِ سفر کا مژدہ جانفزا سنتے ہی فرطِ مسرت سے آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

مرکبِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم : حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کی رات جب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ کی جانب روانہ ہوئے تو آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے نعلینِ مبارک اُتار لیے اور پنجوں کے بل چلنے لگے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مُبارک زخمی ہوگئے اپنے محبوب کو اس شکل میں دیکھ کر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مرکبِ مُصطفےٰ بننے کا شرف عطا کرکے بارِ نبوت کو اُٹھانے کی حیران کن قوت سے نواز دیا۔

یارِ غارِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم : مکہ سے مدینہ طیبہ کا سفر ہر طرح سے پُرخطر اور کٹھن تھا۔ دورانِ سفر پہلا مرحلہ غارِ ثور میں قیام تھا سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پر سوار کیا اور پہاڑی کی چوٹی پر لے گئے اور غار کو جا کر صاف کیا اس پُرخطر جگہ پر صرف اور صرف سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ

کو صحبت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان انمول لمحات میسّر تھے اسی لیے رہتی دنیا تک قرآن گواہ بن کر مسلمانوں کو بتا رہا ہے۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ ۔ (سورۃ التوبہ)

یہ عظیم ساعتیں جو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس غار میں گزاریں تمام اُمت کے لیے قابلِ رشک ہیں۔ کیا تنہائی کا عالم ہوگا اور کیا راز و نیاز کی باتیں ہوں گی ان ساعتوں کی عظمت کے سبب ہی تو آقائے دو جہاں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے استفسار پر بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیکیاں آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غارِ ثور کی ایک رات کی نیکیاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ساری نیکیوں پر بھاری ہیں۔ غارِ ثور میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے انتہائی فکرمند دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو ان کی حالتِ حُزن پر اتنا پیار آیا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے "لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" کے الفاظ کہلوا کر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بہت بڑے اعزاز سے نوازا۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف آوری پر فرزندانِ توحید کھنچے چلے آئے اور ایک مرکز پر جمع ہونے لگے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیرِ مسجد کا ارادہ فرمایا اس سلسلہ میں مدینہ کے دو یتیم بچوں کی زیرِ ملکیت زمین پسند فرمائی گئی جسے اگرچہ وہ ان کے لواحقین بلا قیمت دینے پر مصر تھے تاہم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں کا مال بلا قیمت لینا پسند نہ فرمایا اور اس کی قیمت ادا کرنے کا شرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بخش دیا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "یومِ بدر میں ہم نے نمازِ ... [illegible]

پھر ہم نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کون رہے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مشرکین میں سے کوئی آپ پر چھاپہ مارے۔ بس خدا کی قسم، سوائے ابو بکر کے ہم میں سے کوئی قریب نہ گیا وہ ننگی تلوار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ فگن رہے جس کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا ابو بکر اُس پر حملہ ہوئے، جس خیمے میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تھا اسی میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، ٹھہرے اور آپ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بارگاہ رسالت سے مالی قربانی پیش کرنے کا اعلان ہوا تو اگرچہ وہ زمانہ بڑی ہی عسرت اور تنگی کا تھا لیکن سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور گھر کا سارا اثاثہ لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں یہ کہتے ہوئے نچھاور کر دیا۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس ٭ صدیق کے لیے ہے خدا و رسول بس

۹ ہجری میں مسلمانوں پر حج کی فرضیت کا حکم آنے پر مدینہ سے حج کی غرض سے مسلمانوں کا قافلہ تیار ہوا۔ آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر الحج کا عظیم عہدہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل وکمال کے مظہر اتم تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے اسرار و معارف کو سب سے زیادہ سمجھنے کا آپ کو شرف حاصل تھا۔

ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے خطبہ میں فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا خواہ وہ دنیا کو اختیار کرے یا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے اسے اختیار کرے تو بندے نے وہ اختیار کیا جو اللہ کے پاس ہے۔ یہ سنتے ہی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور آنسو ٹپ ٹپ رخساروں سے گرنے لگے۔

حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ کیفیت دیکھ کر ہم حیران ہو کر انھیں دیکھنے لگے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات بیان فرمائی ہے اس میں رونے کی بات ہی کیا ہے ؟ لیکن بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں بندے سے مراد خود حضور نور کی اپنی ذاتِ مبارکہ تھی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کی خبر دی تھی جس کو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا مزاج شناسِ رسول اللہ علیہ وسلم سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کلماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی رمز کو سمجھ لیا اور آپ بے ساختہ گریہ کناں ہو گئے۔

آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض جب شدید ہو گیا تو آپ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہو کہ نماز کی امامت کریں یہ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی "وہ ایک رقیق القلب، کمزور آواز آدمی ہیں جب قرآن پڑھتے ہیں تو بہت روتے ہیں ۔" مطلب یہ تھا کہ نماز کی امامت نہ فرما سکیں گے مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر آپ کو یہ فرض ادا کرنا پڑا اس طرح سترہ نمازوں کی حیاتِ مقدس میں امامت کا شرف آپ کو حاصل ہوا۔

دوشنبہ نمازِ فجر کے وقت سرورِ کائنات پردہ اُٹھا کر باہر تشریف لائے شدید سر کی وجہ سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی ۔ آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم یہ روح پرور نظارہ جس میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امام تھے اور اُمت کے چھوٹے بڑے مقتدی دیکھ کر محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مُبارک لبوں پر مسرت کی دلآویز لہر دوڑ گئی ۔

مرضِ وصال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی زیر نگرانی رومیوں کے خلاف سات سو جیالے نوجوانوں کا ایک لشکر روانہ کرنے کے لیے نامزد کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید علالت اور وصال کے باعث روانہ نہ کیا جا سکا ۔ سیدنا

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بیعت کے دوسرے ہی روز حکم دیا کہ جیش اُسامہ تیار ہو کر بغیر وقت ضائع کیے روانہ ہو جائے۔ حالانکہ فتنہ ارتداد اور کاذب مدعیان نبوت کی سرکشی کے سبب اصحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی رائے اس کے خلاف تھی۔ مگر آپ نے فرمایا " خُدا کی قسم! اگر مدینہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ جنگل کے درندے مجھے اُٹھا کر لے جائیں تب بھی اس مہم کو نہیں روک سکتے جس کے بھیجنے کا محبوبِ خُدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا تھا۔

خلفائے راشدین میں سے صرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ہی خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ جلیلہ عطا ہوا جبکہ دیگر خلفائے امیر المومنین کے لقب سے ملقب تھے۔

۲۱ جمادی الآخر ۱۳ ہجری غروبِ آفتاب کے وقت جب محبوبِ خُدا کی عمر ۶۳ سال یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے برابر ہو گئی تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

امیر المومنین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فضل و شرف اعزاز و خصائص کی انتہا یہ ہے کہ آپ کو حضور سرورِ کائنات کے ساتھ خصوصی اور امتیازی شرفِ رفاقت حاصل ہے سفر و حضر کی رفاقت، غارِ ثور کی رفاقت اور آخر میں پہلوئے مصطفےٰ میں تدفین کے ذریعہ رفاقتِ قبر کا نصیب ہونا پوری اُمت میں آپ کو عظیم مرتبہ ظاہر کرتا ہے۔

علامہ جامی رحمتہ اللہ علیہ شواہد النبوت میں لکھتے ہیں " سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت وصیت فرماتے ہوئے کہا کہ مرنے کے بعد میرا جنازہ تیار کر کے روضۂ اقدس کے پاس رکھ دینا اور میرے آقا سے اُن کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت طلب کرنا۔ اجازت مرحمت ہو جانے کی صورت میں مجھے میرے آقا کے پہلو میں دفن کر دینا ورنہ لے جا کر جنت البقیع میں دفنا دینا۔ جب آپ کی وصیت کے مطابق ایسا کیا گیا تو روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آواز آئی۔ ادخلو الحبیب الی الحبیب

" حبیب کو اس کے حبیب کے پاس رکھ دو "

مولانا محبوب الرحمن ازہری ندوی

مسجد اور مسلمان

اسلام اور مسلمان کے لفظ کی ابتداء ہزاروں سال پہلے سے ہے ابھی تک اس سے زیادہ قدیم لفظ کسی بھی دوسرے دین یا فرقے کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے مستند اور باوثوق ذرائع میں کتب سماویہ کو مقدم مانا گیا ہے اور علمی اعتبار سے قرآن میں اب تک کوئی تحریف یا تبدیل کی گنجائش سے انکار کیا گیا ہے۔ قرآن نے کہا۔ مِلّةَ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین من قبل۔

یہ تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب ہے انھوں نے تمہارا نام مسلمین رکھا ہے" زمانہ گزرتا گیا اور حضرت ابراہیمؑ کے بعد انبیاء اور مرسلین کا سلسلہ جاری رہا، کتب سماویہ کا نزول ہوتا رہا اور مختلف مذاہب موسوم ہوتے رہے قدرت خداوندی نے آخر اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہا تو خاتم النبیین کی بعثت ہوئی اور مکہ معظمہ میں جب دعوت کا کام شروع ہوا تو لوگ انفرادی طور پر اللہ کی عبادت کرنے لگے"۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے عبادت کے لئے مکہ کے قریب ایک پہاڑی پر غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے، کیونکہ عبادت گاہ کا تصور منتشر مذاہب کے اپنے اپنے طریقوں پر تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان میں سے کسی کو اختیار کرتے تو وہ ایک فریق بن جاتے بعثت کے بعد مکہ کے حالات ایسے نہیں

تھے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا کوئی مرکز مقرر ہو سکتا کیونکہ مسلمان افراد پر کافی سختیاں اور مظالم کفار کی جانب سے مسلسل جاری تھے، مکی زندگی میں صرف بیت اللہ (جو جزیرۃ العرب کے تمام باشندوں کے لئے مرکزی عبادت گاہ کا درجہ رکھتا تھا) مشہور و معروف عبادت گاہ اور مرجع خلائق تھا اور اسی میں تمام قبائل عربیہ کے معبودوں کا سلسلہ جاری ہوتا تھا، یہود و نصاری بیت المقدس کو اپنا مرکز مقرر کئے ہوئے تھے، یعنی مرکزیت صرف دو عبادتگاہوں کو حاصل تھی، گرچہ اس مرکزیت کو ختم کرنے کی بار بار کوششیں کی گئیں لیکن ہمیشہ ناکامی ہوتی رہی۔ بخت نصر وغیرہ نے بیت المقدس کو اور شاہِ حبش نے کعبہ کو ختم کرنے کی بھر پور کوشش کی جس کا نتیجہ صفر ہی رہا۔ مکہ سے مدینہ منورہ دینِ اسلام کی دعوت منتقل ہوئی تو بیت المقدس کی مسلمہ مرکزیت بحیثیت ادیان سماویہ کی صراحت کے باقی رہی اور بیت اللہ پر چونکہ مشرکوں کا غلبہ تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازمیں قبلہ کا رخ بیت المقدس کو رکھا، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان بیت اللہ کی طرف تھا یہ رجحان بھی اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو عبادت گاہ بنائی تھی وہی اصل مرکزی نقطہ تھا اللہ تعالیٰ کی وحدت اور عبادت کا۔ اسلام چونکہ استسلام اور خود سپردگی کا نام ہے۔ اس لئے اہلِ عقل و خرد اپنے جذبات دلی احساسات کو اللہ کے حکم کے تابع بناتے ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کا ہی رخ کیا، ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ پہونچے، سب سے پہلے آپ اونٹنی قباء کے مقام پر ٹھہری اور آپ نے بحکم خدا وہاں چند روز قیام کیا اور سب سے پہلے مسجد کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں نے سب سے پہلی عبادت گاہ میں خدائے واحد کے سامنے اجتماعی طور پر سر جھکایا، اس کے بعد وہاں سے آپ بحکم خداوندی روانہ ہو کر موجودہ مسجدِ نبوی کے قریب موجودہ تعمیر میں مسجد میں شامل ہیں۔ تشریف لائے اور وہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا۔

اسلام کی اجتماعی دعوت و تبلیغ کا کام شروع کرنے کے لیے مرکز کی ضرورت تھی اسی غرض سے جگہ تلاش کی گئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ کے متصل زمین مل گئی اس کو خرید کر مسجد کی بنیاد ڈالی گئی اور اس کی تعمیر میں کبار صحابہ رضؓ کے ساتھ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیری کام میں حصہ لیا۔ اور یہیں سے مسجد کا نام مقرر ہوا جس کو آج کی اصطلاح میں بہت سے ناموں کا مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔

اسلام کی سب سے پہلی غرض و غایت عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَما خلقت الجن والانس الا لیعبدون میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے ہی پیدا کیا ہے، جب آفرینش کی غرض و غایت محض عبادت ہی ہے اور وہ بھی خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کی تو اس غرض و غایت کو انجام دینے کے لیے اسی مناسبت سے ایسی عبادت گاہ ہونا چاہیئے جس میں مختلف معبود یا مختلف ذرائع اور وسائل عبادت کے استعمال نہ ہوسکیں اور وہ طریقہ صرف نماز ہے جس کی تفصیلات قرآن و حدیث سے ثابت ہیں۔

اسلام کسی فرد یا شخص کی ذاتی فکر و عقل یا خواہش و تمنا پر مبنی نہیں ہے یہ تو بنی نوع انسان کے ہر فرد کی فلاح و صلاح کے لئے ہے، اسی لئے عبادت میں شریک ہونے والوں میں عمومیت لابدی ہے اور افراد کی کثرت ان کے اجتماع کو مستلزم ہے تو پھر خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لئے مسجد کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں ہوسکتا۔

تعلیمی مرکز کے بہت سے نام مکتب، مدرسہ، پاٹھ شالہ، بیت العلم، دارالعلوم جامعہ یونیورسٹی، کالج، اسکول وغیرہ وغیرہ ان سب کے مجموعہ کا نام مسجد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مرکز مسجد ہی ہے وحی نزول کو دوسروں تک پہونچانا، فرمودات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل کرنا، احکام دین سے باخبر ہونا، دینی مسائل کا جاننا اس پر عمل کرنے کے طریقے معلوم کرنا یہ سب اسی مرکز سے ہوتے رہے مسلمانوں

کا شغف اس بارے میں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکان مسجد سے کچھ دوری پر تھا اور اپنے کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے علمی مرکز سے بھرپور فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے تو انھوں نے اپنے انصاری بھائیوں اور پڑوسی سے طے کیا کہ ایک دن مرکزِ علم میں وہ حاضری دیں اور دوسرے دن حضرت عمرؓ بہرشام کو دن بھر کی تعلیم دوسرے کو بتا دیں۔

اس یونیورسٹی کے طالب علموں کا یہ حال تھا کہ غیر حاضری نہ ہو سکے، ہم نے تعلیمی مرکز کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے وسیع معنوں میں صرف حصولِ علم ہی نہیں بلکہ معلمین اور مدرسین کی ٹریننگ بھی شامل ہے جس کے لیے ہماری اصطلاح میں ٹریننگ کالج کا لفظ ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مسجد کی مرکزیت کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ حسبِ ضرورت معلمین اور مدرسین کا انتخاب کرکے دوسرے علاقوں اور دوسرے علمی مراکز میں تعلیم و تدریس کی خدمت کے لیے بھی بھیجے۔

اسلام ایک آفاقی دین ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے ہی اسلام نے تبلیغ و دعوت کو پیشِ نظر رکھا اور تبلیغ و دعوت کے کام کو ہمیشہ اولیت اور اہمیت حاصل رہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں انتہائی مخالف ماحول میں دعوت کا کام شروع کیا اور باوجود تمام رکاوٹوں اور مصیبتوں کے اس میں کوتاہی نہیں ہوئی سابقین اولین نے بھی اپنی تمام مالی اور جسمانی قربانیاں ادا کرتے ہوئے دعوت کو سینے سے لگائے رکھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی پیشکش کی گئی کہ وہ محض دعوت الی اللہ سے باز آجائیں مگر ان کا جواب تھا کہ اگر ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھ دیا جائے تب بھی وہ دعوت الی اللہ سے باز نہ آئیں گے خاندان یاسر پر کیا مصیبتیں نہیں ڈالی گئیں، مگر جب بھی ہوش آتا تھا کہتے تھے احد، احد، اتنے بڑے کام کے لیے مکہ میں تو صرف گھروں میں جمع ہو کر دعوتی کام کے نقشے اور پروگرام بنتے اور ان پر عمل ہوتا تھا، حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد علی الاعلان

اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور جبل ابو قبیس کی چوٹی پر سے ندا ئے اللہ اکبر بلند ہوئی۔

مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد باقاعدہ دعوتی کام کا منصوبہ اور پروگرام تیار ہوا اور اس کے لیے مرکز مسجد نبوی۔ بنی۔ اسی مرکز میں دعوتی کام سے روشناس کرایا جاتا تھا اس کی تعلیم دی جاتی تھی اور جو اس کی روح سے متاثر ہو جاتے تھے ان کو دوسرے علاقوں میں دعوت کے لیے روانہ کیا جاتا تھا۔ دعوتی کام کے لیے تعلیم و تربیت دونوں کی اہمیت تھی۔ تعلیم سے تعلق اوپر گذر چکا ہے، تربیت کے لیے اصحاب صفہ کی مثال بہت کافی ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا دار الاقامہ ہے آج کل کی اصطلاح میں ہوسٹل تھا جہاں ۲۴ گھنٹے محض تربیت میں گزارے جاتے تھے ان کو دنیا کے کاموں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دوسرے لوگ ان کی دنیاوی ضرورتیں پوری کرتے تھے اور خلوص و للہیت کا یہ بہترین نمونہ تھے، دنیاوی ملکیت، خواہشات، شان و شوکت یا زیبائش کا اس سے اندازہ لگایا جائے کہ بعض اصحاب صفہ کے پاس صرف ایک ہی کپڑا تھا جو ناف سے گھٹنے تک ستر عورت کا کام دیتا تھا اور وہ بھی بعض وقت اتنا مختصر کہ رکوع میں جاتے وقت گھٹنے پر ہاتھ سے پکڑنا پڑتا تھا کہ مبادا کشف عورت ہو جائے اسی تربیتی مرکز سے تیار ہو کر صحابہ اشاعت دین اور جہاد کے لیے نکلتے تھے۔

مسجد ہی میں عدالت کے اجلاس ہوتے تھے اور تمام عدالتی امور نماز کے بعد انجام پاتے تھے، کسی کا کوئی قضیہ، مطالبہ، محاکمہ اگر ہوتا تھا تو وہ نماز کے بعد کھڑا ہو جاتا اور اپنا معاملہ پیش کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ خود حاکم اعلیٰ تھے اور فیصلے فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفۂ وقت یا امیر المومنین کا یہ کام ہوتا اگر معاملہ پیچیدہ ہوتا یا تفصیل طلب تو اس کے لیے خلیفۂ وقت کسی اہم شخص کو اس کام کے لئے مقرر فرماتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس سلسلہ میں نام سر فہرست ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اسی مسجد سے دوسرے علاقوں میں قاضی (جج) مقرر کر کے بھیجے جاتے۔

ابتدائے اسلام سے ہی مدینہ طیبہ صدر مقام تھا اور یہیں دارالخلافہ یا کیپٹل تھا اسی جگہ سے اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی اور پروان چڑھی، حکومت کے تمام کام مسجد سے ہی انجام پاتے تھے، سرکاری احکام بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتے اور آپ مسجد ہی میں اس کا اعلان کرتے جنگ بدر کے بعد قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں اختلافات تھے ان کا آخری فیصلہ اسی مسجد میں ہوا اور پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو اس وقت قیدی تھے ان کا فدیہ دس مدینہ کے طالب علموں کو پڑھانا لکھانا تھا، اسی مسجد میں یہ کام کیا گیا۔ تحصیل اموال اور اس کی تقسیم سب کچھ اسی مسجد سے وابستہ تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مال غنیمت مسجد کے صحن میں ڈھیر ہو جاتا تھا اور خلیفۂ وقت اس کی مقررہ تقسیم میں دن بھر مصروف رہتے تھے اور جب تک مال تقسیم ہوتا یا ختم نہ ہو جاتا خلیفۂ وقت مشغول رہتے، حضرت عمر رض کے زمانہ میں ہی بیت المال کے لیے جگہ مقرر کی گئی جو مسجد کے قریب ہی تھی۔

مسجد نبوی ہی میں مجاہدین کی بھرتی ہوتی تھی اور ان کی مختلف سپہ سالاروں کے ساتھ مسجد سے ہی روانگی ہوتی تھی اور واپسی میں بھی سب سے پہلے مسجد میں آکر جمع ہوتے اور اس کے بعد اپنے گھروں کو واپس جاتے، جنگوں کے لئے مشورے تیاریاں سب کچھ اسی مسجد سے وابستہ امور تھے۔

جو شخص بھی کہیں سے چھوٹا ہو یا بڑا دارالخلافہ آتا تھا وہ مسجد ہی کا رُخ کرتا اور اس کے قیام کا انتظام یہاں ہوتا یا یہاں سے ہوتا۔ اس کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں درج ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو ظاہر ہے کہ آخری مرجع آپ کی ذات اقدس تھی، اس وقت احکام بذریعہ وحی نازل ہوتے تھے، اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیاوی امور میں مشورہ کے لیے مسجد ہی میں جمع ہوتے تھے اور صحابہ کھل کر اپنی رائے دیتے تھے غزوۂ احد میں مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنا یا باہر نکل کر صف آرا

ہونا، اختلاف رائے کے باوجود مسجد ہی میں فیصلہ ہوا۔

غزوۂ خندق میں دفاع اور حفاظت کی شکلوں پر غور وخوض مسجد ہی میں ہوا۔ غزوۂ تبوک کا اعلان اور اس میں شرکا کی تربیت مسجد ہی میں طے ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی جیش اسامہ کو مسجد سے ہی رخصت کیا اور جتنے بھی فیصلے کیتے، مسجد میں صحابۂ کرام کے مشورہ سے کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو "الصلوۃ جامعۃ" کی ندا دی جاتی اور صحابۂ کرام مسجد میں جمع ہوکر رائے دیتے، ایک عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا تھا کہ جب وہ مہر کی تحدید کرنا چاہتے تھے تو اس کی رائے کو آپ نے قبول کیا۔ کیا آج کی ترقی یافتہ دور کی پارلیمنٹ میں عوام میں سے کسی کو حق ہے کہ حاکم کے خلاف صدائے حق بلند کرے۔ اس کا موقع ہرگز ہرگز نہیں ہے، چہ جائیکہ ایک فرد کی رائے پر حق کو تسلیم کر لیا جائے۔

خلیفۂ وقت کے مکان کی کوئی اہمیت نہیں تھی مسجد ہی وہ جگہ تھی جہاں صدر یا خلیفۂ وقت کا دیوان یا مجلس ہوتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں فارس کا ایک (ایلچی) سفیر ایک پیغام کے ساتھ مدینہ وارد ہوا۔ اس نے بادشاہ کے محل کو معلوم کرنا چاہا تو اس کو بتایا گیا کہ ہمارے یہاں نہ بادشاہ ہے نہ محل، اُس کو بڑا تعجب تو ہوا ضرور مگر اپنا کام انجام دینے کے لئے سربراہ مملکت یا صدر وغیرہ شخصیت کے بارے میں معلوم کیا تو امیر المومنین کا لفظ اس کو ملا۔ اس نے ان کی جگہ کے بارے میں دریافت کیا تو اس سے کہا گیا کہ مسجد میں ہوں گے۔ وہ سمجھا شاہی محل کا نام مسجد ہے پوچھتا ہوا پہونچا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ معمولی سی عمارت شاہی محل ہے۔ خیر! امیر المومنین وہاں موجود نہیں تھے اور پھر وہ تلاش میں مدینہ کے باہر باغات میں گیا جہاں فرشِ زمین پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آرام فرما تھے۔ دیکھ کر حیران رہ گیا اور بے ساختہ اس کے منہ سے یہ کلمات نکلے، حکمت فعدلت فامنت فنمت، آپ نے حکومت کی تو انصاف کیا اور پھر بے خوف

ہو کر سو گئے اس کے بعد لپنے بادشاہ پر طنز کیا۔

یہاں تک جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے دور کا نقشہ ہے، مسجد کی یہ جامعیت جب حضرت علی نے دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کیا اور حضرت معاویہ نے شام میں دمشق کو دار الخلافہ قرار دیا تب بھی یہ تمام امور مسجد سے ہی طے پاتے تھے، یہاں تک کہ ۴۱ھ میں جب حضرت حسن نے حضرت معاویہ کی بیعت کرلی تو صرف دمشق ہی پایۂ تخت بن گیا اور مسجد کی اہمیت اسی طرح برقرار رہی حضرت معاویہ رض نے پے درپے چند شہادت کے واقعات کے بعد مسجد میں ایک حجرہ بنوالیا تاکہ خلیفۂ وقت پر آسانی سے وار نہ کیا جا سکے مسجد کی اہمیت قائم رہی اور امام جمعہ اور عیدین اور دوسرے پنجگانہ اوقات میں بھی امام صرف امیر المومنین ہوتے تھے یا ان کے غائبانہ میں ان کی طرف سے مقرر کردہ شخصیت، رفتارِ زمانہ نے اگرچہ مساجد کو سرکاری کاموں سے الگ کر دیا، مگر پھر بھی عوامی اجتماعات اور دینی کاموں کے لیے مسجد کا مقام باقی رہا مدارس مساجد ہی میں ہوتے تھے اور دینی مواعظ وغیرہ کے لیے مساجد کا ہی استعمال ہوتا تھا حرم مکی اور حرم نبوی میں پچاس ساٹھ سال قبل تک درس و تدریس کا کام ہوتا رہا اور تیرہویں صدی کی آخری دہائی تک مکہ مکرمہ میں کوئی منظم درسگاہ نہیں تھی۔ بڑے بڑے محدثین علماء فقہاء حرم مکی اور حرم نبوی میں درس دیتے تھے، جس میں ہر شخص کو شرکت کا موقع ملتا تھا، مکہ معظمہ میں پہلا منظم مدرسہ مدرسہ صولتیہ ہے، جو ۱۲۹۱ھ میں قائم ہوا، اس کے باوجود حرم میں تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ چودھویں صدی کے دوسرے نصف میں مکہ میں سرکاری اسکول اور پھر کالج اور آخر میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔

جامعہ ازہر مصر میں اور جامعہ زیتون مغرب اقصیٰ میں سب سے پرانی یونیورسٹیاں ہیں جن کی ہزار سالہ برسی مناتے ہوئے بھی نصف صدی گذر چکی ہے، وہاں بھی درس و تدریس کا نظام، وہی مسجد میں علماء کا درس دینا تھا جامعہ ازہر میں ۱۹۲۴ء میں شیخ

مصطفےٰ مراغی نے تنظیم شروع کی اور باقاعدہ کلاس ابتدائی، ثانوی، عالی اور تخصص جاری کئے اور سنہ ۱۹۴۶ء تک دونوں نظام (مسجد میں تعلیم اور مختلف مراحل کے نظام تعلیم) برابر جاری رہے، پہلے نظام کو قسم عام اور دوسرے کو قسم نظامی کہا جاتا ہے اب صرف مختلف کالج اور ڈاکٹریٹ کا نظام رہے:

مسجد کی عظمت اور احترام کے پیش نظر ضروری ہے کہ مسجد کو پاک و صاف رکھا جائے اور کسی قسم کی بھی نجاست غلاظت سے ان کی حفاظت کی جائے، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب تک فرش تک نہیں تھا۔ صرف ریت ہی تھی۔ اس وقت بھی حکم تھا کہ مسجد میں تھوکا نہ جائے اور اگر ایسا ہو جائے تو اس کا حق ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔ مسجد میں ایسی چیزیں کھا کر نہ داخل ہوں جن سے منہ سے بدبو آتی ہو، جیسے لہسن، مولی وغیرہ، مسجد میں بلند آواز سے بات نہ کی جائے، چہ جائیکہ لڑائی، جھگڑا کیا جائے مسجدوں کو بازار یا منڈی نہ قرار دیا جائے جہاں بیع وشرا ہوتا ہے، مسجد میں کوئی گم شدہ چیز کو نہ تلاش کیا جائے اور نہ اس کا اعلان کیا جائے، ایک اعرابی اپنی اونٹنی تلاش کرنے مسجد میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا رد اللّٰہ ضالتک "اللہ تعالیٰ تمہاری گم شدہ اونٹنی نہ لوٹائے۔ ساتھ ہی مسجد میں کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو عبادت میں خلل انداز ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

"مسجدیں اس لئے نہیں تیار کی گئیں ــــ مسجدیں تو اللہ کی عبادت اور اس کے ذکر کے لئے بنائی گئی ہیں۔"

یہ عام حکم تمام مساجد کے لیے ہے چاہے چھوٹی ہو یا بڑی جامع مسجد ہو یا محلہ کی مسجد، شہر کی ہو یا دیہات کی اور قصبات کی مسجد، مسجد بہرحال مسجد ہی ہے مساجد کے ساتھ صرف عمارت ہی کا تصور نہیں، بلکہ اس کے ساتھ مسجد کو آباد رکھنا اور اس کی حفاظت بھی لازمی ہے مسجد کی آبادی ظاہر ہے کہ اس میں پنجگانہ نماز باجماعت اور دیگر عبادات کے لئے اس کا استعمال ہے۔ مساجد کی اس وقت بہ لحاظ

عمارات کے کمی نہیں ہے۔ لیکن مسجد کی آباد کاری بحیثیت اقامت صلوٰۃ میں مسلمانوں کی کوتاہی ہے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

مسجد تو بنائی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

مساجد کو اگر یونہی چھوڑ دیا جائے اور اس میں خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت نہ کی جائے تو خطرہ ہے کہ آس پاس والوں کے لیے باعثِ عذاب نہ بن جائے ہماری بہت سی آفتیں شاید اسی لیے ہیں کہ ہم نے مساجد کی آباد کاری سے غفلت برتی ہے اور اس کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتے ہیں، مساجد کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر ہے، مشرکین کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ مسجد کی ذمہ داری میں شریک ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"مَاکان للمشرکین ان یعمروا مسَاجد اللّٰہ شاھدین علیھم بالکفر"

مساجد کی تعمیر اور آباد کاری میں مشرکین کا کوئی حصہ نہیں جو (مشرکین) اپنے کفر کا اعلان اور اظہار کرتے ہوں۔

مسلمانوں کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ مسجد کی تعمیر اور آباد کاری، تحفظ اور بقاء، پاکی اور صفائی میں کتنی ذمہ داری برداشت کرتے ہیں اور اگر ہم سے کوتاہیاں ہوئی ہیں تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور دُعا کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمادیں اور ہمیں توفیق بخشیں کہ ہم آئندہ اس کے لیے پوری کوشش کریں۔ محض اللہ کی توفیق ہمیں کامیاب وکامران کرتی ہے اور جن کو اللہ نے توفیق بخشی ہے ان کو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے ہمیں اس نعمت سے نوازا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ٥

پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری

سائینس کی تاریخ اسلام کی آغوش میں

اِسلام کے پیشوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ "علم کے محقق بنو" اور اس کے راوی نہ بنو" یہ بنیادی نظریہ ہے جس سے سائنس پیدا "ہوتی ہے اور اسی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کیوں مسلمان سائنس کی تعلیم کو "علم" کا جزو سمجھتے رہے اور سائنس کے علم کی طلب میں کوشش اور جد و جہد کو انسان کی فلاح اور ترقی کا طریقہ قرار دیتے رہے

مسلمانوں نے سائنس کی تعلیم کو صرف بنیادی سائنس تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اخلاقی سائنس کو کمال پیدا کرنے کو علم اور ترقی کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ چنانچہ طب، ناپ تول، مساحت اور پیمائش، جغرافیہ، زراعت، باغبانی، اسلحہ سازی، جہازرانی، مشین سازی، باربرداری جانوروں اور مویشیوں کو پالنا اور نئی نسل کو پیدا کرنا اتنی ہی عزت اور خدمت کے قابل کام سمجھے جاتے رہے ہیں جتنا کہ بنیادی علم اور ان کی قدر و منزلت علم کے برابر ہی کی جاتی رہی ہے غرض کہ تعلیم اسلام کے ابتدائی دور ہی سے سائنس دانوں میں امام جعفر صادق، خالد بن یزید اور جابر بن حیان کا دور ۷۵ھ تا ۸۰۰ ہجری کا ہے انھوں نے کیمیا کو بحیثیت سائنس تجربہ اور تحقیق کی اور دنیا کے سامنے پیش کیا اور موجودہ کیمیائی تجربہ، ترکیب اور کیمیائی عمل کے طریقے کو اور عمل کو پہلی مرتبہ جدا جدا متعین کیا۔ اسلام کی دوسری صدی سائنس کی تاریخ "نشأۃ ثانیہ" کا رتبہ رکھتی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ خلفاء، سلاطین، امراء اور پڑھنے لکھنے

والے سب لوگ سائنس کی طرف ایک شوق اور بے تابی کے انداز میں متوجہ ہیں چنانچہ کوشش کی گئی کہ یونان، مصر، چین، ہندوستان میں جو کچھ بھی علم سائنس کے میدان میں تین چار ہزار سال سے پیدا اور مرتب ہوا تھا اس کو فوراً ہی جمع اور محفوظ کر لیا جائے اور اندازہ لگایا جائے کہ اسلام سے پہلے کتنی سائنس حاصل کی گئی تھی چنانچہ بیت الحکمت بغداد میں ایک فوج کی فوج ترجمہ کرنے والوں کی مقرر کی گئی جو ہر زبان سے سائنس کا ترجمہ کرتے تھے۔ ہارون الرشید اور مامون رشید کے فرزند کے زمانے میں سارے علوم عربی میں داخل ہو گئے۔ پھر مسلمان سائنس کے میدان میں بحیثیت محققین کے اتر آئے اور پانچ سو برس تک دنیا کے عظیم ترین سائنسداں اسلام کے گہوارے ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ تاریخ عالم میں اس انداز اور جوش اور ذوق و شوق سے سائنس کی طلب کی مثال نایاب ہے جذباتی اعتبار اور شوق کی حد تک یہ کیفیت آج بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

مسلمانوں نے جو علمی کام انجام دیئے ان کی چھپانے اور مٹانے کی جو کوشش یورپین اقوام نے کی ہے وہ انسانی بد خصلتی اور خود غرضی کی بدترین مثال ہے مسلمانوں نے تو یہاں تک کیا تھا کہ جس یونانی، مصری، ہندوستانی سائنسداں سے علم حاصل کیا اس کے نام کی فہرست لکھتے رہے بلکہ بہت سے علماء نے اپنے کارناموں کو انہی کے نام سے منسوب کیا ہے کیا علمی قدردانی اور اعتراف کی ایسی مثال یورپ کی کوئی قوم پیش کر سکتی ہے؟ مغربی شہنشاہیت اور حکومت کے پیش نظر ایک منظم اور متفقہ کوشش کی تھی کہ عرب سائنسدانوں کا نام تاریخ کے صفحے سے مٹا دیا جائے۔ ہزاروں برطانوی کتابیں یہ ظاہر اور بیان کرتی ہیں کہ ارسطو اور اقلیدس اور ارشمیدس کے بعد دنیا میں راجر بیکن، آئزک نیوٹن، مائیکل فراڈے جیسے ہی پیدا ہوئے۔ اس خود غرضی کی انتہا تو یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ برطانوی کتابیں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی سائنس دانوں کے نام تک کو چھپا دیتی ہیں پھر مسلمانوں اور خاص طور پر عرب سائنس دانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور یہ تو یورپ

بھر کی عام پالیسی رہی ہے کہ اگر عرب حکیم یا سائنس داں کا نام بھی لیا جائے تو بارہویں صدی تک اس کے بعد سے مسلمانوں کے سارے علمی کارناموں کو تاریخ سے مٹا دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک یورپ کی قوموں کے پاس ایک بھی سائنس کی اعلیٰ کتاب موجود نہیں تھی۔ اندلس کے اسلامی گہوارے نے یعنی غرناطہ، اشبیلیہ قرطبہ وغیرہ نے اپنی عالمگیر خدمت اور علم کی اشاعت کی خاطر ہزارہا اطالوی، برطانوی فرانسیسی اور دیگر اقوام یورپ کے لوگوں کو تعلیم دی پھر یہ سائنسداں اپنے ملکوں میں گئے اور انہوں نے اپنے بادشاہ کو سائنس اور علم کی عظمت سے آگاہ کیا۔ ان کی سرپرستی میں یورپی زبانوں میں کتابوں کا عربی سے ترجمہ کرایا گیا۔ ان ترجموں کے بعد سے یورپی زبانوں میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ جیسے ہی لاطینی زبانوں میں سائنس داخل ہوئی۔ عربی کی یاد مٹانے کی کوشش تیز کردی گئی اور عرب دشمنی کی بنا پر مسلمانوں اور خاص طور پر عربوں کے تیرہویں صدی سے سولہویں صدی تک اور اس کے بعد کے کارناموں کا ذکر نہیں کیا گیا۔

حالانکہ سائنس کی ترقی اور تحقیق کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ تمام تحقیق اور معلومات جو کسی کتاب کے لکھتے وقت تک موجود ہیں، بیان کر دیئے جائیں تاکہ طالب علم اس سے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ سولہویں صدی سے جب یورپین قوموں نے اسلامی ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ اور حکومت جمالی تو پہلی کوشش یہی کی گئی کہ یہاں سے آیا رد ا بداد کی کتابیں لندن، پیرس، لائڈن، روم، اسکوریال کی لائبریریوں میں بند کردی جائیں اور ایک عالمگیر منظم کوشش کے ذریعے مسلمانوں سے نہ صرف سائنس کے علوم چھین لیئے جائیں بلکہ ان کی یادیں بھی بھلا دیں جائیں اب بیسویں صدی میں جب امریکہ اور دوسری قوموں نے یہ محسوس کیا کہ تاریخ سائنس پڑھانا ایک ضروری اور لازمی ضرورت ہے اور سائنس کے نئے خیالات اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتے جب تک کہ نوع انسان کی ساری تاریخ نہ پڑھائی جائے تو اس مقصد سے مجبور ہو کر یورپ اور امریکہ کی دوسری کتابوں میں کہیں کہیں عرب نام بھی نظر آنے لگے اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی زور و شور سے لکھی جانے لگی کہ عربوں نے یہی خدمت کی ہے کہ یونانی

کی سائنس کو مٹنے سے بچالیا اور پھر مغرب نے اس یونانی ورثہ کو سنبھال لیا۔ ایک ستم ظریف عالم ڈیمپیر نے جن کی کتاب انگریزی زبان کی درسی کتاب ہے یہاں تک لکھا ہے کہ یورپ نشأۃ ثانیہ کے جوش میں سائنس کے میدان میں ہر دور سے فائدہ اٹھائے اور بغیر عربی سائنس کی کتابوں کے پڑھے وہی مرتبہ اور ترقی حاصل کرسکتا تھا جو عربوں سے سیکھنے کے بعد حاصل ہوئی۔ حق ناشناسی کی اس سے بدتر مثال تاریخ سائنس میں نہیں مل سکتی۔ جن لوگوں نے اسکوریال، لندن، ویانا، پیرس، لائڈن، قسطنطنیہ، سمرقند میں عربی کتابوں کے نسخے دیکھے ہیں وہ ایمانداری سے یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اتنے بڑے علمی ذخیرے کے پیدا کرنے والے کیا اس کے مستحق نہیں کہ ان کو قدیم سائنس کا بانی نہیں تو سائنس کا بانی ضرور کہیے؟ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پیرس کی یونیورسٹی، جنوبی اطالیہ کی یونیورسٹیاں، آکسفورڈ یونیورسٹی غرناطہ اور قرطبہ ہی کے طالب علموں نے قائم کیں اور عربی زبان کی تعلیم تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی تک ان درسگاہوں میں جاری رہی۔

عرب یا مسلمان سائنس والوں نے کیا کارنامے انجام دیئے۔ ایک مختصر سے مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، وہ بھی اس حالت میں جبکہ بیشتر مواد عربی میں ہو اور یہ کتابیں بھی ہم کو میسر نہ ہوں بلکہ یورپ اور امریکہ کے مقفل کتب خانے کی زینت ہوں۔ ایسے ہی علمی ذخیروں کو دیکھ کر اقبال نے کہا تھا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی = جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

سچی بات یہ ہے کہ ۷۵۰ء تا ۱۱۰۰ء تک جابر بن حیان سے ابن رشد تک عربی زبان اور عرب بلا استثنا دنیا سے سائنس کے تنہا حکمراں تھے پھر اسلامی رواداری، علم پروری اور انسانی خدمت کے نتیجے میں اور قوموں کی زبانوں میں بھی سائنس کی کچھ کتابیں شائع ہوئیں جن کا مبلغ علم اور تحقیق سطح عرب سائنس سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اسلامی سائنس کا دور ۱۵۰۰ء تک عالمگیر شہرت اور علمی کمال کا حامل ہے اور اس کے بعد کے سائنسی کارنامے ہمیں اس وجہ سے معلوم نہ ہوسکے کہ یورپین زبانوں میں دانستہ ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا حالانکہ سائنس کے معیار کے

سے لحاظ سے وہ ضرور اس کے مستحق تھے۔ مسلمانوں نے سائنس جس انداز سے شروع کی اس کا پہلا جزو تو یہ تھا کہ یونان، مصر، روم، چین اور ہند کے سارے علمی مواد کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور ایک جامع اور موثر انداز سے سائنس کی ترقی اور تحقیق کی جائے۔ عربی تحقیق کا اسلوب یہ تھا کہ سارے سارے علوم کی حکمت عملی طریقہ اور سالمیت کو ساتھ ساتھ بیان کیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے بہت سے ایسے علما پیدا کیے جنھوں نے جامعیت کا یہ معیار حاصل کر لیا جو آج تک ان کے بعد کے انسانوں نے پیش نہیں کیا۔ ان کتابوں میں فارابی (۸۷۰ تا ۹۵۱) کی حصار علم، ابن سینا (۱۰۳۸) کی کتاب "الشفا" جو ۵۲ کتابوں پر مشتمل ہے۔ غزالی (۱۱۱۱ء) کی "مقاصد الفلاسفہ"، ابن حزم (۱۰۶۳ء) کی کتاب "الملل والنحل" ابن ماجہ (۱۱۳۶ء) کی مجموع الفلسفۃ الاسلامیہ"، ابن طفیل (۱۱۸۵ء) کی کتاب "حی بن یقظان" ابن رشد کی کتاب" الشرح متوسط والشرح کبیر" اور ابن خلدون کا "مقدمہ" بلا کسی بحث اور اختلاف کے شامل ہیں فارابی نے نہ صرف ارسطو کے علم کو زندہ کیا اور دنیا سے روشناس کرایا بلکہ سارے علوم کی ترقی کا راستہ نکالا۔ شیخ الرئیس ابن سینا نے گیارہویں صدی تک علوم و فکر میں جو بھی ترقی کی اور اس میں ان کی اپنی تحقیقات بھی شامل تھی وہ دنیا کو پیش کر دی۔ غزالی نے سائنس اور الٰہیات پر عالمگیر تبصرہ ایک تحقیق کے ذریعہ علم اور دین اور خدا پرستی کو مربوط علم بنا دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ارسطو کی مثال کو اختیار کیا اور طبیعیات (سائنس) ما بعد الطبیعیات (میٹافزکس، تصوف وغیرہ) اور الٰہیات (علوم دینیہ) میں ایک رابطہ اور فکری یکسانیت پیدا کر دی۔ اگر غزالی یہ کام نہ کرتے تو عالم اسلام آج یورپ کی طرح ملحد اور بے دین ہو جاتا اور اخلاقی قدریں اور روحانیت اور انسانی محبت اور خدمت کا جذبہ دنیا سے نیست و نابود ہو جاتا۔

ابن رشد نے سائنس کی رسائی اور طرزِ فکر کو الٰہیات کے مطالعہ اور تحقیق سے مختلف اور مخصوص حیثیت دے کر جدید سائنس کے دور کی ابتدا کی۔ ▲▲

مولوی حبیب الرحمٰن کا انتقال پر ملال

یہ خبر آندھرا پردیش میں بالعموم اور اُردو حلقوں میں بالخصوص انتہائی رنج و ملال کے ساتھ سُنی جائے گی کہ انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے بانی اور اُردو کے مخلص خدمت گزار اور خدمت گزاروں کے قافلہ کے سالار پروفیسر حبیب الرحمٰن کا کراچی میں ۱۵ر مئی ۱۹۹۱ء کو شام کے ساڑھے پانچ بجے انتقال ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب ۲۱ر ڈسمبر ۱۸۹۸ء کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم میں ابتدائی تعلیم کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۴ء میں میٹرک کیا۔ کچھ دنوں تک نظام کالج میں پڑھنے کے بعد علی گڑھ منتقل ہو گئے جہاں سے معاشیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ معاشیات میں مددگار پروفیسر ہو گئے پھر لندن گئے اور ۱۹۲۰ء میں لندن اسکول آف اکنامکس سے بی۔ ایس سی (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ ایک سال آکسفورڈ یونیورسٹی میں اگریکلچرل ریسرچ کا کام کیا۔ واپسی پر عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ معاشیات مقرر ہوئے۔

۱۹۴۰ء میں محکمۂ تعلیمات عامہ سے متعلق ہوئے اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں محکمہ صنعت و حرفت آپ کے تفویض کیا گیا اور ۱۹۴۶ء میں اسی محکمہ کے معتمد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں قبل از وقت وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے۔

اس کے بعد انھیں پاکستان سے بہت آفر آئے لیکن وہ نہیں گئے اور آخر عمر میں جب وہ بہت بیمار تھے اور ان کی لڑکی، داماد انھیں پاکستان لے جانے پر مُصر تھے تب بھی وہ ہندوستانی شہریت کو باقی رکھتے ہوئے محض پاسپورٹ پر تشریف لے گئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کو دہلی منتقل کیا اور پھر وہ خود پاکستان چلے گئے اور مولانا آزاد نے انجمن کے دفتر کو علی گڑھ منتقل کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان کو صدر اور قاضی عبدالغفار کو معتمد عمومی مقرر کیا۔

قاضی صاحب اور پنڈت سُندر لال (جو انجمن ترقی اُردو ہند کے نائب صدر تھے) حیدرآباد آئے اور حیدرآباد میں حبیب الرحمٰن صاحب سے تعاون کے خواستگار ہوئے کہ یہاں انجمن کی شاخ قائم کی جائے۔

چنانچہ ۱۹۵۴ء میں اُردو کی پہلی کل ریاستی کانفرنس ہوئی جس کے صدر پنڈت کشن پرشاد کول تھے۔ حیدرآباد میں اُردو پر بہت بُرے دن بیت رہے تھے۔ خود اُردو والے بے حسی کا شکار تھے۔ ایسے میں حبیب الرحمٰن صاحب نے خود اپنی زمین دی، چندہ اکٹھا کیا اور اُردو ہال کی تعمیر کروائی۔ انجمن ترقی اُردو کا صدر دفتر اسی اُردو ہال میں واقع ہے۔ انھوں نے اپنا سکونتی مکان بھی اُردو ہال کو وقف کر دیا۔

حبیب الرحمٰن صاحب نہ صرف انجمن کی شاخ کے بانی بلکہ اُردو کی بقاء کے لیے جدوجہد کے میر کارواں رہے۔ آپ کی رہنمائی میں ریاست بھر میں اُردو کا کام بڑھنے لگا اور جب ۱۹۶۶ء میں ریاستی سرکاری زبان کا قانون بن رہا تھا تب آپ کی رہنمائی اور پیش قدمی سے ریاست بھر میں ایجی ٹیشن چلایا گیا کہ اُردو کو بھی سرکاری و قانونی موقف دیا جائے چنانچہ دفعہ ۷ شامل کی گئی جس کے ذریعہ یہ صراحت کی گئی کہ ان علاقوں میں جہاں اُردو یا کسی اور اقلیتی زبان کی قابلِ لحاظ آبادی ہے ان اغراض و مقاصد کے لیے جن کی سرکاری اعلامیہ میں صراحت کی جائے گی اُردو یا ایسی اقلیتی زبان کو بھی سرکاری طور پر استعمال

کیا جائے گا۔

اس دور میں نواب میر احمد علی خاں صاحب صدر اور حبیب الرحمٰن صاحب انجمن کے معتمد تھے جب ان کی صحت بگڑنے لگی اور عمر کا تقاضہ بھی تھا کہ سخت اور مسلسل کام ان کے لیے ممکن نہ تھا تو وہ صدر ہو گئے اور عابد علی خاں صاحب معتمد عمومی مقرر ہوئے۔ بعدازاں جب ان کے پاکستان جانے کا فیصلہ ہوا تو ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر منتخب ہوئے اور پروفیسر حسینی شاہد معتمد عمومی۔

حبیب الرحمٰن صاحب انجمن ترقی اُردو (ہند) کے بھی لائف ممبر تھے وہ آصفیہ ہائی اسکول، ممتاز سائنس کالج، اُردو اورینٹل کالج، اُردو آرٹس (ایوننگ) کالج کے بانیوں میں سے ہیں۔ علاءالدین ٹکنیکل کالج کے معتمد بھی رہ چکے ہیں۔

حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال پر [illegible] سے گلشن [illegible] حبیب پر الم ناکی چھائی ہوئی ہے اُردو والوں کا ایک مخلص رہنما اُٹھ گیا۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے بھی اور شاخ آندھرا پردیش نے بھی ایک سچے خدمت گار، مخلص اور رہنما کو کھو دیا۔ (ر رحیم خاں)

سری نیواس لاہوٹی
دارالشفاء، حیدرآباد

پروفیسر حبیب الرحمٰن
سیرت و شخصیت

ایک انگریز مفکر کا قول ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی بڑے ہوا کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی صلاحیت اور کوشش سے بڑے بنتے ہیں۔ ایسے ہی بڑے لوگوں میں سے ایک پروفیسر حبیب الرحمٰن تھے جنھوں نے اعلا تعلیم، محنت اور جفاکشی، تفکر و تدبّر کے ذریعہ اپنی شخصیت کے سونے کو کندن بنا دیا اور اپنے دماغ کی روشنی سے اُردو تحریک کو وہ ضیا بخشی کہ اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

شخصیت کیا ہے اس پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اجمالی طور پر شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کا مجموعہ ہے جن کی بدولت کوئی فرد عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور میں حبیب الرحمٰن صاحب کے اسی امتیاز کا ذکر کروں گا۔

حبیب الرحمٰن صاحب کے آبا و اجداد نیلور سے حیدرآباد آئے اور یہیں کے ہو گئے ان کے والد جناب محی الدین نواب فخرالملک بہادر کی پیشی کے معتمد تھے جو اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے سیاہ و سفید کے کرتا دھرتا کہلاتے تھے اگست ۱۸۹۷ء میں حبیب الرحمٰن صاحب حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی اس کے بعد انھیں دارالعلوم میں شریک کر دیا گیا جہاں ان کے

ساتھیوں میں پروفیسر کلیم اللہ حسینی قابلِ ذکر ہیں ۔ جن کا بعد میں لندن میں بھی ساتھ رہا ۔ دارالعلوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ خانگی طور پر انگریزی کا درس لینے کے لیے معتمد الانام ہائی اسکول کے ایک استاد مسٹر ابراہیم کے پاس جایا کرتے تھے جہاں ان کا ساتھ رام لال صاحب سے ہوا۔ جنھوں نے بعد میں بلس مال کے رکن کی حیثیت سے بڑا نام کمایا اور اس وقت بھی بقیدِ حیات ہیں ۔ انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے کا ذکر انھوں نے اپنے والدین سے نہیں کیا لیکن جب اس کی بھنک انھیں پڑی تو وہ اس میں مانع نہیں ہوتے ۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں مدرسہ آصفیہ کے ذریعہ مڈل کا امتحان پاس کیا ۔ مڈل کے کامیابی کی سند آج بھی آصفیہ اسکول کی لائبریری میں آویزاں ہے جس کے وہ برسوں معتمدِ اعزازی بھی رہے ۔ انھوں نے پنجاب سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد چند دنوں تک نظام کالج میں شریک رہے۔ جہاں ان کے ہم جماعت نواب مہدی نواز جنگ اور نواب دین یار جنگ بہادر تھے ۔ لیکن اس کے چند دنوں بعد انھوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لے لیا جس کا الحاق اس وقت الہ آباد یونیورسٹی سے تھا جہاں سے انھوں نے ایم اے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ ایم اے او کالج میں ان کے ساتھیوں میں قابلِ ذکر ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور اکبر علی خاں بار ایٹ لا ہیں جو بعد میں جامعہ عثمانیہ میں ان کے شاگرد بھی رہے ۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد ان کا ابتدائی تقرر مددگار پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ میں ہوا ۔ اس وقت پروفیسر الیاس برنی صدر شعبۂ معاشیات تھے۔ ان کے تقرر کے سلسلہ میں پروفیسر عبدالستار صدیقی نے سرپرستی کی اور جب بھی ان کا ذکر آتا جیسے رشتی برتے احترام سے ان کا نام لیا کرتے تھے اس وقت جامعہ کا ذریعۂ تعلیم اردو میں درس دینے میں اتنے کورے تھے کہ وہ کلاس میں جانے سے ہچکچا رہے تھے لیکن الیاس برنی صاحب نے ان کی ہمت بندھائی اور کلاس روم تک انھیں چھوڑنے آئے ۔ جب انھوں نے اپنی زبان کھولی تو چند ثانیوں تک پریشان لیکن بعد میں وہ اس قدر کامیاب استاد ثابت ہوئے کہ ان کے طالب علم انھیں عرصۂ دراز

تک یاد کرتے رہے

جامعہ میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ ان کی پہلی اور قابل ذکر کتاب "معاشیات" ہے اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ معاشیات جیسے خشک موضوع کو عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے اس کے علاوہ انھوں نے عالمی کساد بازاری کے اسباب CAUSES OF WORLD DEPRESSION محصول اندازی کے اصول اور طریقے BOOK ON PRINCIPLES & METHODS OF TAXATION، مبادلات خارجہ A BOOK ON FOREIGN EXCHANGE، ہندوستان کے معاشی حالات A BOOK ON ECNOMIC HISTORY OF INDIA جیسی کتابوں کے تراجم کیے جو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے شائع ہوئے۔ ان کے ترجمے ہوں کہ مضامین نہایت ہی شستہ اور سلیس زبان میں ہے اور جن لوگوں نے ان کو پڑھا ہے ان کا خیال ہے کہ ان کتابوں کے اس سے اچھے ترجمے نہیں ہو سکتے تھے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ درس و تدریس اور تصنیف ترجمہ کا اتنا زیادہ کام کرنے کے باوجود انھیں معاشیات کے موضوع سے بعد میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔ جامعہ عثمانیہ سے الیاس برنی صاحب کے چلے جانے کے بعد یہ معاشیات کے پروفیسر بنائے گئے اور ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد سول سروس کی کچھ کلاسیس بھی ان کے ذمہ کی گئیں۔ سول سروس کے ان کے شاگردوں میں دوسروں کے علاوہ ایل این گپتا، شیو کمار لال اور ظہیر احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد ایل این۔ گپتا نے ان کی اتنی مدد کی کہ وہ ہمیشہ ان کے معترف رہے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک یہ انگلستان میں رہے جہاں انھوں نے لندن اسکول آف اکنامکس سے آنرز کیا اور پھر آکسفورڈ میں ایک سال تک زرعی معیشت کے شعبۂ ریسرچ میں فیلو رہے۔ لندن کے ان کے ساتھیوں میں مشہور کمیونسٹ لیڈر پی۔ پی۔ ایل بیدی ... پروفیسر ہیرالڈ لاسکی اور پروفیسر ... کے شہرہ کے تمام نام ہاں ہیں۔ پروفیسر ... اور ان اشتراکی خیالات کی ...

مشہور تھے۔ یہاں ان کے جواں مرگ ساتھی احسن صاحب کا بھی ذکر ضروری ہے جو علی گڑھ "لندن" اور جامعہ عثمانیہ میں ان کے ساتھی اور خاص دوستوں میں سے ایک تھے۔ ۱۹۳۶ء میں حبیب الرحمٰن صاحب ناظم اطلاعات عامہ کے ناظم بنائے گئے۔ اس کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں پونا میں اکنامکس کانفرنس کا انعقاد عمل میں آنے والا تھا اور اس کے صدر سر اکبر حیدری بنائے گئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا صدارتی خطبہ ایسا ہو کہ ہر سننے والا چونک جائے۔ مرحوم احمد محی الدین جو بعد میں مرکزی حکومت میں ڈپٹی منسٹر بنے انھوں نے سر اکبر حیدری سے حبیب الرحمٰن صاحب کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ انھیں لے آئیں تاکہ خطبۂ صدارت پر بات چیت کی جا سکے۔ جب احمد محی الدین صاحب نے اس کا ذکر حبیب الرحمٰن صاحب سے کیا تو انھوں نے چلنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ سے "جی حضوری" نہیں ہو سکتی۔ لیکن احمد محی الدین صاحب چونکہ اُن کے علی گڑھ کے ساتھیوں میں سے تھے اس لیے انھوں نے کسی طرح سے آمادہ کیا اور سر اکبر حیدری سے گفتگو کے بعد انھوں نے خطبہ تحریر کر کے احمد محی الدین صاحب کے حوالے کر دیا۔ جب خطبۂ صدارت کانفرنس میں پڑھا گیا تو اس کی اتنی تعریف ہوئی کہ سر اکبر حیدری نے ان کو ناظم اطلاعات عامہ بنا دیا۔ جہاں وہ چھ سال تک بحیثیت ناظم کام کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں ناظم صنعت و حرفت بنائے گئے اور ۱۹۴۶ء میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی جگہ انھیں معتمد صنعت و حرفت بنایا گیا۔ جب یہ معتمد صنعت و حرفت تھے تو پولیس ایکشن ہوا اور اس کے بعد کانگریس کی قائم کردہ نئی حکومت نے مسلمانوں اور خاص طور پر مسلم ملازمین کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا ان میں سے ایک حبیب الرحمٰن صاحب بھی تھے۔ اس وقت ان کے محکمہ کے انچارج ایک آئی۔ سی۔ ایس آفیسر مسٹر پردھان تھے جو انتہائی متعصب اور تنگ نظر واقع ہوئے تھے۔ جب کوئی فائل ان کے پاس جاتی تو وہ یہ دیکھتے کہ حبیب الرحمٰن نے کسی مسلمان کی سفارش تو نہیں کی۔ ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ان کے محکمہ کے ایک معصوم مسلمان کو گنہگار ہونے کا جھوٹا الزام عائد کر کے اس کی معطلی یا برطرفی کی نیچے سے سفارش کی گئی تھی

لیکن حبیب الرحمٰن صاحب اس شخص سے ذاتی طور پر واقف تھے اس لیے انھوں نے ماتحتین کی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے اسے دوبارہ مامور کرنے کی سفارش کی۔ اس پر پردھان صاحب اتنے چراغ پا ہوئے کہ حبیب الرحمٰن صاحب سے پوچھ بیٹھے کہ آپ نے کیسی سفارش کی ہے۔ اُنھوں نے اس بازپرس کا اُسی لہجہ میں جواب دیا اور کہا کہ میں نے حقائق بیان کردیئے ہیں اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ میری تجویز کو مانیں یا رد کردیں لیکن پردھان صاحب کا اصرار تھا کہ وہ اُس کی برطرفی کی سفارش کردیں۔ اس بات سے حبیب الرحمٰن صاحب نے صاف انکار کردیا اور اُن کے اجلاس سے اُٹھ کر چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ منسٹر اور معتمد کے تعلقات معتدل نہ ہوں تو محکمہ کے کام کا انصرام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چل سکتا اور یہ صورتِ حال دنوں برقرار رہی۔ اسی دوران حکومت کی جانب سے ایک گشتی جاری ہوئی کہ جو ملازم سرکار اپنی ملازمت کے پچیس ۲۵ سال پورے کرلیے ہوں وہ اگر چاہیں تو وظیفہ حاصل کرسکتے ہیں ــ حبیب الرحمٰن صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور سرکاری ملازمت سے وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کرلی۔

وظیفہ حسن خدمت سے سبکدوشی ہونے کے بعد ان کے پاس کئی آفر آئے حتیٰ کہ پاکستان والوں نے بھی انھیں مدعو کیا لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت تک مرکزی انجمن ترقی اردو کا احیا عمل میں آچکا تھا اور اس کے معتمد عمومی قاضی عبدالغفار بنائے گئے تھے وہ اور پنڈت سندرلال حیدرآباد آئے اور انجمن کی شاخ کے قیام کے سلسلہ میں حبیب الرحمٰن صاحب سے ربط پیدا کیا۔ قاضی صاحب حبیب الرحمٰن صاحب سے بخوبی واقف تھے اس لیے کہ وہ روزنامہ "پیام" کے اڈیٹر تھے اور حبیب الرحمٰن صاحب ناظم اطلاعاتِ عامہ تھے اس لیے کوئی دقت پیش نہیں آئی پہلے تو حبیب الرحمٰن صاحب نے حسبِ عادت انکار کیا لیکن جب قرعہ فال انھیں کے نام نکلا تو انھوں نے مزید انکار نہیں کیا اور اردو والوں کا ایک اجتماع اپنی کوٹھی پر بلوایا جس کے لیے انھوں نے تقریباً ۸۰ دعوت نامے جاری کیے جن حضرات کو مدعو کیا گیا تھا ان میں سے اکثریت بے مادری

کیے جن حضرات کو مدعو کیا گیا تھا ان میں سے اکثریت کی مادری زبان اُردو تھی لیکن ان میں سے بہتوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا شرکت سے کہ پہلے ہی سے مسلمانوں پر آفت نازل ہے اس پر حبیب الرحمٰن انھیں اور مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے بعض غیر مسلم دوستوں نے ان کی ہمت بندھائی۔ اس جلسہ میں مشکل سے ۲۰ حضرات نے شرکت کی مگر حبیب الرحمٰن صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور مجروح سلطانپوری کے اس شعر کی تفسیر بن کر اُردو کا کام شروع کر دیا کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر ٭ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور آج یہ کارواں کتنا بڑا اور وسیع ہے اس کا اسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس کے بعد سے حبیب الرحمٰن اُردو زبان کی بقا و ترقی کی تدبیروں میں اتنے سرگرم ہو گئے کہ جہاں پھول چند اور کانٹے زیادہ تھے اس کو انھوں نے گلزار بنا دیا۔ انجمن کے قیام کے حیدرآباد اور آندھرا پردیش کے طول و عرض میں انھوں نے دورہ کیا اور جہاں کہیں بھی گئے وہاں کے لوگوں پر اُردو کی افادیت اور مادری زبان کی اہمیت کو واضح کیا۔ چار ہی سال میں انجمن نے حیاتِ نو حاصل کر کے ایسی اٹھان کہ اس کی بیداری اور زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے جس کا اندازہ انجمن کی سالانہ رپورٹوں سے کیا جا سکتا ہے اور اردو تحریک کی افادیت آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انجمن ترقی اردو کو بلا مبالغہ اردو کی اب تک کی دکانیں پنساریوں کی دکانوں کی طرح قائم ہو گئی ہیں لیکن انجمن کو جو ترقی اور عروج نصیب ہوا اس کے لیے ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ سب حبیب الرحمٰن صاحب کی کاوش کا نتیجہ اور ثمر ہی تو ہے۔ ان کے کام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی حال میں بھی امید و اخلاص کا دامن نہیں چھوڑتے تھے اور نہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو اس کی اجازت دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کام کرتے چلے جاؤ اور یہ مت دیکھو کہ اس کا پھل ملا یا نہیں کہ کسی نے دیکھا ہے

ہزار طرح جیسے بسم کہو عالم میں ٭ منور جیسے حیدر اخبار کو جلا کر دیں

انجمن نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو یہ تو مستقبل کا مورخ ہی بتلائے گا لیکن اس نے اغیار کو بینا کرنے کی کامیاب سعی ضرور کی ہے اور اس کا اعتراف مرکزی انجمن ترقی اردو کو بھی ہے۔

انجمن کے قیام کے بعد حبیب الرحمٰن صاحب کا دوسرا بڑا کارنامہ اردو ہال کی تعمیر کا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے لاکھوں روپے کی زمین بطور عطیہ دی۔ اس کا افتتاح ۱۹۵۰ء میں اُس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اس کے بعد اردو آرٹس کالج کا قیام ان کی فکر و عمل کا ایسا کارنامہ ہے کہ اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اردو ذریعۂ تعلیم کا آندھرا پردیش ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا پہلا کالج تھا جس کے بعد دوسروں نے اس سے کسبِ فیض حاصل کیا۔ اس کالج کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے قیام نے جامعہ عثمانیہ میں دوبارہ اردو ذریعۂ تعلیم کو جنم دیا اور آج تو وہ اردو کی اعلیٰ تعلیم کا ایسا سرچشمہ ہے کہ آئندہ نسلیں اسے بھول نہیں سکیں گی جس طرح سے پولیس ایکشن کے بعد اردو کو نیست و نابود کردیا گیا تھا لیکن انجمن کے قیام نے حکومتی ایوانوں کے سکون آمیز جھیلوں میں ایسا پتھر لڑھکایا کہ اس کی لہروں میں آج بھی حرکت پائی جاتی ہے اسی طرح سے اردو آرٹس کالج کا قیام مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کا ایسا سنگِ میل ہے کہ اس کی وجہ سے مادری زبان میں علم کے حصول کو ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہو گئی۔

حبیب الرحمٰن صاحب ہمیشہ عملی سیاست سے دور رہے لیکن ایک بار وہ اتنے مجبور ہوئے کہ انھیں کل ہند مجلس مشاورت کے نائب صدر کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ وہ سیاسیات میں ہمیشہ علیحدگی پسندی کی سخت مخالفت کرتے رہے اس کا ثبوت ان کا وہ خطبہ استقبالیہ ہے جو انھوں نے کل ہند مسلم مجلسِ مشاورت کے اجتماع کے موقع پر جو حیدرآباد میں پڑھا تھا اس خطبہ میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ "مسلمانوں کے لیے یہ مفید نہیں ہے کہ وہ انتخابات لڑنے کے لیے اپنی ایک خالص اسلامی پارٹی بنائیں اسی طرح اُن کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ خود کو کسی ایک سیاسی پارٹی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستگی

ختیار کریں ۔ یہ بات مناسب ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ آپ کس طرح تصور کر سکتے ہیں کہ سارے کے سارے مسلمان ایک ہی سیاسی تصور یا آئیڈیالوجی کے حامی بن جائیں"۔ آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ " جہاں تک ملکی سیاست اور پارلیمانی اور دوسرے انتخابات کا تعلق ہے وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے نصب العین اور پروگراموں کو دیکھ کر اپنے سیاسی شعور کے مطابق کسی نہ کسی پارٹی میں شریک ہو جائیں چاہے وہ کانگریس پارٹی ہو یا کمیونسٹ پارٹی یا سوتنترا پارٹی ہو یا سوشلسٹ پارٹیاں"۔ یہ خطبہ ان کی سیاسی وسیع النظری اور غیر فرقہ واری سیاست کی نشاندہی کرتا ہے ۔

ہمارے دیس میں یہ رواج کثرت سے چل پڑا ہے کہ ہم غیر اہم شخصیتوں اور افراد کے بارے میں تعریف و توصیف کے پل باندھ دیتے ہیں اور تہذیبی سفیروں کے خطابات سے سرفراز کر دیتے ہیں مگر ان افراد کو نظرانداز کر دیتے ہیں جنھوں نے بے غرض اردو کی خدمت کی اور سینکڑوں دلوں کو اردو کا کام کرنے کے لیے گرمایا۔ اس موقع پر مولانا آزاد کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "جب انسان بے غرض ہو جاتا ہے تو وہ بے پناہ ہو جاتا ہے" حبیب الرحمٰن صاحب کی اردو سے والہانہ وابستگی انھیں بے پناہ بنائے رکھی ۔ انھوں نے حیدرآباد میں اردو کے لیے ایسی محترک زندگی گزاری کہ جن لوگوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے وہی اس بات کی گواہی دینے کے اہل ہیں ۔ میں عمر کے مختلف حصوں میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوا ہوں ان کی تعداد بہت مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم ہے۔ ان میں سے ایک پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کی شخصیت بھی رہی ہے جن کی سرکردگی میں مجھے تقریباً ۲۵ سال تک اردو کا کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے اس لیے مجھے یہ لکھنے کی اجازت دیجئے کہ حبیب الرحمٰن صاحب کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے مشن پر ڈٹے رہیں اور ہر سطح پر اس کے لیے جدوجہد کریں اور انھوں نے جو ادارے قائم کیئے ہیں انھیں اور ترقی دیں تاکہ آنے والی اردو داں نسل کا مستقبل تابناک ہو سکے ۔ ان کی زندگی ایثار و قربانی کی مثالی زندگی ہے ▲

کمپیوٹر

انعام علوی کمپیوٹرز کے بانی اور مینجنگ ڈائرکٹر محمد انعام علوی کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے مردِ میدان ہیں۔ مختلف بین الاقوامی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دینے کے بعد آپ نے کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی کو ملک میں فروغ دینے کی غرض سے قائم کیا اور ایک ایسے زاویئے سے اس شعبے میں کام کیا، جس زاویے سے کام کرنا ایک امرِ محال سمجھا جاتا تھا۔ یعنی اُردو کمپیوٹر۔ جنوری ۱۹۸۹ء میں انہوں نے "سرخاب" کے نام سے اُردو نستعلیق کی کتابت کرنے والا ایک جامع اور ارزاں کمپیوٹر متعارف کرایا۔ کمپیوٹر ٹکنالوجی کے بارے میں ان کے زریں خیالات نو قارئین کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر بنیادی طور پر کس قسم کی مشین ہے نیز اس کا استعمال کس طرح اور کن کن شعبوں میں ممکن ہے؟

جواب: جہاں تک کمپیوٹر کی تعریف اور اس کی بناوٹ کا تعلق ہے تو اس کی مصنوعی توانسانی تحت الشعور سے بہت حد تک مماثلت رکھتی ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ایک مشینی دماغ ہے جو بلا کسی غلطی اور تھکن کے حسب ہدایت اپنا کام انجام دیتا ہے۔ ایک انسان اپنی جو بھی یادداشت محفوظ رکھنا چاہتا ہو اور اس کی جزیات اور کلیات جب چاہے، حسب ضرورت استعمال کرسکتا ہے، البتہ یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ تمام ہدایات اور یادداشتیں

اس مشینی دماغ میں ایک تسلسل اور نظام کے ساتھ اس میں منتقل کردی جائیں۔ یہ مشین بہرحال اس حد تک انسان کی محتاج ضرور ہے جہاں تک اس کے استعمال کا تعلق ہے تو اسے ہر شعبۂ زندگی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مغربی ممالک کی مثال سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس کی کارکردگی اور افادیت عام تصور سے کہیں زیادہ ہے، البتہ ہمارے ملک میں گو کہ اس ٹکنالوجی کو آئے ہوئے ایک عشرے سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے مگر اس سے افادیت حاصل کرنے کا گراف مقابلتاً نہ ہونے کے برابر ہے۔

سوال : کیا آپ کے خیال میں اس ٹکنالوجی سے ملکی طور پر بھرپور فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے اور اس کی افادیت سے عوام الناس کو روشناس کرانے کی کس حد تک ضرورت ہے اور اس کے لیے آپ کیا تجاویز رکھتے ہیں ؟

جواب : کمپیوٹرز ٹکنالوجی سے ہمارے ملک میں بہت کم استفادہ حاصل کیا جا رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگ اول تو اس کے استعمال سے واقف نہیں ہیں دوسری بات یہ ہے کہ ابھی تک ہم اپنے روائتی تجارتی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس سے جن نقصانات کا سامنا ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ کروڑوں روپیے کا زرمبادلہ خرچ ہونے کے باوجود اس مشینری کا استعمال انتہائی مختصر ہے اگر اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا جائے اور نت نئے شعبوں میں استعمال کرنے کے تجربات وسیع کیئے جائیں تو ہم یقینی طور پر خرچ کئے گئے زرمبادلہ سے کہیں زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی افادیت ضرور حاصل کرلیں گے جو ملکی معیشت کے لئے انتہائی ضروری ہے اگر حکومت وقت اور نجی شعبے عوام الناس کو موثر طریقے پر اس ٹکنالوجی سے روشناس کرائیں تو بڑے بڑے کاروباری ادارے اور نیم سرکاری اداروں کے ساتھ ساتھ نجی کاروبار کرنے والے نسبتاً کم سرمایہ کاری کرنے والے بھی اس جانب ضرور متوجہ ہوں گے، البتہ سرکاری سطح پر پذیرائی سے مراد یہ ہے کہ اس شعبے سے متعلق لوگوں کو بہتر سہولیتیں مہیا کی جائیں اور ان کو یکجا کرکے اس سے متعلق معاملات کو حل اور بہتر سے بہتر پروگرام کے لیے ان کی آراء کی روشنی میں لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ سرکاری سطح کی یہ پذیرائی لوگوں میں ایک

اُمنگ اور حوصلہ کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر کمپیوٹر ٹکنالوجی سے دلچسپی کا سبب بنے گی جو اس کی ترویج کے لیے نہایت ضروری ہے۔ بہرحال حکومت کے اس شعبے کی بہتری کے لیے کیے گئے حالیہ فیصلے کو ایک مستحسن قدم کہنا یقیناً لازمی ہے کیونکہ ایسے پرزہ جات پر ڈیوٹی ختم کردی گئی ہے جن کا استعمال اس شعبے میں ہوتا ہے۔ اس کے مثبت نتائج بہرحال سامنے آئیں گے۔

سوال : کمپیوٹرز ٹکنالوجی پر گفتگو کے دوران دو الفاظ بڑی روانی اور تسلسل کے ساتھ آتے ہیں ایک ہارڈویئر اور دوسرا سافٹ ویئر، جب کہ یہ الفاظ بظاہر بالکل متضاد معنی میں استعمال ہوتے ہیں ۔۔ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب : آپ کا یہ سوال موقع کی مناسبت سے بڑا ضروری ہے اور میں بھی چاہتا ہوں کہ ان الفاظ کے خصوصی معنی سے لوگ واقف ہوجائیں، ویسے ہوتا یہی ہے کہ "ہارڈویئر" کا لفظ سنتے ہی لوگوں کے ذہنوں میں کیل کانٹوں یا لوہے کی اسی قسم کی دیگر اشیاء کا تصوّر ابھرتا ہے۔ دراصل ہارڈویئر کا لفظ، اس ٹکنالوجی میں ان اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کو ہم ہاتھوں سے چھو سکیں یا دیکھ سکیں مثلاً کی بورڈ، اسکرین وغیرہ یا اسی قسم کی چیزیں جو اس میں استعمال ہوتی ہیں سب ہارڈویئر کہلاتی ہیں۔ جب کہ ان سے وابستہ پروگراموں کو سافٹ ویئر کہتے ہیں۔ مثلاً ڈسک ہارڈویئر ہے اور اس میں محفوظ پروگرام سافٹ ویئر کہلاتے ہیں۔

سوال ۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ عموماً جو نوجوان کمپیوٹرز انسٹیٹیوٹ سے باقاعدہ ٹریننگ لے کر اور کورس کرکے آتے ہیں وہ نہ تو اعتماد کے ساتھ کمپیوٹرز پر کام کر پاتے اور نہ ہی ان کی معلومات مکمل ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ عملی طور پر نامکمل ہوتے ہیں اور ان کو لازمی طور پر کسی انجینئر یا ماہر تجربہ کار کے ساتھ دوبارہ سیکھنا پڑتا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ٹکنالوجی اتنی پیچیدہ ہے جو عام طور پر سمجھ میں نہیں آتی یا ٹریننگ دینے والا عملہ بذاتِ خود اس ٹکنالوجی سے واقفیت نہیں رکھتا۔۔؟

جواب: ہمارے ملک میں عام طور پر جتنے بھی اس قسم کے انسٹیٹوٹ ہیں وہ تمام ہی تقریباً نجی اور تجارتی بنیادوں پر ہیں اور اس میں موجود عملہ اس ٹکنالوجی سے عملی طور پر واقف نہیں ہوتا ہے۔ لہذا وہ اپنے شاگردوں کو بھرپور ٹریننگ نہیں دیتے۔ ویسے بھی یہ ٹکنالوجی بڑی تیز رفتاری سے آگے کی سمت بڑھ رہی ہے۔ لہذا دن بہ دن اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور نت نئی تبدیلیاں بڑی روانی کے ساتھ سامنے آتی جارہی ہے جس کے لیے انسان کو ہر لمحہ بدلتی ہوئی قدروں سے باخبر رہنا ضروری ہے جو کہ ایسے اداروں کے لیے اگر ناممکن نہیں ہو تو کم از کم انتہائی دشوار ضرور ہے لہذا یہ کمی فارغ التحصیل لڑکوں میں ہونا لازمی جز ہے۔ ویسے بھی ان اداروں سے متعلق اشخاص یا ٹریننگ لینے والوں کے علم میں ہے کہ ٹرینڈ اشخاص کا فقدان ایسے اداروں میں عام ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کورس کی کامیاب تکمیل کے بعد ایسے ادارے والے ان ہی لڑکوں میں سے ذہین طالب علموں کو تھوڑے سے معاوضہ پر اسی انسٹیٹوٹ میں تربیت دینے پر رکھ لیتے ہیں۔ لہذا یہ کمزوری ہر اسٹیج پر قائم رہتی ہے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس ٹریننگ کا کوئی باضابطہ معیار نہیں ہوتا جس پر پرکھا جا سکے۔ والدین یا سرپرست حضرات بھی اس تعلیم سے بخوبی واقف نہیں ہوتے لہذا وہ بھی اپنے بچوں کو چیک کر نہیں پاتے کہ آیا ان کی ٹریننگ کس حد تک کامیابی سے ہو رہی ہے۔ نیز ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایسے اداروں میں بھاری فیسوں کے باوجود جس کا جہاں دل چاہا پڑھانا شروع کر دیا۔ اسی ناقص طرزِ تربیت کی وجہ سے لڑکے عملی زندگی میں ناکام رہتے ہیں اور انھیں از سرِ نو تعلیم لینی پڑتی ہے۔

سوال :۔ تیسری دنیا کے ایک ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے کمپیوٹر ٹکنالوجی کے امکانات کا اُفق کس حد تک وسیع ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں اس کا استعمال عام ہونے میں کتنا وقت درکار ہوگا ؟

جواب : بلا شبہ اس کے بہت روشن امکانات ہیں البتہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ لوگوں کو اس سے متعارف کرنے کے لیے آپ کیا اقدامات کر رہے ہیں اور اس

امنگ اور حوصلہ کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر کمپیوٹر ٹکنالوجی سے دلچسپی کا سبب بنے گی جو اس کی ترویج کے لیے نہایت ضروری ہے۔ بہرحال حکومت کے اس شعبے کی بہتری کے لیے کیے گئے حالیہ فیصلے کو ایک مستحسن قدم کہنا یقیناً لازمی ہے کیونکہ ایسے پرزہ جات پر ڈیوٹی ختم کردی گئی ہے جن کا استعمال اس شعبے میں ہوتا ہے۔ اس کے مثبت نتائج بہرحال سامنے آئیں گے۔

سوال : کمپیوٹرز ٹکنالوجی پر گفتگو کے دوران دو الفاظ بڑی روانی اور تسلسل کے ساتھ آتے ہیں ایک ہارڈ ویئر اور دوسرا سافٹ ویئر، جب کہ یہ الفاظ بظاہر بالکل متضاد معنی میں استعمال ہوتے ہیں ۔ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب : آپ کا یہ سوال موقع کی مناسبت سے بڑا ضروری ہے اور میں بھی چاہتا ہوں کہ ان الفاظ کے خصوصی معنی سے لوگ واقف ہو جائیں، ویسے ہوتا یہی ہے کہ "ہارڈویئر" کا لفظ سنتے ہی لوگوں کے ذہنوں میں کیل کانٹوں یا لوہے کی اسی قسم کی دیگر اشیاء کا تصور ابھرتا ہے۔ دراصل ہارڈویئر کا لفظ، اس ٹکنالوجی میں ان اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کو ہم ہاتھوں سے چھو سکیں یا دیکھ سکیں مثلاً کی بورڈ، اسکرین وغیرہ یا اور اسی قسم کی چیزیں جو اس میں استعمال ہوتی ہیں سب ہارڈویئر کہلاتی ہیں۔ جبکہ ان سے وابستہ پروگراموں کو سافٹ ویئر کہتے ہیں۔ مثلاً ڈسک ہارڈویئر ہے اور اس میں محفوظ پروگرام سافٹ ویئر کہلاتے ہیں۔

سوال : یہ دیکھا گیا ہے کہ عموماً جو نوجوان کمپیوٹرز انسٹیٹیوٹ سے باقاعدہ ٹریننگ لے کر اور کورس کر کے آتے ہیں وہ نہ تو اعتماد کے ساتھ کمپیوٹرز پر کام کر پاتے اور نہ ہی ان کی معلومات مکمل ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ عملی طور پر نامکمل ہوتے ہیں اور ان کو لازمی طور پر کسی انجینئر یا ماہر تجربہ کار کے ساتھ دوبارہ سیکھنا پڑتا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ٹکنالوجی اتنی پیچیدہ ہے جو عام طور پر سمجھ میں نہیں آتی یا ٹریننگ دینے والا عملہ بذاتِ خود اس ٹکنالوجی سے واقفیت نہیں رکھتا۔؟

جواب: ہمارے ملک میں عام طور پر جتنے بھی اس قسم کے انسٹیٹوٹ ہیں وہ تمام ہی تقریباً نجی اور تجارتی بنیادوں پر ہیں اور اس میں موجود عملہ اس ٹکنالوجی سے عملی طور پر واقف نہیں ہوتا ہے۔ لہذا وہ اپنے شاگردوں کو بھرپور ٹریننگ نہیں دیتے۔ ویسے بھی یہ ٹکنالوجی بڑی تیز رفتاری سے آگے کی سمت بڑھ رہی ہے۔ لہذا دن بہ دن اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور نت نئی تبدیلیاں بڑی روانی کے ساتھ سامنے آتی جارہی ہے جس کے لیے انسان کو ہر لمحہ بدلتی ہوئی قدروں سے باخبر رہنا ضروری ہے جو کہ ایسے اداروں کے لیے اگر ناممکن نہیں ہو تو کم ازکم انتہائی دشوار ضرور ہے لہذا یہ کمی فارغ التحصیل لڑکوں میں ہونا لازمی جز ہے۔ ویسے بھی ان اداروں سے متعلق اشخاص یا ٹریننگ لینے والوں کے علم میں ہے کہ ٹرینڈ اشخاص کا فقدان ایسے اداروں میں عام ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کورس کی کامیاب تکمیل کے بعد ایسے ادارے والے ان ہی لڑکوں میں سے ذہین طالب علموں کو تھوڑے سے معاوضہ پر اسی انسٹیٹوٹ میں تربیت دینے پر رکھ لیتے ہیں۔ لہذا یہ کمزوری ہر اسٹیج پر قائم رہتی ہے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس ٹریننگ کا کوئی باضابطہ معیار نہیں ہوتا جس پر پرکھا جاسکے۔ والدین یا سرپرست حضرات بھی اس تعلیم سے بخوبی واقف نہیں ہوتے لہذا وہ بھی اپنے بچوں کو چیک کر نہیں پاتے کہ آیا ان کی ٹریننگ کس حد تک کامیابی سے ہو رہی ہے۔ نیز ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایسے اداروں میں بھاری فیسوں کے باوجود جس کا جہاں دل چاہا پڑھانا شروع کردیا۔ اسی ناقص طرزِ تربیت کی وجہ سے لڑکے عملی زندگی میں ناکام رہتے ہیں اور انہیں از سرِ نو تعلیم لینی پڑتی ہے۔

سوال:۔ تیسری دنیا کے ایک ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے کمپیوٹر ٹکنالوجی کے امکانات کا افق کس حد تک وسیع ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں اس کا استعمال عام ہونے میں کتنا وقت درکار ہوگا؟

جواب: بلاشبہ اس کے بہت روشن امکانات ہیں البتہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ لوگوں کو اس سے متعارف کرنے کے لیے آپ کیا اقدامات کر رہے ہیں اور اس

عمل میں جتنا وقت لگے گا۔ وہی ہمیں آگے کی سمت بڑھانے کا موجب ہوگا اور میرا اندازہ ہے کہ جس انداز سے اس وقت کام ہو رہا ہے، اس کے پیش نظر ہمارا آئندہ چند برسوں میں اس ٹکنالوجی سے افادیت کا گراف توقع سے کہیں زیادہ بلند ہو جائے گا۔ اس سے ہٹ کر میں اس جانب بھی حزب اقتدار کی توجہ دلانا چاہوں گا کہ ہارڈ ویئر کی تیاری اور بیرون ملک برآمد سے بھی ایک کثیر زرمبادلہ کمایا جا سکتا ہے اس سلسلے میں میں پڑوسی ملک کی مثال دوں گا کہ وہ ہارڈ ویئر برآمد کر کے ایک بڑی رقم کا زرمبادلہ ہر سال کما رہا ہے، جب کہ ہمارے ملک میں اس جانب توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس جانب توجہ دی جائے تو کم لاگتی اخراجات کی وجہ سے ہم اپنا مال بیرونی منڈی میں (ہارڈ ویئر) فروخت کر کے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت زیادہ منافع کما سکتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں لیبر کیونکہ بہت سستا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا تمام تر اثر لوگ لاگت پر پڑتا ہے۔

سوال: عام طور پر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال عام ہے کہ کمپیوٹر کی وجہ سے بے روزگاری بڑھ گئی ہے اور ایک کمپیوٹر کم از کم چند تہائی عملہ کو فارغ کر دیتا ہے۔ آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں؟

جواب: بادی النظر میں بلاشبہ ایسا محسوس ہوتا ہے مگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو روزی کمانے کے زیادہ امکانات میسر آتے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ کار کو ایک جانب سے اخراجات کی کمی، دوسرے شعبوں میں سرمایہ کاری کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور تجارتی برادری اپنا سفر نئی سمتوں میں شروع کرتی ہے جس کے سبب ملک میں نئی صنعتیں قائم ہوتی ہیں اور لوگوں کی کھپت بڑھ جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر میں استعمال ہونے والے ہارڈ ویئر کی تیاری اور دیگر اشیاء کی تیاری اور بیرونی منڈی فروخت کے اقدامات مزید افرادی قوت کے طلبگار ہوتے ہیں۔

مردم شماری ۱۹۹۱ء

۱۹۹۱ء کی مردم شماری بھی ختم ہوگئی اور وہی کچھ ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا جو شکایتیں ہمیں ملیں ہیں، ممکن ہے کہ دوسری لسانی اقلیتوں کو بھی ہو لیکن ہماری شکایتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اردو والوں کو یہ احساس بلکہ یقین ہے کہ مردم شماری میں ان کی تعداد بہت کم کر کے دکھائی جاتی ہے تعداد کم کر کے دکھائے جانے کے وجوہ دو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن لوگوں کو اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ اسکول کے اساتذہ ہوتے ہیں اور انھیں بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے انجمن کا ایک وفد مردم شماری کے رجسٹرار جنرل سے ملا تھا۔ رجسٹرار جنرل نے گفتگو کے دوران وفد کو بتایا کہ انھیں اعداد و شمار جمع کرنے والے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ انھوں نے ایک شہر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں اسکولوں کے بیشتر اساتذہ نے یہ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا اور حکومت کا دباؤ ڈالے جانے پر ہی وہ راضی ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جب اعداد و شمار اکٹھا کریں گے تو وہ ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیں گے۔ یہ شکایت عام ہے کہ اعداد و شمار جمع کرنے والے دو ایک سوال کر کے چلے جاتے ہیں اور باقی فارم گھر پر جا کر بھرتے ہیں ایسے لوگ کسی تعصب کا شکار نہیں ہوتے بلکہ غیر ذمہ دار اور لاپرواہ ہوتے ہیں لیکن ان کی اس لاپرواہی کا فائدہ صوبے کی سرکاری زبان کو ہوتا ہے یعنی دہلی، اترپردیش، بہار، ہریانہ، مدھیہ پردیش اور راجستھان وغیرہ میں شمار کنندے خانہ بند کر کے مادری زبان "ہندی" لکھ دیتے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ لسانی اقلیتوں کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے اور ...

حکومت ان لسانی اقلیتوں کے بارے میں کچھ کرنا چاہتی ہے تو یہ اعداد و شمار آڑے آتے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو تو اُردو کے لیے کچھ نہ کرنے کا بہانہ چاہیے۔ یہ اعداد و شمار حکومتوں کو سہارا دیتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شمار ندوں میں ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں جو مذہبی لسانی اور علاقائی تعصب سے کام لیتے ہیں۔ بعض ریاستوں سے ہمیں یہ شکایتیں موصول ہوئی ہیں کہ ایک فرقہ پرست جماعت نے شمار ندوں کو باقاعدہ ہدایت دی تھی کس طرح مردم شماری میں لسانی اقلیتوں کی تعداد کم کر کے دکھائی جائے۔ یہ تعصب کے شکار شمار ندے زبان ہی نہیں مذہب بھی بدل دیتے ہیں۔ اس دفعہ ایسی شکایتیں بہت موصول ہوئی ہیں کہ شمار ندوں نے ایک مسلمان کا مذہب "ہندو دھرم" اور اس کی مادری زبان "ہندی" لکھی ہے اگرچہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے پورے ایک سال جدوجہد کر کے خاصی تعداد میں اُردو والوں کو مردم شماری کی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور ان کو ہدایت دی تھی کہ جب فارم پُر کیا جاچکے تو وہ خود دیکھ لیں کہ زبان کے خانے میں ان کی مادری زبان "اردو" لکھی گئی ہے یا نہیں۔ لیکن اُردو والوں میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ۲۰ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے گویا ۸۰ فیصدی فارم ایسے بھرے گئے ہیں جنھیں چیک کرنے والا کوئی نہیں تھا

ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ آندھرا پردیش، مغربی بنگال، کرناٹک اور جنوبی ہند کی دوسری ریاستوں میں خاصی بڑی تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو اُردو کو نہیں بلکہ ان ریاستوں کی علاقائی زبانوں کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔ لیکن شمالی ہند میں ایسا بالکل نہیں ہے یہاں یوپی بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے اُردو بولنے والوں میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی شامل ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ صرف وہ مسلمان جو ملازمت کے سلسلے میں جنوب ہند سے ان ریاستوں میں آتے ہیں اور اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں۔ دہلی میں جنوبی ہند سے آئے ہوئے مسلمانوں کی تعداد ایک فی صدی اور شمالی ہند کی باقی ریاستوں میں ... یہ

[illegible]

ایسا نہیں ملا جو اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کو اپنی مادری زبان بتاتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ان ریاستوں میں کم سے کم دو نسلوں نے ہندی پڑھی ہے اور وہ اُردو لکھنے اور پڑھنے سے قاصر ہیں لیکن یہ لوگ بعض سیاسی اور سماجی وجوہ سے اُردو ہی کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں

اب اس مسئلے کے دوسرے پہلو پر آئیے۔ اگر مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق شمالی ہند کی ریاستوں میں بڑی تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں تو یقیناً ہندوؤں میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے اور مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوں گے جن کی مادری زبان ہندی کے علاوہ کوئی اور زبان ہے ہم نے صرف شمالی ہند کی چار ریاستوں کے اعداد و شمار کا ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق تجزیہ کیا ہے آپ بھی مردم شماری کے ذمہ داران کی کرشمہ سازی ملاحظہ کیجئے:

اُترپردیش: ہندوؤں کی کل آبادی: ۹۲۳۶۵۹۶۸ } فیصد ۱۷ ٪
ہندی بولنے والوں کی تعداد ۹۹۱۴۴۹۶۲

مسلمانوں کی کل آبادی ۱۷۶۵۷۷۳۵ } فیصد ۶۰٫۹
۱۰۷۶۷۱۷۵

راجستھان؛ ہندوؤں کی کل آبادی ۳۰۶۰۳۹۷ } فیصد ۱۰۷٫۲ — مسلمانوں کی کل آبادی ۲۴۹۲۱۴۵ } فیصد ۲۹٫۱
ہندی بولنے والوں کی کل تعداد ۳۰۶۸۵۸۸۷ — اُردو بولنے والوں کی تعداد ۷۲۵۴۰۲

مدھیہ پردیش؛ ہندوؤں کی کل آبادی ۴۸۵۰۴۵۷۵ } فیصد ۹۰٫۴ — مسلمانوں کی کل آبادی ۲۵۰۱۹۱۹ } فیصد ۴۵٫۲۱
ہندی بولنے والوں کی آبادی ۴۳۸۷۰۲۴۲ — اُردو بولنے والوں کی تعداد ۱۱۳۱۲۸۸

بہار؛ ہندوؤں کی کل آبادی ۵۸۰۱۱۰۷۰ } فیصد ۹۲٫۴۳ — مسلمانوں کی کل آبادی ۹۸۷۴۹۹۳ } فیصد ۷۰٫۴۳
ہندی بولنے والوں کی تعداد ۵۵۸۲۵۰۸۴ — اُردو بولنے والوں کی تعداد ۶۹۵۵۸۳۸

ان اعداد و شمار کے بارے میں ہماری گزارش ہے کہ ہمیں شمالی ہند کی کسی بھی ریاست کے ایسے سو مسلم افراد کے نام و پتے بتا دیجئے جو اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں ہم مہینہ بھر کے اندر اندر ان تمام لوگوں کے ایسے تحریری بیان آپ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

گے جن سے حقیقت واضح ہو جائے گی ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو والے کس طرح مردم شماری کے اعداد و شمار سے مطمئن ہوں گے اس سلسلے میں ہمارا جواب ہے کہ جب شمالی ہند میں مسلمانوں اور اُردو والوں کی تعداد تقریباً برابر ہوں گے یعنی ہم تسلیم کر لیں گے کہ اگر کسی علاقے میں ایک ہزار خاندان رہتے ہیں تو ایک سو نے اپنی زبان ہندی لکھوادی ہوگی (یہ ممکن ہے) لیکن یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ ایک ہزار میں سے پانچ سو یا چھ سو مسلمانوں کی مادری زبان ہندی ہے ۔"

۱۹۸۱ء کی لسانی اعداد و شمار تقریباً آٹھ سال بعد شائع ہوئے تھے اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ لوگوں نے اپنی مادری زبان وہی لکھوائی تھی جو وہ بولتے ہیں مثلاً اُتر پردیش میں پوربی برج بھاشا، قنوجی اور اودھی وغیرہ اور بہار میں میتھلی اور بھوجپوری وغیرہ ۔ اگر مردم شماری کے اعداد و شمار میں ان زبانوں کو جوں کا توں دے دیا جاتا تو ہندی اقلیتی زبان بن جاتی ۸ سال کے غور و فکر کے بعد ان تمام زبانوں کو ہندی کے خانے میں ڈال دیا گیا ۔ اس سال بھی ہمیں ڈر ہے کہ مردم شماری کے اعداد و شمار میں یہی کچھ ہوگا ۔

مردم شماری میں ہونے والی دھاندلیوں کے سلسلے میں ہمیں بہت سی شکایتیں موصول ہوئی تھیں ، ہم نے کئی شکایتوں کرائی اور ایک منزل وہ بھی آئی جب ہم نے تار دے کر وزیر اعظم اور حکومت کے بعض دوسرے ذمہ داران کی توجہ اس طرف مبذول کرائی مگر افسوس کہ ہمیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ۔ ہمارا یہی جو مردم شماری کے ذمہ داران نے طے کر لیا تھا ۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس دفعہ تناسب کے اعتبار سے اُردو والوں کی تعداد پہلے سے بھی کم دکھائی جائے گی ●● (بشکریہ ہماری زبان دہلی)

'شاداب' میں اشاعت کیلئے تخلیقات کا غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے ۔
جواب طلب امور کیلئے جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ آنا ضروری ہے

سہیل حامد

مردم شماری
یا
اردو بیزاری

اردو والوں کے پاس یہ یقین کرنے کے لیے بہت سے اسباب ہیں کہ مردم شماری میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت کم دکھائی جاتی ہے۔ مرکزی انجمن ترقی اردو نے رجسٹرار جنرل کا دھیان دو ملاقاتوں میں اپنے اندیشوں کی طرف دلایا۔ انھوں نے یقین دہانی کی۔ لیکن شمار کنندوں کی روش کی جو خبریں آرہی ہیں بہت تشویشناک ہیں شمار کرنے والے مادری زبان کے متعلق عام طور پر سوال ہی نہیں کرتے اور اکثر اس خانہ میں "ہندی" درج کردیتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر میں شکایتیں متواتر آرہی ہیں ایسا لگتا ہے کہ بابری مسجد۔ رام جنم بھومی قضیہ نے اتنی تلخی پیدا کردی ہے اور فضا کو اس حد تک مسموم کردیا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان سمجھنے والے مردم شماری میں ان کا وزن گھٹانے پر تل گئے ہیں حالانکہ ایسا سمجھنا اور کرنا دونوں بہت نامناسب ہیں۔ لیکن زبان کے تعلق سے زیادتی مردم شماری کے دوران پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہے، تاہم شاید نہ اتنی۔

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ حکومت کے احکام اور ہدایتوں کی سب سے بہتر عمل آوری راجدھانی میں ہوتی ہے قصبات اور دیہات میں جو سرکار کے صدر مقام سے دور ہوں تعمیل میں ڈھیل آجاتی ہے۔ یہ تصور بھی عام ہے کہ مردم شماری میں ڈنڈی وہیں ماری جاتی ہے جہاں شمار کیے جانے والے لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور ہوش و گوش نہیں رکھتے اور بھولی نادر اعتماد کے ساتھ غلط اندراج کیا امکان کو روک نہیں پاتے۔ مذکورہ دونوں تاثر

کو تسلیم کرنے کے بعد اگر ایسے واقعات آئیں جن میں مادری زبان کے خانہ میں دیدہ ودانستہ غلط اندراجات راجدھانی میں کیے گئے ہوں اور ایسے لوگوں کے ضمن میں جو علم کے منتہی ہوں تو یہ فیصلہ آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کہ دوسری جگہوں پر کم پڑھے لکھے لوگوں کی مادری زبان کے بارے میں بڑے پیمانے پر غلط تو لیاں کی گئی ہوں گی۔ واقعات کیا ہیں ملاحظہ کیجئے۔ مُشتے نمونے از خروارے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ان کے والد ماجد جناب شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب مرحوم مشہور سیاسی رہنما اور سماجی کارکن تھے جنہوں نے اپنی زندگی جنگِ آزادی، قومی یک جہتی اور تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کردی تھی پروفیسر صدیق الرحمٰن جامعہ نگر میں رہتے ہیں جہاں اردو بولنے والوں کا جمگھٹ ہے شمار کندے نے ان کی مادری زبان اور ان کے اہل وعیال کی مادری زبان ہندی لکھی، ان کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے وزیر اعظم، وزیر داخلہ اور رجسٹرار جنرل سے فریاد کی، تب جاکر ایک ڈپٹی رجسٹرار نئے سرے سے اندراج کرنے پر مامور ہوئے۔

ایک اور معروف پروفیسر کے ساتھ جو شیخ سرائے (یا مالویا نگر) میں رہتے ہیں شمار کرنے والے نے اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ ان کے سخت اور طویل احتجاج کے بعد "ہندی" کاٹ کر ان کی اور ان کے اہل وعیال کی مادری زبان "اردو" لکھی گئی۔ شمار کندے نے پہلے تو تصحیح کرنے سے اس بنا پر انکار کردیا گیا تھا کہ "اگر اردو کی جگہ ہندی لکھ دیا گیا تو کیا فرق پڑتا ہے"۔

جناب شریف الحسن نقوی سابق سکریٹری دہلی اردو اکاڈمی اپنی لیاقت اور کارگزاری کے لیے نامور ہیں۔ شمار کرنے والے نے ان کی اور اہل وعیال کی مادری زبان "ہندی" لکھ دی۔ کافی ردّ وکد کے بعد اس اندراج کی تصحیح ہوسکی۔

قارئینِ کرام غور فرمائیں کہ دہلی میں پڑھے لکھے، با اثر اور اردو سے وابستہ لوگوں کے ساتھ

ساتھ اس پیمانہ کی غلط اندراجی ہوسکتی ہے تو ملک کے دوسرے حصوں میں کیا ہوا ہوگا۔ لطف یہ کہ قدوائی صاحب اور نقوی صاحب انجمن کے ان وفود میں شامل تھے جو رجسٹرار جنرل صاحب سے ملا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مختلف سطحوں پر' بالائی سطح کو چھوڑتے ہوئے مردم شماری کرنے والوں کو یہ ہدایت کردی گئی تھی یا خود اُن کا رجحان ہی یہ تھا کہ چھوٹتے ہی مادری زبان" ہندی" لکھ دی جائے اس طرح کہ بے چارے شمار کیے جانے والے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اگر وہ آہٹ لے ہی لے یا تصحیح پر اصرار کرنے لگے تو اندراج صحیح کردیا جائے۔ حکومت کا کاروبار اعتماد پر چلتا ہے۔ خود باڑھ جب کھیت کو کھانے لگے تو فصل کا کیا حشر ہوگا۔

یہ بھی انوکھی سی بات ہے کہ جامعہ نگر کی شکایت پر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب کے گھر کے اندراجات ٹھیک کرنے کو کافی سمجھا گیا۔ حالاں کہ ضرورت تھی پورے علاقے کے اندراجات کو چیک کرنے اور ٹھیک کرنے کی' کیوں کہ ان سب کی صحت مُشتبہ ہوگئی تھی۔

ان تین مثالوں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد انصاف کا تقاضہ ہے اور رجسٹرار جنرل صاحب پر واجب ہو جاتا ہے کہ ملک بھر میں (خصوصًا ان ریاستوں میں جو عُرفِ عام میں ہندی ریاستیں کہلاتی ہیں) مادری زبان کے اندراج کو نمونتاً [illegible] چیک کیا جائے اور اگر جا بجا غلطیاں پائی جائیں تو زبان کا اندراج نئے سرے سے کیا جائے۔ یہ لسانی اقلیتوں کا بنیادی حق ہے اور جمہوری حکومت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے اہل کاروں یا شمار کرنے والوں کو بڑے پیمانے پر حق تلفی کی چھوٹ دے دی جائے۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید
"گرین ویو" شانتی نگر
حیدرآباد ۲۸

غزل

سمجھ میں کچھ نہیں آتا عقل ششدر ہے
وہ دور جو رہتا تھا دل کے اندر ہے

خیال بھی ترا رنگیں بیان بھی رنگین
"ترا وجود تو رنگوں کا ایک سمندر ہے"

سدا سفر میں ہوں خانہ بدوش کی مانند
سکون پاؤں کہاں کیا کہیں میرا گھر ہے

قدم قدم پہ ہیں اہل فساد کے پہرے
ہمارے شہر میں ہر سمت خوف خنجر ہے

تماشہ کس طرح دیکھوں زوال انساں کا
جھلس رہا ہے میری روح کیسا منظر ہے

مقابلہ نہ زمانے سے کر سکا کوئی ؟
کہاں سکندر و دارا کہاں ہر ہٹلر ہے

طواف کعبہ عبادت عظیم ہے لیکن
دلوں کو جیتنا اصل حج اکبر ہے

عجیب ہے قوم کا کردار اور حسن نظر
جو راہزن تھا وہی آج سب کا رہبر ہے

گناہ طاہرہ میرا ہے بے گناہی میری

ماہنامہ　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　حیدرآباد

شاداب

جلد (۸) شمارہ (۸)　　　　　　　　اگست ۱۹۹۱ء　　　　　　　　حیدرآباد

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	65 روپے	۲ سال	120 روپے	تاحیات	1500 روپے
خلیجی ممالک	"	200 "	"	360 "	"	3700 "
پاکستان	"	175 پاکستانی روپے	"	300 پاکستانی روپے	"	3000 پاکستانی روپے
امریکہ	"	40 ڈالر	"	75 ڈالر	"	700 ڈالر
انگلستان	"	25 پونڈ	"	45 پونڈ	"	400 پونڈ

ترسیلِ زر کا پتہ :

ماہنامہ "شاداب"

147۔5۔11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" 147۔5۔11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

"شاداب" آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اس کے لیے خود لکھیئے دوسروں کو ترغیب دلائیے اور اپنے حلقۂ احباب میں اسے متعارف کروائیے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
ترجمہ: مولانا عبدالنور صاحب ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء

اُمتِ اسلامیہ کا مستقبل

وہ اہم مقالہ جو قاہرہ مصر میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس کے لیے لکھا گیا جو شئونِ اسلامیہ کی مجلسِ اعلیٰ اور وزارتِ اوقاف حکومتِ مصر نے ابریل ۹۱ء کی ۲۵، ۲۶، ۲۷، تاریخوں میں بلائی تھی اور جس میں خلیج کی جنگ اور اس سے پیدا شدہ حالات و نتائج کا حقیقت پسندانہ اور منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے اور مسلم قیادت اور ذمہ داروں کو دیانتدارانہ و جرأتمندانہ مشورہ دیا گیا ہے۔

حضرات!

"خلیجی جنگ کے بعد اُمتِ اسلامیہ کا مستقبل" کے موضوع پر منعقد ہونے والا یہ اجتماع بروقت بھی ہے اور برمحل بھی، بروقت اس لیے کہ یہ بے سبب اور لاحاصل جنگ ابھی ختم ہوئی ہے۔ اس کے اسرار کھل رہے ہیں اور نتائج سامنے آرہے ہیں، نہ تو اس کا کوئی جائز اور معقول سبب تھا، نہ اس کے ممکنہ نتائج و عواقب کو سامنے رکھا گیا تھا۔ اس کو ایک مجنونانہ جست، حصولِ قیادت و عظمت کا جنون یا جنگی دماغی دورہ (HYSTERIA) ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور شخصی و انفرادی قیادتوں، سطوت و اقتدار کے جذبے، بڑھے ہوئے

شوق اور نخوت و غرور کے مظاہروں کی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں، میں اس طرح کے قائدین کی فہرست پیش کر کے اور ان کے زمان و مکان کی تفصیلات بیان کر کے اس محترم و مؤقر مجلس پر چھائی ہوئی سنجیدگی اور شائستگی کو نہ مجروح کرنا چاہتا ہوں اور معزز حاضرین کی کبیدگیٔ خاطر کا سبب بننا چاہتا ہوں۔ جن میں عالم عربی و اسلامی کے قابلِ احترام علماء، اصحابِ فکر و نظر، سیاست و انتظامیہ کے ممتاز ترین افراد شامل ہیں بڑے افسوس اور معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام کی شاندار اور طویل تاریخ بھی اس طرح کے مہم جو افراد سے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اس طرح کے سیاسی قمار بازوں سے خالی نہیں رہی، حالانکہ اسلام کے پاکیزہ پیغام، اس کی حکیمانہ تعلیمات، اس کے عظیم مقاصد اور بلند معیار کی روشنی میں بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اسلامی تاریخ اس طرح کی نامناسب مثالوں اور فاسد نمونوں سے خالی ہو، لیکن انسانی فطرت اپنا کام کرتی ہے، وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے خاص طور سے ایسی صورت میں جہاں صحیح طور پر طاقتور اور مؤثر تربیت کا فقدان ہو، یا اجتماعی و دینی احتساب کا شعور و احساس نہ ہو، یا رب العالمین و "ارحم الراحمین" خالق کائنات پر ایمان رکھنے والا قلب و ضمیر موجود نہ ہو اور آخرت کا خوف نہ ہو، جہاں ہر انسان سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اور اس کا دائرۂ اثر و نفوذ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔

بہرحال اب جنگ کے بادل چھٹ گئے ہیں اور ہیجانی و ہنگامہ خیز مرحلہ ختم ہو چکا ہے جس میں زیادہ دنوں تک باقی رہنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی، نہ دینی اعتبار سے نہ اصولی حیثیت سے اور نہ عقل اور حقیقت پسندی کی رو سے اور اب اگرچہ حالات اپنی راہ پر آ گئے ہیں اور حق حقدار کو مل گیا ہے لیکن دعوتِ اسلامی اور تحریک "پیامِ انسانیت" کے ایک کارکن کی حیثیت سے، وہ بھی ہندوستان جیسے حساس ملک اور نازک و پیچیدہ حالات میں جہاں اکثر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں اور انسانی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں! یہ کہتے ہوئے میرا دل رنج و غم سے بھرا ہوا ہے اور کلیجہ پھٹا جا رہا ہے کہ اس جنگ نے اسلام

شہرت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اسلام ہی سب سے عظیم و نمایاں دین ہے جو انسانیت کے احترام اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنے کی دعوت دیتا ہے، ایسے معبود پہ ایمان رکھتا ہے جو "رب العالمین" ہے اور ایسے نبی کا پیرو اور امتی ہے جو "رحمۃ للعالمین" ہیں۔ ایسے دین کی شہرت و عظمت کو اس جنگ نے اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ تاریخ میں ایک مدت سے اس کی مثال نہیں ملتی، تاریخ کے ایک طالب علم اور مصنف کی حیثیت سے اور ہندوستان میں تحریکِ پیامِ انسانیت "کے ایک داعی کی حیثیت سے یہ بات میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں، پیامِ انسانیت کی تحریک کو اللہ کا شکر ہے ہندوستان میں توقع سے زیادہ کامیابی ملی ہے، وہ غیر مسلم اکثریت کے تعلیم یافتہ اور صاحبِ فکر و دانش رہنماؤں کی تائید اور ان کا اعتراف حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے، اس تحریک کے رہنماؤں نے غیر مسلم دانشوروں اور قائدین کے تعاون کے ساتھ جو اجتماعات منعقد کئے ہیں وہ بہت کامیاب رہے ہیں اور ملک کے مختلف طبقات کے ممتاز ترین لوگ ان میں شریک ہوئے اور متاثر ہوئے ہیں لیکن عراق کے ظالمانہ اقدام نے اس تحریک کی راہ میں مشکلات پیدا کر دیئے کویت پر عراق کا حملہ قزاقی کے علاوہ کچھ نہیں تھا اس میں دینی وحدت و اشتراک کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ مال و دولت کے علاوہ بے شمار جانیں ضائع ہوئیں، عزتیں پامال کی گئیں، احسانات کی ناشکری ہوئی اور رذالت و بدکرداری کی آخری حدیں پار کر لی گئیں جس سے برصغیر کے مسلمانوں کے سر شرم سے جھک گئے، پیشانی عراق آلود ہو گئی اور برادرانِ وطن کو امن و آشتی کی دعوت کے لیے اب زبان کھولنی مشکل ہے اگر ہمارے غیر مسلم برادرانِ وطن خلیجی جنگ اور کویت جیسے اسلامی اور امن پسند ملک کے ساتھ عراق کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ کریں یا مسلمان کردوں کے ساتھ عراقی حکام کے رویہ کا تذکرہ کریں، جنھوں نے کسی زمانہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے بطلِ جلیل کو پیدا کیا اور وہ کہیں کہ جناب ہمیں احترامِ انسانیت کی دعوت دینے سے پہلے ذرا اپنے گھر کی، اپنے ہم مذہب لوگوں کی خبر لیں۔ اور مسلمانوں کی "مثالی قوم" کو دیکھیں تو ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

محترم حضرات! جنگ کے بادل اگرچہ چھٹ چکے ہیں اور یہ منحوس مرحلہ اگرچہ ختم ہو چکا ہے تاہم بھی امتِ اسلامیہ کے حال و مستقبل کی فکر رکھنے والے مصلحین و مفکرین کو یہ جنگ اور اس کے دوران پیش آنے والے واقعات و حالات، چند حقائق کی طرف پوری قوت کے ساتھ متوجہ کر رہے ہیں جو اس مدت میں واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں بلکہ ان احوال و کوائف نے ہر سنجیدہ و باشعور اس امت کی فکر رکھنے والے اور تجربات سے فائدہ اٹھانے والے مسلمانوں کی انگلی اس امت میں موجود کمزوریوں اور اس کی صفوں میں موجود شگافوں (GAPS) پر رکھ دی ہے بلکہ اس جنگ نے اس سے بھی زیادہ خطرناک دوررس اور امت کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی خامیوں کو آئینہ کر دیا ہے جو موجودہ اخبارات، صحافت، دیگر ذرائع ابلاغ اور بہت سی اسلامی تحریکات کے طرزِ فکر اور ان کے ذہن و شعور میں گھر کر گئی ہیں، ان کا۔ خاص طور سے اس مؤقر مجلس میں اخلاقی جرأت کے ساتھ جائزہ لینا، قوت و وضاحت کے ساتھ بیان کرنا اور مکمل غیر جانبداری کے ساتھ اپنا اور دینی بھائیوں کا محاسبہ کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء۔ ۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنے رہو چاہے وہ تمہارے یا تمہارے والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی ہو

لیکن ہم ان غیر خوش کن حقائق اور امتِ اسلامیہ کی (جس میں عرب مسلمان بھی شامل ہیں) موجودہ زندگی میں موجود قابلِ تشویش خلا پر گفتگو سے پہلے اس امر پر قدرے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ یہ کانفرنس جس طرح عین وقت ہو رہی ہے اسی طرح صحیح اور مناسب ترین جگہ میں منعقد ہے اللہ نے مصر کے لیے یہ مقدر کر دیا ہے اور اس کو یہ شرف بخشا ہے کہ انتہائی نازک اور خطرناک گھڑی میں اور جیسا کہ قرآن میں آیا ہے

إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ (القیامۃ۔ ۲۶۔ ۲۷)

ترجمہ : اور جب جان حلق میں جا اٹکے اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کی تلاش ہونے لگے۔

ایسے وقت میں اسلام کی عزت و شرف اور مقدسات اسلامیہ کی حفاظت کے لیے فیصلہ کن اور قائدانہ کردار ادا کرے، کم از کم تاریخ میں دو بار ضرور ایسا ہوا ہے، جن کی طرف مختصراً اشارہ کرنا ضروری ہے۔

پہلا موقع تو وہ ہے جب کہ یورپ کے صلیبی عیسائی اپنے بادشاہوں، فوجی سرداروں اور پُرجوش اور سرفروش سپاہیوں کے ساتھ اور بے نظیر عزم و ارادہ کے ساتھ عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے، اُن کے عزائم یہ تھے کہ جزیرۃ نمائے عرب اور حرمین شریفین پر قبضہ کرلیں، وہاں سے اسلام کے آثار و نشانات مٹادیں، اور ان مقدسات کی توہین کے مرتکب ہوں جن پر مسلمان اپنی جان، اپنا مال، اپنی عزت اور اپنے خون کا آخری قطرہ تک قربان کرنے پر تیار رہتے ہیں، اس حملہ اور اُس کی وجہ سے عالم اسلام کو لاحق خطرات کے سلسلہ میں ہم ایک صاحب اختصاص مغربی مصنف اسٹینلے لین پول STANLEY LANEPOOLE کی شہادت پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں وہ اپنی مشہور کتاب "صلاح الدین" SALADIN میں لکھتا ہے۔

"صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اُڑا دیں گے۔"[1]

([1] سلطان صلاح الدین ص ۹)

اس موقع پر علیم و قدیر کارساز عالم کا یہ فیصلہ سامنے آیا کہ مسلمانوں کا قبلہٴ اول بیت المقدس نوّے سال صلیبیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں رجب ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) میں اسلام اور مسلمانوں کو واپس ملے۔

صلاح الدین، الملک العادل نورالدین زنگی کے سپہ سالار اور ان کی طرف سے مصر کے حاکم تھے، اس طرح اس عظیم کارنامہ اور شاندار فتح کے ساتھ مصر کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہوگیا اور یہ فضیلت صلاح الدین کی صورت میں مصری قیادت کے حصہ میں آئی ظاہر ہے کہ اس نے اللہ کی مدد کے ساتھ مصر کے بہادر مسلمان مجاہدین کے ذریعہ یہ کارنامہ

بجام دیا" لین پول لکھتا ہے:

"نورالدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا رودِ نیل پر قابض ہو جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی کرہ سی کے بیچ میں آ گئی تھی، وہ دونوں طرف سے دب رہی تھی اور دونوں جانب جو چیز اسے بھینچ رہی تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے، دمیاط اور اسکندریہ کی بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک بحری بیڑے پر بھی ہو گیا اور انھوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کر دیا۔" ؎۲ (؎۲ سلطان صلاح الدین ص ۸۹)

سلطان صلاح الدین خود اس کا اعتراف کرتے تھے کہ اس کارنامہ میں مصر کا اہم حصہ ہے، ایک مرتبہ انھوں نے کہا:-

"جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی اللہ کو مجھے دینا منظور ہے۔" ؎۳ (؎۳ سلطان صلاح الدین ص ۱۴۶)

دوسرا موقع ساتویں صدی ہجری میں عالم اسلام پر تاتاری یورش کا ہے، یہ یورش عالم اسلام کے لیے ایک بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان مبہوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا، تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابلِ قیاس سمجھی جاتی تھی، یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا۔ إذا قيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق" (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوئی ہے تو یقین نہ کرنا)

اس نازک موقع پر جو صلیبی حملوں سے بھی زیادہ خطرناک تھا، مسلمان بادشاہ حکومتیں اور قیادتیں تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سامنے نہیں آئیں، انھوں نے تاتاری غلبہ و تسلط کو تقدیر کا فیصلہ اور عذاب الٰہی سمجھ رکھا تھا، اس موقع پر ایک بار پھر مصر سامنے آیا

اور تاتاریوں کے مقابلہ اور شکست دینے میں سبقت حاصل کی، مصر کے حاکم الملک المظفر سیف الدین قطز اور اس کی بہادر مصری مسلمان فوجوں کو یہ شرف حاصل ہوا کہ تاتاریوں کے شکست نہ کھانے کا مقولہ غلط ثابت کر دیں۔ مورخین لکھتے ہیں۔

"شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رُخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا۔ سلطانِ مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے اور تاتاریوں کی بڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے اس لیے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی فوج میں مقابلہ ہوا اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکستِ فاش ہوئی وہ بُری طرح بھاگے، مصریوں نے ان کا تعاقب کیا اور بڑی تعداد میں گرفتار کیا۔" لہ　　　(لہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو" الکامل ابن الأثیر ج ۱۲)

علامہ سیوطی "تاریخ الخلفاء" میں لکھتے ہیں۔

"تاتاریوں کو شرمناک ہزیمت ہوئی اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا اور وہ اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو پکڑ لیتے تھے اور لوٹتے تھے۔" لہ　　　(لہ تاریخ الخلفاء ص ۴۲۵)

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل کر دیا اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

سید احمد عروج قادری قسط ۱۲

اسلامی تصوّف

۳۔ ایک مرتبہ شفیا اصبحی مدینہ آئے، دیکھا کہ ایک شخص کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ پوچھا کون ہیں ؟ لوگوں نے کہا : ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! یہ سن کر شفیا اصبحی ان کے پاس جاکر بیٹھ گئے ۔ اس وقت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ لوگوں سے حدیث بیان کر رہے تھے، جب حدیث سنا چکے اور مجمع چھٹ گیا، تو شفیا نے ان سے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث سنائیے جس کو آپ نے ان سے سنا ہو، سمجھا ہو، جانا ہو، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ایسی ہی حدیث سناؤں گا یہ کہا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو کہا میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کروں گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر میں بیان فرمائی تھی اور اس وقت میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی تیسرا شخص نہ تھا، اتنا کہہ کر زور سے چلائے اور پھر بے ہوش ہو گئے افاقہ ہوا تو منہ پر ہاتھ پھیر کر کہا میں تم سے ایسی حدیث بیان کروں گا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر میں بیان فرمائی تھی اور د... میرے اور آپ صلی اللہ علیہ کے سوا کوئی شخص نہ تھا، یہ کہا اور پھر چیخ مار کر، غش کھا کر، منہ کے بل گر پڑے، شفیا اصبحی نے تھام لیا اور دیر تک سنبھالے رہے ہوش آیا تو کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن جب خدا بندوں کے فیصلہ کے لیے اترے گا تو سب

پہلے تین آدمی طلب کیے جائیں گے، عالمِ قرآن، راہِ خدا میں مقتول اور دولت مند۔ پھر خدا عالم سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو قرآن کی تعلیم نہیں دی، وہ کہے گا "ہاں خدایا۔" فرمائے گا تو نے اس پر عمل کیا، وہ کہے گا "رات دن اس کی تلاوت کرتا تھا" خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، تو اس لیے تلاوت کرتا تھا کہ لوگ تجھ کو قاری کا خطاب دیں، چنانچہ خطاب دیا ۔۔۔ پھر دولت مند سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو صاحب مقدرت کرکے لوگوں کی احتیاج سے بے نیاز نہیں کر دیا؟ وہ کہے گا "ہاں خدایا" فرمائے گا "تو نے کیا کیا۔" وہ کہے گا میں صلہ رحمی کرتا تھا، صدقہ دیتا تھا، خدا فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے، بلکہ اس سے تیرا مقصد یہ تھا کہ تو فیاض اور سخی کہلائے اور کہلایا۔ پھر وہ جسے راہِ خدا میں جان دینے کا دعویٰ تھا، پیش ہوگا، اس سے سوال ہوگا تو کیوں مار ڈالا گیا، وہ کہے گا تو نے اپنے راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا تھا میں تیری راہ میں لڑا اور مارا گیا، خدا فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے، چاہتا تھا کہ تو دنیا میں جری اور بہادر کہلائے تو یہ کہا جا چکا۔

یہ حدیث بیان کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ پہلے ان تینوں سے جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنی تو کہا جب ان لوگوں کے ساتھ ایسا کیا گیا تو اور لوگوں کا کیا حال ہوگا یہ کہہ کر ایسا زار و قطار روئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ مر جائیں گے۔ جب ذرا سنبھلے تو منہ پر ہاتھ پھیر کے پُر موعظت آیتیں پڑھیں۔

(سیر الصحابہ ج ۶ مطبوعہ معارف اعظم گڈھ، بحوالہ ترمذی الجاب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ)

ہمارے پاس ترمذی کا جو مطبوعہ نسخہ ہے اس میں یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے منہ پر ہاتھ پھیر کر یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا اور

اس کے بعد دو آیتیں پڑھی تھیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

"جو لوگ بس اسی دنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی، مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور جو کچھ انھوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیا میٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔"

(ہود: ۱۵، ۱۶)

یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ امام مسلم نے بھی کتاب الامارۃ باب من قاتل للریاء والسمعۃ میں روایت کی ہے یہ لرزہ انگیز حدیث اتنی واضح ہے کہ کسی تشریح کی ضرورت نہیں ــــ

دنیا میں مومن کے لیے بشارت:

ریا و سمعہ چونکہ اخلاق کو تباہ کر دیتے ہیں اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بعض ایسی باتوں سے بھی ڈرنے لگے کہ کہیں یہ بھی ریا میں داخل نہ ہو، انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے اس کے بارے میں اطمینان حاصل کیا۔ اس سلسلے کی دو حدیثیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا خیال ہے کوئی آدمی کوئی عمل خیر کرتا ہے پھر لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کے لیے وہ بشارت ہے جو دنیا میں اسے ملتی ہے۔

(مسلم کتاب البر والصلۃ والادب آخری باب)

(باقی آئندہ شمارے میں)

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

اسلام میں لباس کی اہمیت

قبل اس کے کہ نظافتِ لباس پر گفتگو کی جائے ضروری ہے کہ ہم اسلام میں لباس کی اہمیت و مقام کو واضح کریں۔ لباس اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت ہے۔ اس کا ذکر ربّ العزت نے قرآن کریم میں ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّکُمْ یَذَّکَّرُوْنَ ○ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا اِنَّهٗ یَرٰىکُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○

(الاعراف ۷، ۲۷)

ترجمہ:۔ اے اولادِ آدم! ہم نے تمہیں جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانپنے کے لیے لباس عطا کیا جو اس کے لیے ذریعہ حفاظت ہونے کے ساتھ ساتھ زینت بھی ہے سب سے بہتر لباس تقویٰ کا لباس ہے یہ اللہ کی نشانیوں میں ایک نشانی ہے تاکہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔ اے بنی آدم! کہیں پھر ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح

حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیم اور تربیت میں اُن کے والد شاہ عبدالرحیم کا اہم کردار رہا ہے۔ صغرِ سنی میں آپ نے مکتبی تعلیم کا آغاز کیا۔ چھ سال کی قلیل مدت میں کلام مجید پڑھا اور ساتویں سال سے نماز اور روزوں کی پابندی شروع کی۔ پھر عربی، فارسی اور دینی رسائل پڑھے۔ دس سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ نے شرح جامی، معقولات اور منقولات کے ساتھ فقہ، منطق اور حدیث کے علاوہ اپنے والد سے اُس زمانے کے دستور کے مطابق طب، معانی اور علم ہندسہ و حساب کی کتابیں پڑھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں والد نے اُنھیں بیعت کیا۔ والد کی وفات کے بعد آپ نے مدرسۂ رحیمیہ کی مسندِ تدریس سنبھالی اور تقریباً ۱۲ برس تک عُلومِ دینی و عقلی کی تعلیم دی۔

شاہ ولی اللہ نے بفضلِ تعالیٰ صحت مند اور چاق و چوبند زندگی گزاری، حضرت شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے کہ

"وہ اپنے کام میں اس انہماک سے مشغول ہوتے کہ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے، نہ حرکت کرتے اور نہ دہنِ مبارک سے تھوک پھینکتے، معمول تھا کہ آپ سبق پڑھاتے وقت رُو بہ قبلہ دو زانو مودب بیٹھتے تھے اور ہر روز عادت کے مطابق صبح کو غسل کر کے نیا یا دھویا ہوا لباس پہنتے تھے، لطیف الطبع اور بے نہایت ذہین و فطین بزرگ تھے۔"

آپ نے دو بار سفرِ حرمین شریف کیا اور فریضۂ حج سے مشرف ہوئے۔ شیخ محمد اکرام اپنی مبسوط کتاب "رودِ کوثر" میں رقم طراز ہیں کہ،

"قیام مکۂ معظمہ کے زمانے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے ایک خواب دیکھا۔ سرورِ کائنات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بشارت سے مفتخر فرماتے ہوئے دینی اُمور کی انجام دہی کے لیے ہندوستان میں ایک جتھے کی قیادت کا مژدہ سنایا۔"

۱۷۳۲ء میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلی تشریف لائے اور خود کو تدریس، تالیفِ کتب

دینی اور تفسیر و ترجمۂ کلام اللہ کے فارسی ترجمہ و تفسیر سے مربوط رکھا اور ہندوستان کو ولی اللہ تحریک کے دینی و علمی نظام سے آشنا کیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے تاریخ علم الکلام میں لکھا ہے کہ :-

" ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود اُنہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا، کسی صاحب دل و دماغ کا پیدا ہونا ناممکن نظر آرہا تھا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشہ دکھانا تھا کہ شاہ ولی اللہ جیسا مرد خدا پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے "

حضرت شاہ ولی اللہ کا سب اہم کام قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا عظیم اور عہد ساز کارنامہ کلام پاک کا فارسی ترجمہ ہے، اُس زمانے ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا، چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان بوستان، سکندر نامہ اور شاہ نامہ تو پڑھتے تھے اور سمجھتے تھے لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے ناواقف رہتے، علماء اور خواص میں سے اگر کسی نے قرآن مجید پڑھا تو ناظرانہ یعنی مفہوم و معانی سمجھے اور اُس کی روح و تعلیمات سے فیض یاب ہوئے بغیر شاہ ولی اللہ نے جب کلام پاک کا فارسی ترجمہ مکمل کیا تو چند علماء نے مخالفت کی، آخر کار شاہ صاحب نے علماء اور خواص کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لئے نہیں نازل ہوا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاقوں میں رکھ دیا جائے۔ اس کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور سبق حاصل کریں اور حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے کارناموں سے واقف ہوں نیز اس کے ترجمہ کی ضرورت اور اہمیت کو جانیں چنانچہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور شاہ صاحب کے ترجمے کو شہرت دوام نصیب ہوئی۔

شاہ ولی اللہ نے نہ صرف قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا بلکہ اس سلسلے کے تمام پہلوؤں خصوصاً علم تفسیر پر بھی متعدد رسائل قلم بند کیے۔ شاہ صاحب نے علم تصوف پر بھی کتابیں لکھیں جن کی آج بھی صوفیانہ ادب میں بنیادی اہمیت ہے وہ روحانی ضرورتوں کی افادیت کے قائل تھے، صوفیانہ مسلک اور ماحول میں آپ نے تربیت پائی تھی۔ آپ کی ایک اہم تصنیف اسرارِ علم دین سے متعلق ہے جس میں تمام احکامِ دین کی حکمت اور عمل کے رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں۔ بشمول "قصص الانبیاء" حضرت شاہ ولی اللہ کی تقریباً ۷۴ تصانیف ہیں جن میں سے بیشتر کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے

حضرت شاہ ولی اللہ نے بمقام دہلی ایک کم ساٹھ سال کی عمر میں ۱۷۶۲ء میں پردہ فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات "زوبود امامِ اعظم دین" سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتی ہے۔
شاہ ولی اللہ کو ہندوستانی علماء کی مجلس کا صدر نشین قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اُن کا ترجمہ القرآن ہی ایک ایسا کارنامہ ہے اگر وہ کچھ اور نہ کرتے تب بھی انھیں ہمارے علمی محسنوں کی صفِ اول میں جگہ ملتی۔ لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے عُلومِ اسلامی کی ہر شاخ مثلاً حدیث، تفسیر، تاریخ، فقہ، اسرارِ دین اور تصوّف پر سیر حاصل، بلند پایہ اور بنیادی کتابیں تصنیف کر کے اِن عُلوم کا ایک مستقل کُتب خانہ یادگار چھوڑا۔

مولانا ابو علیٰ مودودی نے درست لکھا ہے کہ

"اُنھوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیشرؤوں سے بازی لے گئے ہیں، آپ سے پہلے امام غزالیؒ نے جو کام انجام دیا تھا قدرتی بات ہے کہ آپ اس راہ میں امامِ موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

ہماری قومی اور مذہبی زندگی کے ایک بہت اہم اور نازک دَور میں شاہ ولی اللہ نے جنم لیا تھا اور آپ نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ ہندوستان کے باشعور اور سوچنے (باقی صر

کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے جو بھی اس کو دیکھتا ہے۔ بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے۔ مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ۔

یہ لباس باطنی (تقویٰ) ہی انسان کو ظاہری لباس میں افراط و تفریط کا شکار ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ظاہری لباس پوری طرح ساتر ہونا چاہیئے زینت میں حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو۔ فخر و تکبر اور عز و رو ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو اور پھر ان ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بناء پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں اور عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندۂ جاوید اشتہار بن جاتی ہے ▲

(بقیہ سلسلہ صلا ۱۶ سے آگے)

والے علماء، صوفیاء اور عام مسلمانوں نے انھیں متفقہ طور پر تسلیم کیا، آپ کے بعد آپ کے فرزندوں نے بھی رشد و ہدایت اور دین و ایمان کے استحکام کو اپنا وظیفۂ حیات بنائے رکھا۔

اسلامی حکومت ہندوستان کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہ کی عظمت اور اہمیت زیادہ تر ان کی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے ہے، شاہ صاحب کا معتدلانہ نقطۂ نظر اور متوازن ذہن و دماغ حضرت مجدد الف ثانی کی یاد دلاتا ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ حیدرآباد)

پروفیسر عبد السّلام (قسط اول)
ترتیب: پروفیسر اسرار احمد

یقیں محکم، عمل پیہم

میں جھنگ کالج میں ۱۹۳۸ء میں بارہ برس کی عمر میں داخل ہوا۔ چار سال یہاں گزارے اس زمانے میں کالج انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ نویں۔ دسویں، فرسٹ ائیر اور سکنڈ ائیر کی کلاسیں تھیں۔ کثرت ہندو طلبار کی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کالج میں مجھے نہایت قابل اور شفیق اُستاد ملے۔ پرنسپل گجرات کے حکیم محمد حسین مرحوم تھے۔ انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد، عربی کے شفیق اُستاد صوفی ضیار الحق، فارسی کے اُستاد خواجہ معراج الدین حساب اور سائنس کے مضمون اس زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ حساب میں لالہ بدری ناتھ اور لالہ رام لال، فزکس کے استاد لالہ ہنس راج اور کیمسٹری کے استاد لالہ نوبت رائے تھے۔

میرے تعلیمی کیریئر کی بنیاد اسی کالج میں پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بعد کی حقیر کامیابیاں اس کالج کی تعلیم اور میرے جھنگ کے اُستادوں کی شفقت کی مرہونِ منت ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اُستاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔ اس توجہ کی ایک مثال عرض کروں۔ فرسٹ ائیر کے دوران میں نے انگریزی کے بہت سے نئے اور خوبصورت لفظ سیکھے۔ پسند آئے اور میں اپنی تحریر میں ان مشکل اور بعض اوقات متروک لفظوں کو بے تکلف اور بے محل استعمال کرنے لگا۔ استادِ گرامی شیخ اعجاز صاحب نے کئی بار ٹوکا، تنبیہہ فرمائی۔ میری طرف سے

تعاون نہ ہوا۔ سہ ماہی کا امتحان آیا۔ جناب شیخ صاحب نے پرچہ مارک فرمایا۔ ہر متروک اور بے محل لفظ کے استعمال پر فی لفظ پانچ نمبر کے حساب سے نمبر کاٹ لیئے ظاہر ہے میرا ٹوٹل صفر کے قریب جا پہنچا پھر اسی پہ اکتفا نہ کی۔ کلاس میں میرا پرچہ لائے اور ہر ہر غلط لفظ کا تذکرہ ساری کلاس کو سنایا۔ اس کے بعد پرچہ میرے حوالے کیا۔ اس پر تحریر تھا،

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی ـ کیں راہ کہ میروی بترکستان است

اس وقت مجھے یہ خصوصی سلوک بہت ناگوار گزرا۔ لیکن اب غور کرتا ہوں تو یہ سراسر شفقت تھی، نوازش تھی، کرم تھا اس SHOCK THERAPY کا اثر یہ ہوا کہ کم از کم انگریزی میں خوبصورت۔ لیکن بے محل لفظ استعمال کرنے کی عادت چھوڑ دی۔

میری تعلیم جہاں استادوں کی مرہونِ منت تھی اس سے زیادہ قبلہ والد صاحب کی نگہ اور ان کی دعاؤں کی مرہونِ منت تھی۔ اس زمانے میں میٹرک کا امتحان صوبہ پنجاب کے لیے ایک قسم کا اکھاڑہ ہوا کرتا تھا جس میں مختلف اسکولوں کے پہلوان دنگل کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر سناتن دھرم اور آریہ اسکولوں کے طلبا اس دنگل کے نامی پہلوان تصوّر کیے جاتے تھے مجھے یاد ہے جس دن میٹرک کا نتیجہ نکلا۔ میں مگھیانہ کچہری میں قبلہ والد صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ رزلٹ کی کاپی دوپہر کے وقت لاہور سے مگھیانہ اسٹیشن پہنچی۔ والد صاحب نے آدمی بٹھا رکھا تھا۔ کاپی ان کے دفتر میں لائی گئی۔ ساتھ ہی لاہور سے مبارکبادوں کے تار آنے لگ گئے جس طرح میں نے عرض کی ہے اس زمانے میں میٹرک کا رزلٹ ایک نیشنل EVENT کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی وجہ ہندو کمیونٹی کی علم دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے دو بجے دوپہر سائیکل پر سوار ہو کر میں مگھیانہ سے جھنگ شہر واپس لوٹا رزلٹ کی خبر جھنگ شہر میں میرے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ چونکہ پولیس والے گیٹ سے مجھے بلند دروازہ کی طرف جانا تھا مجھے اب تک یاد ہے وہ ہندو دوکان دار جو عموماً مئی کی اس تیز گرم دوپہر کے وقت اپنے کھاٹوں پر دوکانوں کے چھپروں کے سائے تلے سوئے ہوئے

ہوتے تھے، جس وقت میں سائیکل سے گذرا اس روز وہ سب تعظیماً اپنی اپنی دکانوں میں میرے آنے کے انتظار میں قطاروں میں کھڑے تھے۔ ان کی اس علم نوازی کا نقشہ ہمیشہ میرے دل پر رہا ہے۔

میں جھنگ سے گورنمنٹ کالج لاہور اور وہاں سے کیمبرج پہنچا۔ کیمبرج میں انگریز طلباء کی علم نوازی کا مشاہدہ کیا۔ کیمبرج کے کلاس روم میں طالب علم اس انداز سے بیٹھے ہیں جس طرح نماز سے پہلے نمازی مسجد میں آکر بیٹھتے ہوں۔ لیکچرار آنے سے پہلے ایک سناٹا ہوتا ہے۔ لیکچر کے درمیان میں انگریز طالب علم چار چار قسم کی سیاہیوں والا قلم، صحیح لکیریں ڈالنے کے لیے رولر استعمال کر رہا ہوگا اس کی نوٹ لینے والی کاپیاں ایسی احتیاط سے لکھی گئی ہوں گی جیسے پروفیشنل خوش نویس لکھ رہا ہو۔ میرے ساتھ والے طالب علم براہ راست اسکولوں سے آئے تھے۔ عمر میں مجھ سے سب کم تھے۔ لیکن ان کی خود اعتمادیوں اور ان کی امنگوں کا وہ عالم تھا جسے تحصیل کرنے کے لیے مجھے کم از کم دو سال درکار ہوئے۔ وہ ایسے ماحول سے آئے تھے جس میں ان کے اسکولوں کا استاد اچھے پڑھنے والے بچوں کو یہ سمجھا کر کیمبرج روانہ کرتا کہ عزیزو تم اس قوم کے فرزند ہو جس میں نیوٹن پیدا ہوا تھا۔ سائنس اور ریاضی کا علم تمہاری میراث ہے اگر تم چاہو تو تم بھی نیوٹن بن سکتے ہو۔

کیمبرج میں ڈسپلن کا انداز بھی میرے لیے نیا تھا۔ کیمبرج میں بی اے کا امتحان آپ زندگی میں صرف ایک بار دے سکتے ہیں۔ آپ خدانخواستہ فیل ہو جائیں تو پھر دوسری بار امتحان دینا ممکن نہیں۔ ہوسٹل کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ دس بجے رات تک بلا اجازت کالج سے باہر رہ سکتے ہیں دس سے بارہ بجے تک ایک پینی جرمانہ۔ لیکن اگر آپ بارہ بجے کے بعد آئے تو سات دن کی GATING ہوگی اور اگر سال کے دوران تین بار ایسا ہوا تو آپ کیمبرج سے نکال دیا جائے گا۔ کیمبرج میں ہر طالب علم ADULT تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے سب کاموں میں مکمل ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اس سے بے جا

تعرض نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ سزائیں بھی وحشیانہ میں جنھیں وہ طالب علم مردانہ وار قبول کرتے ہیں۔

کیمبرج کا طالب علم ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے پہلے دن جب میں JOHNS COLLEGE پہنچا۔ میرا تیس۳۰ سیر کا بکس ریلوے اسٹیشن سے تو ٹیکسی پر چلا آیا۔ لیکن جب کالج پہنچکر میں نے پورٹر کو بلایا اور کہا یہ میرا باکس ہے؟ اس نے کہا ٹھیک ہے وہ WHEEL BARRAW ہے آپ اسے اٹھائیے اور باقیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لے جائیے۔ ان پرانے قصوں کی بازخوانی محض ذاتی حظ لینے کے لیے نہیں کررہا۔ میں تعلیم اور علم نوازی کے موضوع پر چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلہ میں یہ داستانیں میرے مضمون کا حصہ ہیں۔

آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا کہ ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔

تعلیمی نظام کا اوّلین کام شخصی کردار کو ڈھالنا تصور کیا جاتا ہے کردار کی جو بنیاد کالج میں بنتی ہے وہ زندگی بھر شاید ہی بدلتی ہے۔ لیکن میں شخصی کردار کے بارے میں عرض پیش نہیں کروں گا۔ میرا رخ ہمارے تعلیمی نظام کے قومی پہلوؤں کی طرف ہے دوسو سال کی غلامی کے بعد پاک پروردگار نے ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ اس بات کو اب تقریباً چالیس سال گزرچکے ہیں لیکن اس طویل عرصہ میں ہم اپنے اندر احساسِ یگانگت، احساسِ اخوت اور احساسِ قومیت پیدا نہ کرسکے۔

آزادی کے بعد ہمارے تعلیمی نظام کا اوّلین فرض یہ ہوتا چاہیئے تھا کہ ہماری یگانگت اور قومیت کے احساس کو پختگی دیتا۔ یگانگت اور قومیت کا تصوّر مختلف زبانوں میں بدلتا چلا آیا ہے۔ آج کے تصوّر کے لحاظ سے دُنیا کے کئی ملکوں اور قوموں کی مثالیں ملتی

ہیں جن کا استحکام محض ان کے تعلیمی نظام کا مرہون منت ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا حال لیجئے۔ امریکہ کے یونائیٹڈ اسٹیٹس میں انگریز، جرمن، اٹالین، سویڈش، فرانسیسی سب قبیلوں کے لوگ بستے ہیں۔ میں ان لوگوں کو قبیلوں کا نام دے رہا ہوں یہی وہ لوگ ہیں جو یورپ میں اپنی عقیدہ قومیت کے لیئے دو عظیم جنگوں میں جانیں دے چکے ہیں۔ ان کی زبانیں امریکہ آنے سے پہلے مختلف تھیں، مذہب مختلف تھے اور اب بھی مختلف ہیں۔ لیکن امریکہ کے تعلیمی نظام نے جیسے ایک CRUCIBLE میں پگھلا کر ان قبیلوں کو ایک واحد قومیت میں منسلک کر دیا ہے۔ اسکولوں میں ہر بچے کو امریکن کانسٹی ٹیوشن حفظ کرائی جاتی ہے۔ امریکن ہیرو اس کے زبان زد ہوتے ہیں۔ دن رات وہ امریکن ترانے سنتا ہے۔ ادیب لکھنے والے، شاعر، افسانہ نویس اس طرز سے لکھتے ہیں کہ امریکہ کے ہر ہر خطے سے محبت اس کے شہری کے خمیر میں رچ بس جائے۔ امریکہ کے شہری کو نہ صرف اپنے شہر سے محبت کا درس دیا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو امریکہ کے ہزاروں شہروں کا شہری سمجھتا ہے۔ دور افتادہ یورپ کی گلیوں سے جہاں سے وہ یا اس کے آباؤ اجداد آئے تھے اسے مناسبت نہیں رہتی۔ اسے اپنے اس خطے سے مناسبت ہوتی ہے جس سے اس کا کھانا، اس کا پینا، اس کا روزگار اور اس کا ہر وسیلہ متعلق ہے اس خطے کو بڑھانے اور چمکانے کے لیے کوشاں رہتا ہے اور یہ سب کچھ اسکولوں، کالجوں، اخبارات، رسائل اور ٹی وی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم یگانگت کو CONSCIOUBLY اجاگر کرے۔

میری دوسری گزارش ٹکنالوجی اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان اقتصادی طور پر پسماندہ ہیں یہاں ایک فرد کی اوسط آمدنی ستر ڈالر کے قریب بنتی ہے ایک امریکن ہماری نسبت پچاس گنا زیادہ کماتا ہے۔ انگلستان کے ایک فرد کی آمدنی ہم سے بیس گنا زیادہ ہے۔ جاپان کی پندرہ گنا زیادہ، ایران کی آٹھ گنا زیادہ ترکی آٹھ گنا زیادہ، عراق، الجیریا، شام، مصر کی فی کس آمدنی ہم سے ۴ گنا زیادہ ہے

پروفیسر اسرار احمد

پروفیسر عبدالسلام

ایک مطالعہ

عبدالسلام اگر ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء کے بجائے اس سے سو سال قبل پیدا ہوئے ہوتے تو وہ ماہرِ طبیعیات پروفیسر عبدالسلام نہ ہوتے بلکہ شمالی ہند کے ٹیپو سلطان ہوتے۔ ان کا حبِ وطن اہلِ اسلام کو سربلند دیکھنے کا اضطراب اور ظلم و استحصال کے خلاف جذبۂ جہاد، آتشِ فرنگ میں بے خطر کود پڑتا۔ مختلف طاقتوں کو ایک لڑی میں پرو دینے کا ان کا ہنر، اُن کا عزم اُن کا ولولہ انگریز تاجروں کے مکروہ مقاصد کے سامنے ایک ناقابلِ تسخیر دیوار کھڑی کر دیتا۔ لیکن قدرت نے اُن کے لیے کچھ اور ہی کام تفویض کر رکھا تھا وہ ایک غیر معروف قصبہ جھنگ میں اُس وقت پیدا ہوئے جب انگریزوں کا پنجۂ استبداد مدتوں پہلے ہندوستان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور یہ بات کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ جب تک ہم ان علوم و فنون میں مہارت نہ حاصل کر لیں جو فی الحقیقت ہمارا ہی گم شدہ مال ہے اور جس کی بدولت مغرب مغرب ہے اس وقت تک مکمل آزادی اور عالمی برادری میں ایک باوقار مقام کی تمنا خیالِ خام ہے۔

یہ عبدالسلام کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو امیر بھی تھا اور غریب بھی۔ ان کا خاندان علم کی دولت سے بھرا تھا۔ مگر اس کے پاس مادی وسائل

کی کمی تھی جس کے نتیجے میں بچپن سے ہی اُن کے دل میں علم کی عظمت جاگزیں ہوگئی اور ان کو وہ مواقع نہ ملے جو اکثر بچوں کی بربادی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی خُدا داد صلاحیتوں کو دیکھ کر اُن کے والدین نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اُن کی تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ جس کی وجہ سے اسکول کی سطح سے لے کر یونیورسٹی تک کوئی بھی امتحان ایسا نہ تھا جس میں کامیاب ہونے والوں میں ان کا نام سرفہرست نہ رہا ہو۔ غیر منقسم ہندوستان میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اپنا آخری امتحان ۱۹۴۶ء میں ایم اے ریاضی کا دیا اور ۹۵ فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

نوجوان عبدالسلام کی تعلیمی میدان میں یہ قابلِ رشک کامیابیاں صرف اُن کی خداداد ذہانت اور بہتر سرپرستی کی وجہ سے ہی نہ تھیں بلکہ اس میں ان کی دن رات کی مسلسل محنت اور لگن کا بھی کافی ہاتھ تھا۔ انھیں شروع سے ہی وقت کی قیمت کا احساس تھا اور وہ شب و روز کے ۱۳۔۱۴ گھنٹے حصولِ علم صرف کرتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں بھی ان کے شوقِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے کھلی رہتی تھی ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ تھا وہ مطالعے میں کچھ ایسے غرق ہوئے کہ مرغی ان کی سالن کی پلیٹ سے بوٹیاں نکال لے گئی اور ان کو کچھ پتہ بھی نہ چلا۔

عبدالسلام جیسا شاندار تعلیمی ریکارڈ اور اپنے سماج میں سول سروس کے اعلیٰ عہدیداروں کی اہمیت، بہت ممکن تھا کہ وہ اس راہ پر لگ جاتے۔ مگر قدرت، ان کی پشت پر تھی۔ اس نے ان کی عبقریت کو فائلوں کی نذر ہونے سے بچانے کا کچھ اور ہی انتظام کر رکھا تھا۔ اولاً دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے سول سروس کے مقابلے کے امتحانات بند کر دیئے گئے تھے جس سے اس راہ پر لگنے کا امکان ہی باقی نہ رہا۔ دوم اس جنگ عظیم میں انگریزوں کی مدد کے لیے ایک مشہور زمیندار خضر حیات ٹوانہ نے ۱۵ لاکھ روپے کی جو رقم اکٹھا کی تھی وہ ۱۹۴۵ء میں جنگ بند ہو جانے کی وجہ سے استعمال ہونے سے رہ گئی۔ بعد میں یہی رقم چھوٹے زمینداروں کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وقف کر دی گئی تھی۔ عبدالسلام کو اس فنڈ سے پانچ سو پچاس روپے

روپے ماہانہ کا وظیفہ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے ایک سال بعد ہندوستان کے تقسیم ہو جانے کی وجہ سے کسی اور کو اس فنڈ سے وظیفہ نہ مل سکا۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ فنڈ خاص طور سے عبدالسلام ہی کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

عام ایشیائی نوجوانوں کے لیے مغربی تہذیب بڑی کشش رکھتی ہے وہاں کی چکاچوند بہت جلد انھیں مسحور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی تہذیب اور اپنے مذہب سے نہ صرف برگشتہ ہو جاتے ہیں بلکہ اُلٹے اس کا مذاق اُڑانے لگتے ہیں۔ البتہ ذہین اور حساس نوجوانوں کے لیے اسی مغرب کا قیام ایک تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ گاندھی جی سوٹ بوٹ میں گئے، دھوتی چپل میں واپس آئے۔ اقبالؒ مغرب کیا گئے سراپا مشرق بن گئے۔ عبدالسلام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ان کا قیام کیمبرج (انگلستان) میں ۴۶ تا ۱۹۴۹ء رہا۔ اس دوران جہاں انھوں نے اعلیٰ امتیازات کے ساتھ سہ سالہ بی۔اے (آنرز) ریاضی کا کورس دو سال میں اور سہ سالہ بی۔اے (آنرز) فزکس کا کورس ایک ہی سال میں پاس کیے اور متعدد اعلیٰ پیمانے کے تحقیقی مقالے لکھے وہیں انھیں اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے اعلیٰ ہونے کا عرفان بھی ہوا۔ وہ نیوٹن اور میکسویل کے دیس میں رہتے ہوئے بھی دن بدن بوعلی سینا اور ابن الہیثم کے قریب ہوتے گئے۔ ان کا جذبۂ حبِ وطن شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اپنے وطن پاکستان کی خدمت کے جذبے سے سرشار اور اسے عالمی برادری میں ایک اعلیٰ مقام دلانے کی آرزو سینے میں دبائے ۱۹۵۱ء میں وہ واپس آئے جہاں گورنمنٹ کالج لاہور میں انھیں ریاضی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

ایک سائنس داں غیر سائنسی ماحول کی سوسائٹی میں نکو بن جاتا ہے عبدالسلام جس دور میں واپس پاکستان لوٹے وہاں کی سوسائٹی نہ صرف غیر سائنسی تھی بلکہ سائنس کش بھی تھی۔ سائنس کی اہمیت کا زبانی اقرار تو کیا جاتا تھا۔ مگر عملاً اس کے فروغ کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ سائنس میں تحقیق کو فروغ دینے کی کوشش کو تضیع اوقات سمجھا جاتا تھا اور کالج کی انتظامیہ اس عمل کو تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ اس ماحول میں سائنس داں عبدالسلام

طلبہ ہی اپنے آپ کو ماہی بے آب محسوس کرنے لگے اور جب بات یہاں تک پہنچی کہ ایک علمی مباحثے کے سلسلے میں گرمیوں کی تعطیل میں ان کے بمبئی آنے پر تنخواہ کاٹ لی گئی تو انھوں نے اپنی تحلیقی صلاحیتوں کو بے موت مرنے سے بچانے کے لیے پھر انگلستان کی طرف رجوع کیا۔ وہاں امپریل کالج لندن میں ان کی تقرری بہ حیثیت لکچرر ہوئی۔ اس کے دو سال بعد وہیں پروفیسر کا عہدہ ملا جس پر وہ آج تک قائم ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کی تحقیق کا میدان نظریاتی ذراتی طبعیات ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں کام کرنے سے بڑے بڑے لائق سائنس داں بھی گھبراتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیقات میں ہمیشہ ہی بنیادی اہمیت کے مسائل کو اٹھایا ہے اور اس کا خوبصورت حل پیش کیا ہے۔ اب تک انھوں نے تقریباً دو سو پچاس بنیادی اہمیت کے بین الاقوامی ایوارڈ اور میڈل حاصل کیے ہیں۔

صرف ۳۴ سال کی عمر میں ہی ان کو فیلو آف رائل سوسائٹی چن لیا گیا اور دنیا ئے علم کا سب کا بڑا اعزاز نوبل انعام ۱۹۷۹ء میں ان کو ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے علمی اور دیگر کارناموں پر دیئے گئے اعزازات کی فہرست کافی لمبی ہے اور اس کا بیان اس تعارفی خاکے میں ممکن نہیں۔

انسان کی عظمت کا معیاری پیمانہ وسیع القلبی ہے۔ کوئی کتنا ہی قدآور کیوں نہ ہو اگر اس کا دل تنگ اور درد سے خالی ہو تو وہ بونا ہے۔ بڑا وہ ہے جس کا دل بے درد دیوار ہو، تنہا آگے بڑھنا آسان ہے مگر اپنے ساتھ مفلوجوں کی فوج لے کر آگے بڑھنا مشکل۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو عبدالسلام عظیم ترین ہیں۔ سائنس کی تاریخ میں کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کے دل میں اپنوں میں سائنس کو فروغ دینے کی تڑپ ہو۔ عبدالسلام کے دل میں ہے پاکستان کے جس سائنسی ماحول نے جنوری ۱۹۵۴ء میں ان کو اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا وہ اسے بھولے نہیں۔ ذاتی کامیابیوں اور اعزازات کی بارشوں میں بھی اٹھا، تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام کے اس سائنسی ماحول کو بدل رکھا جس

نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے ہی مرجاتے ہیں۔ تیسری دُنیا میں سائنس کو فروغ دینے اور وہاں ایک سائنسی ماحول پیدا کرنے کے لیے وہ مستقل بے قرار رہے۔ اس بے قراری کو بالآخر انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کی شکل میں سکون ملا۔ یہ مرکز جو آئی سی۔ ٹی۔ پی کے نام سے مشہور ہے ۱۹۶۴ء میں اطالیہ کے شہر ترلیستے میں قائم ہوا۔ یہ عبدالسلام کا تیسری دنیا کی سائنس پر وہ عظیم احسان ہے جسے نسل دَر نسل یاد کیا جاتا رہے گا۔ اس مرکز کے قائم ہونے میں عبدالسلام کو کن کن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بڑی طاقتوں کے نمائندوں سے کیا کیا جنگ کرنی پڑی اس کے بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یہ مرکز عبدالسلام کے عزمِ محکم جہدِ مسلسل اور جذبۂ صادق کا نادر نمونہ ہے۔ یہاں ہر سال تیسری دُنیا کے ہزاروں سائنس داں مختصر قیام کے لیے آتے ہیں اور عُلومِ جدیدہ کے ماہرین سے فیض یاب ہوکر واپس لوٹتے ہیں ان سائنس دانوں کے سفر اور قیام کے اخراجات مرکز خود برداشت کرتا ہے یہ مرکز کیا ہے وحدتِ انسانی کا ایک مکمل نمونہ ہے یہاں سیاست دانوں کی بنائی ہوئی ساری سرحدیں ختم ہوجاتی ہیں۔ یہاں مشرق و مغرب مل کر ملا تا ہے۔ گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکیت سرمایہ داری کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے۔ تنہا اس مرکز کا قیام ہی عبدالسلام کا وہ کارنامہ ہے جس پر ایک اور نوبل انعام نچھاور کیا جاسکتا ہے۔ عبدالسلام کی شخصیت بڑی ہی پیاری اور دلآویز ہے۔ سامنے ہوں تو بے اختیار عقیدت سے آنکھیں جُھک جاتی ہیں۔ مجھے ان سے پہلی ملاقات کا شرف ۱۹۷۱ء میں آئی سی۔ٹی۔ پی ترلیستے میں ہوا جس کے وہ ڈائرکٹر ہیں۔ اس وقت تک اُن کو نوبل نہ ملا تھا مگر اُن کے علمی اور دیگر کارناموں کو سُن سُن کر دل پر ایک رعب بیٹھ چکا تھا۔ ان سے ملنے میں ایک قسم کی جھجک مانع تھی اور ملاقات کو جی بھی بہت چاہ رہا تھا۔ بالآخر ایک روز ہمت کرکے اُن کے پاس پہنچ ہی گیا تعارف ہوا ادھر تو شفقت کی وہ بوچھار ہوئی کہ یکسر بھول گیا کہ ابھی چند منٹ قبل مجھے اُن سے ملاقات کرنے میں جھجک سی محسوس ہورہی تھی۔ گفتگو اُردو میں ہوئی (وہ اُردو جاننے والوں سے اسی زبان میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں) اور وہ زیادہ تر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں (باقی صفحہ پر)

فارمیشن سنٹر
سی سی آر یو ایم
نئی دہلی 110017

طبِ یونانی

جیسا کہ اِس کے نام سے ظاہر ہے طبِ یونانی کی ابتدا یونان سے ہوئی۔ یہ یونانی فلسفی طبیب بقراط (۴۶۰ - ۳۷۷ ق م) کا کارنامہ ہے کہ اس نے طب کو توہمات اور جادوگری کے جال سے نکال کر سائنس کا درجہ دلا دیا۔ طبِ یونانی کے نظریاتی ڈھانچے کا دارومدار بقراط کے نظریۂ اخلاط پر ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے جسم انسانی میں چار اخلاط رہتے ہیں، جو دم، بلغم، صفرا، اور سودا ہیں۔ جب جسم میں یہ اخلاط متوازن ہوتے ہیں تو انسان صحت مند ہوتا ہے اور اگر یہ اخلاط متوازن نہ رہیں تو بیماری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بقراط کے بعد متعدد دیگر یونانی عالموں نے اس طریقۂ علاج کو قابلِ لحاظ ترقی دی۔

عرب تہذیب کے سنہرے دور میں عرب دانشوروں نے تقریباً تمام یونانی طبی اور سائنسی تصنیفات کو عربی جامہ پہنا دیا، انھوں نے طبِّ یونانی کے مختلف پہلوؤں پر بے بہا رسائل تحریر کئے۔ اہم ترین تصنیفات میں سے "القانون فی الطب" ہے جس کا مصنف ابن سینا ہے۔ یہ کتاب عرب دنیا کے علاوہ یورپی ممالک میں بھی تقریباً آٹھ صدیوں تک نصاب میں شامل رہی۔

ہندوستان میں آمد: جب منگولوں نے فارس اور وسط ایشیا کے شیراز، تبریز اور گیلان جیسے شہروں کو تاراج کیا تو طبِ یونانی کے دانشوروں اور معالجوں نے ہندوستان ہجرت کی، دہلی کے خلجی، تغلق سلاطین اور مغل شہنشاہوں نے ان عالموں کو سرکاری سرپرستی میں لے لیا اور ان میں سے بعض کو درباری طبیب کی حیثیت (۲)

تیرہویں سے سترہویں صدی عیسوی تک کا زمانہ ہندوستان میں طب یونانی کا درخشاں دور ہے۔ اس عرصہ میں جن طبیبوں نے اس طریقِ علاج کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ان میں سے چند قابلِ ذکر نام ابوبکر بن عثمان کاشانی، صدرالدین دمشقی، بہوا بن خواص خاں، علی گیلانی، اکبر ارزانی، اور محمد ہاشم علوی خاں ہیں۔

جن یونانی طبیبوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا انھوں نے ان ادویہ پر ہی انحصار نہ کیا، جو پہلے سے جانی پہچانی تھیں بلکہ انھوں نے ہندوستان میں پائی جانے والی ادویہ پر تجربات کیئے اور ان کی روشنی میں اپنی طب میں متعدد ہندوستانی ادویہ کو شامل کرکے اس کو مزید مالا مال کیا۔ اس طب نے جلد ہی عوام کے دلوں میں گھر کرلیا اور ان کی آن میں ملک بھر میں اس کا بول بالا ہوگیا۔ اور ایک عرصہ تک اس طریقِ علاج کا کوئی دوسرا طریقہ علاج مدمقابل نہ تھا۔ اور سلطنتِ مغلیہ کے خاتمہ کے بعد تک بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔

برطانوی دور میں طب یونانی کے راستے میں مشکلات حائل ہوئیں اور سرکاری سرپرستی سے محروم ہوجانے کے باعث اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ لیکن چونکہ عوام اس طریقہ علاج پر یقین رکھتے تھے اس لئے یہ فن زندہ رہا اور دہلی میں خاص طور پر خاندانِ شریفی، لکھنؤ میں خاندان عزیزی اور نظام حیدرآباد کی جدوجہد کے باعث برطانوی دور میں بھی طب یونانی کی شمع روشن رہی۔ طب یونانی ایک مایہ ناز طبیب اور دانشور حکیم اجمل خاں (۱۸۶۴ - ۱۹۲۷) نے ہندوستان میں طب یونانی کے مقاصد حصول کے لئے زبردست جدوجہد کی دہلی میں ہندوستانی دواخانہ اور آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج آج بھی ان کی طب یونانی اور آیورویدک جیسی دیسی طبوں کی ہمہ جہتی ترقی کی کوششوں کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ اور حقیقتاً یہ حکیم اجمل خاں ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے (۱۹۲۰) کے دہے میں طب یونانی میں سائنسی تحقیق کی اہمیت پر زور دیا۔

آزادی کے بعد طب یونانی اور دیگر دیسی طبوں نے ترقی کی جانب مستحکم قدم بڑھائے

آزادی سے پہلے بھی ۱۹۴۳ء میں حکومت ہند نے صحتی سروے اور ترقی کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے بھی ہندوستان میں ان طبوں کے اس اہم رول پر زور دیا تھا جو ان کو ادا کرنا تھا اور ۱۹۴۶ء منعقدہ وزرائے صحت کی کانفرنس نے سفارش کی تھی کہ ہندوستا طریقہ علاج یعنی یونانی اور آیورویدک میں ریسرچ کے معقول مالی اور دیگر وسائل مہیا کئے جائیں ۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں حکومت ہند کی جانب سے متعد کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں جن میں سے کرنل آر. این چوپڑہ ۱۹۴۶ء اور سی۔ جی پنڈت ۱۹ کمیٹیاں مشہور ہیں ۔ ان کمیٹیوں نے تفصیلی طور پر دیسی طبوں کی ترقی کے لئے سفارشا پیش کی تھیں ۔

تاہم یونانی اور دیگر دیسی طبوں کی باضابطہ ریسرچ حکومت ہند کی سرپر میں ۱۹۶۹ء سے اس وقت شروع ہوئی جب سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان انڈین م اینڈ ہومیوپیتھی (سی، سی، آر، آئی، ایم۔ ایچ) قائم ہوئی تقریباً دس سال تک طب یونانی میں تحقیق بھی اسی کونسل کے تحت ہوتی رہی ۔ ۱۹۷۸ء میں اس کو کو چار کونسلوں میں تقسیم کردیا گیا (۱) یونانی (۲) آیورویدک و سدھا (۳) ہومیو (۴) یوگا و نیچروپیتھی کی علٰحدہ علٰحدہ کونسلیں قائم ہوگئیں ۔

(RUM)

کونسل کے بارے میں : سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن جو وزارت صحت و خاندانی بہبود، حکومتِ ہند کے تحت ایک خود مختار تنظیم ہے طب یونانی کے متعدد نظریاتی اور عملی پہلوؤں پر ہمہ جہتی تحقیقاتی ترقیات میں م ہیں ۔ کونسل کے اخراجات کلی پر حکومت ہند پورا کرتی ہے اور اس نے اپنی ا مدت قیام میں اپنے ریسرچ پروگراموں میں قابل ذکر پیش رفت کی ہے ۔ مرکز صحت و خاندانی بہبود کونسل کے صدر اور وزیر مملکت برائے صحت و خاندانی بہبو

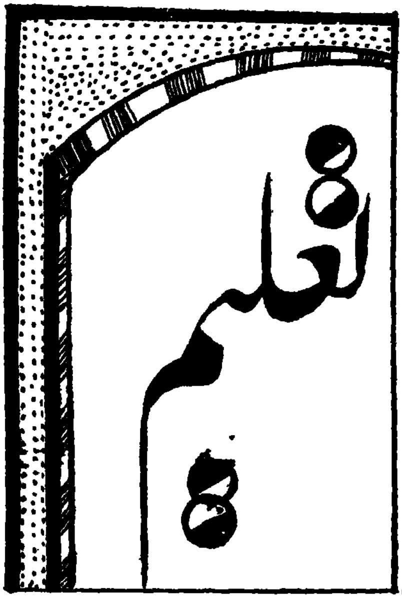
کے نائب صدر ہیں۔

ادارہ جات: سردست کونسل کے تحت ۱۲۹ ادارے ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں ایک سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن حیدرآباد (آندھرا پردیش) ہات ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن جن میں سے ایک ایک مدراس (تامل ناڈو) بھدرک (اڑیسہ)، پٹنہ (بہار) لکھنؤ (یوپی) علی گڑھ (یوپی) بمبئی (مہاراشٹرا) اور سرینگر (جموں کشمیر) میں ایک لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں، دس کلینکل ریسرچ یونٹس، دو نئی دہلی میں، اور ایک ایک ایڈاپھلا (کیرالا) الہ آباد (یو۔پی)، بنگلور (کرناٹک)، کریم گنج (آسام)، کرنول (آندھرا پردیش)، ریوا (مدھیہ پردیش)، بھوپال (مدھیہ پردیش)، اور کلکتہ (مغربی بنگال) میں پانچ ڈرگ اسٹینڈرڈائزیشن ریسرچ یونٹس، ایک ایک نئی دہلی، حیدرآباد، مدراس، لکھنؤ اور بنگلور میں، ایک کیمیکل ریسرچ یونٹ بگرانٹ ان ایڈ، علی گڑھ میں ایک سنٹرل ہرب گارڈن اور میوزیم لکھنؤ میں دو فیملی ویلفیر یونٹس حیدرآباد اور بمبئی میں ایک ایک اور نئی دہلی میں ایک انفارمیشن سنٹر شامل ہیں۔

(بقیہ صا۳۱ سے آگے)

گو وہ اس یونیورسٹی سے کبھی منسلک نہیں رہے پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ اس ادارے سے ایک قسم کا قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ جب میں نے انھیں یہ بتایا کہ ہماری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سائنس کے میدان میں کافی ترقی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ وہ اس کو کیمبرج کے اور آکسفورڈ کے ہم پلہ دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ پھر کسی ہندوستانی عبدالسلام کو حصولِ علم کے لیے اپنے وطن کو چھوڑ کر انگلستان نہ جانا پڑے۔ کاش! ہم اُن کے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا سکیں۔

ریاض الدین احمد
حال مقیم دوحہ، قطر



آج ہم قطر کے تعلیمی حالات کے بارے میں کچھ ذکر کریں گے۔ مگر پہلے ہیوسٹن (HOUSTON) چلتے ہیں جہاں ہماری پیاری بیٹی صوفیہ کمال نے تعلیمی مقابلے میں پورے صوبہ ٹکساس (TEKSAS) میں اول مقام حاصل کیا ہے اور اب ریاست ٹکساس کے صدر مقام آسٹن (AUSTIN) جاکر اپنا انعام حاصل کرنے والی ہے۔ دوسرا انعام اس کو خود اپنے شہر ہیوسٹن میں پیش کیا جائے گا جس کے لیے اس نے صوبائی اعزاز کمایا ہے۔ اس سے پہلے اسے اعلیٰ تعلیمی کارکردگی کے لیے ایک سرٹیفکیٹ سابق صدر امریکہ ریگن کے دستخطوں سے مل چکا ہے۔ مگر سب سے پہلے اس نے اللہ جل شانہٗ کے دربار سے قرأت قرآن کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور ۸ سال کی عمر میں ہمارے خاندان کی سب سے کم عمر قاریہ بن گئی اور برکتوں کا خزانہ لے کر زندگی کے محاذ پر چمکنے لگی۔ دعا ہے کہ تاعمر اُس سرزمینِ کفر میں ایمان کی شمع جلاتی رہے۔ ہم نے سنا ہے کہ اولاد کا حفظِ قرآن والدین کے لیے باعثِ نجات بنتا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ پڑھنے میں آیا کہ انھوں نے اپنے عالم بیٹے کو بلاکر فرمایا۔
" میں نے تم کو عالم بنایا تمہاری فلاح کے لیے اس علم کا حق ادا کرنا۔ مگر قرآن پڑھایا اپنی نجات کے لیے۔ میری اس امانت کو سینے سے لگائے رکھنا۔"

تو مجھے اب یقین آرہا ہے کہ صوفیہ کا کمال اس کے مرحوم باپ کی روح کے لیے باعثِ طمانیت ہوگا اور اس پیاری بیٹی کا قرآن اس کے لیے اور دادا، دادی کے لیے باعثِ نجات ہوگا۔ جو بھی نجات کا طالب ہو اسے اپنی اولاد کو قرآن پڑھانا چاہیئے۔

آیئے اب دوحہ چلیں۔ یہ دولت قطر کا صدر مقام ہے۔ یہاں کی ترقیات کو ہم اس نظریئے سے دیکھتے ہیں کہ اس کی آزادی کی عمر نے ابھی دو دہائی بھی پوری نہیں کی ہے خلیج عرب کے وسط میں ایک جزیرہ نما ۱۱۴۳۷ مربع کلو میٹر رقبے کا ہے۔ یہاں کی کل آبادی چار لاکھ کے قریب ہے حکومت تعلیم کی طرف توجہ دے رہی ہے۔ قطری طلبا، کے لیے مفت تعلیمی انتظام کے علاوہ کتابیں، تعلیمی ضروریات کی مختلف چیزیں، سواری کھیل کا لباس سب مفت ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ترغیبات مثلاً انعام، تعلیمی سفر کی سہولتیں، وظیفے، بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات کی فراہمی وغیرہ کثیر مقدار میں موجود ہیں۔ مگر سب سے زیادہ واضح جو تصویر نظر آرہی ہے۔ تعلیمی میدان میں لڑکیوں کا حصہ ہے۔ دن کے اسکولوں میں طلبا و طالبات کی مجموعی تعداد ۲۷،۹۷۱ ہے اس میں تقریباً نصف لڑکیاں ہیں۔ ثانوی سطح پر سائنس پڑھنے والی قطری لڑکیاں ہیں جن کی تعداد ۱۹۳ اور لڑکوں کی ۱۷۱ ہے۔ آرٹس کے درجات میں لڑکیاں بہت آگے ہیں۔ ۸۱۵ میں ۵۲۹ لڑکیاں ہیں اور باقی لڑکے۔ قطر یونیورسٹی میں لڑکیوں نے دھوم مچا دی ہے یہاں اُن کی تعداد ۳۴۴۵ ہے جب کہ لڑکے صرف ۱۷۰۳ ہے غیر ممالک میں جاکر تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے ذرا مشکل ہے لیکن اس سطح پر بھی ۱۱۰۸ میں ۳۰۷ لڑکیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ہر ملک کے سفارتی انتظام کے تحت تقریباً ۱۱۰۱ اسکول چل رہے ہیں۔ ان میں بھی لڑکیاں بھاری تعداد میں تعلیم حاصل کررہی ہیں یعنی ۱۸۵۳۵ میں لڑکیاں ۱۲۴۰۵ ہیں۔ ان اعداد سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس ملک کی تعلیمی ترقیات میں خواتین ایک کلیدی کردار ادا کرنے جارہی ہیں۔ مذہبیات میں بھی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں ۳۹۷ لڑکیاں ہیں

جب کہ لڑکے ۱۱۱۔ شعبۂ تعلیمات میں ان کی تعداد ۱۴۵۰ ہے جب کہ لڑکے صرف ۵۰۴ ہیں۔ یہاں تک کہ شعبۂ ایڈمنسٹریشن میں لڑکیاں ۱۲۰ ہیں اور لڑکے ۱۱۰۔ مگر ثانوی سطح کے خاص مذہبی اداروں میں جن کی تعداد نہیں معلوم ہوسکی ہے لڑکیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ حالانکہ قطر کی وزارتِ تعلیم و نظم و نسق میں خواتین کی تعداد ۲۰۱۹ اور ہے جو مجموعی تعداد کی ۸۵ر۴۸ فی صدی ہے۔ اس کے برخلاف وزارت تعلیمات میں خواتین صرف ۸ فیصدی ہیں اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قطری خواتین اسکولوں کی چہار دیواری میں محبوس رہنے کے بجائے اب کھلی دنیا میں قدم جمانا چاہتی ہیں۔

یہاں کی کثیر الاقوام برادریوں نے اپنی اپنی قومی ضرورتوں کے لحاظ سے ثانوی سطح کے پرائیوٹ اسکول کھول رکھے ہیں۔ ان میں دو ہندوستانی اسکول ایک مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کیرالا کا ایم۔ ای۔ ایس کے نام سے ہے دوسرا انڈین آئیڈیل اسکول کے نام سے مشہور ہے۔ تعریف ہے کیرالا مسلم سوسائٹی کی کہ انھوں نے اس دور افتادہ مقام پر اپنے عزم کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ ان کے پاس ایک وسیع عمارت ہے جو چار ہزار بچوں کے لیے اب چھوٹی پڑ رہی ہے چالیس بسیں ہیں جو بچوں کو روزآنہ لاتی ہیں اور لے جاتی ہیں اور اساتذہ کی ایک فوج ہر چند کہ درجات میں بچے معیاری تعداد سے کہیں زیادہ ہیں اور کمرے بھی روزافزوں تعداد کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں مگر بچے جو مرکزی تعلیمی بورڈ کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں سو فیصد کامیاب ہو رہے ہیں یہاں فیس بھی کم ہی ہے یعنی ۵۰۴ ریال سالانہ اور تنخواہوں کی شرح بھی کم ہی ہے یعنی ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ ریال تک۔ اس کے باوجود نتائج اتنے شاندار ہیں تو اس سے اساتذہ کی کارکردگی پر روشنی پڑتی ہے جو کہ اپنے وطن کے تعلیمی اداروں اور اساتذہ کے لیے باعثِ تقلید اور ترغیب ہے۔

ان کے مقابلے میں یہ دوحہ کالج ہے جہاں ہماری تینوں بیٹیاں پڑھ رہی ہیں یہ ایک برطانوی اسکول ہے جو یورپی روایات کے مطابق چل رہا ہے۔ چار ہزار کی بجائے یہاں بچوں کی تعداد صرف چار سو ہے اور کلاسوں میں بچاس کی جگہ صرف بیس بچے

ہر جبینتر نپی تلی - ہر کام معیاری - مگر فیس وہاں کے ۵۴ سو کے مقابلے میں ۵۴ ہزار
س میں درسی کتابوں کی قیمت شامل ہے مگر بس کا کرایہ الگ دینا پڑتا ہے - ٹھیک سات
ے صبح کو بچوں کو لے کر بس روانہ ہو جاتی اور ۱/۲ ۳ بجے سہ پہر میں پہنچا دیتی ہے (اس
قت میری گھڑی میں ٹھیک ۱/۲ ۱ بجے ہیں اور بچوں نے گھر میں قدم رکھ دیا ہے) یہاں صرف
۵ مضامین۔ انگریزی اور ریاضی لازمی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ باقی مضامین کیسے چُنیں - یہ نیچے - میرے سامنے میز پر ایک ایسا جاذب نظر رسالہ پڑا ہوا ہے جس کو نہ دیکھنا بد ذوقی میں شمار ہو سکتا ہے - اس میں ان مضامین کی فہرست ہے جن میں سے آپ چُن سکتے ہیں - ہر ایک کے نفسِ مضمون پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس سے کیا صلاحیت متوقع ہے - کیا کام اور کیسی محنت کرنا پڑے گی یہ تمام باتیں تفصیل سے درج ہیں - ہوم ورک کا رواج بالکل نہیں ہے ہر کام اسکول ہی میں ہوتا ہے اور کاپیاں بھی اسکول ہی میں محفوظ رہتی ہیں - گھر پر غیر درسی کام کیجئے - اپنی ہابی (HOBBY) پر وقت صرف کیجئے - ہماری بڑی بیٹی آرٹسٹ نکل رہی ہے اور اس کی دوسری ہابی کتابوں کو ہضم کرنا ہے جب بازار جائے گی تو کچھ کتابیں خرید لائے گی - دوسری صاحبہ ڈرامے میں اپنے حصہ کی تیاریاں کر رہی ہیں اور تیسری فرانسیسی سیکھ رہی ہیں - اسکول کے اوقات کے باہر بھی اسکول میں مختلف پروگرام ہوتے رہتے ہیں' اس کا ٹائم ٹیبل شائع کر کے بچوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے - وقتِ مقررہ پر والدین بچوں کو لے جاتے ہیں اور واپس لاتے ہیں - ایک ڈرامہ میں ہماری شرکت بھی ہو گئی - اس میں قصہ اُن جنگلی جانوروں کا تھا جنھوں نے ایک انسانی بچہ کو پال لیا تھا - بچوں نے جنگلی جانوروں کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا اور انسانی بچہ جسے شیر نے پال لیا تھا ہماری بھتیجی ڈاکٹر شہلا اور ڈاکٹر قوی کا بیٹا تھا داخلہ ٹکٹ سے تھا - ٹکٹ کی شرح ۲۵ ریال تھی۔

یہ لوگ خدمتِ خلق کی ترغیب بھی دلاتے ہیں - ایک مرتبہ ہڈی کے کینسر پر ریسرچ

پروجیکٹ کی امداد کے لیے ایک نادر طریقہ اختیار کیا گیا۔ اساتذہ کی طرف سے ایک اعلان ہوا کہ ہم اپنے کو ایک دن کے لیے بیچ رہے ہیں جو طالب علم چاہے خرید لے۔ چنانچہ بچوں نے اپنے استاد اور استانیوں کی قیمت لگا کر خرید لیا۔ مگر ایک شوخ طالب علم نے ایک کتے کی زنجیر لا کر اپنی استانی کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا آج میں آپ کا باس (BOSS) ہوں۔ آپ کے سپرد یہ کام ہے کہ اس کتے کو نہلاتی رہیئے۔"

مگر کرسچین اسکولوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام بھی کسی نہ کسی نہج سے ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا پہلے تو یہی بات ہمارے لیے گراں تھی کہ بچوں سے پیغمبر کا رول ادا کروایا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس قصے کی ترتیب انجیل کے مطابق رکھی گئی جو قرآن کے بیان سے ٹکراتا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ والدین پر اس کا کیا ردّعمل ہوا۔

یہاں والدین اور اساتذہ کے درمیان بھی گہرا ربط قائم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے کبھی کبھی والدین کو بچوں کے اساتذہ سے ملاقات کے لیے ایک خاص پروگرام بنتا ہے۔ قبل ملاقات یہ پروگرام شائع کر دیا جاتا ہے۔ اسی میں ملاقات کی تاریخ کا اعلان ہوتا ہے کس استاد/استانی کی کس وقت ملاقات ہوگی اور کس کمرے میں ہوگی اور اسکول کا ایک نقشہ ساتھ ہوتا ہے تاکہ حسبِ ضرورت کمروں کے جائے وقوع سے آگہی ہو جائے۔ ملاقات کے وقت آپ کے بچے کے تعلیمی کردار پر پوری روشنی ڈالی جاتی ہے بچوں کی کاپیاں آپ کے سامنے ہوں گی اور آئندہ ترقی کے لیے تبادلۂ خیال اور مشورے۔ یہ ملاقاتی پروگرام والدین کے لیے ایک لازمی کورس کی طرح ہوتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لیے والدین اپنا قیمتی وقت ضرور فارغ کریں گے

ہر بچے کے لیے ایک تفصیلی پروگرس رپورٹ ہوتی ہے جس میں ہر استاد اپنے شاگرد کے حسن و قبح پر پوری روشنی ڈالتا ہے اچھے بچوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

[illegible] اور انٹرویو

جاتا ہے۔ ٹی وی پر تصویریں آتی ہیں۔ بچوں کی برتھ ڈے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اخباروں کے مخصوص شمارے بچوں کے لیے نکلتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے خلیج ٹائمز کا ہفتہ واری ضمیمہ ویک اینڈ (WEEK END) پڑا ہے اس کا موضوع ہے۔ "کھیل سے زیادہ" یعنی کھلونے جو صرف کھیل نہیں ہیں بلکہ درسیات بھی ہیں اس سے متعلق رنگین عکسی تصویروں سے یہ رسالہ بھرا ہوا ہے اس طرح سے ایک پورا مصور رسالہ اس سال کے ٹاپر (TOPPER) بچوں پر ہے۔ افسوس اس کا رہا کہ ٹاپر (TOPPER) کی فہرست میں مسلمان بچے بچیوں کے نام مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔ اس سال کی ایک لڑکی جس نے پورے خلیج میں ٹاپ کیا ہے اس کا نام "بیجل" ہے ویک اینڈ (WEEKEND) نے ایک پورا شمارہ اس پر شائع کیا جس میں ان کی تصاویر کے ساتھ فیملی کی تصاویر اور انٹرویو وغیرہ ہیں، اس طریقۂ عمل سے بچوں کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

دو شعر

*

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے، ہوا چل رہی ہے
چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ، نئی روشنی ہے

خمار بارہ بنکوی

*

ضمیر وقت کی بے چین کروٹوں میں ابھی
اسی طرح کی ہزاروں کہانیاں ہونگی
سلگتی کانپتی افلاس وغم کے شعلوں میں
نہ جانے اور بھی کتنی جوانیاں ہونگی

خورشید احمد جامی

کے۔کے۔کھلّر

سعادت حسن منٹو
ایک بے باک مصنّف

سعادت حسن منٹو کی یک لخت مقبولیت خاص کر مغربی ممالک میں بہت حیران کن معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی مغرب ہے جس نے کسی بھی ہندوستانی کا ادبی سکّہ اس وقت تک نہیں مانا جس وقت تک کہ وہ مغربی ادیبوں، اداروں اور مغربی فضا کی پناہ نہ لے اور چونکہ منٹو نے کوئی ایسی گستاخی نہیں کی مغرب میں منٹو کی یکایک مقبولیت کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ کئی مغربی ادیب منٹو پر کام کر رہے ہیں جن میں روسی، انگریز اور فرانسیسی خاص طور پر شامل ہیں۔ اگر منٹو آج زندہ ہوتا تو ان کو اُن کا مقام بتاتا جیسا کہ اس نے اس امریکن ادیب کے ساتھ کیا تھا جو اس کی ہر ایک کہانی کا 500 روپے دینے کو تیار تھا۔ ایک بار تو منٹو نے 500 روپے لے لیا تھا کیوں کہ انہے روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن جب اسے یہ احساس ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے تو اُس نے ساری رقم لوٹا دی۔ ہندوستانی ادب میں ایسی مثالیں کم ہیں۔ شاید نہیں کے برابر۔ اپنے مجموعہ "یزید" کے آخری مضمون میں، جو دراصل ایک خط ہے منٹو لکھتا ہے۔

"آج میرا دل بہت افسردہ ہے۔ میرے دل میں اب سارا غم افسردگی

میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میں بہت ملول ہوں اور مغموم بھی۔ میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے۔ دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کما پاتا ہوں کہ روزمرہ کی ضروریات کے لیے پورا ہو سکے۔ اور یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری دہشت پسندی لطیفہ بازی اپنی جگہ سہی، لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ بھی ہوں۔ ان میں اگر کوئی بیمار ہو جائے اور موزوں اور مناسب علاج کے لیے بھی در در کی بھیک مانگنی پڑے تو مجھے کوفت ہوتی ہے۔ میرے دوست بھی مجھ سے زیادہ مفلوک الحال ہیں۔ اگر میں ان کی مدد نہ کر سکوں تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں کسی کا بلا اپنا سر جھکا ہوا دیکھوں تو خُدا کی قسم مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے بہت دکھ ہوتا ہے لیکن میں جب سوچتا ہوں کہ میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور لائبریریوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور میرے افسانوں کو وہی رُتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت بے چین ہوگی۔ میں اس بے چینی کے پیشِ نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے۔ خُدا مجھے اس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی ہڈیاں چاٹے گی۔ فتویٰ دینے والے سوچ رہے ہیں اور اب پھر سے یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور فتویٰ یہ فتویٰ دینے والی سرکار مجھے ترقی پسند تسلیم کرتی ہے۔ یعنی ایک طرف بھی کمیونسٹ، کبھی جھنجلا کر مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگاتی ہے اور مقدمہ چلاتی ہے۔ دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں اشتہار دیتی ہے کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے جس کا

قلم گزشتہ ہنگامی دور میں کبھی رواں دواں نہیں رہا۔ میرا افسردہ دل
لرزتا ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تحفہ میرے کفن کے ساتھ
ٹانک دے گی جو میرے داغِ عشق کی بہت بڑی توہین ہو گی۔"

ایسا خط دُنیا کی ادبی تاریخ میں آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ کسی اور ادب نے منٹو جیسا افسانہ نگار پیدا نہیں کیا۔ منٹو کی موت کو آج 35 سال ہو گئے لیکن منٹو جیسا ادیب پیدا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغرب منٹو کے لیے سرنگوں ہے۔ مغرب کی یونیورسیٹیاں منٹو پر تحقیق کروا رہی ہیں یہ کسی بھی ادب کے لیے باعثِ خوشی ہے بلکہ باعثِ فخر بھی ہے۔ منٹو ایک فرد کا نام نہ تھا بلکہ یہ ایک تہیم کا نام تھا۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ چاہے 35 سال بعد ہی سہی۔

لیکن بالآخر منٹو کی ایک ادیب کی حیثیت سے شنوائی ہوئی تو سہی اس سے منٹو کو تو فرق پڑنے والا نہیں ہے لیکن کم از کم ہم نے اچھے ادب کا اعتراف تو کیا۔

پچھلے 35 سالوں میں دہلی، علی گڑھ، جالندھر، امرتسر اور حیدرآباد سے منٹو کی کتابوں کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے عنوان بدل کے۔ لیکن شاید کوئی ایسا ناشر ہو جس نے منٹو کی بیوی (جو آج اس دُنیا میں نہیں ہیں) کو یا اس کی بچیوں کو (جو اب خود بال بچے دار ہیں) کوئی رائلٹی یا معاوضہ دیا ہو۔ منوں مٹی کے نیچے دبا ہوا منٹو آج بھی ان لوگوں سے پوچھ رہا ہے۔

"دیکھو میاں کتنا کمایا میرے کفن سے"

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح مہر
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

منٹو اُردو ادب کا سب سے بڑا بے باک اور بدنام افسانہ نگار ہے سب سے بانکا اور سب سے باغی جس نے "بو" "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت" جیسے افسانے لکھے اور نقادوں کو للکارا۔ منٹو اگر امریکہ یا کسی مغربی ملک میں پیدا ہوا

ہوتا تو آج اس پر ایک لائبریری قائم ہو چکی ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ منٹو پر ریسرچ کرنے پر بضد ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں منٹو لکھتا ہے۔

"سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں سیاست دانوں اور دوا فروشوں کو ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی دونوں پیشے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے کہ سیاست سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کہ گاندھی جی کو سنیما سے۔ گاندھی جی سنیما نہیں دیکھتے میں اخبار نہیں پڑھتا۔ دراصل ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنی چاہیئے اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔ سینکڑوں افسانوں کا مصنف فلم ساز بھی تھا۔ کرشن چندر کے ساتھ مل کر اس نے ایک فلم "مڈ" (کیچڑ) لکھی تھی۔ "بیگم" "آٹھ دن" "چل چل رے نوجوان" "آغوش" فلموں کی کہانیاں منٹو کی ہیں۔ "آٹھ دن" میں تو اس نے ایک رول بھی کیا تھا۔

بحیثیت مکالمہ نگار اور منظر نویس منٹو کا ایک ممتاز مقام ہے۔ اس کے علاوہ منٹو نے درجنوں ریڈیو ڈرامے لکھے۔ "کیا میں اندر آسکتی ہوں" جیسے مشہور ریڈیو پلے منٹو کے قلم کے ہی مرہونِ منت تھے۔ دراصل منٹو کی ساری زندگی ایک رنگین فلم کی طرح تھی جس کے فلم ساز نے اس ہر سین میں نئی جان ڈال دی ہو۔

فلمیں دیکھنے کا شوق منٹو کو بچپن سے تھا۔ امرتسر میں منٹو کا گھر کوچہ وکیلان میں تھا۔ اس گھر میں فلمی رسائل خاصی تعداد میں آتے تھے۔ اپنے کمرے میں منٹو نے گریٹا گاربو اور مرلین ڈیٹ رچ کی تصویریں لگائی ہوئی تھی۔ لیکن ایک نقلی ٹیلیفون بھی تھا۔ بمبئی جاکر منٹو نے ایک فلمی رسالہ بہ عنوان "مصور" کی ایڈیٹری سنبھالی تھی۔ مصور کے تبصرے بڑے غور سے پڑھے جاتے تھے لوگ پیار سے منٹو کو ادبی دنیا کا چارلی چیپلین کہتے تھے اس کی ہر بات کا رنگ نرالا تھا اس کی ہر ادا

انوکھی تھی۔ وہ ایک ایسے راستے کا مسافر تھا جو سفر کو اپنی منزل اور منزل کو سفر سمجھتا تھا۔

منٹو ایک ایسا فوٹوگرافر تھا جس کی حقیقت نگاری نے ایک ایسا البم تیار کیا تھا جس کے ہر ورق پر ایک شکل تھی جو تصویر اور آرٹ کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو کی اچانک موت نے نہ جانے ہم سے کتنے منگو کوچوان، کتنی سوگندھیاں، کتنے ورد ے، پہلوان کتنی کلونت کوریں کتنے ایشر سنگھ، کتنی موزیلیں اور کتنے بابو گوپی ناتھ چھین لیے ہیں۔

منٹو نے عورتوں اور طوائفوں پر بے تحاشہ لکھا لیکن اس کے اعصاب پر عورت سوار نہ تھی۔ منٹو ان ستائی ہوئی ظلم رسیدہ عورتوں کا افسانہ نویس تھا۔ جن پر قلم اٹھانے کے لیے ہمت بے باکی اور جراتِ رندانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوگندھی سلطانہ، سراج، شاردا، کلونت کور، موزیل جن کے ساتھ زمانے نے انصاف نہیں کیا ایسی "خواتین" پر قلم اٹھانا ایک ایسا قدم تھا جو منٹو سے پہلے نہ تو کسی نے اٹھایا نہ اس کے بعد کوئی شاید اٹھائے۔ "ہتک" کا آغاز مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوتا ہے

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی کہ میونسپل کمیٹی کا داعغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی۔ آیا اور اس کی بڑی پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس چلا گیا۔ وہ رات کو یہاں بھی لیٹ جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔"

سوگندھی جیسا کردار اردو ادب میں منٹو کی دین ہے سوگندھی اگرچہ ایک طوائف ہے لیکن جب ہر روز اسے نیا یا پرانا گاہک اسے کہتا ہے:

"سوگندھی میں تم سے پریم کرتا ہوں" اور سوگندھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس سے سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔ موم ہو جاتی ہے اور ایسا

محسوس کرتی ہے کہ وہ سچ مچ اس سے پریم کرتا ہے۔" پریم۔ کتنا سندر بول ہے۔"

منٹو کی اردو ملاحظہ ہو۔

"پریم کتنا سندر بول ہے" "وہ چاہتی تھی کہ اس کو پگھلا کر سارے انگوں پر مل لے۔ تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور وہ اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے یا پریم کئے جانے پر یا پریم کیے گئے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اپنی ہی گود میں سلا دے۔"

منٹو اردو ادب میں سب سے بڑا اور سب سے بے باک انسان تھا۔ جس کی انسان دوستی اس کے تمام انسانوں کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ سہائے منٹو کو جوان، بابو گوپی ناتھ سوگندھی، نرملا، موذیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے لافانی کردار صرف منٹو ہی دے سکتا تھا۔ اگر "پھاہا" میں منٹو نے نرملا کی سن بلوغ کی نفسیاتی حقیقت کو ایک عظیم فنکار کی طرح پیش کیا ہے تو "سراغ" میں "ڈھونڈو" اسی عظیم فن کا نمونہ ہے منٹو کے انسانوں میں دل فریب جملے اور دلفریب تشبیہوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ اگر "ٹھنڈا گوشت" میں ایشر سنگھ گالی دیتا ہے تو ایشر سنگھ منٹو کی نہیں بلکہ اپنی زبان بول رہا ہے۔ کلونت کور کی زبان بھی منٹو کی زبان نہیں ہے۔ پھر منٹو نے عدالت میں بھی یہی کہا تھا کہ میں ایشر سنگھ اور کلونت کور کی زبان کو بدل نہیں سکتا۔ زبان فحش نہیں ہوتی اس کا اثر فحش ہوتا ہے۔" ٹھنڈا گوشت" کو پڑھنے کے بعد قاری کے دل میں ملال اٹھتا ہے اور ملال فحش نہیں ہے۔

منٹو ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایک عزت دار افسانہ نویس تھا اس کا اٹھنا بیٹھنا عزت دار لوگوں میں تھا۔ منٹو اچھے پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور ایک سخت گیر طبیعت رکھنے والے کشمیری تھے۔ منٹو کے ایک بڑے سوتیلے بھائی ہائیکورٹ میں جج تھے حالانکہ منٹو کی اپنی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک رہی انھوں نے ہندو کالج امرتسر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فضاؤں میں سانس لیا تھا۔ روسی اور فرانسیسی ادب سے بخوبی واقف تھا زندگی کے آخری ایام میں وہ پنجابی بولیاں اکٹھا کر رہا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان بولیوں میں پرندوں کی اڑان ہے۔ قدرت کا رقص ہے ان کے سامنے ساری شاعری "فراڈ" ہے پنجابی کا سب سے بڑا شاعر "اُستاد دامن" منٹو کا لوہا مانتا تھا۔

مرنے سے پہلے منٹو نے ایک کتاب جس کا عنوان "گنجے فرشتے" تھا چھپوائی۔ لکھی تو شاید کچھ سال پہلے کی تھی۔ ادیب اپنی زندگی میں ایک آدھ کتاب ایسی ضرور لکھتا ہے جس میں وہ اپنی روح ڈال دیتا ہے جس میں وہ اپنے دل کو کھول کر رکھ دیتا ہے "گنجے فرشتے" جو فلمی دُنیا کے لوگوں کے زندگی کے خاکے ہیں۔ ایک ایسی کتاب ہے اس میں پری چہرہ نسیم ہے۔ آہو چشم راگنی، پراسرار نینا آغا حشر کاشمیری، اشوک کمار عرف گنگولی دادا جس نے منٹو سے اُردو سیکھی تھی بے بی نرگس اور پھر وہ ہزار کھڑکیوں والی کتھک ڈانسر ستارہ۔ یہ سب لوگ منٹو کے دوست تھے اور جو زندہ ہیں وہ آج بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ منٹو نے ان سب کی اصل تصویر قاری کے سامنے اپنے خاص انداز سے لکھی۔ بے نقاب بھی کیا تو اپنے خصوصی انداز میں۔ یہ انداز منٹو کے بعد اُردو ادب سے جاتا رہا۔ "مولی کی دُھن" میں ایکٹر شیام ہے۔ ہنستا کھیلتا شیام جس کو یہ فخر تھا کہ ہندوستان چھوڑتے وقت منٹو نے یہ راز صرف اسے بتایا تھا اور وہ یعنی شیام اس کو بمبئی کی بندرگاہ پہ کراچی کے لیے جہاز میں چھوڑنے گیا تھا اس

کتاب میں ایک اور خاکہ ہے بعنوان "میرا صاحب" یہ قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں ہے۔ جناح پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جو کردار جناح کا منٹو نے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ منٹو پر برٹش سرکار نے ہندوستان میں تین مقدمے چلائے۔ تینوں فحاشی کے الزام میں "کالی شلوار" "بو" اور "دھواں" افسانوں پر۔ تین اور مقدمے اسی فحاشی کے الزام پر پاکستان کی سرکار نے بھی چلائے۔ "ٹھنڈا گوشت" "کھول دو" اور "اوپر نیچے اور درمیان" افسانوں پر ۔ ہر بار منٹو بری ہوا۔ ہر بار منٹو فتح یاب ہوا۔ اگر چھوٹی عدالت نے سزا دی تو بڑی عدالت نے چھوڑ دیا۔ لیکن منٹو کی پریشانیاں اتنی بڑھ گئیں اور اس نے اتنی زیادہ شراب پینی شروع کر دی کہ 18 ارجون 1954ء کی سرد صبح کو اسے لہو کی قئے آئی اور بیشتر اس کے کہ اس کی نیک بیوی صفیہ اسے میو ہسپتال لاہور لے جاتی منٹو نے دم توڑ دیا۔

مرنے سے کچھ دن پہلے اس نے اپنا کتبہ لکھا تھا۔ جو یوں ہے ۔

"یہاں منوں مٹی کے نیچے منٹو ابدی نیند سو رہا ہے اس کے ساتھ افسانے کے وہ سب راز بھی سو رہے ہیں جو صرف منٹو جانتا تھا۔"

سعادت حسن منٹو جیسا ادیب سو سال میں ایک بار پیدا ہوتا ہے اگر آج منٹو زندہ ہوتا تو یقیناً اس "جعلی ادب" کے خلاف آواز اٹھاتا اور بے باکی کے ساتھ لکھتا۔ وہ ادب "جو نہ تو برائے ادب ہے اور نہ ہی برائے زندگی۔ منٹو اردو ادب کا "سیاہ حاشیہ" نہیں بلکہ اردو ادب کا "گنجا فرشتہ" ہے جس نے اردو افسانے کو ایک نئی زندگی بخشی ۔ منٹو ایک ٹرینڈ سیٹر (trend setter) تھا جو زندگی کے انداز اور اس کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

رفعت نواز
محلہ گھاٹی۔ اورنگ آباد
431001
(مہاراشٹرا)

سب اچھا کہیں جیسے

سالہاسال پہلے کی بات ہے لیکن آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے اور ذہن کے پردے سے نکل کر آنکھوں کے آگے اس کی تصویر مجسم ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے سٹی ہائی اسکول کے برگد کے پیڑ سے لگا کھڑا ایک لڑکا ہے گھنگریالے گھنے بال، کشادہ پیشانی، چمکدار آنکھیں، چوڑا تیکھے تیکھے نقوش والا پرکشش چہرہ، سڈول اور مناسب بدن، ہاف پینٹ ہاف شرٹ، گلے میں خوش رنگ اسکارف، کتابیں ہاتھوں میں تھامے کھڑا ہے۔ چلتے چلتے ٹھٹھک جاتا ہوں۔ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہوں، اس کی شخصیت کا سحر آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ اس سے بات کرنے کو دل مچلتا ہے، خود پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے، بال بکھرے ہوئے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، بغیر استری والے کپڑے، میلے کچیلے پیروں میں ربر کی چپل۔ اسی کشمکش میں ہوں کہ میرا دوست سلیم اس لڑکے سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ سلیم سے ملنے کے بہانے اس کے قریب جاتا ہوں سلیم تعارف کرواتا ہے یہ رشید الدین ہے۔ نویں کلاس میں داخلہ لیا ہے اور میرے ساتھ گھاٹی ہوسٹل میں رہتا ہے، جھجک یکلخت ختم ہو جاتی ہے۔ بے تکلفی سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہوں وہ بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا ہے لگتا ہے ہم اجنبی نہیں رہے۔

گھاٹی ہوسٹل دو مکانوں پر مشتمل تھا، ایک میرا ہی مکان تھا۔ ایک ہمارے انگلش [illegible] بھکلتی کا۔ اسکول سے [illegible] ساتھ آنے لگے، چند ہی دنوں میں [illegible]

دوستی ہوگئی۔ گھنٹوں ساتھ رہنے لگے۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تو ختم کرنے کو جی نہ چاہتا۔ اسکول کی باتیں، ٹیچروں کی باتیں، ہم جماعت لڑکوں کی باتیں اور سب سے زیادہ فلموں اور فلمی گیتوں کی باتیں۔ ان دنوں ہمارے یہاں ریڈیو نہیں تھا روز ہاسٹل جاتا۔ ریڈیو سیلون سے نشر ہونے والے فلمی گیت سنتا۔ سنیچر کو دوپہر کی چھٹی ہوا کرتی، ہم تینوں سہ پہر کو گھر سے نکل جاتے۔ گھاٹی سے شاہ گنج تک پیدل جاتے سیٹھ ہوٹل، لکی ہوٹل یا مہاراشٹر ہوٹل میں ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھ کر ریکارڈ پلیئر پر فلمی گانے سنتے اور ایک آنے والی چائے پی کر مطمئن ہوجاتے۔ دنیا بھر کی باتیں کرتے، واپس آکر والی بال کھیلتے اور مغرب کے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے جاتے۔ میں دسویں کلاس میں تھا اور رشید نویں میں۔ میٹرک پاس کیا اور ملندہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ کبھی کبھی کالج کی پرکشش فضا، رشید کو کھینچ لاتی میرے ساتھ کلاس میں بیٹھتا، لیکچرز سنتا، کالج سے فارغ ہوکر ہم راموکے ہوٹل میں جاکر بیٹھ جاتے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔

میٹرک کے بعد رشید نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہوسٹل چھوڑ دیا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہنے لگا۔ ہماری رہائش گاہوں کا فاصلہ بڑھ گیا تھا لیکن روز شام کو ہماری ملاقات ہوتی رہتی۔ پھرتے پھراتے شاہ گنج کے ہوٹل میں جاکر بیٹھ جاتے جیب میں تین چار آنے ہوتے تو مزے سے دو گھنٹے ہوٹل میں گزار دیتے تھے دونوں چائے پیتے، پان میں کھاتا، رشید سرکلے سگریٹ پھونکتا۔ ہمارے درمیان خاموش معاہدہ ہوگیا تھا وہ پان نہیں کھائے گا میں سگریٹ نہیں پھونکوں گا۔ دونوں عیش کرنے کے لیے پیسے کہاں سے لاتے۔ ان ہی دنوں ادب کا چسکا لگا۔ کالج میگزین میں چھپنے اور مقابلوں میں سرخرو ہونے کا شوق بڑھا۔ ہم دونوں نے مزاحیہ مضامین لکھے اور اپنے اپنے کالج میگزین میں وہ چھپ بھی گئے۔ رشید مسلسل لکھتا رہا، روزنامہ انقلاب میں اس کے مضامین متواتر آنے لگے اور اخبار اعزازی طور پر اس کے نام جاری ہوگیا میں نے بھی جوش میں آکر لکھنا شروع کردیا۔ تیسرے درجے افسانے ادنیٰ سے چیتے

مضامین اور بمبئی کے روزناموں میں یہ شائع ہونے لگے۔ اسی زمانے میں "مطلع ادب" کا قیام عمل میں آیا۔ جے پی سعید کے مکان پر ہفتے پندرھواڑے نشست ہونے لگی۔ ہم دونوں اپنی "کاوشیں" پیش کرنے لگے۔ رشید نے طنز و مزاح کو اپنایا، میں نے افسانے کی مہم پر نکلا بیڑہ اٹھایا۔ ایک قلمی رسالہ بھی "مطلع ادب" کے زیر اہتمام جاری کیا گیا "عکاس" جے پی سعید ایک کاپی لکھتے اور ہمارا دوست سریندر رکار مہرا (جسے مرحوم لکھتے ہوئے آج بھی قلم کانپ رہا ہے) دوسری کاپی لکھتا۔ شہر کے ادبی حلقوں میں عکاس کی کاپیاں گشت کرتیں۔ ہم دونوں کے علاوہ ایاس فرحت، سریندر رکار مہرا، جمیل احمد، خلیل صادق اور یوسف حامد کے افسانے عکاس میں آتے تھے۔ قاضی سلیم، بشر نواز، وحید اختر انور معظم، شفیق فاطمہ شعریٰ، جے پی سعید اور مولوی یعقوب عثمانی کی نظمیں غزلیں بھی دی جاتی تھیں۔ سال دو سال بعد رشید الدین کا طنزیہ مزاحیہ مضمون "اردو ادب مئے خانے سے چائے خانے تک" ماہنامہ شاعر میں شائع ہوا اور دھوم مچ گئی۔ تین چار ماہ بعد میرا افسانہ بھی "شاعر" میں شائع ہو گیا۔ بس بن گیا میں لکھاری۔ کورس کی کتابیں دھری رہ گئیں اور امتحان میں مسلسل ناکام ہوتا رہا۔ رشید نے گریجویشن کیا اور محکمہ زراعت میں کچھ عرصہ اہلکاری کی پھر اوائل ۱۹۶۰ء میں اس کا تقرر محکمہ ترجمہ حیدرآباد میں بحیثیت مددگار مترجم ہو گیا روز کی ملاقات موقوف ہو گئی۔

پندرہ دن یا مہینے میں ایکبار خطوط کے ذریعہ ادھوری ملاقات ہوتی رہتی۔ رشید نے شادی رچائی پانچ بچوں کا باپ بنا۔ ترقیاں پائیں اور ہر اعتبار سے کامیابی حاصل کرتا رہا ملنا برسوں بعد ہوا۔ میں بھی روٹی کے فراق میں بھٹکتا رہا۔ لکھتا بھی چھپتا بھی رہا اور رسوا بھی ہوتا رہا۔ رشید بھی لکھتا رہا۔ سرخرو ہوتا رہا، شہرت کی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ وہ ہر کام سلیقہ سے کرتا رہا۔ دوستی بھی سلیقہ سے نبھا رہا ہے میری بے حساب خامیوں کے باوجود وہ مجھ سے اسی خلوص، اسی اپنائیت سے ملتا ہے بالکل لڑکپن کے رشید کی طرح۔ جب بھی حیدرآباد جاتا ہوں اسے فون کر دیتا ہوں وہ اسکوٹر لے کر

ہو جاتا ہے اور مجھے لیے لیے پھرتا ہے۔ اپنے کام چھوڑ دیتا ہے ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے ہیں، وقت پر لگا کر اڑنے لگتا ہے دن دیکھتے دیکھتے گزر جاتے ہیں اور جدائی کی گھڑی آجاتی ہے ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، آواز بھرا جاتی ہے۔

رشید الدین ہنگامے کا قائل نہیں، وہ خاموشی اور سلیقہ سے کام کرتا ہے اس نے ملازمت کرتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اب ڈی لٹ کر رہا ہے مددگار مترجم سے مترجم پھر اسٹنٹ ڈائرکٹر اور اب ڈپٹی ڈائرکٹر ٹرانسلیشن ڈپارٹمنٹ آندھرا پردیش کے اہم عہدے پر فائز ہے اس کے لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سعودی عرب میں برسر کار ہیں۔ خوبصورت گھر ہے۔ سلیقہ شعار بیوی ہے۔ گھر میں اچھی سی لائبریری ہے۔ ہر اعتبار سے کامیاب زندگی گزار رہا ہے تین کتابوں کا مصنف ہے چوتھی کتاب زیر طبع ہے۔ پہلی کتاب علامہ حیرت بدایونی کی شخصیت اور فن کے بارے میں ہے۔ دوسری کتاب "خواہ مخواہ" طنزیہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے (اس کتاب پر مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کا انعام بھی ملا ہے) تیسری کتاب "ذکرِ رفتگاں" ہے جس میں مرحومین کا تذکرہ ہے۔

رشید بڑی دلچسپ باتیں کرتا ہے، بات میں بات پیدا کر دیتا ہے، جہاں بیٹھتا ہے اپنی حاضر جوابی اور دلچسپ فقرے بازی سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ خود بھی جی کھول کر قہقہہ لگاتا ہے اور دوسروں کو بھی قہقہہ لگانے پر اکساتا ہے۔

رشید کے بارے میں اتنا سب کچھ لکھنے کے بعد احساس ہوا کہ پڑھنے والے یہ کہیں گے کہ میں نے دوستی کا حق یوں ادا کر دیا کہ ساری اچھائیاں اس کی شخصیت میں دکھلا دیں، یوں کہ وہ آدمی نہیں فرشتہ لگے۔ رشید میں کچھ کمزوریاں بھی ہوں گی جو ہر آدمی میں ہوتی ہیں۔ لیکن اچھائیاں اتنی ہیں کہ کمزوریوں پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ مجھ میں خود اتنی کمزوریاں ہیں اور میری شخصیت خود اتنی ٹوٹی پھوٹی ہے کہ جس شخص میں چند خوبیاں نظر آتی ہیں میں اسے خود سے برتر سمجھنے لگتا ہوں اور رشید تو میرا پرانا یار ہے۔

تبصرہ نگار: مومن خاں شوق
افتخر ولا۔ ۳-۱۱-۲۲۳۔ ملے پلی حیدرآباد

تبصرہ

چراغ کی لَو

(مرزا غفار بیگ آشر گلشن آبادی کا شعری مجموعہ، صفحات ۹۶، قیمت ۲۰ روپے)
(ملنے کا پتہ ● مرزا غفار بیگ آشر کوٹھی قدسیہ باغ جاؤرہ۔ ضلع رتلام یوپی)
● ڈاکٹر ندیم خاں، بنگلہ نمبر ۱۱۔ منگل بازار صدر ناگپور

شاعری مشاہدات، تجربات اور احساسات کی ہی نہیں بلکہ خلوص و محبت آئینہ دار ہے بلکہ انسان کے داخلی اور خارجی جذبہ کی عکاس بھی ہے اِن کے ساتھ ساتھ فنّی بصیرت اسے اور روشن کر دیتی ہے۔

"چراغ کی لَو" شعری مجموعہ پر اپنے تاثرات ڈاکٹر محمد مختار الرحمٰن خان منشاؔ نے یوں قلم بند کیا ہے خُدا کا شکر ہے کہ فی زمانہ کچھ ایسی صالح مزاج کلاسیکل ادبی ذوق رکھنے والے غزل گو بھی موجود ہیں جو تمام فنّی لوازمات کے ساتھ ساتھ نئے نئے دل پذیر موضوعات سے غزل کے دامن کو مزیّن کیے جا رہے ہیں۔ ان باشعور سخنوروں میں قدسیہ باغ کے رہنے والے جناب مرزا غفار بیگ آشر گلشن آبادی کا بھی شمار ہوتا ہے آپ کا تعلق جاؤرہ (گلشن آباد) کے اس ادبی ماحول سے ہے جو دہلی کی تہذیب و تمدن کا پروردہ ہے ریاست جاؤرہ سے دہلی کے حکمراں خاندان والوں کے ساتھ دیرینہ روابط رہے ہیں۔ مغل حکمراں شاہ اکبر ثانی نواب جاؤرہ اور آشر صاحب کے جدِ امجد تینوں رشتہ ہم زلفی میں بندھے ہوئے تھے اِسی لیے دہلی کا ادبی ثقافتی اور تہذیبی رنگ اہلِ جاؤرہ کی زبان، رہن سہن، سماجی رسومات اور کلچر پر غالب نظر آتا ہے۔

بقول ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشاء "آثر صاحب ایک بالغ نظر انسان اور حساس اہلِ دل فنکار ہیں سلاست، سادگی اور صداقت اُن کے کلام کے نمایاں جواہر ہیں۔ ہر شعر میں پختگی و شائستگی اپنی بہار دکھاتی نظر آتی ہے۔"

آثر صاحب کے شعری مجموعہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں قدیم و جدید لب و لہجہ کا ایک خوبصورت سنگم ہے یہ جو کچھ کہتے ہیں ڈوب کر کہتے ہیں۔ اخلاقی قدروں کو بڑے مثبت اور جمالیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ سنجیدگی، وقار، خلوص اور آگاہی ان کے فن کی پہچان ہے زبان پر قدرت حاصل ہے محاوروں کو خوب تر برتا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی، حالات اور زمانے کے تقاضوں کی عکاسی اچھے انداز میں ملتی ہے۔

"چراغ کی لَو" کے شاعر کے یہاں روایت کے ساتھ عصری آگہی کی ترجمانی بھی ہے ان کے یہاں بیان کی شگفتگی، جستجو، مشاہدات، تجربات کے ساتھ ساتھ فن کا تحفظ ملتا ہے جو بڑی بات ہے۔ آثر صاحب کے کلام میں خیالات کی ندرت ہے جو متاثر کرتی ہے اِس مجموعۂ کلام میں حمد، نعت، منقبت، قطعات اور زیادہ غزلیں شامل ہیں۔

آئیے شاعر کی زبان، بیان، فنکارانہ صلاحیت اور چاشنی سے لطف اندوز ہونے کے لیے چند منتخب اشعار پیشِ خدمت ہے آپ خود اندازہ لگا لیجئے فیصلہ آپ پر ہے۔

وہ نہیں چاہے تو پھر پتا بھی ہل سکتا نہیں
ہے آثر اپنی جگہ دستِ دعا اپنی جگہ

میں نے سر کر لیا پہاڑوں کو = تیری ذرّہ نوازیوں کی قسم

ہمارا ہو کے بھی سایۂ فگن پڑوس میں ہے
ہمیں ہیں دھوپ میں حالانکہ شجر اپنا

کس کا تھا کس کا ہوگا کس کو خبر = ہم جو اپنا مکان کہتے ہیں

دیکھ سکتے ہیں کہہ نہیں سکتے
ایک گونگے کا خواب ہیں ہم لوگ

دل نادان دیوانہ ہوگیا ہے
وہ عنواں اب فسانہ ہوگیا ہے

روشنی میں بھی نظر آتا نہیں
کتنے پردوں میں چھپا ہے آدمی

آپ نے ہٹایا کیوں راستہ کے پتھر کو
ٹھوکریں تو لگتی تھیں اک سبق تو ملتا تھا

جوڑ سکے تو جوڑ مگر — لوگوں کو تقسیم نہ کر

اک طوفاں سروں پر سے گذر جائیں آخر
ہم چٹانوں کی طرح پھر سے اٹل ہیں یارو

حق گوئی کا دعویٰ تو کرتا ہے آخر لیکن
منصور اگر ہوتا سولی پہ چڑھا ہوتا

ایسے بے شمار اشعار اس مجموعہ میں پڑھنے کو ملیں گے جس سے آپ شاعر اور شاعری کو پسند کریں گے دیدہ زیب سرورق اچھی کتابت اور طباعت کا روشن شعری مجموعہ ہے۔ "چراغ کی لَو" ادبی حلقوں میں اس کی قدر و منزلت ہونی چاہیئے۔

(بقیہ سلسلہ صـ۵۳ سے آگے)

اتنی ساری خوبیاں کا حامل کہ میری نظر سے اس کی دو چار کمزوریاں اوجھل جاتی ہیں۔

حاصل اس تحریر کا یہ ہے کہ رشید الدین پورا آدمی ہے جس میں انسانیت بھی ہے اور فنی زمانہ ادھورے آدھے آدمیوں کی بھیڑ میں انسانیت کا کسی شخص میں مل جانا کیا نایاب چیز نہیں۔

الیکٹرانکس

کے ذریعہ روزگار

ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو ایک غریب ملک وراثت میں ملا تھا جہاں قلت اور بھوک کا سامنا تھا اور جسے اپنی بقا کے لیے بھی خارجی امداد پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ نہرو نے قوم کی سائنسی پالیسی کا ذمہ خود اٹھایا اور سائنسی انقلاب کے ایک طویل المدت پروگرام کو شروع کیا۔ آج چالیس برس بعد ہندوستان بھاری مشینیں اور اشیاء صرفہ خود تیار کرتا ہے اور بہت حد تک خود کفیل ہو چکا ہے۔

ہمارے ملک میں الیکٹرانکس کی صنعت کی تاریخ کی ابتدا ۱۹۵۰ء کے دہے سے کی جاسکتی ہے جب کہ ٹیلیفون کے آلات، الیکٹرانک ویلوز اور فوجی ضروریات کے مواصلاتی سیٹوں جیسے چھوٹے اور آسان قسم کے آلات کی تیاری سرکاری دائرہ کار میں شروع کی گئی اور ریڈیو سیٹوں کی ساخت بھی دائرہ کار میں شروع ہوئی ۱۹۶۰ء کے دہے کے وسط تک اس صنعت کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ ہمارے ملک میں الیکٹرانکس اور الیکٹرانکس کی صنعت کو اصل تحریک اور ترغیب عمل بھابھا کمیٹی کی رپورٹ سے ملی جو کہ ۱۹۶۰ء کے دہے کے دوران تیار کی گئی۔ دراصل یہ رپورٹ الیکٹرانکس کی صنعت کی آئندہ ترقی کے لیے بنیادی خاکہ ہے اور سائنسی شعبے کے افراد کے لیے ایک چنوتی ہے۔ ملک نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے اور ملک میں الیکٹرانکس کی ترقی کے کام کو خصوصی اہمیت دی ہے نیز الیکٹرانکس کی

منصوبہ بندی اور ترقی کے عمل سے نپٹنے کے لیے حکومت کے اندر خود مختاری انتظامیہ شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ منصوبہ بندی اور تخصیص زر کے عمل میں تحقیق اور ترقی کو اہم درجہ دیا گیا ہے۔ جس سے ایک خود کفیل صنعت کی ترقی کا یقینی اہتمام ہو گیا ہے جو اپنی سائنسی و ٹکنالوجیکل بنیاد پر کھڑی ہو اور یہ اہتمام آئندہ چل کر ایک ایسی صنعت کے قیام کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے جو الیکٹرانکس جیسے ترقی یافتہ شعبے میں بین الاقوامی مقابلے میں ٹھہر سکے۔

آج ہمارے ملک میں ہر سال ۹ ہزار کروڑ روپے کی مالیت کا الیکٹرانکس کا سامان اور حصے پُرزے تیار کیے جاتے ہیں جس میں عام صارفین صنعت، فوج اور کمپیوٹروں کی صنعت کو درکار تمام سامان شامل ہے۔ حالیہ برسوں میں اس کام میں حوصلہ افزا ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں پیداوار کی کل مالیت ۱۰۰ کروڑ روپے تھی جو ۸۲-۱۹۸۱ء میں ایک ہزار کروڑ روپے ۸۴-۱۹۸۳ء میں دو ہزار کروڑ روپے اور ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۹ ہزار دو سو کروڑ روپے ہوگی ۹۵-۱۹۹۴ء میں یہ پیداوار ۳۰۰۰۰ کروڑ روپے اور موجودہ صدی کے اختتام تک ۷۵۰۰۰ کروڑ روپے تک پہنچا دینے کی تجویز ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ پیداوار کی بنیاد بھی وسیع ہوئی ہے اب اس سیکٹر میں کارخانوں کی تعداد ۲۵۰۰ ہے جن میں سے ۱۱ کارخانے اپنے صنعت کار اداروں کے ساتھ مرکزی سرکار کے دائرہ کار میں ہیں۔ ۶۰ کارخانے ریاستی سرکار دائرہ کار میں تقریباً ۴۰۰ منظم نجی دائرہ کار میں اور باقی چھوٹے پیمانے کے دائرہ کار میں ہیں یہ صنعت تین لاکھ افراد کو براہ راست روزگار مہیا کرتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اتنے ہی لوگ اس صنعت کی امدادی سرگرمیوں میں برسرِ روزگار ہیں جس میں مال کی فروخت اور سروس کے شعبے شامل ہیں۔

اگرچہ الیکٹرانکس کے سامان کی پیداوار کی مالیت ۸۲-۱۹۸۱ء میں ایک ہزار کروڑ سے بڑھ کر ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۹ ہزار کروڑ روپے ہوگی لیکن اس صنعت میں براہ راست روزگار میں اس کا تناسب سمجھ میں آسکتا ہے کہ جو یہ ہے کہ گذشتہ کئی برسوں میں روپے کی قیمت

کم ہوگئی ہے اور فی کس سالانہ پیداواریت جو ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۷۰۰۰۰ روپے تھی
۹۰-۱۹۸۹ء میں بڑھ کر ۷۰۰۰۰ ۲ کروڑ روپئے ہوگئی ہے۔ سرکاری اور نجی دونوں
شعبوں میں پیداواریت کم و بیش ایک جیسی ہے تاہم یہ پیداواریت اور بھی زیادہ
دکھائی جاسکتی ہے اگر غیر ممالک سے درآمد کردہ کرٹوں کو جوڑ کر مشینیں اور سیٹ تیار
کرنے والے یونٹوں کا تناسب زیادہ ہو اور کسی کارخانے میں اُس صورت میں
پیداواریت کم دکھائی دے گی اگر وہاں مال اپنے ساخت کردہ سامان سے بنایا گیا ہو۔

اگر فولاد کیمیات اور معدنیات کی دیگر صنعتوں سے مقابلہ کیا جائے تو الیکٹرانکس کی
صنعت میں مال کی پیداوار سرمائے کے مقابلے میں زیادہ ہے ہمارے ملک میں سرمائے کی شدید
قلت ہے لہٰذا ہماری معیشت میں الیکٹرانکس کی صنعت کی ترقی معیشت کے دیگر شعبوں جیسے
زراعت، فولاد، کیمیات، کپڑا، بجلی، کھاد وغیرہ کے مقابلے میں بہت اہمیت اختیار
کرگئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر سیکٹر میں مال کی کوالٹی اور پیداواریت میں اضافہ کرنے
کے لئے آلات کے ذریعہ کنٹرول کے عمل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے خدمتوں کے شعبہ جیسے
ریلوے، بنکنگ، حفظانِ صحت، تعلیم اور سماجی بہبود میں الکٹرانکس کے ذریعہ اعداد و
شمار کی فراہمی اور فیصلے کرنے سے پیداواریت اور اہلیت میں اضافہ ہوتا ہے جس سے بیش قیمت
وقت کی بچت ہوتی ہے مذکورہ بالا اقسام کی دونوں صورتوں میں تربیت یافتہ سائنسی اور
تکنیکی افرادی قوت کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے ملک کے پہلے وزیراعظم کے تصوّر کی
مہربانی سے ہماری [illegible] نصیبی ہے کہ ہمارے پاس دنیا میں تیسرے نمبر پر سب سے
زیادہ تربیت یافتہ سائنسی و تکنیکی افرادی قوت ہے۔

الکٹرانکس کی صنعت کے لیے آٹھواں پانچسالہ منصوبہ کافی بڑا ہے آٹھویں منصوبہ
کے لیے مقرر کردہ نشانے صرف مالی اقدامات جیسے کہ درآمدی برآمدی پالیسیوں محصولات
کے ڈھانچے وغیرہ سے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ اس کے لئے مال کے معیار اور پیداواریت میں
اضافہ کرنے کے لیے خود کار عمل کو بڑے پیمانے پر رائج کرکے ہماری مالی ساخت تیار کرنے

نالوجی کی تجدید کرنی ہوگی۔ ہماری الکٹرانکس صنعت کی پیداواریت دُنیا کے الکٹرانکس کا
ل تیار کرنے والے سبرکردہ ممالک جیسے امریکہ، جاپان اور کوریا کے کسی طرح بھی ہم پلہ
نہیں ہے جب تک کہ ہمارے پیداواری طریقوں میں انقلابی تبدیلی نہ کی جائے ہم کبھی
ن ملکوں کا مقابلہ کرنے کی اُمید نہیں رکھ سکتے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں بینکوں اور مالیاتی
اداروں پر سرکاری کنٹرول کا جو سماجی وسیاسی فلسفہ زیرِ عمل ہے اُس سے بڑے پیمانے
پر غیر ملکی سرمایہ حصص اور کٹوں کے جوڑنے کے عمل پر ہمارے الکٹرانکس کی صنعت ترقی
نہیں کرسکتی۔ جیسے کہ دیگر ملکوں میں رواج ہے اس لیے ہماری صنعتی ترقی اور اس کے مال کی
ساخت کرنے کی قوت اپنے ہاں تیار کردہ اشیاء سے مال تیار کرنے کے خیال پر مرکوز کرنے کی
ضرورت ہوگی۔

ٹکنالوجی پر مبنی تبدیلیوں اور اختراعات کی مخالفت کی توقع ملازموں اور اُن کی
انجمنوں کی طرف سے ہی نہیں جنھیں روزگار کے مواقع کم ہوجانے کا خدشہ ہے بلکہ ملک میں
روائتی تصورات سے بھی نکلنا چاہیئے۔ ہمارا روائتی اندازِ فکر یہ ہے کہ ہماری صنعتوں میں
زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار ملنا چاہیئے اور خود کاری کے عمل سے اگر روزگار کی صلاحیت
میں کمی ہوتی ہو تو اس عمل کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیئے۔ لیکن جہاں تک یہ ہے۔

اگرچہ ہمارے ملک میں صنعت کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں الکٹرانکس کی
صنعت کی ترقی زیادہ موثر دکھائی دیتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دُنیا میں الکٹرانکس کا مجموعی
طور پر جتنا مال تیار ہوتا ہے ہندوستان میں تیار کردہ مال کا تناسب اس میں صرف ۰ر۵
فیصد ہے۔ اس صورتِ حال پر یقینی طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ جدید ترقی پذیر
ممالک میں ہندوستان صارفین کی دوسری بڑی منڈی ہے ہندوستان میں الکٹرانکس کی
صنعت کی ترقی کی ضرورت نہ صرف دستیاب صارفین کی منڈی کی وجہ سے بلکہ اس لیئے
بھی ہے کہ الکٹرانکس کا شعبہ ملک میں مجموعی قومی وصنعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیئے
سرمایہ کاری کا بہترین موقع مہیا کرتا ہے۔

۱۹۸۴ء میں دنیا میں الکٹرانکس کے سامان کی تجارت کی کل مالیت ۱۶۴ بلین ڈالر تھی۔ اس میں ہندوستان کا حصہ صرف ۰.۵ فیصد تھا۔ برآمدات میں جاپان کا تناسب ۲۸ فیصد ایشیا کے دیگر ترقی پذیر برآمد کرنے والوں کا تناسب ۷.۶ ۱۳ فیصد، مغربی یورپ کا ۳۴ فیصد اور شمالی امریکہ کا تناسب ۱۹.۵ فیصد تھا۔ آج بھی ہمارے ہاں الکٹرانکس کا زیادہ تر مال ملکی کھپت کے لیے تیار کیا جاتا ہے ہماری الکٹرانکس کی صنعت نے عالمی منڈیوں کی ضروریات کی بناء پر کبھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ ہمیں اپنے خیالات میں انقلابی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ الکٹرانکس کے بعض شعبوں میں ہمیں نہ صرف گھریلو ضروریات پوری کرنے بلکہ عالمی منڈی کے لیے برآمدات کا مقابلہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے اگر آئندہ پانچ برسوں میں عالمی منڈیوں کی ضروریات کے دو یا تین فیصد حصے کو بھی حاصل کرنے کا نشانہ مقرر کیا جائے تو ہمارے ہاں الکٹرانکس مال کی پیداوار اور صنعت کاری کے عمل کی سطح میں انقلابی تبدیلی آجائے گی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ملک میں الکٹرانکس سامان اور پرزوں کی تیاری کی صنعت میں چھ لاکھ افراد کو روزگار مل رہا ہوگا جبکہ ملک میں اس قسم کے سامان کی پیداوار کی مالیت ...۴۰ کروڑ روپے تک پہنچ چکی ہوگی۔ موجودہ صدی کے اختتام تک جبکہ پیداوار کی مالیت کا اندازہ ...۷۵ کروڑ روپے کا ہے دس سے ۱۲ لاکھ افراد کو اس صنعت سے براہ راست روزگار حاصل ہوگا۔ ۸۹-۱۹۸۸ء میں ہمارے ۵۰ فیصد محنت کش مال کی ساخت کے عمل میں کام کر رہے تھے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں تناسب گر کر ۴۴ فیصد اور صدی کے آخر تک اور بھی کم رہ گیا آئندہ برسوں میں الکٹرانکس مال کی فروخت کی دیکھ بھال، مرمت اور دیگر خدمتوں کے کاموں میں اور بھی زیادہ تر افراد کو روزگار ملنے کا امکان ہے کمپیوٹروں اور اعداد و شمار کی ترتیب و تدوین کمپیوٹروں کے غیر مشینی حصوں کے کام میں بھی روزگار کے بہت سے مواقع ملنے کا امکان ہے اس طرح اس صدی کے آخر تک الکٹرانکس سے متعلقہ خدمتوں کے سیکٹر میں روزگار پانے والے افراد کی تعداد الکٹرانکس سامان کی پیداوار میں براہ راست روزگار پانے والوں کی تعداد

سے زیادہ ہو جائے گی اور ایک اندازہ یہ ہے کہ خدمتوں کے شعبے میں روزگار پاتے والوں کی تعداد پیداواری عمل کے شعبے سے کم از کم دو تین گناہ ہو جائے گی ظاہر ہے کہ آٹھواں پانچسالہ پلان کی مدت میں الکٹرانکس کے سیکٹر میں قریب ۹ لاکھ افراد کو روزگار ملے گا ان میں سے ایک تہائی افراد گریجویٹ انجینیر ہوں گے ۶۰ فیصد مانگ ڈپلومہ/سرٹیفکیٹ افراد گریجویشن حاصل کرتے والوں کی ہوگی۔ یہ تخمینے تیار کرتے ہوئے یا ان کے مطابق عمل کرتے ہوئے صرف اعداد و شمار کو ہی اہمیت دینا زیادہ دانشمندی نہیں ہوگی۔ زیادہ اہمیت افرادی قوت کے معیار کو دینے کی ضرورت ہے۔ لہذا تربیتی سہولیات جن میں نظریاتی اور عملی سہولیات شامل ہیں، تربیت کے معیار، جانچ پرکھ یا امتحان کے طریقوں اور معیار ایسے امور ہیں جو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

روزگار کے لیے مستقبل میں صلاحیت اور امکانات الکٹرانکس ٹکنالوجی پر مبنی خدمتوں کے سیکٹر میں ہیں۔ لہذا ایک آج اور روزگار و خوشحالی پیدا کرنے کی صلاحیت سے پوری توجہ کا مستحق ہے۔ اس بات کے قطع نظر معیشت کی طویل المعیاد ترقی کا انحصار تیار کردہ مال کی گھریلو پیداوار کی مالیت پر ہے جس سے نہ صرف ملکی ضروریات پوری کی جا سکے۔ غیر ملکی زر مبادلہ کی ضرورت نہ صرف ملک میں تیار ہونے والے الکٹرانکس کے سامان کے لیے درکار خام مال اور حصوں پرزوں کی درآمد کے لیے بلکہ بالآخر ہندوستان کے لیے غیر ملکی زر مبادلہ کمانے کے لیے بھی ہے۔

کسی ملک کا سب سے بڑا وسیلہ اس کے لوگ ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ۔ ہنرمند لوگ، اختراعی صلاحیت کے لوگ اور زندگی کے ہر شعبے میں نئے کاروبار شروع کرنے والے لوگ۔ ترقی کے عمل میں اختراع کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے پاس یہ وسیلے کافی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اس لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے ایک سرکردہ ترقی پذیر ملک کے طور پر ہوتا ہے لیکن جب ODH IAM BO کے تصورات کی روشنی میں دیکھا جائے کہ ٹکنالوجی کے زور والے

استعمال سے تیار کئے جانے والے سامان کی برآمد میں ہندوستان سمت ترقی پذیر ملکوں کا حصہ ۲۸ ء ۲ سے ۳ ء ۲ فیصد ہے۔ گو ہماری حالت زیادہ خوش فہمی کی نہیں ہے۔ غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے سائنسی و ٹکنالوجی انسانی وسیلوں کو مناسب طور پر سکھایا یا پڑھایا جاتا ہے اور اُن کی ٹھیک رہنمائی کی جاتی ہے اور کیا اُن کا ٹھیک طور سے استعمال ہوتا ہے اتنی ہی اہمیت اس سوال کی بھی ہے کہ کیا ہماری سائنسی و ٹکنالوجی کی کارگاہوں اور کارخانوں میں اختراعات پر مناسب زور دیا جاتا ہے ؟

الکٹرانکس میں پیداوار اور پیداواری ٹکنالوجی میں تجدید یا ایک نئے پن کی ضرورت ہے اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انسانی سرمائے کی تجدید کی بھی ضرورت ہے۔ ترقی کے ملکہ بقار کے لیے بھی ہمیں پیداواری عمل میں خود کاری کی ضرورت ہے اور انسانی وسیلوں کو اُن کاموں پر لگانے کی ضرورت ہے جو مشین نہیں کرسکتی۔ ہماری قومی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے انسانی سرمایہ کے درجے کی بلندی کی وکالت کرتے ہوئے ہم ہارورڈ کے ایک مشہور مفکر کی اقوام متحدہ کو دی گئی تنبیہہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ " امریکہ بلکہ ہر صنعتی ملک کی خوشحالی کا انحصار اُس کے شہریوں کی قابلیت پر ہے۔ مستقبل کی مشینوں کا انحصار مشینوں کی موجودگی پر نہیں ہے جو ہر کہیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ بلکہ انسانی وسیلے یا قابلیت پر جو ٹکنالوجیکل لحاظ سے اپنی فوقیت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔"

لہٰذا الکٹرانکس یقینی طور پر مستقبل کی ایک ایسی صنعت ہے جسے بالادستی حاصل رہے گی۔

غزلیں

محمود عشقی
ناندیڑ 431601 (مہاراشٹرا)

ہر اک افواہ کی گردن اڑا دو
سبھی مخدوش دیواریں گرا دو

نگاہِ شوق سے جلتے ہیں تلوے
گھنی زلفوں کی چھاؤں کو بڑھا دو

مسرت کی عمارت بن رہی ہے
غم و آلام کا ملبہ ہٹا دو

مہاجر کی طرح پھرتی ہے خوشبو
اسے آنچل کے گوشے میں بسا دو

تلاطم بدنہ قابو پا سکو تو !
سفینے لا کے ساحل سے لگا دو

رہیں گے راز میں اسرارِ شب کے
چراغوں کی زبانوں کو جلا دو

شرابی جب سے تائب ہوگیا ہے
گرفتارِ مصائب ہوگیا ہے

نہ مل پایا اُسے جب کوئی منصب
کسی قاضی کا نائب ہوگیا ہے

تلاشِ گمشدہ میں جانے والا
کہیں شہروں میں غائب ہوگیا ہے

کس و ناکس کا ہے تانتا گھر پر
یہ اب دارالعجائب بن گیا ہے

لبِ شیریں کا سارا شہد عشقی
اچانک کیسے غائب ہوگیا ہے

ماہنامہ حیدرآباد
شاداب
جلد (۸) شمارہ (۹)
ستمبر ۱۹۹۱ء حیدرآباد
فون: 229161

ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری
جائنٹ ایڈیٹر: رشید الدین
مینجنگ ایڈیٹر: علیم الدین احسن

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	65	روپے	۲ سال	120	روپے	تاحیات	1500	روپے
خلیجی ممالک	〃	200	〃	〃	360	〃	〃	3700	〃
امریکہ	〃	40	ڈالر	〃	70	ڈالر	〃	700	ڈالر
انگلستان	〃	25	پونڈ	〃	45	پونڈ	〃	400	پونڈ
پاکستان	〃	175	پاکستانی روپے	〃	300	پاکستانی روپے	〃	3000	پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد

▲ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے پبلک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

ڈاکٹر زبیر احمد صدیقی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظامِ تربیت

اگر ہم پوری تاریخِ اقوام کا گہری نظر سے جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مصلحین، فلسفی اور مفکرین جب اپنی قوم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں یا ان میں انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے اقوال سے، اشعار سے، تقریر و تحریر سے ان کے فکر و نظر کو مہمیز لگاتے ہیں جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے خود ان کا اپنا دامن ان سے خالی ہوتا ہے لیکن اسلام وہ دینِ حق ہے جہاں تطہیرِ فکر اور تعمیرِ فکر کے ساتھ عملیت پر بھی پورا پورا زور دیا گیا ہے جہاں فکر و نظر، ایمان و ایقان اور عقائدِ حقہ سے جلا بخشا جاتا ہے وہاں عملِ صالح پر بھی پوری طرح توجہ کو مرکوز کیا گیا ہے اسی لیے قرآن حکیم میں بکثرت "اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا حسین امتزاج آپ کو نظر آئے گا۔

ادیانِ عالم کا مطالعہ کرنے والے حضرات سے یہ مخفی نہیں کہ یہ فخر صرف اور صرف رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ صلاح کی وہ اعلیٰ اور درخشندہ روایات قائم کیں کہ قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کے لیے اسوہ حسنہ اور نمونہ عمل قرار پائیں بلکہ حضورؐ نے اپنے فیضانِ تربیت سے صحابہ کرام کی وہ عظیم جماعت تیار کی جس کی مثال پوری دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر سراجِ منیر (آفتابِ ہدایت) ہیں تو آپ کے صحابہ کرام "اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" کے

مصداق آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں جن کی روشنی سے آنے والی نسلوں نے نورِ ہدایت حاصل کی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تربیت کا ایک ہمت گا نہ طریق امتِ مسلمہ کو سکھایا۔

ابن کثیر یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفسار کیا گیا۔

یا ام المومنین انبئتی عن قیام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ قالت الست تقرا ھذہ السورۃ (یا ایھا المزمل)

(ام المومنین ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں آگاہ فرمائیے تو آپ نے فرمایا "کیا تو وہ سورۃ مزمل نہیں پڑھتا ؟"

ام المومنین نے اس کی مزید وضاحت فرمائی"

فان اللہ افترض قیام الیل فی اول السورۃ فقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ حتی انتفخت اقدامھم وامسک اللہ خاتمتھا فی السماء اثنی عشر شھرا ثم انزل اللہ التخفیف فی اخر ھذہ السورۃ فصار قیام الیل تطوعا من بعد فریضۃ"

(اللہ تعالیٰ نے رات کے قیام کو اس سورت کے آغاز میں فرض ٹھہرایا چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام ایک برس تک اس پر عامل رہے حتی کہ ان کے قدموں پر ورم آگیا اور بارہ ماہ بعد اس مبارک و مسلسل عمل کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے آخر میں تخفیف کا حکم نازل فرمایا نتیجۃً راتوں کا قیام فرض رہنے کے بعد نفل قرار پایا۔

سورۂ مزمل کی روشنی میں تربیت کے ہشت گانہ طریق کار کا اجمال ذکر کیا جاتا ہے

۱۔ قیام لیل (قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ

۲۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت ترتیل کے ساتھ (ورتل القرآن ترتیلا)

۳۔ دن کو بھرپور، سرگرم اور فعال زندگی گزارنا (اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا

ذکر اللہ (اللہ تعالیٰ کے کسی اسم گرامی کا ورد) (وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ،

تَبَتُّل (ماسوا سے منقطع ہو کر عبادت میں مشغول ہونا ، یعنی معبود حقیقی سے کامل وابستگی) وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا)

توکل (رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ،

صبر و استقامت (وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ)

ہجر جمیل (وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا)

اب قدرے تفصیل کے ساتھ اس ہشت پہلو طریقِ تربیت کا ذکر کیا جاتا ہے

رات کا وقت جہاں سہانا ہوتا ہے ، ہلکا ہلکا اندھیرا اور ستاروں کی روشنی میں ح انسان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہے ، عرب کے صحرا میں جہاں پوری نات ایک کھلی کتاب نظر آتی ہے ۔ آسمان پر نظر ڈالنے سے خالق کائنات کی تیں ذہن و قلب میں جاگزیں ہوتی جاتی ہیں قرآن حکیم نے سورہ مزمل میں کتنے ہشیں انداز سے یہ بیان کیا ۔

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا ۔

(بے شک رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے تیر بہدف ہے اور قرآن لیم کی تلاوت کے لیے زیادہ موزوں ہے)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغۃ میں اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے ۔

" آخری شب کا وقت وہ پر سکون وقت ہے کہ اس وقت انسان کا دل پریشان ن ، تشویش انگیز اشتغال سے پاک و صاف ہوتا ہے ۔ اس وقت اس کو سکون اور دلجمعی میسر ہوتی ہے ۔ آواز شور و شغب سے خالی ہوتی ہے اور لوگوں کے سونے کا قت ہوتا ہے ۔ ریا ، یعنی نمائش وغیرہ سے پاک ہوتا ہے اور اطاعات و عبادات [illegible] توجہ قلب کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس وقت

بہترین طریقے سے حاصل ہوتی ہے۔"

شاہ صاحب اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" نیز یہ وقت رحمتِ الٰہی کے نزول کا وقت ہے اور رب العالمین اس وقت اپنے بندوں کے قریب تر ہو جاتا ہے ... نیز قوت بہیمیہ کو کمزور کرنے میں شب بیداری عجیب و غریب تاثیر رکھتی ہے۔ شب بیداری انسان کے حق میں تریاق کا حکم رکھتی ہے۔"

قیام لیل تربیت کی وہ بنیاد و اساس ہے جس پر تربیت کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اس کی ترغیب و تلقین کی گئی ہے ارشادِ باری ہے۔

" وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا　(سورۃ دہر ۲۶)

ترجمہ: رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور لمبی رات تک اس کی تسبیح و تقدیس کرتے رہو۔ ایک اور جگہ (سورہ الذریت ۱۷-۱۸) متقی لوگوں کی صفات میں قیام لیل کا بھی ذکر کیا گیا ہے

" كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

ترجمہ: متقی لوگ رات کو کم ہی سوتے تھے پھر وہی رات کے آخری حصے میں اللہ کے حضور مغفرت و بخشش کی التجا کرتے تھے۔

قیام لیل کے حوالے سے سید قطب نے "فی ظلال القرآن" میں مجمع کمالات حضور کی عظیم شخصیت کے اس کمال کے بارے میں بڑی پیاری بات کہی ہے۔

"وقیل لرسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔" قم "۔ فقام وظل قائما لبعدھا اکثر من عشرین عاما! لم یسترح ولم یسکن ولم یعش لنفسہ ولا لاھلہ قام وظل قائما علی دعوۃ اللہ۔"

ئدعرصے تک قیام فرمایا۔ آپ نے کماحقہ استراحت اور سکون حاصل نہ فرمایا۔ آپ نے
پنے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے عیش و راحت کی زندگی اختیار نہ کی۔ آپ نے
ام فرمایا اور پھر تسلسل کے ساتھ اللہ کی دعوت پر قائم رہے۔)

قیام لیل چونکہ تربیت کے لیے بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے
س کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔

۲۔ اب رات کو قرآن حکیم کی تلاوت کی حکمت اور نفس انسان پر اس کے اثرات کا
ائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم وہ صحیفۂ فطرت اور کتابِ ہدایت ہے جس میں
وری انسانی زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں رہنما و زریں اصول بیان کیے گئے ہیں
چنانچہ رات کے سہانے سماں میں قرآن حکیم کی ترتیل کے ساتھ تلاوت، ایک ایک آیت
پر ٹھہرنا۔ اس کے معانی و مطلب پر غور وفکر کرنا ایک طرف روح و قلب میں بشاشت
پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف ذہن وفکر کو جلا بخشتا ہے۔ حدیث میں (بخاری،
مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی میں متعدد روایات سے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ ایک
ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہر جاتے تھے۔ ایسے مثالوں سے
بھی واضح کیا گیا ہے تاکہ قلب پر صفاتِ باری کے ذکر پر عظمت و ہیبت، نعمت و
رحمت کے ذکر پر تشکر و امتنان کے جذبات سے معمور اور غضب و عذاب کے ذکر
پر خوف و رقت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

قیام لیل اور نظام حیات سے آگہی کے بعد انسان کے اندر ایک پرعزم زندگی گزارنے
کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی
بلکہ ایک بھرپور فعال اور سرگرم زندگی گزارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ہادیانِ عالم کی
زندگیوں پر نظر ڈالیں۔ آپ کو سرکار دو عالم کی حیاتِ طیبہ سے بڑھ کر کوئی اور اس طرح
کی بھرپور زندگی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ مدبر و مفکر، مقنن، سربراہ مملکت

میدان ہے جس کا شہسوار آپ نہیں؟

۴۔ اپنے معبود حقیقی کے ساتھ کامل وابستگی کے حصول کے لیے اللہ کا ذکر از بس ضروری ہے۔ کاروبار دنیوی میں مگن ہونے کے باوجود، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روح کو شادابی اور سیرابی حاصل ہوتی ہے حیرت کی بات ہے کہ یہود کی موجودہ شریعت میں (تورات میں) اللہ کے نام لینے کو بے ادبی شمار کیا گیا ہے جب کہ مسلمانوں میں آپ اللہ کے نام کے حوالے سے حسبنا اللہ، الحمداللہ، ان شاء اللہ سبحان اللہ، جزاک اللہ، یرحمک اللہ، یھدیکم اللہ کے الفاظ کانوں میں رس گھولتے اور روح کو طراوت و حلاوت بخشتے نظر آتے ہیں اور باقاعدہ اوقات میں اللہ کا ذکر تو روح کو صیقل کرتا ہے اور اللہ کی رحمت پیہم برسنا شروع ہو جاتی ہے۔

۵۔ اللہ سے لَو لگانے کے ساتھ اگر دوسرے خیالات کی ذہن و قلب میں بھرمار ہو تو مطلوبہ یکسوئی کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اس لیے تبتل کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ انسان ماسوا سے منقطع ہو کر کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے معبودِ حقیقی کے حضور میں اپنے عجز و نیاز کے گلہائے عقیدت پیش کرے۔ حضورؐ کی مشہور حدیث "حدیث جبریل" میں "احسان" سے اسی مفہوم کو واضح کیا گیا ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ تو مشاہدہ حق سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ وگرنہ کم از کم یہ بات ضرور ہو کہ وہ عظیم خداوند تجھے دیکھ رہا ہے۔

۶۔ توکل کے معنی ہیں اپنے امور کو وکیل کے سپرد کر کے مطمئن ہو جانا۔ جب کاروبارِ حیات میں بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ حق پر عمل کرنے میں مشکلات کا ایک طوفان امڈتا نظر آتا ہے جب باطل میں مفادات دنیوی کی ترغیب و تحریص ملتی ہے تو انسان بے چارہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنے رب اپنے وکیل و چارہ ساز کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اس کے حضور التجا کرتا ہے تو "اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (میرا بندہ جب مجھ سے مانگتا ہے تو اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔)

ہیں قبولِ دعا پر یقین حاصل ہوتا ہے اور "فانی قریب" کا روح پرور پیغام اسے بلاؤں کے طوفان میں سکون و طمانیت کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ کارگہ حیات میں توکل انسان کے عزم کو مستحکم کرتا اور اس کے ارادوں کو غیر متزلزل بناتا اور اس کے قلب میں شمع ایمان کو فروزاں کرتا ہے۔

۷۔ جادۂ مستقیم پر چلنا، راہ حق کو اپنانا گویا لعنتوں اور مصائب کو دعوت دینا ہے جو شخص بھی ولولہ و عزم سے کام لیتے ہوئے راہ حق پر گامزن ہوتا ہے تو قدم قدم پر رکاوٹیں اس کا راستہ روکتی ہیں۔ کئی مواقع تو ایسے آتے ہیں کہ اب انسان یاس و قنوطیت کی وادی میں گرا ہی گرا۔ یہ صبر ہی کی وہ نعمت اور دولت ہے جس سے انسان ان رکاوٹوں کو خندہ پیشانی سے صرف برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ دین حق کے فروغ کے لیے اپنے پُرعزم سفر کو جاری رکھتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ زندگی کا طویل سفر جو حق کے لیے اختیار کیا جائے۔ صبر کے بغیر گزرنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں صبر کی اہمیت کو بار بار اجاگر کیا گیا ہے اور اسے اللہ کی محبوبیت اور اس کی معیت کے حصول کے ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ ایک عابد و زاہد صوفی پر جب شیطان کا مکر و فریب اور جادو نہ چل سکا تو جاتے جاتے اسے کہنے لگا کہ ٹھیک ہے مجھ پر لعنت بھیجتے رہو۔ اس بزرگ نے جواباً فرمایا ظالم جاتے جاتے بھی وار کرنے سے باز نہیں آتا۔ میں جو وقت تم پر لعنت بھیجنے میں صرف کروں گا وہی وقت مفید مصرف میں یعنی اللہ کے ذکر میں کیوں نہ گزاروں۔

ہجرِ جمیل کا مقصد و حید یہ ہے کہ انسان غم و غصے اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو فضول بحث میں ضائع کرنے کے بجائے اذا خاطبھم الجٰھلون قالوا سلٰما کے حوالے سے شریفانہ طور پر اس سے کنارہ کش ہو جائے۔ اس سے اس کا قیمتی وقت ضائع نہیں ہوگا۔

حدیث کی کتابوں میں (مثلاً کتاب مشکاۃ المصابیح کو دیکھیئے) آپ کو باب صلاۃ اللیل، باب مایقول اذا قام من اللیل اور باب التحریض علی قیام اللیل کو رحمت دوعالم، مربی و معلم، ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا طریق کار، آداب اس کی تحریض و ترغیب کے حوالے سے متعدد احادیث ملیں گی جن کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے جو تربیت کا خواہاں اور آرزومند ہے از بس ضروری ہے۔

ہم یہاں صرف ایک واقعہ کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

"ایک دفعہ میں رات کو اپنی خالہ میمونہؓ کے ہاں رہا۔ اس روز رسول اللہؐ بھی وہیں تھے۔ آپ نے تھوڑی دیر اپنی اہلیہ محترمہ سے گفتگو فرمائی اور پھر آرام فرمانے لگے جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ گیا یا اس سے کچھ کم تو آپ اٹھے اور آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیت پڑھی۔

"اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ..

آخر سورت تک پڑھی۔ پھر مشک کی طرف گئے۔ اس کا منہ کھولا اور پیالہ میں پانی بھرا پھر اچھی طرح وضو کیا پھر کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی ... یہ دیکھ کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وضو کیا اور آپؐ کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے میرا کان پکڑا اور مجھے بائیں جانب کھڑا کر دیا پھر حضورؐ نے تیرہ رکعتیں پوری فرمائیں پھر آپ لیٹ گئے۔

حضرت ابن عباسؓ ہی سے ایک روایت ہے کہ:

" وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک رات کو سوئے۔ پس آپؐ رات کو بیدار ہوئے۔ مسواک کی اور وضو کیا اور پھر یہ آیت پڑھی۔

(اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ.... آخری سورت تک) پھر آپؐ کھڑے ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی جس میں قیام، رکوع اور سجدہ کو بہت دراز کیا پھر آپؐ لیٹ گئے اور

سو گئے اور آپؐ کے سونے کی آواز آنے لگی... تین بار آپؐ نے اسی طرح کیا۔

حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے (یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ابھی کمسن تھے) کہ حضورؐ کے قیام لیل اور آپؐ کے فیضانِ صحبت کے کتنے دُور رَس اثرات ان کی زندگی اور ان کی تعمیر شخصیت پر واقع ہوئے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جسے بھی رسول عربیؐ کا فیضانِ صحبت حاصل ہوا اُس کی دینی و روحانی زندگی ہی نہیں پوری انسانی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ لیکن ایک بات جس کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ آپ کسی بھی صحابی کی مبارک زندگی پر نظر ڈالیں آپ کو یہ آٹھ اصول۔ قیام الیل تلاوتِ قرآنِ حکیم، بھرپور زندگی، ذکر اللہ، تبتل، توکل، صبر اور ہجرِ جمیل کسی نہ کسی حد تک ان کے اوصافِ جمیلہ میں جھلکتے نظر آئیں گے۔

المختصر اس کارگہ حیات میں دعوت ارشاد کا فریضہ کسی بھی شخص کو خواہ حکومتی سطح پر ادا کرنا ہو یا قومی اور ملی سطح پر ادا کرنا ہو یا علمی و تعلیمی سطح پر ادا کرنا ہو۔ اس کے لیے تربیت کا حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جو مسلمانوں کو عظمتِ رفتہ کے حصول میں اور تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

(سلسلہ صـ ۴۹ سے آگے)

یہ شعریت سے عاری لہجہ یا یہ کھردراپن غزل کے شایانِ شان نہ سمجھی مگر ممدوح کی زندگی سے اس کا گہرا ربط رہا ہے اور سچا شاعر تو وہی ہے جو شعر میں بھی زندگی کی کڑی سچائیوں کے اظہار کا سلیقہ رکھتا ہو۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

دوسری قسط

امتِ اسلامیہ کا مستقبل

ان دو غیر معمولی مثالوں کی روشنی میں مصر کو اسلامی تاریخ میں اپنے کارناموں اور خدمات پر فخر کا حق حاصل ہے۔ اس کو اللہ کی تائید و نصرت اور مقدس و نازک فریضہ کے لئے انتخاب پر بارگاہِ الٰہی میں شکر گذار ہونا چاہئیے، اسلام اور مقدساتِ اسلامیہ کے تحفظ میں مصر کی شاندار اور قابلِ فخر تاریخ کا تقاضا ہے کہ اس دور میں بھی اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے سامنے آئے قائدانہ کردار ادا کرے اور اپنے ترکش کے تیروں۔ مثبت اور تعمیری تیروں کو سامنے لائے، مصر کو قدیم زمانہ سے "کنانۃ الاسلام" اسلام کا ترکش کہا گیا ہے اور اسلام کے ترکش کے تیر نہ کبھی ختم ہوتے ہیں نہ نشانہ خطا کرتے ہیں، آج کے نازک دور میں "کنانۃ الاسلام" سے جو تیر مطلوب ہے اور اس ملک سے جس کردار و عمل کا انتظار ہے، وہ ہے نئے حقائق کا شعور و ادراک اور ان کا اعتراف و اظہار، کویت پر عراق کے ظالمانہ حملہ، صدام حسین کے غیر عاقلانہ اور مغرورانہ طرزِ عمل اور عرب اور دیگر مسلمان اقوام کے ردِ عمل کے نتیجہ میں بہت سے نئے حقائق سامنے آئے ہیں، امتِ اسلامیہ اسلامی تنظیموں اور مسلم صحافت کے ذہن اور طرزِ فکر میں بہت سی خامیوں اور دراڑوں سے پردہ ہٹ گیا ہے۔

یہاں میں عام مسلمانوں کے طرزِ فکر، ملک کی صحافت و ذرائع ابلاغ یا زیادہ وسیع اور واضح الفاظ میں ان کی زندگی میں موجود خامیوں اور ان کے علاج، امت کی صفوں میں پڑنے والی دراڑ اور اس کے ذکر کرتے اور قرآن و حدیث اور تاریخ الفاظ کا بھاری ... و آمت [redacted]

کے مستقبل پر مرتب ہونے والے خراب و خطرناک نتائج و عواقب سے محفوظ رکھنے کے اصولوں کی طرف امت کا ذہن بنانے والوں، تعلیم و تربیت کے ذمہ داروں، صحافیوں، دعوتِ اسلامی اور "صحوۃ اسلامیہ" کی خدمات انجام دینے والوں کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ عام مسلمانوں، خاص طور پر نوجوانوں کی ایک اہم کمزوری جو اس جنگ کے دوران بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے وہ ہے پُرجوش نعروں، بلند بانگ دعووں اور سحر انگیز وعدوں سے فریب کھانے کا مزاج یا مستقل صلاحیت۔ اس سلسلہ میں عام مسلمان نہ تو نعرہ لگانے والوں کے افکار و عقائد دیکھتے ہیں نہ ان کے ماضی کا [illegible] کی تحریکات اور ان کے فکر و فلسفہ اور مقاصد و اعمال کو دیکھتے ہیں جن سے یہ نعرہ لگانے والے پوری طرح مربوط و ہم آہنگ ہوتے ہیں اور خاص طور سے اگر یہ نعرے اور ڈینگیں کسی بڑی طاقت کو چیلنج کرتی ہوں اور ڈینگیں مارنے والے جرأت و حوصلہ مندی کا مظاہرہ کریں تو عام مسلمان اور خاص طور سے نوجوان شدید تاثر، جذباتی اُبال اور ایک طرح کے دماغی دورہ کا شکار ہو جاتے ہیں جس کو کسی طرح قابو میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایسی صورت میں نہ دینی احکام و مصالح کا پاس و لحاظ ہوتا ہے نہ علمی تنقید و تحلیل اور نہ حالات و حقائق کا دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ ہی کچھ مفید ثابت ہوتا ہے، بلکہ کھولتی ہوئی ہانڈی کی طرح جذبات میں اُبال آجاتا ہے جو اکثر دینی معتقدات اور شعائرِ اسلام سے اعراض بلکہ ان کی اہانت تک پہنچا دیتا ہے اور دین کے نمائندہ علماء اور اصحابِ اختصاص تو سب سے پہلے زد میں آتے ہیں اس طرح کے جذبات کی رو میں بے سوچے سمجھے بہہ جانے والوں کی بلیغ ترین صفت سیدنا علی بن ابی طالبؓ نے ایک جملہ میں بیان فرمائی ہے جن کو اس صورتِ حال کا بار بار سامنا کرنا پڑا تھا اور جنھیں دوسرے ائمۂ اسلام کے مقابلہ میں اس طرح کے حالات سے زیادہ سابقہ پڑا تھا اور جنھیں دوسرے آپ نے اہلِ عراق کے بارے میں فرمایا تھا۔

"أتباع كل ناعق" (ہر زور سے بولنے والے کے پیچھے بھاگنے والے ہیں)

لہٰذا اُمت کے مختلف طبقوں میں یہاں تک کہ دیندار اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی ضرورت

اس بات کی ہے کہ صحیح دینی، سماجی اور سیاسی شعور پیدا کیا جائے، نیک و بد کو سمجھنے کی صلاحیت کو تقویت پہنچائی جائے، نئے مسائل پر غور کرنے، ان کی گہرائیوں تک اترنے اور ان کے نتائج و عواقب کا صحیح اندازہ لگانے کی قوت میں جلا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کو صفائی اور صراحت کے ساتھ بتلایا جائے کہ قائدین کار کا اصل اور صحیح ماخذ کون سے ہیں اور قوت و نشاط کے حقیقی سرچشمے کہاں ہیں۔

مسلم عوام کو اس بات کی طرف دعوت دینے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو سمجھیں زمانہ کے مشکلات و مسائل اس میں جاری و ساری رجحانات، تحریکوں، اسلام کے بارے میں ان کے رویہ، زندگی پر مرتب ہونے والے ان کے اثرات، دین کے مستقبل کے لئے ان سے لاحق خطرات اور نئی مسلم نسل کے ذہن پر پڑنے والے سایوں کو ذہن میں رکھ سکیں۔ ان قیادتوں کے مطمح نظر اور ان کے اغراض و مقاصد سے ناواقف نہ رہیں، جو ملکوں پر اور سماج پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں جو سماج کو اپنے عقائد، اپنے افکار و نظریات اور اپنے آدرشوں کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں جو زندگی کو نئی راہ اور نیا رخ دینا چاہتے ہیں، ان ملی قوتوں، رجحانات، افکار اور قیادتوں کو نظر انداز کرنا اور دینی جماعتوں کا اپنے خول میں بند رہنا خود ان تحریکوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے، ان تحریکوں کی دینی دعوت ان کی سرگرمیاں اگر فرائض و واجبات، طہارت و عفت کی زندگی اور نوافل کے اہتمام تک محدود رہیں تو خطرہ اس بات کا ہے کہ کچھ مدت گذرنے کے بعد دین پر عمل اور شرعی احکام کے نفاذ کی آزادی سلب کر لی جائے اور حالات ان کے لیے اس قدر دشوار ہو جائیں جس کی تصویرکشی قرآن نے اپنے بلیغ اور معجزانہ اسلوب میں کی ہے کہ:۔

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ۔

(سورۃ التوبہ - ۱۱۸)

ترجمہ: زمین ان پر باوجود اپنی فراخی کے تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے۔

جذباتی نعروں، دعووں، وعدوں اور کھوکھلی شجاعت کے مظاہروں سے فریب، کھانے کے

لیے ہمہ وقت تیار رہنا زبردست خطرہ ہے (خاص طور پر اس اُمت کے لیے اپنے عقیدہ پر اور اپنے پیغام پر قائم رہنے کے لیے اور نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ کی انجام دہی کے لیے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آسمانی شریعت اور اس آخری دین پر قائم رہنے کے لیے) اس طرح مسلمانوں کا یہ رویّہ قرنِ اوّل سے لے کر اس وقت تک کے ان کے مصلحین ، مجددین، مجاہدین اور دعوتِ اسلامی کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے والے شہداء کی تمام کوششوں پر پانی پھیر سکتا ہے، اس سے خطرہ اس بات کا پیدا ہو گیا ہے کہ اُمت میں اور قدیم ترین اسلامی ممالک میں بھی مغربی عیسائیوں کا یہ تصور کارفرما نظر آنے لگے کہ : "دین ایک ذاتی معاملہ ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان محدود ہے، قانون سازی، سیاست اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں اس کا عمل دخل نہیں۔"

عام مسلمان اور خاص طور سے نوجوان جوان بے حقیقت پُرجوش نعروں اور کسی بڑی طاقت کو للکارنے کے جھوٹے مظاہرے سے اس حد تک متاثر ہو گئے کہ عقل و ہوش کھو بیٹھے، اس کے کچھ نفسیاتی اسباب بھی ہیں اگرچہ وہ اس کا جواز فراہم نہیں کرتے کہ ہم جوشیلے نعرے لگانے والے کو تقدیس کی حد تک پہنچا دیں پھر بھی انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کا احساس کیا جائے اور ان کا سدِباب کیا جائے۔

اس اُمت میں عرصہ سے ایسی طاقتور اور جرأتمند قیادت کا فقدان ہے جس کے اندر جہاد کی روح کارفرما ہو، جسے اپنے عقیدہ پر فخر ہو، دنیا کی رہنمائی کے منصب اور اس کی ذمہ داریوں کا شعور ہو اور بڑی حد تک مغربی یا مشرقی بڑی طاقتوں کے سہارے سے بے نیاز ہو، یہ بڑی طاقتیں ہی اسلامی کوششوں اور وسیع تر حلقہ اثر رکھنے والی اسلامی تحریکوں کو ناکام بنانے اور اسلامی ممالک کو ایسی عظیم، مؤثر اور قومی شخصیتوں سے جن پر دینی فکر غالب ہو، جو اپنے ملک میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ چاہتی ہوں، جو اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی قوت و شوکت کے عزائم رکھتی ہوں، محروم کرنے کی ہر طرح کی سازشیں کرتی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ پورا عالم اسلام ماضی قریب میں بہترین رہنماؤں سے محروم ہوتا رہا۔

پھر یہ بھی لحاظ رہے کہ قوت و شوکت اور کبھی کبھی خطر پسندی سے متاثر و مرعوب ہونا فطری بات ہے جن صفات سے انسان خود محروم ہوتا ہے اُن سے متاثر ہوتا ہے اور اسلام کی تاریخ شجاعت و شہامت اور بڑے سے بڑے خطرہ کو خاطر میں نہ لانے کے واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن اس دور کے باضمیر اور غیرتمند مسلمان کمزور حکومتوں اور آرام طلب قیادتوں سے تنگ آ گئے ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر مسلمان اور خاص طور سے نوجوان بڑی طاقتوں کی سرگرمیوں اور ان کی سازشوں سے واقف ہیں، اور اُن سے نفرت کرتے ہیں۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی قیادت کو سامنے لانے پر توجہ دی جائے جو طاقتور ہو، جرأتمند ہو، صاحب ایمان اور دور اندیش ہو، اللہ تعالیٰ نے ملک کو جو طاقت و ثروت عطا فرمائی ہے، ان پر اعتماد رکھے، ان میں اضافہ کی کوشش کرے۔ ٹکنالوجی، صنعتوں اور فوجی قوت پر توجہ دے، ممکن حد تک غیروں سے بے نیاز ہو، ایمانی قوت، قوم و ملت کے اخلاص اور ایمان و عقیدہ کے دفاع کے لئے قربانی کے جذبہ پر اعتماد کرتے ہوئے اسلامی مصالح اور صحیح و مخلص قیادت کے خلاف کسی بھی سازش کے مقابلہ میں یا اسلامی مسائل و ممالک میں کسی بھی دخل اندازی کے سامنے جم کر کھڑی ہو جائے۔

اسلامی ممالک میں مثبت، فعّال و متحرک اور طاقتور دینی تحریک کے قیام و استحکام پر توجہ دینا بھی ضروری ہے اور اگر کوئی ایسی تحریک موجود ہو تو اس سے خطرہ محسوس کرنے اور اس کو ختم یا کمزور کرنے کی کوشش کے بجائے اس کی قدر اور ہمت افزائی کرنی چاہیئے، اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تکمیل اور اس کے استحکام و بقا کے لئے ایک ایسی اسلامی دعوتی تحریک بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے جو مردانگی، جرأت و ہمت، بلند ہمتی اور پیش بینی کی صفات سے متصف ہو، جو ایسی طاقتوں اور قیادتوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت و صلاحیت رکھتی ہو، جنہوں نے بلا کسی استحقاق و جواز کے نوعِ انسانی کی زمام قیادت اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے اور جو اسلامی و غیر اسلامی ممالک و اقوام کی قسمتوں کی مالک بن بیٹھی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قوم مسلم۔ اپنی بیماریوں اور کمزوریوں کے باوجود، جن میں بعض کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا۔ مشرقی و مغربی تمام اقوام کے مقابلہ میں بعض صفات کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔۔ ؎

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر ۔ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

یہ صفات ہیں اللہ اور آخرت پر ایمان، زندگی کی بے ثباتی کا شعور، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے زندگی کی لذتوں اور آسائشوں کی قربانی سے شہادت کا شوق، جنت اور رضائے الٰہی کی امید، اللہ کے وعدہ کئے ہوئے اجر و ثواب کا یقین اور اس کے لئے جان و مال سب کچھ لٹا دینے کی تڑپ، بے مثال صلاحیتوں کی یہ چنگاریاں منتظر ہیں کسی طاقتور مخلص داعی کی جو ان کے اسلامی جوش کو ابھار دے شرارے یا ان کو متعلہ جوالہ بنا دے اور ابھی ماضی قریب تک بعض مخلص اللہ والوں نے یہ کارنمایاں کر دکھایا ہے سه (جیسے ہندوستان میں سید احمد شہید بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ) طرابلس میں سیدی احمد الشریف السنوسی (م ۱۳۵۱ھ) اور امیر عبدالقادر الجزائری (م ۱۳۰۱ھ) وغیرہ۔) قرآن کریم نے بھی مسلمانوں کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو انھیں دیگر مادی اقوام و ملل کے سورماؤں اور بہادروں سے جن کا رابطہ آسمانی پیغام اور ایمانی سرچشموں سے منقطع ہو گیا ہے کے مقابلے میں ممتاز کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ (النساء ۱۰۴)

ترجمہ: اور مخالف قوم کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو اگر تمہیں (جسمانی) دکھ پہونچتا ہے تو ان کو بھی پہونچتا ہے، اور تم اللہ سے (اجر و ثواب کی) وہ امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے

یہ ایسی دولت ہے جس کی کوئی مثال نہیں، ایسی طاقت ہے جس کا کوئی جواب نہیں اور مسلمان ملکوں اور قوموں پر زیادتی ہوگی، بلکہ ان ملکوں اور قوموں میں قائم حکومتوں اور قیادتوں کے حق میں بھی یہ زیادتی ہوگی کہ وہ اس سے گھبرائیں اور اپنی قیادت و حکومت کے لئے ان سے خطرہ محسوس

کریں۔ ان کو اپنا حریف سمجھیں اور بات یہاں تک پہنچ جائے کہ ان کو ختم کرنے اور ان کے اثر و نفوذ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ساری طاقتیں اور سارے وسائل۔ جن میں صحافت دیگر ذرائع ابلاغ اور نظامِ تعلیم و تربیت وغیرہ بھی شامل ہیں، وقف کر دی جائیں؟ یہ ایک بے محل جد و جہد ہے اور قوم و ملک کے ان عزیز ترین فرزندوں کے خلاف جنگ کی ایک شکل ہے جو نازک گھڑی میں ان کے کام آ سکیں۔

ان مسلمان اقوام کا ایک نمایاں اور معروف وصف اللہ اور اللہ کے دین کے ساتھ اخلاص بھی ہے شرط یہ ہے کہ اس کے اظہار کا صحیح موقعہ و محل فراہم ہو کوئی اللہ کے نام پر اور اسلام کے نام پر آواز لگاتا ہے تو مسلمان اس کی طرف ایسے جوش اور جذبہ کے ساتھ لپکتے ہیں جس کی اس زمانہ میں نظیر نہیں ملتی۔ مسلمان حکومتوں اور قیادتوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ حقائق کو نظر انداز کرتی ہیں اور اس قیمتی سرمایہ اور زبردست طاقت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کو دبانے اور ہٹانے کے لئے ساری طاقت، ذہانت اور وسائل صرف کرتی ہیں۔

اسلام ہی عرب قومیت کی اساس و بنیاد ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عالم عربی کی روح ہیں، اس کے امام اور قائد ہیں اور ایمان کی طاقت ہی عربوں کی اصل طاقت ہے، عربوں نے جب اس طاقت سے فائدہ اٹھایا تو پوری دنیا پر چھا گئے۔ آج بھی اس کے اندر وہی قوت و صلاحیت موجود ہے اور عرب اقوام آج بھی اس کی مدد سے اپنے دشمنوں کو شکست دے سکتی ہیں اور اپنا تحفظ کر سکتی ہیں، اسلام اور ایمانی قوت کے بغیر عربوں کا نہ کوئی امتیاز ہے نہ وقار و اعتبار، نہ کوئی تشخص اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا　　　محمد عربی سے ہے عالم عربی

محمد عربی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہی عربوں کو دنیا کے سامنے ایک حقیقت اور ایک ممتاز و مشخص قوم کی حیثیت سے پیش کیا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور قومیت و وطنیت کے مقابلہ میں اس حقیقت کو تسلیم کرنا۔ اس کو اپنانا اور اس کا پُرجوش داعی بننا چاہئے۔ عالم عربی کو پورے عالم اسلامی سے مربوط کرنے کا یہی سب سے مضبوط و مستحکم ذریعہ

[redacted]

ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے پوری دنیا کا مسلمان عالم عرب سے نسبت و ہمدردی رکھتا ہے اس کی مدافعت اور اس کے لیئے قربانیوں کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتا ہے یہ سب سے بڑی حقیقت ہے جو عالم عربی کو مغربی اور غیر اسلامی قوموں کی نظر میں بھی ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

ممکن حد تک ناز و نعمت اور عیش و عشرت کی زندگی سے دور رہنا چاہیئے، ترقی و تمدن کے مظاہر میں مبالغہ، بے ضرورت کے اخراجات، لذت و شہوت اور شان و شوکت کے اظہار کے لیے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کوئی پسندیدہ بات نہیں، ایسے اعمال و اخلاق سے پرہیز لازمی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند نہ ہوں اور تائید و نصرت الٰہی سے مانع بن سکتے ہوں۔

چھٹی صدی عیسوی کا رومی اور ایرانی تمدن جو زیب و زینت، دولت و ثروت اور پُر تکلف زندگی کی آخری حدوں تک پہنچ رہا تھا اس کے مقابلہ میں قدیم عرب مسلمانوں نے اپنے اسلامی اخلاق، سادگی، فضول خرچی سے اجتناب، محنت و مشقت کی زندگی اور شہسواری کی خصوصیات کو باقی رکھا تھا۔ آج بھی اس زندگی کو اپنانے کی ضرورت ہے اور اگر تمدن کو اختیار کرنا کسی حد تک ضروری ہو تو اسے ان تعلیمات کے سانچہ میں ڈھال دینا۔ ان اخلاق و آداب کے رنگ میں رنگ دینا اور ان مقاصد اور نشانوں کے تابع بنا دینا چاہیئے، جن سے اسلام کے ذریعہ اللہ نے اس امت کو نوازا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جو قوم بھی عیش و عشرت، آسائش حیات کی کثرت اور ناز و نعمت میں ڈوب گئی۔ اس میں جاہلیت کی عادتیں پھیل گئیں اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئیں وہ دوسروں کے ظالمانہ حملوں کا نشانہ بن گئیں۔

سُنَّتَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا

(الاحزاب ۳۸)

ترجمہ: یہی اللہ کا معمول رہا ہے ان لوگوں کے بارے میں جو ہو گزرے [illegible]

تجویز کیا ہوا ہوتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں اسلامی معاشرہ میں عام طور سے یہی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں جب تاتاریوں کا سیلاب عالم اسلام پر اُمنڈ پڑا، جس نے نسلی اور دینی قتل عام کی شکل اختیار کرلی۔ تاتاری حملہ سے پہلے بغداد کے مسلم معاشرہ کے حالات کا اندازہ لگانے کے لئے ہم یہاں صرف ایک بڑے مورخ کی شہادت پر اکتفاء کرتے ہیں، اس زمانہ میں دوسرے مسلم ممالک اور شہروں کے حالات اس سے زیادہ مختلف نہیں تھے، مفتی قطب الدین نہروالی اپنی کتاب "الإعلام بأعلام بیت اللہ الحرام" میں لکھتے ہیں۔

مرفّهون بلين المهاد، ساكنون على شطّ بغداد في ظل نخيل وماء معين وفاكهة وشراب واجتماع احباب واصحاب، ما كابدوا حربًا ولا دافعوا طعنا ولا ضربًا۔ (الإعلام ص ۱۸۰)

ترجمہ: عیش وعشرت کے مزے لوٹ رہے تھے، بغداد میں دجلہ کے ساحل پر آباد تھے جہاں گھنا سایہ تھا، بافراط میٹھا پانی تھا۔ میوے اور مشروبات کی کثرت تھی، دوست احباب کی مجلسیں تھیں، جنگ کی مصیبتوں سے سابقہ نہیں تھا نہ نیزے اور تلواریں اٹھانے کی نوبت آتی تھی۔

مسلمانوں کی طویل تاریخ کے اندر بہت سے مسلم معاشروں، مسلمان قوموں اور وسیع اور ترقی یافتہ حکومتوں میں عیش وعشرت اور فارغ البالی کی یہی کہانی دہرائی گئی اور اس کا نتیجہ وہی ہے جو بغداد میں ظاہر ہوا۔ شدت و وسعت میں اگر کچھ فرق رہا ہو تو ان معاشروں کے قد و قامت یا ان حکومتوں کی قوت وحیثیت اس کا سبب بنی ہے۔ (اس کی تفصیل کے لیے ہندوستان میں مغلوں کے عروج و زوال اور ایران و ترکستان میں خوارزم شاہی سلطنت کی تاریخ کا مطالعہ مفید ہوگا)

اس مرحلہ پر اس امر کی بھی ضرورت واضح ہوکر سامنے آگئی ہے کہ عرب اور اسلامی حکومتوں اور قوموں کی اپنی ایک موثر اور فعال تنظیم ہونی چاہیے جو اسلامی ممالک اور ان میں عرب

کی بین الاقوامی سیاسی اور دفاعی ضرورتوں کی دیکھ ریکھ اقوام متحدہ کی جگہ لے سکے۔
ادی اور عزت و وقار کے تحفظ میں ان کی ہمت افزائی کرے، اگر کوئی بڑا ملک کسی چھوٹے
ے پر حملہ آور ہو تو اس کی مدافعت کا فریضہ انجام دے۔ اس طرح کے معاملات میں
ام متحدہ یا کسی بڑی طاقت کی جگہ اس کی طرف رجوع کیا جاسکے اور اس سے مدد لی جاسکے
کسی تنظیم کو اتنا احترام و وقار اور اتنی طاقت حاصل ہونی چاہیئے کہ وہ کسی بھی اسلامی ملک
جارحیت کا مناسب جواب دے سکے اور انانیت پسند استبدادی قیادتیں اور دنیا کی
ی طاقتیں اسے نظر انداز نہ کر سکیں۔

اس طرح کی کسی تنظیم کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہونی چاہیئے کہ وہ حجاز مقدس اور حرمین
ریفین کی خاص طور پر اور پورے جزیرۃ العرب کے تحفظ و دفاع کی عام طور پر ذمہ داری
نھالے کیونکہ یہی اسلام کا اصل مرکز اور دعوتِ اسلامی کا اصل سرمایہ ہے مسلمان
ی ترمانہ میں بھی اور کسی جگہ بھی ہوں، ان کا عز و شرف حجازِ مقدس کی عزت و عظمت
ساتھ وابستہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ (المائدہ۔۹۷)
اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے نیز حرمت
الے مہینہ کو۔

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ نظام عالم در حقیقت بیت اللہ
لحرام کے ساتھ وابستہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ عقائد اور اعمال و اخلاق کا نظام اس
لوت سے وابستہ ہے جس کے لیئے اس گھر کی تعمیر ہوئی ہے مسلمان دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہوں
ن کے لیئے مرکز اسلام۔ جہاں اللہ کی آخری وحی نازل ہوئی اور جہاں نوعِ انسانی کے لیئے نئی
صبح صادق طلوع ہوئی۔ کے بارہ میں انتہائی حساس اور غیرتمند ہونا اسلامی فریضہ ہے
اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے سے

اک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیئے ، نیل کی ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

آخیر میں اسلامی ممالک کے ذمہ داروں اور سربراہوں کی خدمت میں بھی ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

محترم حضرات! قرآن، سنت، دعوتوں اور دنیا کی تبدیلیوں اور انقلابات کی تاریخ کی روشنی میں سب سے بہتر اور مفید چیز ہے اللہ کے ساتھ صدق و اخلاص، اس کی طرف رجوع و انابت ساتھ ہی فرد اور سماج کی زندگی میں ہر ممکن اصلاح، سماج سے منکرات اللہ کی تائید و نصرت سے محروم کرنے والے اخلاق و اعمال کا ازالہ اور سماجی، سیاسی، انتظامی اور انفرادی زندگی سے سستی و کاہلی اور تضادات سے اجتناب، قرآن و حدیث اس پر شاہد ہیں، سیرت مبارکہ، خلفائے راشدین اور صالح بادشاہوں کی زندگی میں اس کے بے شمار نمونے موجود ہیں، ان کی تفصیل اور واقعات، داسماء کے تذکرہ و تعیین کی یہاں ضرورت نہیں، خلاصہ یہ کہ انابت الی اللہ اور اصلاح امت و ازالۂ منکرات کی جدوجہد میں اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے مصیبتوں اور دشواریوں کے وقت قوموں اور معاشروں کو بُرے نتائج سے محفوظ رکھنے کی موثر ترین قوت ہے اور عام ذرائع و اسباب فوجی طاقت یا بڑی طاقتوں کی تائید و حمایت یہ ساری چیزیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

(سلسلہ صفحہ ۶۲ سے آگے)

۳۰ اگست ۳ بجے دن محترم سید شاہ سلیم الدین شرفی سجادہ نشین درگاہ شرفی چمن کے زیر نگرانی محبان ادب کا سالانہ طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ نگران محفل کے علاوہ مسرز خورشید جنیدی، معین الدین بزمی، داؤد نفیس، محمد بن حسین نقیب، کلیم قریشی، میر اعظم علی خاں اعظم، راغب فاروقی، محمود شرفی، یوسف نظر، خواجہ حمید، ابو الفاروق شعور، زبیر کشمی اطہر شرفی، ڈاکٹر غیاث عارف، سید عابدی، عرفان اللہ شاہ نوری، سرفراز علی سحر، غوث الدین ابرار، عباس علی عباس، صدیق صابری، زاہد قادری اور معتمد مشاعرہ دلاور علی حزیں نے طرحی سلام پیش کیا۔ سجادہ نشین درگاہ شرفی چمن کی دعا پر مشاعرہ کا اختتام عمل میں آیا۔

سید احمد عروج قادری قسط ۳

اسلامی تصوّف

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص عمل خیر لوگوں سے چھپا کر کرتا ہے لیکن جب کسی طرح لوگوں کو اس کی خبر ہو جاتی ہے تو اس کو اس سے خوشی ہوتی ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ نے کہا کہ اس کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیا کہ اس کے لیے دو اجر ہیں، ایک مخفی رکھنے کا اجر اور دوسرا اعلانیہ عمل خیر کا اجر۔ بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح کی ہے کہ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو" اس بنا پر لوگوں کی تعریف سے اسے خوشی ہوتی ہے کہ وہ اس کے عمل خیر کے گواہ ہو گئے اور بعض نے یہ توضیح کی ہے کہ اس کو خوشی اس لیے حاصل ہوتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی اس عمل خیر کی ترغیب ہو گی۔ لیکن اگر وہ اس لیے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم اور احترام کریں تو یہ ریا ہے۔ (ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ)

خوشی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نیکی سے خوش ہونا اور بدی سے ناخوش ہونا، ایمان کی علامت ہے۔ ایک حدیث میں ہے "جس کو کوئی نیکی خوش کرے اور کوئی بدی ناخوش کرے، وہ مومن ہے"

اوپر کی دو حدیثوں سے واضح ہوا کہ لوگوں کو خوش کرنے اور ان کی تعریف

حاصل کرنے کے لیے عمل کرنا ریا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے مطلع ہو جانے کے بعد اس لیے خوش ہونا کہ اب لوگ اس کی تعظیم کریں گے ریا میں داخل ہے لیکن اگر کوئی شخص لوگوں سے چھپا کر خالصاً مخلصاً اللہ کی رضا کے لیے عمل خیر کرتا ہے اور لوگوں کے مطلع ہو جانے کے بعد وہ شخص اس لیے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کے گواہ ہو گئے یا یہ کہ دوسروں کو اس عمل صالح کی ترغیب ہوگی یا یہ کہ طبعاً مومن اپنی اچھی حالت سے خوش ہوتا ہے تو یہ ریا نہیں بلکہ مومن کے لیے بشارت ہے۔

صوفیۂ کرام کے اقوال : اوپر قرآن اور احادیث سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں مخلص صوفیہ کے چند اقوال کا مطالعہ بھی کر لینا چاہیئے۔

۱۔ استاذ ابوعلی دقاق نے کہا کہ اخلاصِ کامل یہ ہے کہ اللہ کی طاعت و عبادت سے صرف اس کا تقرب مقصود ہو۔ اس کے علاوہ کچھ اور مقصود نہ ہو۔

۲۔ ابوعثمان نے کہا "اخلاص یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام اعمالِ خیر میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر نظر رکھے اور یہ بھول جائے کہ مخلوق اس کو دیکھ رہی ہے" ہمیشہ اللہ کے فضل پر نظر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ یہ ملحوظ رکھے کہ جو عملِ خیر وہ کر رہا ہے وہ محض اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے۔

۳۔ حذیفۃ المرعشی نے کہا "اخلاص یہ ہے کہ بندے کے افعال ظاہر و باطن ہر جگہ یکساں ہوں، کسی انسان کے وجود و عدم وجود سے ان میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔"

یہاں ظاہر سے جلوت اور باطن سے خلوت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جس طرح اور جس کیفیت کے ساتھ تنہائی میں عمل خیر کرتا ہے اسی انداز سے لوگوں کے سامنے بھی کرے۔ مثال کے طور پر ایسا نہ ہو کہ تنہائی میں تو نماز جلدی جلدی ادا کرے اور لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے کیونکہ ایسا کرنا کھلی ہوئی

ریاء ہے۔

۴۔ فضیل بن عیاض نے کہا، لوگوں کی وجہ سے عمل ترک کرنا ریاء ہے اور لوگوں کے لیے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تمہیں ریاء اور شرک دونوں سے بچائے۔

لوگوں کی وجہ سے ترکِ عمل کو ریاء کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عملِ خیر کو اس خوف سے ترک کرنا کہ کہیں لوگ اس کو ریاء کار نہ سمجھ لیں یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہ میں مخلص بنے رہنے کی خواہش سے مغلوب ہے تاکہ لوگ اس کا احترام کرتے رہیں یہ ریاء کی وہ قسم ہے جو عمل میں نہیں بلکہ ترکِ عمل میں رونما ہوتی ہے حضرت فضیلؒ کے پورے قول کا مطلب یہ ہے کہ عمل یا ترکِ عمل میں مخلوق کی تعریف یا مذمّت کو پیشِ نظر رکھنا اخلاص کے خلاف ہے۔ آدمی کو اچھا عمل صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کے امتثالِ امر کی نیت سے کرنا چاہیئے۔ اس کے بارے میں لوگوں کا خیال کچھ بھی ہو۔

۵۔ سہل بن عبداللہ سے پوچھا گیا کہ نفس پر سب سے زیادہ سخت چیز کیا ہے انھوں نے جواب دیا کہ اخلاص۔ کیونکہ اس میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔

۶۔ یوسف بن حسینؒ نے کہا کہ دنیا میں سب سے نادر شئے اخلاص ہے میں اپنے دل سے ریاء کو دُور کرنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہوں۔ لیکن وہ رنگ بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔ (یہ تمام اقوال رسالہ قشیریہ باب الاخلاص سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔)

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم الدین میں ان میں کے اکثر اقوال نقل کیئے ہیں۔ میں اُن کی کتاب سے چند مزید باتیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

قسط ۲

پروفیسر عبدالسلام
(نوبل انعام یافتہ)

یقیں محکم، عمل پیہم

افریقہ میں گھانا کی فی کس آمدنی ہماری نسبت سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ہم قومی طور پر اس قدر غریب کیوں ہیں؟ مان لیا کہ ہماری بہت سی قومی دولت انگلستان والوں نے دہلی، پنجاب، اور سندھ پر سو سالہ حکومت کے زمانے میں لوٹ لی۔ مان لیا کہ امریکہ خوش قسمت ہے۔ امریکہ والوں کو قدرتی اور معدنی وسائل سے بھرپور ایک خالی خطۂ زمین مل گیا لیکن پوچھنے والا ہم سے سوال کر سکتا ہے کہ ہم انگریز کے غلام کیسے بنے؟ اگر انگریز فنِ جہاز رانی سے واقف تھا اور ہم نہیں تھے تو یہ فن اسے کس نے سکھلایا۔ اگر کلائیو کی FLINTLOCK رائفلوں، بندوقوں اور توپوں کی ساخت اتنی اعلیٰ تھی کہ سراج الدولہ کی فیتلہ سوز MATCH LOCKS ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں تو بندوق سازی کا یہ فن کس نے انگریز کو ودیعت کیا۔ کیا یہ فن اس قوم نے ایجاد نہیں کیا تھا؟ کیا یہ فن ایجاد کرنے کے بعد تعلیم کے ذریعے سے انگریز نے خود ہی اسے اپنی قوم میں فروغ نہیں دیا؟

پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح بابر کے رومی توپ خانے کی مرہونِ منت تھی رومی ترک تو اس فن میں ۱۵۲۶ء کے بعد بھی مزید تحقیق کرتے رہے لیکن بدقسمتی سے بابر کی اولاد کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ توپ سازی کے فن میں ترقی کے لیے باقاعدہ تجربہ گاہ بناتے آپ قسطنطنیہ میں تشریف لے جائیں۔ رومی ترک کا [illegible] کا تصور اس زمانے [illegible]

شاہی جامعہ کے ایک طرف اسپتال بنے گا دوسری طرف مدرسہ۔ یہ مدرسہ صرف دینی درس گاہ ہی نہیں ہوگا اس میں توپ سازی کے تجربے بھی ہوں گے۔ بدقسمتی سے جو ترک پاکستان اور ہندوستان آئے، علم سے ان کی رغبت کم تھی وہ اپنی یادگاریں مزار اور مقبرے تو چھوڑ گئے۔ مدرسے اور تجربہ گاہیں نہیں۔

اگر خدا کی ذات نے امریکن پہ رزق کھولا اور اسے ایک نئے CONTINENT سے نوازا تو کیا یہ اس کے اس عزم کا بدلہ نہ تھا جس نے اسے بے کنار سمندروں میں نئے CONTINENTS کی دریافت میں طوفانوں سے لڑوا دیا۔ اگر آج جاپان نے اپنی INDUSTRY کی دھاک ساری دنیا میں بٹھا دی ہے تو اس میں جاپانی نظام تعلیم کا کتنا حصہ ہے۔ خدا کے فرشتے جاپانیوں کو TECHNOLOGY کی تعلیم دینے کے لیے نازل نہیں ہوتے ایک زمانہ تھا کہ جاپان کا مال دنیا کی منڈیوں میں ناکارہ سمجھا جاتا تھا اب ٹیکنیکل لحاظ سے سب سے زیادہ اسی کی ساکھ ہے BERTISH LEYLAND نے MINI MORRIS کار تیار کی جب جاپان والوں نے وہی کاریں بنائی ہیں بجائے 1000 سی سی کے جاپانی 600 سی سی کے آدھے سائز کے انجن سے وہی پاور پیدا کرتا ہے یہ کس طرح ہوتا ہے؟ بیس سال ہوئے امریکہ کے پروفیسر TOWNES نے ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔ انھیں اس دریافت پہ نوبل پرائز ملا۔ ان کا PATENT توڑنے کے لیے ٹوکیو کی یونیورسٹیوں میں کوششیں شروع ہوئیں اور اس قدر کامیاب ہوئیں کہ اس وقت سے الیکٹرونکس میں جاپانی بادشاہ ہیں نہ صرف انھوں نے وہ ایجاد دوبارہ دریافت کی بلکہ انھوں نے اس کا نسخہ رسالہ عام میں شائع کر دیا تاکہ جو چاہے ہندوستانی ہو، پاکستانی ہو، عرب ہو، ایرانی ہو، ٹرانسسٹر ٹکنالوجی کو DEVELOP کر سکتا ہے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں آپ یقین نہ کریں گے یہ وہی لوگ ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی کے فن سے ناآشنا تھے ایڈمرل PERRY (امریکن ایڈمرل) [illegible]

جا یا تو جہاز کی توپوں کی چند باڑوں نے جاپان والوں کو اپنی بندرگاہیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امریکن ایڈمرل کے جہاز سے ایک چوری ہوئی وہ ایک گھوڑے کی چوری تھی۔ رات کے وقت گھوڑا غائب ہو گیا۔ اور دوسرے دن اسے واپس کر دیا گیا۔ جاپانی اس کے نعل غور سے دیکھنے اور نعل بندی سیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت ان کی METALLURGY اس حد تک نہ پہنچی تھی کہ وہ لوہے کے نعل بناتے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم "خودکشی موسم" کہلاتا ہے اس امتحان کے نتائج پر آئندہ داخلے ہوتے ہیں لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات، فزکس اور کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے دوران میں پرچوں کے راز افشا نہیں ہوتے۔ اسٹرائکیں نہیں ہوتیں۔ امتحان کے سنٹروں کے دروازے اور شیشے نہیں توڑے جاتے۔ ساری قوم، سب والدین، طالب علم EXAMINATION FEVER کا شکار ہوتے ہیں اور پھر یہ لوگ ان امتحانوں کے نتائج کو اپنے مخصوص طرز پر قبول کرتے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں مجھے خوش قسمتی سے چین جانے کا موقعہ ملا۔ چین کے مڈل اسکول میں طالب علم بارہ برس کی عمر میں آتا ہے اور سترہ برس کی عمر میں ان کا کام ختم ہو جاتا ہے ان مڈل اسکولوں کو میرے طالب علمی کے زمانے کے انٹرمیڈیٹ سمجھ لیجئے۔ ان پانچ سالوں میں لازمی تعلیم کی وجہ سے ہر چینی کو بارہ مضامین پڑھنا پڑھتے ہیں۔ جن میں کوئی مضمون اختیاری نہیں ہوتا۔ وہ بارہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ وطنیات ، ۲۔ چینی زبان، ۳۔۴ دو غیر ملکی زبانیں انگریزی، روسی یا جاپانی ۵۔ ریاضی ، ۶۔ فزکس ، ۷۔ کیمسٹری ۸، بیالوجی اور زراعت، ۹۔ تاریخ، ۱۰۔ جغرافیہ ۱۱۔ آرٹس۔ ڈراما۔ میوزک، ۱۲۔ ورک شاپ

طالب علم سائنس اور آرٹس دونوں پڑھیں گے۔

آپ شاید گمان فرمائیں گے کہ سائنس کی اس لازمی تعلیم کا نتیجہ لازمی یہی ہوگا کہ ان مضمونوں کا معیار سولہ، سترہ برس کے طالب علم کے لیئے ہمارے انٹرمیڈیٹ کے معیار سے کم ہوگا۔ اس کا تجربہ کرنے کے لیئے میں نے فزکس اور ریاضیات دونوں کے ایک ایک گھنٹے کے درس ATTEND کیئے۔ ریاضیات میں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں دیکھا کہ چودہ سالہ طالب علم ORDERS OF INFINITY پڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جو ہم لوگ بی اے میں پڑھاتے ہیں۔

چین نے تہیہ کیا ہے کہ وہ ہر صنعتی تکنیک کو چین میں رائج کریں گے۔ ان کی نئی قومی زندگی ہمارے دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی۔ لیکن ان کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان چالیس سالوں میں انھوں نے قومی سطح پر الکٹرانکس کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل کیا ہے۔ فولادسازی چالیس ہزار ٹن سالانہ سے شروع کر کے آج انگلستان کے برابر دو کروڑ ٹن تک جا پہنچی ہے وہ اب SOPHISTICATED MACHINE TOOLS بناتے ہیں۔ مگ جیٹ ہوائی جہاز بناتے ہیں۔ ہر چینی طالب علم اپنے اسکول اور یونیورسٹی کے زمانے میں ہفتے میں ایک دن ورکشاپ میں مشق میں صرف کرتا ہے جس اسکول کا معائنہ میں کرنے گیا تھا اس میں یہ کیفیت تھی کہ ۱۴ سال سے ۱۶ سالہ طلباً کا ایک گروپ ٹرانزسٹر کے COMPONENTS بنا رہا تھا دوسرا گروپ POTASIUM CARBONATE کو معدنی صورت سے لے کر GRINDING TITATION وغیرہ کرنے کے بعد بوتلوں میں بند مارکیٹ کے لیے تیار کر رہا تھا ۱۲ سالہ ۴ طالب علموں کا ایک گروپ اپنے ہم جماعتوں کے باقی طلبا کے جوتوں کی مرمت کرنے میں مصروف تھا۔ ان میں سے ایک بچی بول اٹھی۔ آپ اس کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالیں۔ ان پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب پہلے جوتوں کی مرمت شروع کی تو ہم بدبودار جوتوں کو ہاتھ سے شرماتے تھے۔ کھڑکیوں پر پردہ ڈالے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہمیں اس

محنت سے اب شرم نہیں آتی۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی طالب علمی کے زمانے میں تخلیق کار بنیں PARASITE نہ بنیں۔ سارے چین میں یونیورسٹی، کالج اور اسکول کے طلباء اور استاد اپنی تعطیلات گرما فیکٹریوں اور فارموں پر گزارتے ہیں۔

آپ میری باتوں میں مبالغہ سمجھیں گے۔ یقین مانیئے مجھے بھی کوئی آکر یہ کہانی سناتا کہ اتنا بڑا ملک اس قدر یکجہتی سے چل رہا ہے تو میں ہرگز نہ مانتا، لیکن اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلاؤں۔ ایک بار نہیں میں تین چار بار چین کا سفر کر چکا ہوں مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ اسی کروڑ سے زائد انسان اسی طرح قومی مفاد کے لیے نہ صرف اپنے ذاتی منافع کو قربان کرسکتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قومی خودی میں اپنی انفرادی خودی مدغم کرسکتے ہیں۔ اس قوم کا ہر فرد دن رات ان تھک طریقے پر کام کرتا ہے ان کے شہر جو ۱۹۴۹ء میں مکھیوں سے بھنبھناتے تھے، پیکنگ جہاں شاہی محل کے عقب میں DRAGON SEA کے نام سے معروف گندگی کی تیس فٹ چوڑی نہر تھی، جو تین سو سال سے صاف نہ ہوئی تھی یہ شہر اب آئینہ کی طرح صاف ہیں اور یہ صفائی خاکروبوں کی مرہونِ منت نہیں یہ صفائی وکیلوں، استادوں، طالب علموں، سیلسمانوں، دوکانداروں کی مرہونِ منت ہے یہ کام اسٹوڈنٹس یونینوں سے لیا گیا تھا اور وہ اس معاملے میں مقدم اور پہل کرنے والی تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ چینی نظام شاید قائم اس لئے ہے کہ یہ مساواتی نظام ہے۔ چینی وزیر سائیکل پر دفتر آتے ہیں سرکاری کار تب استعمال کرے گا جب وہ آپ کا مہمان کی حیثیت سے استقبال کرنے آئے گا۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہے کہ قوم ایثار کرتی ہے لیکن یہ کہنے کے باوجود میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سسٹم کا اس قوم کے اس عزم سے کہ ٹکنالوجی اور فن سیکھے جائیں گے، براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے چین سے پہلے میں جاپان اور انگلستان کی مثالیں عرض کرچکا ہوں۔

چین کے بیان میں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گیا ہوں۔ میں عرض کر

اگر انگریز نے INDUSTRIAL TECHNIQUE ایجاد کیں اور انھیں تعلیم کے ذریعے اپنی قوم میں پھیلایا۔ اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے بغیر مدنی یا دیگر وسائل رکھنے کے اپنی ساری قوم میں SKILLS پھیلا سکتا ہے اگر چین والے اپنی قوم کو ذہنی اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی SKILL سیکھے گا' اسے بڑھائیگا۔ اگر یہ سب قومیں اپنی غربت کا علاج اس طرح کر رہی ہیں تو کیا اس میں ہمارے لیئے سبق نہیں ہے؟ آپ فرمائیں گے کہ غریبی ایسی لعنت ہے کہ اگر انسان بھوکا ہو ننگا ہو تو اس کی دماغی صلاحیتوں کے بڑھانے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے جرمنی کا ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ ۱۹۴۷ء کی بات ہے میں کیمبرج میں طالب علم تھا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جرمن قوم سرنگوں تھی۔ کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلباء کی ایک پارٹی کو امریکن کنٹرول کمیشن والوں نے جرمنوں کی حالت دیکھنے کے لیئے دعوت دی۔ تقریباً پانچسو کے قریب طالب علم سارے یورپ سے میونخ پہنچے۔ اس شہر میں ایک عمارت بھی نہیں تھی جو صحیح و سالم ہو۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مکانوں میں نہیں بلوں میں رہ رہے ہیں۔

ہمارے لیئے شہر کے ایک پارک میں خیمے لگائے گئے ان خیموں میں میں نے سُنا کہ ایک جرمن میری تلاش کر رہا ہے معلوم یہ ہوا کہ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے اسے شاید ۲۵ روپے ماہوار ملتے تھے اس مشاہرے سے شاید وہ ایک وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ' جنگ کے دنوں میں وہ ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ملازم تھا جہاں بعض پنجابی قیدی بھی تھے۔ ان پنجابی قیدیوں سے اس نے پنجابی زبان کی تحصیل کی۔ ۱۹۴۷ء میں یہ جرمن ایک پنجابی جرمن ڈکشنری کی تالیف کر رہا تھا۔ پنجابی زبان میں اس کا کل سرمایہ میر وارث شاہ کی ایک کاپی اور ایک ملا ہوا سے چھپی ہوئی اور انتہائی خستہ حالت میں پھٹی ہوئی دلا بھٹی کی کاپی تھی۔ یہ سن کر شہر میں ایک پنجابی وارد ہے وہ جرمن میری تلاش کر رہا تھا کہ دلا بھٹی میں بعض مشکل مقامات

میں اسے سمجھا دوں۔ اس کی بدقسمتی سے یہ مقامات میرے لیئے بھی بہت مشکل تھے اور اس بے چارے کی یہ خواہش تشنۂ تکمیل رہ گئی۔

اس واقعہ پر غور فرمائیے۔ مجھے معلوم نہیں وہ ڈکشنری شائع ہوئی یا نہیں۔ اگر شائع ہوئی بھی تو اسے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن یہ ایک علم دوست قوم کی کہانی ہے۔ ایسی قوم جس کا سارا اثاثہ علم ہے۔ سائنس کا علم ٹکنالوجی کا علم، زبانوں کا علم اور پھر ایسی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا بے معنی ہی سہی لیکن اپنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گزاریں گے۔ اسٹرائکیں نہیں کریں گے فلمیں نہیں دیکھیں گے۔ اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے۔ علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے۔ شاید اس میں ہمارے لیئے بھی سبق ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک کہانی دہرانا چاہتا ہوں۔ یہ داستان چیئرمین ماؤ نے بیان کی تھی اور اسے آپ ہر چینی کی زبان سے سنیں گے۔

" پرانے زمانے میں چین کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا۔ اس کا نام پیرکم عقل تھا۔ اس بوڑھے کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی لیکن اس کے دروازے کے سامنے "تے ہانگ اور وانگ دو" کے دو عظیم پہاڑ کھڑے تھے جن کی وجہ سے پہاڑ کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہنچتی تھیں۔ ایک دن بوڑھے نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر دور کر دیں۔ اس کے ہمسائے نے جن کا نام "پیر دانش ور" تھا اس بے عقل بوڑھے سے کہا۔ میاں مجھے معلوم تھا کہ تم بے وقوف ہو لیکن اتنا گمان نہ تھا کہ اس قدر کم عقل ہو گے۔ تم کھودنے سے کس طرح ان دونوں پہاڑوں کو رفع کر سکو گے۔ بے عقل بوڑھا بولا تمہارا کہنا درست ہے لیکن اگر میں مر گیا تو اس کے بعد میرے بیٹوں کو رہنا ہے ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے، ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ رہے گا پہاڑ اور زیادہ طویل نہیں ہوں گے ہر کھودنے کے ساتھ ان کی طوالت کم ہی ہو گی، بڑھے گی نہیں۔ ایک دن یہ لعنت ہمارے د ... رسے

دور ہو جائے گی۔

پیر کم عقل کی یہ بات سن کر پاک ذات کو ترس آیا۔ دو فرشتے آئے اور انھوں نے ان دونوں پہاڑیوں کی لعنت کو دور کر دیا۔"

میری عرض یہی ہے سوسائٹی کی لعنتیں ان دو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ انھیں اپنے حلقۂ اثر میں صبر و تحمل کے ساتھ دور کرنے میں کوشاں ہو جائیے۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو آپ کی کوششوں پر بھی ترس آئے گا۔ آمین۔

یہ فکر نہ کیجئے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہوگی یا نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔ خداوند تعالیٰ آپ کی ان کوششوں میں برکتیں ڈالے گا۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۵۲ سے آگے)

"خیال غزل کے منجھے ہوئے شاعر ہیں اور جب ان کی شاعرانہ صلاحیت عروج پر ہوتی ہے تو غزل کی زبان میں ایسے اضافے کر جاتے ہیں جنھیں اہل دل اور اہل نظر نظرانداز نہیں کر سکتے۔"

ایسے شاعر کی ہم اردو والے جتنی بھی قدر کریں کم ہے۔ کتاب کا سرورق، کتابت، طباعت اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔ [illegible] صفحات کی ہے۔ [illegible] کے ہمراہ ہیں۔ کتاب مجلد ہے اس پر قیمت صرف ۵ روپے ہے [illegible] شاعری [illegible] رنگوں [illegible] ہے اور [illegible] کا مطالعات [illegible] ہے۔

ملنے کا پتہ یہ ہے: ۲۵ انیار اماغ، جو [illegible] مارگ۔ [illegible]

یہ کتاب اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے اردو والے خرید کر پڑھیں۔

صالح السلیمان تلخیص و ترجمہ : محمد الحسن

ایک متعصب نصرانی کا قبول اسلام

میرے تصور و خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میں کسی دن نصرانیت سے پھر جاؤں گا۔ میں ایک متعصب کیتھولک عیسائی تھا۔ بچپنے سے میری تربیت ایک کیتھولک ادارے میں ہوئی تھی، جن اداروں کا بنیادی مقصد ہی بچوں کو معاشرہ سے اچک کر نصرانی عقیدہ پر تربیت دینی ہوتی ہے اور وہ اس سلسلے میں گرجا گھروں کے معاون و حلیف ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب میں ادب میں بحث و تحقیق کے لئے آئیلا کی یونیورسٹی گیا ہوں تو نصرانیت پر اپنے مطالعے میں وسعت و گہرائی پیدا کرنے کا انتہائی حریص تھا، اس میں موجود فرقہ بندی و انتشار کا خیال کئے بغیر مجھ پر بس ایک ہی فکر سوار تھی کہ میں ایک عیسائی مبلغ بن جاؤں یہی حالات و اسباب نے کنیسا اور اہل کنیسا سے میرے تعلقات قوی اور انتہائی حد تک مضبوط بنا دیئے۔

چنانچہ جب میں مملکت سعودیہ میں داخل ہوا ہوں تو اپنے دین کے اندھے تعصب میں غرق اور میرا دل اسلام کے خلاف بغض و کینہ سے بھرا ہوا تھا کہ اللہ نے مجھے ہدایت کے نور سے سرفراز کر دیا۔

میں اپنی گذشتہ اڑتالیس (۴۸) سالہ زندگی میں یہ سمجھتا آیا تھا کہ نصرانیت ہی دین حق ہے،

... دوران قیام میں نے ایک [illegible] پروگرام

دیکھا "اسلام کا تعارف" کے عنوان سے یہ پروگرام ڈاکٹر جمال بدوی سعودی ٹیلی ویژن سے انگریزی میں نشر کرتے ہیں، مجھے کیا خبر تھی کہ یہی پروگرام میری زندگی میں ایک عظیم انقلاب کا سبب بنے گا۔ اس دلچسپ پروگرام میں نصرانیت اور اس کے عقائد خاص طور سے "عقیدۂ تثلیث" اور "مغفرۃ الذنب" کے قضیہ کے متعلق جو حقائق سامنے آئے اس سے میں حیران رہ گیا۔

اس واقعہ نے مجھے حقیقت کی تلاش پر مجبور کر دیا اور میں اس حقیقت کی تلاش میں لگ گیا جسے میری سابقہ اندھی دینی عصبیت نے پردۂ غیب میں ڈال رکھا تھا، اس سے قبل کبھی میں نے اس طرح سوچا ہی نہیں تھا اس لیے اسلام کے متعلق جو میں نے سنا اس نے میری عقل و فکر پر پڑے ہوئے ضلالت و جہالت کے دبیز پردوں کو چاک کر دیا اور میں عقل و منطق اور حقیقت و صداقت کے ذریعہ سوچنے لگا

اب میرے عقیدے کا مضبوط قلعہ غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہا تھا، لیکن میں ایک دیکھے ہوئے پروگرام پر کیسے اکتفا کر لیتا، چنانچہ بذاتِ خود حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کا عزم کر لیا اس کے لیے میں نے قرآن کا ایک مترجم نسخہ حاصل کر کے اس کا مطالعہ شروع کر دیا، مطالعہ کے دوران میں قرآن و انجیل کے احکام کا موازنہ بھی کرتا جاتا۔ لیکن میری توجہ عقیدۂ ربوبیت اور وحدانیت کے مسائل پر ہی مرکوز رہتی، یہ مطالعہ بڑا ہی شاق تھا جس نے میری بڑی محنت اور کافی وقت لے لیا میں نہیں سمجھتا تھا کہ اتنی جلد حقیقت کو پالوں گا۔ مزید مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ قرآن کی اسلامی تعلیمات عقل و صداقت سے زیادہ قریب ہیں اس لئے کہ انسانی عقل و فطرت سے ان کا گہرا رشتہ ہے، میں نے دیکھا کہ قرآن جس طرح عقل کے لیے پیغام ہے اسی طرح وہ دل کے لیے بھی ایک پیغام ہے۔ انہوں نے بہت ساری آیتوں میں عقل انسانی کو براہ راست خطاب کرتا ہے اور

اسے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، اس کے برعکس ہم نے دیکھا کہ انسانی ہاتھوں رنگی ہوئی انجیلوں میں جن کی تعداد ۲۰۰ سے بھی متجاوز ہے ایک عقیدہ کا سمجھنا ناممکن ہے۔

اسلام و مسیحیت کے اس موازنہ کے بعد میں اس حقیقت پر پہنچا کہ نصرانیت ایک فاسد عقیدہ ہے اس کی اصلیت وہ نہیں جو میں سمجھتا آیا تھا اور جو نصاریٰ سمجھ رہے ہیں آخر وہ عقیدہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جو ان تک اتنی ساری انجیلوں سے ہو کر پہنچے جو سب کی سب انسانی دستبرد کا شکار ہیں یہ انجیلیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں یہ کلیسائیوں کی مدوّن و محرف اوراق کی ہوائے نفسانی کا ایک مجموعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک دوسرے سے اختلاف و تضاد ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نصاریٰ اس حقیقت کو سمجھیں اور دین حق دین اسلام کی طرف لوٹ آئیں۔
یالیت قومی یعلمون۔

اسلام دینِ حق ہے اس لئے کہ اس کے متبعین اسے صرف ایک ماخذ سے قبول کرتے ہیں اور وہ قرآن ہے جو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں بھی صرف ایک ہی کتاب رہا اور آپ کے بعد بھی آج ایک کتاب کی شکل میں محفوظ رہا، خدا نے اس کی حفاظت کی اور روز قیامت تک اس کی حفاظت کا ضامن ہے، اس میں کوئی تناقض، تغیر و تبدل یا کمی و زیادتی نہیں۔ "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" یہی حال احادیث رسول ﷺ کا ہے، جو قرآن کی شارح اور اسلامی تعلیمات کی مفسر ہیں کہ انہیں بھی بغایت درجہ اہتمام کر کے تحریف سے محفوظ رکھا گیا۔ یہ تھا میرے مطالعہ کا حاصل جس کے نتیجے میں مجھے دین اسلام کی صحت پر شرح صدر اور منزلِ مقصود کو پالینے کا یقین ہو گیا۔

جوں جوں میں اسلام سے قریب ہونے لگا اسی درجہ نصرانیت سے متنفر ہونے لگا۔ اس میں خود نصرانی عوامل بھی کارفرما ہوئے۔ اس سلسلے میں اس کا سب سے بڑا

عقیدہ جیسے وہ "ثالوثِ اقدس" کا نام دیتے ہیں جس کی رو سے خدا ان تین
(خدا، حضرت مریم، حضرت عیسیٰ) کا ایک ہے۔ اس عقیدہ نے مجھے عیسائیت
دور کرنے اور اسلام کی آغوشِ رحمت تک پہنچنے میں اہم کردار ادا کیا۔
اگر کچھ عقل و تدبر سے کام لیا جائے تو کبھی اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی کہ
کائنات کے کئی خدا ہوں جو الگ الگ نظاموں کے مالک ہوں، اس کا لازمی
خداؤں کے آپسی اختلافات، ایک دوسرے پر غلبہ و تسلط کی فکر اور پھر
کائنات کے فساد و بگاڑ کی شکل میں سامنے آئے گا، لیکن ہم بھی اس کائنات
کچھ ایسا نہیں پاتے، اس پوری کائنات کا ایک نظام کے تحت بغیر کسی فساد
کے چلنا یہ خود خدا کی وحدانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔
دوسری چیز جس نے مجھے اسلام کے دامن سے وابستہ کر دیا۔ وہ نصرانیوں کے
اور شرکا ہیں جو عبد و معبود کے بیچ حائل ہوتے ہیں، ان کاہنوں، پوپ
نے خود کو عبد و معبود کے درمیان واسطہ و شریک بنا رکھا ہے۔ ان کی مرضی
بغیر خدا راضی نہیں ہوتا اور ان کے غضب سے رب غضبناک ہو جاتا ہے۔ اس
ہم خدا سے کہیں زیادہ انھیں سے ڈرتے اور خوف کھاتے اور ایسا ہوتا بھی
نہیں کہ ہم ایک خدا پر یقین رکھتے تھے انھوں نے اسی پر ہی بس نہیں
بخشش و مغفرت کی کنجی بھی اپنے ہاتھوں میں لے لی اور خدا کے حضور دست
عرض دراز کرنے سے قبل ان کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلانا ضروری قرار پایا۔
اسلام کی عظمت اس کا حسن یہ ہے کہ یہاں ہم وہ شرکاء اور واسطے نہیں دیکھتے
اسلام میں عبد و معبود کے درمیان تعلق براہِ راست ہوتا ہے نمازوں میں
روزوں میں قرآن کی تلاوت اور طلب مغفرت غرض یہ کہ ان تمام عبادتوں میں
اپنے رب سے بلا شرکت غیرے ملتا اور ہم کلام ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے
کے ذریعہ ایک مسلمان اپنے رب سے معزز ہوتا اور اس کی طرف التفات

فخر محسوس کرتا ہے۔

اسلامی عقیدہ صاف و شفاف عقیدہ ہے، اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو عقل سے کام لے اور تعصب کی عینک اتار کر اسے دیکھے، میں نے اسلام میں آکر خدا کی معرفت حاصل کی اور اللہ کی معرفت ہی ہدایت کی اساس ہے، جس معرفت سے نصرانی ناآشنا اور ناواقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ پھر کبھی اس سے مرتد نہیں ہوتا۔ ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

(تعمیر حیات، لکھنؤ سے ماخوذ)

(بقیہ صفحہ ۵۹ سے آگے)

پروفیسر سینیے نال، پروفیسر ونگیے ناسٹ اور پروفیسر فرالین ارین اقبال کو کو فلسفہ پڑھاتی تھیں اور ان کے ڈسرٹیشن کا معائنہ کرتی تھیں پروفیسر آزاد نے بتایا کہ پروفیسر سینیے فنال، پروفیسر ونگیے ناسٹ اور پروفیسر لین رین کا نام آج بھی ان کے علمی مرتبے کے پیشِ نظر میونخ یونی ورسٹی میں عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب میں میونخ یونی ورسٹی سے واپس آرہا تھا تو اقبال ہی کا ایک شعر تدرے تصرف کے ساتھ میری زبان پر تھا ؎

خوشا وہ وقت کہ میونخ مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

حامد اکمل
(ایڈیٹر "القان" گلبرگہ)

سیکولرازم اور صحافت

دنیا کے تمام ملکوں میں عوامی شعور کی بیداری، جذباتی ہم آہنگی، قومی حیات اور اتحاد کے استحکام اور فروغ میں اخبارات کے رول کو ابتداء ہی سے اہمیت حاصل رہی ہے فروغ علم و عمل کے ایک موثر ذریعہ کی حیثیت سے بھی صحافت کا کردار واضح ہے۔

ہندوستان میں صحافت کو متذکرہ بالا فرائض کے علاوہ چند زائد ذمہ داریاں بھی نبھانی ہیں منصفانہ سماجی و معاشی نظام کے قیام، قومی تعمیر نو، کثرت میں وحدت کے پیکر جنت نشان ہندوستان کی عملی صورت گری اور اس عمل میں مختلف مذہبی اکائیوں کے مابین قربت اور گہرے ارتباط کے فروغ کے کار عظیم کا بوجھ بھی عوامی قیادت کے ساتھ ساتھ صحافت کے کندھوں پر بھی ہے۔

ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب، اختلاف فکر و نظر، محدود طبقہ واری مفادات ...ا اور مفادات حاصلہ کی ریشہ دوانیوں ہی سے متاثر نہیں بلکہ قیادت میں وقتاً ... پیدا ہونے والے خلا اور اس کے خدشات سے بھی پریشان ہے۔ ان حالات ...ت کی ذمہ داریاں دوچند ہوگئی ہیں۔ میرا موضوع گفتگو تاریخ صحافت یا ...ی ذمہ داریوں کا جائزہ نہیں ہے بلکہ سیکولرازم کے فروغ میں صحافت کے کردار پر روشنی ڈالنا ہے

جدوجہدِ آزادی کے دوران قومی صحافت کے دو واضح گروہ تھے ایک قوم پرست اور دوسرا فرقہ پرست، فرقہ پرست صحافت کے بارے میں کسی مخصوص فرقہ ہی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ واضح طور پر قوم پرست کہلائے جانے والے بعض اخبارات نے جدوجہدِ آزادی کے دوران موقع پرستی، مصلحت شناسی اور اسی نوع کے دیگر عوامل کے تحت کسی نہ کسی طرح فرقہ پرستی کا سہارا لیا اور اس کی ہمت افزائی کی۔ تاہم ہندوستانی عوام میں قوم پرستی کے شعور کی بیداری اور عمومی طور پر حصولِ آزادی کے مقصد کی سبھی اخبارات نے کم و بیش حمایت کی اس سلسلہ میں صحافتی تاریخ سے کئی حوالے مل جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے ہریجن، لوک مانیہ تلک کے کیسری، مولانا آزاد کے الہلال اور کامریڈ کے علاوہ بیسیوں اخبارات نے جدوجہدِ آزادی کے دوران قومی اتحاد اور یک جہتی کے کاز کو فروغ دیا۔

آزادی اور تقسیم ملک کے نتیجہ میں پیدا شدہ حالات کے باعث عوام کے مختلف طبقات کو از سر نو متحد کرنے اور نئے قومی منشور کی بیداری کے لیے ایک نئی نظریاتی یا فلسفیانہ وابستگی ضروری تھی۔ اس وقت وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے قومی یک جہتی کے مسئلہ کی پیچیدگی کے پیشِ نظر اس بات پر زور دیا کہ سیکولرازم ہی وہ واحد مسلک (عقیدہ) ہے، جو ہندوستان کو متحد رکھ سکتا ہے نہرو کے نظریۂ سیکولرازم کے بموجب ایسی حکومت تھی جو فرقہ داریت سے دور کا بھی علاقہ نہ رکھتی ہو یہاں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ سیکولرازم کے حقیقی منشا یعنی مذہبی رواداری کے مسلک کی جمہوری دور سے بہت قبل ہی یعنی دورِ شہنشاہیت میں ہمارے صوفیوں اور سنتوں نے تبلیغ کی تھی گو عوام اس وقت سیکولرازم اور مذہبی رواداری کی اصطلاحوں سے آشنا نہیں تھے لیکن عملی طور پر ان کی مذہبی رواداری اور پُرامن ہمہ وجودی کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ہندوستان میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء، محبوبِ الٰہیؒ اور حضرت

خواجہ معین الدین چشتیؒ سے لے کر حضرت خواجہ بندہ نوازؒ گیسو دراز شہباز بلند پرواز
تک تمام صوفیوں نے انسانی اخوت اور اتحاد بین المسلک کی تعلیم دی۔ ان بزرگانِ دین
کی تعلیمات کا ماحصل یہی تھا ۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

اِن بزرگوں کی خانقاہیں بلا لحاظ رنگ و نسل، فرقہ و جماعت تمام بندگانِ خدا کے لئے کھلی ہوئی تھیں یہی حال رشی منیوں اور سنت سادھوؤں کی مجالس کا تھا۔ مذہبی رواداری کا یہی تصور دورِ جدید میں سیکولرازم کے نام سے سامنے آیا جس کی ضرورت پر پنڈت نہرو نے زور دیا۔ سیکولرازم کا مفہوم مذہب سے انحراف یا مذہب کو بے معنیٰ ثابت کرنا نہیں ہے ۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو مسائل کو مذہب کا پابند کئے بغیر ان کے عمومی اسباب و نتائج کی جانب توجہ کرتا ہے۔ ایک سے زائد طبقات کے حامل ممالک نے سیکولرازم کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ یورپ کی تہذیب کے سیاق و سباق میں سیکولرازم سے مراد مذہب سے بے تعلقی ہو سکتی ہے لیکن ہندوستان میں اس سے مراد مذہبی رواداری ہے۔ مذہب اخلاق پر زور دیتا ہے اور مذہب کی اخلاقی تعلیم پر عمل کے ذریعہ ہی ہم دوسرے مذاہب کا احترام سیکھتے ہیں۔ ہندوستانی سیکولرازم کا یہی مطلب ہے اور ہونا چاہیئے کہ ہمارے سیاسی ڈھانچے پر کسی مخصوص مذہب کی چھاپ نہ ہو۔ حکومت، قیادت، سماجی زندگی اور تعلیمی نظام کو ہر قسم کے تعصبات اور فرقہ واریت کے جذبات سے بالکل محفوظ رکھا جائے۔ سیاسی مدبرین کے اس متفقہ خیال کے باوجود ہمارے ملک میں مفاد پرستانہ فرقہ پرستی اور ذات پات کے رجحان میں شدت نے سیکولرازم کو بری طرح متاثر کیا ہے بعض اوقات سیکولرازم کے بارے میں بقول غالب یوں کہنا پڑتا ہے ۔

ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا

ضرورت اس بات کی ہے کہ قیادت کے ایوانوں اور عوامی پلیٹ فارموں پر سیکولرازم کی دُھائی دینے کی بجائے ہر ہندوستانی کے دل میں سیکولرازم کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہمارے دانشوروں، سیاستدانوں، عوامی کارکنوں اور سماجی مصلحین کو عوامی صفوں میں گھس کر کام کرنا چاہیئے۔ صحافت کو ایسی خبروں اور مضامین کی اشاعت سے گریز کرنا چاہیئے جو قومی یک جہتی اور سیکولرازم کے کاز کے لیے مفید ہوں افسوس اس بات کا ہے کہ بعض اخبارات مفاداتِ حاصلہ کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور ہر طرح کی انتشار پسندی اور تعصبات کو ہوا دے رہے ہیں۔ عوامی تحریکات کے نام پر علاقائی عصبیت، لسانی جھگڑوں اور مظاہروں کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔
ان تحریکات میں شامل لوگوں کی اکثریت تحریکات کے مقاصد سے تک واقف نہیں ہے عوامی تحریکات کی مخالفت بجائے خود غلط ہے لیکن حقیقی تعمیری تحریکات اور بے جا تحریکات میں بہر حال فرق کیا جانا چاہیئے۔ یہ امر بھی بے حد بدبختانہ ہے کہ ہم گذشتہ تقریباً نصف صدی سے فرقہ واریت کے جنون پر قابو نہیں پا سکے ہیں لوگوں میں سیکولرازم اور قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے مخلصانہ جدوجہد کے بغیر فرقہ وارانہ جنون پر قابو پایا نہیں جا سکتا۔ فرقہ وارانہ فسادات اور دیگر بحرانی لمحات میں اخبارات کو اپنی ذمہ داریوں کے تئیں بے حد محتاط رہنا چاہیئے۔ انھیں فرقہ وارانہ جانبداری کی بجائے خاطیوں کو بے نقاب کرنا چاہیئے اور حقائق کے اظہار میں انتہائی غیر جانبداری اختیار کی جانی چاہیئے۔ اسی طرح عوامی زندگی کے مختلف شعبوں میں بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے اخبارات عوامی شعور بیدار کر سکتے ہیں۔

بیروزگاری، غربت، ناخواندگی، فرقہ پرستی، تعلیمی و صنعتی بے چینی اور دیگر عوامی مسائل کی اخبارات کو غیر جانبدارانہ نمائندگی کرنی چاہیئے۔ اور ان کی یکسوئی کے لیے رائے عامہ کو متحد کرنا چاہیئے۔

صوفیوں، سنتوں، سماجی مصلحین اور قومی رہنماؤں کی انسانی بھائی چارے اور

[redacted]

مذہبی رواداری کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے صحافت کو زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالنی چاہیئے اور ایسے مواقع تلاش کرنے چاہئیں جنھیں سیکولرازم کے کاز اور اتحاد و یک جہتی کے استحکام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہو۔

سیکولرازم کے کاز کے لیے جس مضبوط سیاسی شعور کی ضرورت ہے اس کی بیداری کے لیے اخبارات اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ اخبارات صرف انہی جماعتوں کو آگے بڑھائیں جو سیکولرازم پر یقین رکھتی ہوں۔ جب تک ملک کی سیاسی پارٹیاں متفقہ طور پر اس کا تہیہ نہیں کرلیتں کہ ان کے سارے پروگرام سماجی اور اقتصادی مسائل پر مرکوز رہیں گے اور وہ سیکولر رجحانات کی نہ صرف پُر زور حمایت کریں گی بلکہ خلوصِ نیت کے ساتھ اسے اپنے لائحۂ عمل کا حصہ بنائیں گی۔ ملک میں غیر ضروری مذہبی تکرار کے لیئے گنجائش نہیں رہے گی۔

مذہبی بنیادوں پر قائم جماعتوں کو بھی مذہبی منافرت پھیلانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ مذہب کی اصل روح کے مطابق بندگانِ خدا کو متحد کریں۔ اس سلسلہ میں مولانا آزاد کے صحافتی مسلک کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا مولانا آزاد نے الہلال میں ایک قاری کے جواب میں قرآنی احکامات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا۔

" دنیا کے تمام مذاہب، پیروانِ حق ہیں ۔ لیکن دنیا پیروانِ مذاہب حق سے منحرف ہوگئے ہیں۔ جس قدر بھی گمراہی ہے جس قدر بھی اختلاف ہے، جس قدر بھی دعووں کی لڑائی اور جماعت بندیوں کا تصادم ہے پیروانِ مذاہب کے فہم و عمل سے ہے، مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے، اگر پیروانِ مذہب کا یہ انحراف دور ہوجائے جو حق نہیں ہے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو حق ہے ۔ یہی مذاہب عالم کا مشترکہ حق دنیا کی عالمگیر روحانی صداقت ہے ▲

رؤف خیر
رسالہ بازار۔ گولکنڈہ
حیدر آباد ۸

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل

ممالک محروسۂ اردو کے باغی شاعر مخدوم نے جب یہ شعر کہا ؎

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

تو اس طرح انہوں نے نظم کو بالمقابل غزل کی قوت کا اعتراف کیا اور پھر بطور خراج جو چند غزلیں پیش کیں وہ ان کو بہ حیثیت غزل گو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ غزل کی طاقت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اقبال بھی اگر زندہ ہیں تو انہی تخلیقات سے جہاں انہوں نے نظم و غزل کا فرق مٹا دیا۔ مسجد قرطبہ اور ذوق و شوق جیسی نظموں کے اشعار بھی غزل کی اکائیوں کی طرح اربابِ ذوق کو یاد ہیں اور جس کسی نے غزل کو حقیر جان کر اس سے روگردانی کی وہ بدنصیب لے ادب ہی ٹھہرا۔ محض نظم پر تکیہ کرنے والے شعرا تو وہ حنوط شدہ لاشیں ہیں جن کا مسالہ کچھ ہی دنوں میں دم توڑ دیتا ہے چنانچہ اختر شیرانی، سلام مچھلی شہری، میراجی، جوش ملیح آبادی وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ کچھ نظم گو شعرا کا کریا کرم ہو گیا، کچھ دفن کر دیئے گئے اور کچھ وصیتاً الکٹرک بھٹی کی نذر ہوئے۔ آتشِ ادب میں کود پڑنے کے لئے ابراہیمی عشق چاہیئے اور یہ راز غزل کے دو مصرعوں پر پوشیدہ ہے۔ ہر شعر کا ایجاز دراصل وہ اعجاز ہے جس کی مسیحائی ہیں

دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ میں یہ بات اتنے یقین سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ غزل کے نہایت کم سخن شاعر اصغر گونڈوی (معیار تر دامن ہاتھوں میں سر آیا جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا) کے آگے جوش جیسے بسیار گو کی گاڑی گزرتی تھی پٹڑی چلتی رہی تھی۔ حالانکہ جوش نظم کے بڑے قدآور شاعر ہیں جن کے طنطنے کا جواب اردو شاعری نہیں لا سکتی۔ دستِ خود و گریبانِ خود کی یہ نسبت جنگل کی شدید [illegible] کے دامن پر ہاتھ ڈالنا کسی مرد افگن عشق ہی کا کام ہے یہ وہ مقام ہے جہاں آدمی جان کی پروا نہیں کرتا، گاڑیوں کا خیال کون کرتا ہے۔

غزل میں وہ جادو ہے جو مخدوم کے فاصلوں سے لے کر کام کے کاملوں تک سب کو گرویدہ بنا لیتی ہے۔ عام مشاعروں سے لے کر مخصوص شعری محفلوں تک ہر جگہ غزل ہی حکمراں ہے یہی اک ایسا سکہ رائج الوقت ہے جو نایافت پیشاد کے خزانے میں "بیا یا جہاں پیا پیا جائے تا" ہے تو مخدوم کے پاس

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھولے بال بچوں کا خیال

یا پھر اس شعر کا آخری ٹکڑا دیکھیے .. آ تقریب لیے لگی ہچکیاں دوستو۔

مخدوم کی غزل میں لفظیات کا ایسا خوبصورت آہنگ ملتا ہے کہ تغزل کی اک ساحرانہ کیفیت ابھر آگئی ہے

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

غالب تعداد و شاعر کے اس تدریاد کا موجب تھے کہ مشاہدہ حق کی گفتگو کے لیے بھی ان سہاروں کی ضرورت تھی، اور مخدوم کے پاس یہ سہارے بھونڈے [illegible] لیے خودی کے بہانے ہیں۔

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی : کوئی لیتا تھا ترا نامِ وفا آخرِ شب
کھنکتا جاتا ہے زنجیرِ درِ مے خانہ : کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

مخدوم محی الدین کے پاس الفاظ اشرفیوں کی صورت ہیں جن کی قیمت کسی عہد میں بھی کم نہیں ہوتی۔ جوش ملیح آبادی نے اشرفیوں کو بھی کوڑیوں کی طرح برتا تھا۔ مثلاً تنہا ۔ فن ہا جیسے ثقیل قافیوں میں رباعی کہتے ہوئے جوش جیسے لفظوں پر مکمل دسترس رکھنے والے بے باک شاعر ہی سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ یہ مصرعے بھی رکھ دیں گے ؎

ٹھٹھری ہوئی ساغر میں نظر آتی ہے صہبا رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

مخدوم کے مزاج کا تغزل ان سے ٹھیٹ غزل کا شعر کہلواتا ہے

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے : گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اردو شاعری میں جو الفاظ کلیشے CLICHE کا درجہ اختیار کر چکے ہیں وہ بھی مخدوم کے لہجے میں بھلے بھلے سے لگتے ہیں ؎

ہجومِ بادہ و گل میں ہجومِ یاراں میں ۔ کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے
بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی .. اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

مخدوم محی الدین نے اپنے دوست سبطِ حسن کے نام اک خط میں لکھا تھا

"ہمارے بعض اسلاف شعرا باوجود ایک ہی بات کو دہرانے کے زندہ رہے۔ ان کی بقا کا گر شاید ان کا اندازِ بیان تھا جس میں تازگی اور نیاپن ہوا کرتا تھا مگر اب خیال کی تبدیلی سے دوسرے اور پیچیدہ سوال ادب میں پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔"

(مطبوعہ ماہنامہ صبا مخدوم نمبر شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ سنہ ۱۹۶۹ء)

اس طرح مخدوم نے سلیقۂ اظہار پر زور دیا ہے جو شاعر کو زندہ رکھتا ہے بات بھلے ہی دہرائی ہوئی سہی کبھی کبھی محض جوشِ بلاغت کی وجہ سے لطف دے جا

[redacted]

ہے اسلوب کا بھی فرق شعرار کے لہجے کے تعین اور فرق مراتب میں مدد دیتا ہے
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے .. میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں
غالب کہتا ہے ؎
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد .. آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

ان دو شعروں میں جو فرق ہے وہ دراصل دو بڑے شاعروں کے اسلوب کا فرق ہے۔ ذیل کے ان اشعار کی تازگی دیکھیئے ایسا لگتا ہے انیس و دبیر دونوں ہی یونین کار بائیڈ والے گیس کے حادثے کے وقت بھوپال میں تھے البتہ دونوں شعراء کے اسلوب کا فرق نمایاں ہے ؎

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

انیس کے اس خیال کو دبیر نے اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے ؎

یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں
جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحبِ مکاں

حالانکہ دبیر کے اس شعر میں الفیاتی آوازوں کی وجہ سے اک صوتی خوش آہنگی پائی جاتی ہے مگر زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں (جانیں) جمع کے بجائے (جان) واحد کے استعمال کا محل تھا (جسم رعشہ دار کی رعایت سے) یا پھر پورے شعر میں صیغۂ جمع (اجسام رعشہ دار) کا رکھا جانا اور زلزلے کا (سے) بھی بُری طرح ملبے کے نیچے آگیا ہے۔

مخدوم کے یہاں مصرعے دیتے نہیں بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ بھرپور ادا بنگی کی مثال ملتی ہے الاماشاءاللہ۔ جیسے۔

جھلوتے میداں میں نوکِ سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکشِ دلِ پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے

سرِ شعر پہ ، یزداں کے گلے میں تو نوکِ سِناں ٹوٹ ہی رہی ہے خود یزداں بھی مخدوم کے گلے میں پھنس رہا ہے (صرف "یزد" ادا ہو رہا ہے) اور بقول مخدوم "خیال کی تبدیلی سے دوسرے اور پیچیدہ سوال ادب میں پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں ۔"

مخدوم کے ہاں عصری حسیت تغزل کی چاشنی کے ساتھ ہے اور یہی مخدوم کی مقبولیت کا سبب بھی ہے ترقی پسندوں نے جبریہ طور پر غزل کے بالمقابل نظم کو اپنانے کی شعوری کوشش کی ۔ مگر جانِ جاں آخر کار غزل ہی کو سُپرد کرنی پڑی ۔ مجاز ، فیض اور جاں نثار اختر آج اگر سرخ رو ہیں بھی تو محض غزل کی وجہ یہی حال مخدوم کا ہے ۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان شاعروں کی نظمیہ شاعری معمولی یا غیر اہم ہے ، بلکہ غزل کی وجہ سے ان کے چہرے اُجاگر ہوئے ہیں نظم ان کی پہچان قائم کرنے میں ناکام رہی مگر غزل نے یہ کام کر دکھایا ۔

مخدوم نے اپنی زندگی کے آخری دہے میں غزل کہنا شروع کی تھی ان غزلوں میں جو رومان ہے وہ ان کی نظموں میں بھی جاری و ساری ہے جیسے "آج کی رات نہ جا بھاگ متی" "ملاقات" "جز تری آنکھوں کے" وغیرہ میں تغزل ہے ۔ اور

ع خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے (طور)

ع وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آگیا (رقص)

ع رات کی شہ رگوں سے اچھلتا لہو جوئے خوں بن گیا (چاند تاروں کا بن)

ع اک چنبیلی کے منڈوے تلے / میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر / دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے (چارہ گر)

ع سانس کی طرح آپ آتے رہے جاتے رہے (انتظار)

جیسے مصرعے مخدوم کے مزاج میں تغزل کی نشاندہی کرتے ہیں لفظ تو مفہوم کی ادائیگی کا اک بہانہ ہے ورنہ لفظ میں واقعی جان تو سلیقۂ اظہار سے پڑتی ہے جیسے

"لپوٹ" دکنی زبان کا منفی انداز کا اک ایسا لفظ ہے جو دغا باز اور بے ایمان آدمی کے لیے بولا جاتا ہے مگر "بساطِ رقص" میں شامل "مضمون" من ترا حاجی بگویم" میں ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مخدوم کے لیے جس پیار سے لپوٹ کا لفظ استعمال کیا ہے اس لفظ میں تغزل کی اک دنیا رکھ دی ہے جس پر ہزار دیوان قربان کیئے جا سکتے ہیں نفی کو اثبات سے بدل کر رکھ دیا ہے رمز و کنایہ، استعارہ و علامت کا استعمال یہی کچھ تو شاعری ہے ہنر لفظوں سے نہیں بلکہ لفظوں کے استعمال کے سلیقے سے کھلتا ہے رات پھولوں کی بات پھولوں کی یا کائنات پھولوں کی کہہ دینے سے تغزل پیدا نہیں ہو جاتا۔

اردو ادب سلیمان اریب (مدیر صبا مرحوم) کا مرہونِ منت رہے گا جنھوں نے اصرار کر کے مخدوم سے غزل کے گیسو سنوارنے کا کام لیا (ویسے اس میں کسی آہوئے خوش چشم سے نسبت کو بھی دخل ہو گا) ورنہ مخدوم تو خواجۂ شہر، دولت خاں اور امامانِ صد فکر و فن ہے جن کی آنکھوں میں نفرت کا کالا دھواں اور جن کی سانسوں میں انی کی پھنکار تھی، خار کھائے ہوئے ماسکو کی خیالی جنت میں پناہ گزیں تھے جو ترقی پسندوں کا لبادہ رہا ہے۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

مخدوم نے بڑی مترنم بحر میں استعمال کی ہیں جو بجائے خود غنائیت کی ضامن ہیں

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر ۔۔ چشم نم مسکراتی رہی رات بھر
رات بھر درد کی شمع جلتی رہی ۔ غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر
سناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا ۔ اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں
اب کہاں جا کے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے ۔ ایک آنسو جو سر چشم وفا ہوتا ہے

مگر اس میں شک نہیں مخدوم کی غزل میں کھردرا پن بھی در آیا ہے۔ جیسے

سیاستِ دل آئینہ چور چور تو تھی ÷ سیاستِ دل آہن گراں بھی ٹوٹی ہے

[illegible]

تبصرہ نگار: رشید الدین تبصرہ

دھوپ، تتلی، پھول

(پریہ درشی ٹھاکر کا شعری مجموعہ)

پریہ درشی ٹھاکر بنیادی طور پر ہندی کے شاعر ہیں جو اردو میں خیالؔ تخلص کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو دنیا میں زیادہ معروف نہیں ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے "ٹوٹا ہوا پل" (نظمیں) اور "رات گئے" (غزلیں) شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے بعد میں انہوں نے اُردو لپی میں بھی شائع کیے۔ زیرِ نظر مجموعہ کی پہلے ہندی میں شائع ہو چکا ہے اور پھر اب اُردو میں شائع ہوا ہے۔ ان کا وصف یہ ہے یہ صرف لپی تبدیل کرتے ہیں زبان نہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کتنی سادہ ہندی لکھتے ہیں۔ اردو سے بھی وہ بہت اچھی طرح واقف ہیں اور اس زبان کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک ہندی شاعر کو اُردو میں لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ آج کل اس کے برعکس ہو رہا ہے تو وہ اس بارے میں کہتے ہیں۔

"روزمرہ، بول چال کی ہندوستانی زبان ہی مجھے شاعری پسند کرنے والوں کے عام آدمی سے جوڑتی ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری شاعری اگر سنسکرت الفاظ سے بوجھل ہندی میں یا عربی، فارسی الفاظ سے لیس خالص اُردو میں ہوتی تو اسے پڑھنے، سننے اور سمجھنے والے اتنے نہ ہوتے جتنے اب ہیں۔ اس لیے جہاں تک زبان کا سوال ہے میں وہاں بیٹھ کر شعر کہتا ہوں جہاں ہندی اُردو مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔"

اس طرح وہ اپنی غزلیں اور نظمیں بہت آسان اور عام فہم قسم کی اردو جسے گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ زبان بھی کہا جاسکتا ہے۔ میں لکھتے ہیں ۔

غزل کے بارے میں وہ کہتے ہیں ۔

''میری رائے میں غزل ایک ایسا آرٹ فارم ہے جس کے ہر ایک شعر کی گاگر میں ایک ایک ساگر بھرا جا سکتا ہے پھر اسی بات کو کہنے کے لئے صفحات رنگنے کا فائدہ ۔ دوسرے بحروں کی پابندی، اسلوب اور قواعد، غزل کو یوں سنگیت نیتے اور لوچ دیتے ہیں جو سچی شاعری کی روح ہوتی ہے، بحر، ردیف اور قافیہ کی پابندیاں شعر کہنے والے کے لئے بھی ایک تخلیقی چنوتی ہوتی ہے کہ ان پابندیوں کو نبھاتے ہوئے وہ کتنی خوبصورتی، صحیح الفاظ اور لاجک کے ساتھ اپنی بات کہتا ہے ۔''

ابھی تک شاعر کا میں نے آپ سے شخصی تعارف پیش نہیں کیا۔ ٹائٹل کے آخری صفحہ پر ان کا جو مختصر سا تعارف شائع ہوا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ "دھوپ"، "تتلی"، "پھول"، کے شاعر پریہ درشی ٹھاکر خیال ۲۲ اگست ۱۹۴۶ء کو موتی ہاری (بہار) میں پیدا ہوئے پٹنہ اور دلی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھگت سنگھ کالج نئی دہلی میں تین سال تک تاریخ کا درس دیتے رہے ۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسیز میں ہیں اور فی الحال جے پور میں رہتے ہیں ۔" صفحہ آخر پر ان کی چھوٹی سی تصویر بھی دی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک خوبرو جوان ہیں ۔ ان کے حالات زندگی اور "میری بات" (پیش لفظ) میں ان کے خیالات پڑھنے اور پھر ان کے شعروں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مہذب، شائستہ، روشن خیال اور اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والے فرد ہیں ۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ہم انھیں ایک معیاری شاعر کہہ سکتے ہیں ۔

کسی سرسبز زمانے کی یادگار یہاں ۔ کچھ ہی باقی ہیں درخت اور چھتنار یہاں
کاٹ لو تم یہ بچے پیڑ بھی لیکن دیکھو ۔ سانس لینا تمہیں ہو جائے گا دشوار یہاں

زیر نظر شعری مجموعہ میں ۸ نظمیں اور ۳۵ غزلیں ہیں جن کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظم اور غزل دونوں پر پوری اُترتی ہیں نظمیں وہ آزاد کہتے ہیں اور غزلیں چھوٹی بحر اور سہل ممتنع میں نہایت مرصع۔ نظمیں طویل ہیں اس لئے یہاں نمونہ دینے کی گنجائش نہیں لیکن ان کی غزلوں کے شعر بھی کچھ کم نہیں۔ ان کی غزلوں میں صرف حسن و عشق کی باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ عصری تقاضوں کو بھی وہ محیط کرتے ہیں۔ ان کے شعر پڑھتے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاعر شعور کی دولت سے مالا مال ہے اور محض قافیہ پیمائی اور روایت کی پاسداری ہی نہیں کر رہا ہے ان کی غزلوں کے یہ رومانی اشعار پڑھیئے ؎

ٹھیک ہے چھوڑ دیا ہے مجھے تم نے لیکن
خود سے اپنے کو بھی کچھ اور کیا ہے تم نے

ربط کی راہ میں آگ کا دریا یا رب ۔ راستے ترک تعلق کے تو آساں ہوتے

لہجہ میں تلخیوں کا سبب آپ ڈھونڈ ئیے
اس طرح سخت بولنا میری تو خُو نہیں

جو ستے ملی ہی نہیں گم وہ مجھ سے کیا ہوگی ۔ یہ طئے سمجھ کر تجھے اب میں کھو نہیں سکتا

"شاداب" کے صفحات کسی طویل تبصرہ کے متحمل نہیں ہو سکتے ورنہ یہ کتاب تو ایسی ہے کہ اس پر ایک طویل اور خوبصورت تبصرہ لکھا جا سکتا ہے پھر بھی میں یہاں شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک خط کے چند جملے نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو انھوں نے شاعر کو لکھا تھا۔

"آپ کو غزل کا خاصا سلیقہ ہے۔ زبان عام طور پر بہت صاف اور برجستہ ہے آپ ہماری گنگا جمنی تہذیب کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔"

اور بشیر بدر کی یہ رائے (سلسلہ ۴۳ پر)

جگن ناتھ آزاد
کا دورۂ برطانیہ و جرمنی، دو ماہ کا علمی، ادبی سفر

اُردو کے مشہور شاعر، نقاد اور محقق پروفیسر جگن ناتھ آزاد جو اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لٹریچر بریڈفورڈ اور انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر کی دعوت پر جون کے وسط میں برطانیہ گئے تھے ہندوستان واپس آ گئے ہیں۔

پروفیسر آزاد نے بریڈفورڈ جانے سے قبل لندن میں اُردو سنیٹر برطانیہ کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار بہ عنوان "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور شاعری" کی صدارت کی جس میں انہوں نے حضرت جوش کے ساتھ اپنے نو برس کے مراسم پر روشنی ڈالتے ہوئے جوش صاحب کی زندگی کے بعض ایسے واقعات پیش کیے جو ابھی تک معرضِ تحریر میں نہیں آئے۔ اِن واقعات کے ساتھ ہی ساتھ پروفیسر آزاد نے زبان و بیان کی اُن تمام باریکیوں اور نزاکتوں کو مثالوں سمیت وضاحت کے ساتھ پیش کیا جو حضرتِ جوش ملیح آبادی کو عزیز تھیں۔

اِسی اُردو سنیٹر برطانیہ نے دوسرے ہفتہ لندن میں "جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام" کا پروگرام منایا جس میں آزاد صاحب نے اپنے زندگی بھر کے ادبی سفر پر روشنی ڈالی اور ان شخصیتوں کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا جن کے قدموں میں انھیں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے والدِ محترم (منشی تلوک چند) محروم اور اپنے دوسرے اساتذہ شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر

اقبال، پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، پروفیسر علم الدین سالک اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی یادیں تازہ کیں اور تفصیل سے بتایا کہ یہ لوگ کس طرح علم وادب میں ڈوبے ہوئے لوگ تھے اور علمی ان کا پیشہ نہیں تھا بلکہ عشق تھا۔

ایک سوال کے جواب میں پروفیسر آزاد نے بتایا کہ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف انھیں حاصل نہیں ہو سکا۔ اگرچہ اُن کا گھر کھلا دربار تھا اور جو چاہتا وہاں بآسانی پہنچ کے علامہ اقبال کا نیاز حاصل کر سکتا تھا لیکن مجھے دنیا کے اتنے بڑے شاعر کی خدمت میں حاضر ہونے کا حوصلہ ہی نہ ہو سکا۔ علامہ اقبال سے ملاقات نہ کر سکنے کی بات چیت کو جگن ناتھ آزاد نے جگر مرادآبادی مرحوم کے اس شعر پر ختم کیا۔

اُس شاہدِ لفظ و معنی سے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اُس کے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاقِ عام نہیں

جگن ناتھ آزاد کی تقریر سوال و جواب سمیت کوئی دو گھنٹے تک جاری رہی جس کے اختتام پر انھوں نے سامعین کی فرمائش پر اپنا کلام پیش کیا آخر میں محمد سرور (جنگ لندن) کی فرمائش پر آزاد نے اپنی وہ مشہور نظم سنائی جو انھوں نے اپنے پہلے سفرِ پاکستان میں کہی تھی ؎

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

اُس سوال کے جواب میں کہ آپ جموں میں مستقل طور پر قیام پذیر ہیں یا عارضی طور پر آزاد صاحب نے بتایا کہ ریاست جموں و کشمیر سے باہر کا کوئی شخص ریاست میں مستقل طور پر مقیم نہیں ہو سکتا۔ آرٹیکل ۳۷۰ کی وجہ سے۔ اس لیے میں جموں میں مستقل طور پر تو مقیم نہیں ہوں (چونکہ آئینی طور پر وہاں کا شہری نہیں ہوں) لیکن نہ

ے کہ اہلِ جموں نے جس عزت و احترام اور محبت کے ساتھ میری اور میرے چھوٹے
ڑے ادبی اور علمی کام کی پذیرائی کی ہے اُس کے پیشِ نظر میں آئین کی نظر میں
ہاں کا شہری نہ ہو کر بھی حقیقتاً وہیں کا شہری ہوں۔ جموں یونی ورسٹی نے مجھے
حیات ایمیریٹس شپ کا ایوارڈ دیا ہے اور پرسنل اسٹاف مہیا کر کے مجھے اپنا علمی
در ادبی کام کرنے کی آسانیاں فراہم کی ہیں۔ کشمیر یونی ورسٹی نے مجھے آنریری
ی لٹ کا اعزاز دیا ہے یہ سب غالباً ابھی تک جموں و کشمیر نے اپنے کسی شہری
ے لیے نہیں کیا۔ اس صورت میں اگر میں اپنے آپ کو جموں کا شہری کہتا ہوں
ر سمجھتا ہوں تو اس میں کیا قباحت ہے؟

اقبال اکادمی برمنگھم اور انجمن ترقی اُردو برمنگھم کی مشترکہ دعوت پر جگن ناتھ آزاد برمنگھم تشریف لے گئے جہاں مذکورہ دونوں انجمنوں نے برمنگھم یونی ورسٹی یں علامہ اقبال کے فکر و فن پر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کے لیکچر کا انتظام کیا تھا۔ لیکچر سے قبل پروفیسر سعید اختر درانی نے اقبال اکادمی کی جانب سے اور جناب عبداللہ بادہا نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے پروفیسر آزاد کو استقبالیہ ایڈریس پیش کیے۔

پروفیسر آزاد نے اپنے لیکچر میں جو کوئی ایک گھنٹے تک جاری رہا اقبال کے فکر اور ان کی شاعری کی مختلف منزلوں اور مدارج پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اقبال کے فکر و فن کا مطالعہ اُن کی نثر کے مطالعے کے بغیر نامکمل ہے اقبال کو سمجھنے کے لیے صرف ان کی شاعری کا مطالعہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ انھوں نے نثر میں جو کچھ لکھا ہے اردو میں اور انگریزی میں، خواہ وہ ان کے خطوط ہیں یا مضامین یا لیکچر یا لجسلیٹو کونسل میں اُن کی تقریریں، ان سب کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے
اس ضمن میں پروفیسر آزاد نے خاص طور سے The Reconstruction of Religious Thought in Islam کا ذکر کیا اور کہا کہ علامہ کی یہ تصنیف علامہ کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

رات کو یونی ورسٹی کے اسی آڈیٹوریم میں ایک کُل برطانیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں برطانیہ کے متعدد شعراء شلاً عاشور کاظمی، سعید اختر درانی، یاسمین حبیب غلام رسول نازکی اور دوسرے حضرات شریک ہوئے۔ آخر میں صاحب صدر جگن ناتھ آزاد نے اپنی متعدد غزلیں اور نظمیں سُنائیں۔

جگن ناتھ آزاد کے الفاظ میں اس سفر کا سب سے زیادہ محرکہ آرا پروگرام جس میں انھوں نے شرکت کی بریڈفورڈ کی بین الاقوامی اُردو کانفرنس تھی۔ اس کا موضوع تھا۔ برصغیر ہند و پاک سے باہر کے ممالک میں اُردو۔ اس کانفرنس میں ہندوستان سے جگن ناتھ آزاد، نثار احمد فاروقی اور آفاق احمد شریک ہوئے اور پاکستان سے محسن احسان اور ساسد محمد خان۔ یہ کانفرنس برطانیہ کے دو علمی اور ادبی اداروں — انجمن فکر و فن (صدر ڈاکٹر ایس اے علوی) اور بزم اُردو (صدر حضرت شاہ) کے باہمی تعاون سے منعقد ہوئی۔ خط و کتابت، موضوعات کا تعین۔ یہ سب ڈاکٹر علوی کے ذریعے سے ہوا اور انھیں کانفرنس کے دنوں میں اس قدر مصروف کیا گیا کہ غالباً انھیں کھانا کھاتے یا چائے پینے کی بھی فرصت نہ ملی ہوگی۔ حضرت شاہ کانفرنس کے دنوں میں صبح سے شام تک شرکائے کانفرنس کی تواضع چائے کافی سے کرتے رہے۔

"برطانیہ میں ایشیائی بچوں کو اُردو کیسے پڑھائی جائے" اس موضوع پر مسعود منور کا کام عملی صورت میں دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اُن کے سامنے بچوں کی ایک کلاس موجود تھی انھوں نے نمونے کے طور پر انھیں اُردو نثر اور اُردو نظم پڑھائی، جس محنت، تن دہی اور محبت کے ساتھ انھوں نے یہ کام انجام دیا۔ اسے دیکھ کر سامعین عش عش کر اُٹھے۔ مسعود منور ناروے میں ناروےجین بچوں کو اُردو پڑھاتے ہیں اگر برطانیہ یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں بچوں کو اُردو پڑھانے کے لیے ایسے اساتذہ میسّر آجائیں تو برصغیر ہند و پاکستان سے باہر اُردو کا قافلہ منزلیں مارتا چلا جائے۔

اس سفر میں ساقی فاروقی سے ایک مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ لندن کے ایک ادبی جلسے میں جو حیدرآباد کے احباب نے منعقد کیا تھا۔ بریڈفورڈ اردو کانفرنس میں اُن کی تقریر سنی۔ "دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار" والا معاملہ تھا۔ پروفیسر آزاد نے بتایا کہ میں نے ساقی فاروقی کی تقریر پہلی بار سنی تھی۔ اور اب آرزو یہ ہے کہ جلد ہی پھر کہیں اُن کی تقریر سننے کا موقع ملے۔

اِس کانفرنس میں برمنگھم سے پروفیسر سعید اختر درانی بھی شریک ہوئے اور یاسمین حبیب بھی۔ گزشتہ برس برمنگھم میں پروفیسر درانی سے ملاقات نہ ہو سکی تھی کیونکہ آپ غالباً اُس وقت چین گئے ہوئے تھے۔ اب کے ان کے ساتھ خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔

کانفرنس پورا اعتبار سے اپنے مقاصد میں یعنی برطانیہ میں فروغِ اردو کے پیشِ نظر کامیاب رہی، لیکن مقاصد میں صد فی صد کامیابی کے لیے پیروی کا عمل Follow up Action ضروری ہوتا ہے یقین ہے ڈاکٹر ایس اے علوی اس امر کی جانب پوری توجہ دیں گے۔

کانفرنس کے خاتمے کے بعد بریڈفورڈ کالج میں جگن ناتھ آزاد کی زیرِ صدارت ایک عالمی مشاعرہ ہوا جس میں برطانیہ کے شعراء کے علاوہ محسن احسان (پاکستان) اور اسد محمد خان (پاکستان) بھی شریک ہوئے۔

ایک سیشن فکشن کا بھی ہوا جس میں قیصر تمکین علوی، اسد محمد خاں، آفاق احمد اور دوسرے افسانہ نگار حضرات نے اپنے افسانے پڑھے۔

اگلے روز اسی کالج میں ایک بہت بڑا انٹرنیشنل مشاعرہ منعقد ہوا جس میں پاکستان کے وہ تمام شعراء شریک ہوئے جو اوسلو کے مشاعرے سے واپس آئے تھے اس کی صدارت ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کی۔ جگن ناتھ آزاد نے بتایا کہ اس میں ہندوستان سے تو صرف میں اور جمیلہ بانو شریک ہوئیں۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

کو اسٹیج پر مدعو کر کے صفِ شعراء میں بٹھایا گیا لیکن وہ تھوڑی دیر بعد خود ہی اسٹیج سے اُتر کر صفِ سامعین میں آکر بیٹھ گئے۔ پاکستان کے جن شعرائے شرکت کی اُن سب کے نام تو آزاد کو یاد نہ آسکے، جو نام انھوں نے بتائے وہ یہ ہیں شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، محسن احسان، عطاء الحق قاسمی، حسن رضوی، اجمل نیازی، توفیق بٹ، سلیم کوثر، جمال احسانی، اسد محمد خان۔ آزاد نے معذرتی انداز میں بتایا کہ ایک زمانے میں میرا حافظہ بہت اچھا تھا لیکن اب میں اکثر نام اور چہرے بھول جاتا ہوں۔

اِس مشاعرے کے ایک روز بعد ہڈرز فیلڈ میں ایک انٹرنیشنل مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ بعض اور شعراء حضرات نے بھی شرکت کی۔

جگن ناتھ آزاد بریڈفورڈ سے فرنڈشم اور وہاں سے واپس لندن چلے گئے لیکن جرمنی روانہ ہونے سے قبل انھیں برمنگھم سے دوبارہ ایک مشاعرے کی دعوت ملی اب کے یہ دعوت انجمنِ فانوسِ ادب (صدر عباس ملک) کی جانب سے تھی۔ اِس مشاعرے میں بھی انھیں صدارت کا اعزاز دیا گیا۔ پاکستان کے وہ تمام شعراء جو بریڈفورڈ میں شریکِ مشاعرہ تھے اِس وقت انجمنِ فانوسِ ادب کی دعوت پر برمنگھم آچکے تھے۔ وہ سب شریکِ مشاعرہ تھے۔ آزاد نے مشاعرے اور ڈنر کے بعد عباس ملک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے مجھے ایک بار پھر اپنے احبابِ پاکستان سے ملوادیا ہے یہ میرے لیے جان اور دل کی حیثیت رکھتے ہیں اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

جگن ناتھ آزاد نے اِس نامہ نگار کو بتایا کہ کانفرنس، لیکچروں اور مشاعروں کے علاوہ اُردو کے تعلق سے اور باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ایک تو کمپیوٹر کے ذریعہ سے اُردو کی جدید ترین طباعت۔ اگرچہ اِس کی ایک جھلک میں روزنامہ نوائے وقت

[redacted]

لاہور اور روزنامہ "جنگ" کراچی کے چھاپہ خانوں میں دیکھ چکا تھا لیکن روزنامہ جنگ لندن کے دفتر میں جانے کا اتفاق، خواہش کے باوجود ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ اِس سفر میں جنگ لندن کے دفتر میں جانے کا وقت بھی مجھے مل گیا۔ ایک تو وہاں نئے اور پرانے دوستوں سے ملاقات ہو گئی، دوسرا محمد سرور اور انور خالد کی بدولت وہ تمام مشینیں دیکھنے کا موقع ملا جن کی بدولت اُردو کی طباعت برطانیہ اور یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کی طباعت سے آنکھ ملا سکتی ہے "جنگ" کے دفتر میں اُس مشین کا کام میرے لیے معجزے سے کم نہ تھا جو پلک جھپکنے کی دیر میں طویل سے طویل نسخ عبارت کو نستعلیق میں تبدیل کر دیتی ہے۔

بریڈفورڈ میں ہفتہ وار "راوی" کا پرنٹنگ پریس دیکھ کر بھی دلی مسرت ہوئی یہ چھاپہ خانہ بھی فوٹو اور طباعت کی جدید ترین مشینوں سے لیس ہے۔ "راوی" برطانیہ کا ایک اہم ہفتہ وار اُردو اخبار ہے جو سال ہا سال سے اُردو دنیا کی خدمت میں مصروف ہے

"بک سنٹر" بریڈفورڈ برطانیہ کی ایک اُردو کتابوں کی دکان کا نام ہے لیکن اسے محض اُردو کتابوں کی دکان کہنے سے بات واضح نہیں ہو سکتی۔ یہ دُکان بلکہ اسٹور تین طویل و عریض منزلوں پر محیط ہے ایک اور چھوٹا سا فلور جسے انگریزی میں MEZZANINE فلور کہتے ہیں، ان تین کے علاوہ ہے۔ میں نے زندگی میں اُردو کتابوں کی اتنی بڑی دکان نہ ہندوستان میں دیکھی ہے نہ پاکستان اور نہ کسی اور ملک میں۔ یہ اُردو کتابوں کی محض ایک دکان نہیں ہے۔ مغربی دُنیا میں اُردو کا ایک ادارہ ہے۔ خدا اِسے زندہ و سلامت رکھے!

لندن، فرودشم، برمنگھم، بریڈفورڈ اور ہڈرز فیلڈ کے بعد پروفیسر آزاد کی منزل میونخ (جرمنی) تھی۔ وہی میونخ جہاں کی یونیورسٹی نے علامہ اقبال کو ۱۹۰۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ آزاد نے بتایا کہ میونخ میں دو ایک دن کے قیام کے دوران [illegible]

مرتبہ: مومن خاں شوق
اشرف ولا ۳-۷-۲۲۴-۱۱ ملے پلی۔ حیدر آباد

ہماری ادبی سرگرمیاں

۶ اگست ۹۱ء۔ دفتر اردو اکیڈمی اے سی گارڈ میں اردو خواندگی کے موضوع پر سیمنار کا انعقاد عمل میں آیا۔ جناب محمد جلیل پاشاہ صدر نشین اردو اکیڈمی نے صدارت کی۔ پروفیسر کرشنا مورتی وائس چانسلر حیدر آباد یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سیمنار کو مخاطب کرنے والوں میں جناب محمد جلیل پاشاہ، پروفیسر کرشنا مورتی سعد حسین سعد (آئی اے ایس) عارف الدین سلیم ایڈیٹر نیوز ٹرسٹ آف انڈیا۔ رحمٰن جامی اسلم فرشوری (آل انڈیا ریڈیو) علاء الدین انصاری ایڈوکیٹ شامل ہیں ڈائرکٹر اردو اکیڈمی مسٹر محمد مسعود بن سالم نے خیر مقدم کیا۔ پی آر او اردو اکیڈمی جناب حسن فرخ نے شکریہ ادا کیا۔

۷ اگست ۶½ بجے شام ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہوا۔ جناب منظور احمد منظور نے صدارت کی بمسرز شاہد صدیقی شاہد (کینڈا) اور بدر الدین مسعود انصاری نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور اجلاس سے خطاب کیا۔ اس موقع پر حیدر آباد کے ایک کہنہ مشق شاعر جناب مسعود صدیقی کے مجموعۂ کلام دیوانِ مسعود کی رسم اجرا جناب راشد آذر نے انجام دی۔ شریک معتمد جناب صلاح الدین نیر نے خیر مقدمی تعارفی تقریر کی۔ جناب سریتو اس لاہوٹی نے حسرت موہانی اور سیاسی زندگی کے زیر عنوان مضمون پڑھا۔ اور جناب مومن خاں شوق نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔ ان تخلیقات پر تبصرہ کیا گیا مبصر

[redacted]

میں مسرز عاتق شاہ، راشد آذر، محمد قمر الدین صابری، صلاح الدین نیر، پروفیسر طیب انصاری، اکمل حیدرآبادی، عزیز بھارتی، ذکی شاداب اور محترمہ نجمہ نکہت شامل تھے۔ جناب صلاح الدین نیر نے شکریہ ادا کیا۔

١٠ اگست کو ہندی بیٹھک سنگھ کا ٢٠ واں ادبی اجلاس پروفیسر رام نرنجن پانڈے کی صدارت میں لچھمی بھون، رام کوٹ میں منعقد ہوا۔ ہندی کے مشہور شاعر و نقاد آچاریہ ترلوچن شاستری (دہلی) مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر وشنو تیندر شرما، پروفیسر وجیندر نارائن سنگھ نے مخاطب کیا۔ سکریٹری ہندی بیٹھک سنگھ نے رپورٹ پیش کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے میوزک کلب جامعہ عثمانیہ کے تعاون سے ہندی کے مشہور شعرا پرساد، سینت نرالا اور مہادیوی کا کلام ساز پر پیش کیا۔ اتوار ١١ اگست کو رویندرا بھارتی تھیٹر میں جسٹس گوپال راؤ اکبوٹے کی صدارت میں ادبی اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر اندو وششٹ، ڈی ایس سنگھ مندرجی، ڈاکٹر رام نرنجن پانڈے نے مخاطب کیا۔ شری تیج راج جین کی ادارت میں شائع کتاب آشیرواچن کی رسم اجرا جسٹس گوپال راؤ اکبوٹے نے کی۔ اجلاس کے دوسرے دور کی صدارت پدم شری جگدیش متل نے کی۔ انہوں نے ہندی کے ٨ ادیبوں کی کتابوں کی رسم اجرا انجام دی۔ ٧ بجے شام نمائش میدان میں ادیبوں کی ایک شام چائے کی میز پر کے زیر عنوان تقریب میں ہندی، اردو، تلگو، کنڑی، مرہٹی کے شاعروں نے حصہ لیا۔ اردو کے کنوینر جناب صلاح الدین نیر، ہندی کے نلجا پرشاد اور تلگو کے نکھلیشور تھے۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور مخاطب کیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بھی مخاطب کیا۔

١١ اگست۔ مرکز ادب حیدرآباد کا ماہانہ غیر طرحی مشاعرہ ٧ بجے شام بمقام اشرف ولا ملے پلی زیر صدارت جناب منوہر لعل بہار منعقد ہوا۔ جناب گیان سنگھ شاطر اور ڈاکٹر مسیح حسن مہمانِ خصوصی تھے۔ جناب عزیز بھارتی صدر ادارہ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ محمود شریف محمود نے مشاعرہ کی نظامت کی۔ مسرز منوہر لعل بہار، گیان سنگھ شاطر، ڈاکٹر مسیح حسن، ادیب تصیب

صلاح الدین نیرؔ، عزیز بھارتیؔ، مومن خاں شوقؔ، محمود شریف محمودؔ، منان منظورؔ، سکندر محسن (کھمم)، ڈاکٹر غیاث عارفؔ، ابوالفاروق قسعور، مسرور عابدی، عزیز ناگپوری اور لطیف الدین لطیف نے اپنا کلام سنایا۔ مومن خاں شوقؔ نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴ اگست کو ۷ بجے شام مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انیسٹیوٹ میں زیر صدارت جناب نریندر لوتھر روزنامہ سیاست حیدرآباد کا توسیعی لیکچر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جناب ضیاء الدین شکیبؔ نے "حیدرآباد کل اور آج" کے عنوان پر سیر حاصل تقریر کی۔ دانشوروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ جناب محبوب حسین جگرؔ جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد نے خیر مقدمی تقریر کی اور جلسہ کی کارروائی چلائی۔ اس تقریب کو صدر جلسہ جناب نریندر لوتھر نے بھی مخاطب کیا۔

۱۵ اگست کو اُردو اکیڈیمی کے آفس (ایسی گارڈ) میں ۶½ بجے شام جشن آزادیٔ ہند کا مشاعرہ ہوا جس کی صدارت صدر نشین اُردو اکیڈیمی جناب محمد جلیل پاشاہ نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے وزیر فینانس مسٹر سنتوش ریڈی اور پرنسپال سکریٹری ایمپلائمنٹ اسکیمس مسٹر آر پارتھا سارتھی نے شرکت کی اور مخاطب کیا۔ اس موقع پر صدر اجلاس جناب جلیل پاشاہ نے بھی اجلاس سے خطاب کیا۔ جناب صلاح الدین نیرؔ کنوینر مشاعرہ تھے۔ ابتداء میں سکریٹری اُردو اکیڈیمی جناب مسعود بن سالم نے خیر مقدمی تقریر کی اس مشاعرہ میں ڈاکٹر علی احمد جلیلیؔ، خواجہ شوقؔ، راشدؔ آذر، صلاح الدین نیرؔ، رئیس اختر رحمٰن جامیؔ، ناصر کرنولی، اکمل حیدرآبادی، خورشید جنیدی، عزیز بھارتیؔ، گیان سنگھ شاطرؔ، منظور احمد منظورؔ، فیض الحسن خیالؔ، علی الدین نویدؔ، حسن فرخؔ، منان منظورؔ، مومن خاں شوقؔ، ڈاکٹر محمد علی اثرؔ، ڈاکٹر منیر الزماں منیرؔ، مظہر مہدی، قدیر انصاری اور ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے کلام سنایا۔ جناب حسن فرخ نے شکریہ ادا کیا۔

۱۷ اگست "میرا شہر میرے لوگ" کی جانب سے یادِ مسعود صدیقی کا اہتمام کیا گیا جناب راشد آذر نے صدارت کی جبکہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے مرزا امیر احمد خسرو

رئیس اختر، رحمٰن جامی اور شاہد صدیقی شاہد نے شرکت کی اور مخاطب کیا۔ صدر جلسہ نے بھی مخاطب کیا۔ امیر احمد خسرو، راشدہ آذر، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، رحمٰن جامی، شاہد صدیقی شاہد (ڈاکٹر) فیض الحسن خیال، اکمل حیدرآبادی، عزیز بھارتی، مومن خاں شوق۔ منان منظور، علی الدین نوید، گیان سنگھ شاطر، ریاست علی تاج، ذکی شاداب، قاضی انجم عارفی، طاہر گلشن آبادی، قدیر انصاری مسرت نے کلام سنایا سکریٹری "میرا شہر میرے لوگ" وکنوینر تقریب جناب صلاح الدین نیر نے خیر مقدمی تقریر کی اور شعری و ادبی محفل کی کارروائی چلائی۔

۱۸ر اگست کی شب گاندھی بھون تھیٹر میں سرود یہ کار یا معال میں گیت چاندنی کا ۱۵ واں مشاعرہ جناب رئیس اختر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز رئیس اختر، نیپال سنگھ ورما، منان منظور، ڈاکٹر اندو وششٹ، نرنید رراۓ ویر بہ کاش لاہوٹی سعادن مندرجی اور دیگر شاعروں نے کلام سنایا۔ جناب نیپال سنگھ ورما نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۹ر اگست کی شام بہ مقام انجمن قمر، ملے پلی میں ممتاز شاعرہ فاطمہ نسرین (امریکہ) کے مجموعۂ کلام "بہاروں کی منزل" کی رسم اجراء محترمہ فاطمہ الطاف نے انجام دی۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے صدارت کی اور مخاطب کیا۔ مہمانان خصوصی محترمہ فاطمہ عالم علی خاں، ڈاکٹر اختر سلطانہ ڈاکٹر صابرہ سعید، انجم قمر سوز اور قمر جمالی نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا محترمہ فاطمہ الطاف اور فاطمہ نسرین نے بھی مخاطب کیا۔ محترمہ انیس قیوم فیاض نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ رسم اجرا تقریب کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، فاطمہ نسرین، انجم قمر سوز، مظفر النسا ناز اور ریشماں نے کلام سنایا۔ محترمہ مظفر النسا ناز نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۱ر اگست کو ۶ بجے شام مہری مارٹن انسٹیٹوٹ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے صدارت کی۔ جناب رشید الدین نے رحمٰن جامی کا کمال

شاعر۔ لاجواب آدمی کے زیر عنوان مضمون پڑھا۔ جناب طاہر گلشن آبادی نے منتخب کلام پیش کیا۔ مبصرین کی حیثیت سے مسرز سریتواس لاہوٹی، راشد آذر صلاح الدین نیر، رئیس اختر، اکمل حیدرآبادی، ریاست علی تاج، ذکی شاداب، ناظر الدین، قدیر انصاری، سکندر محسن (کھمم) محترمہ نجمہ نکہت اور قمر جمالی نے حصہ لیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۲۴ر اگست ۹.۳۰ بجے شب گاندھی بھون لائبریری ہال میں گمت چاندنی کی ۸۹ ویں ماہانہ شعری نشست ڈی ایس سنگھ ٹھاکر چیف ایڈیٹر ہندی ملاپ کی صدارت میں منعقد ہوئی مسٹر نیہال سنگھ ورما نے معتمد کے فرائض انجام دیئے۔ کھمم کے ممتاز شاعر جناب سکندر محسن مہمان خصوصی تھے۔ راکھی پورنیما کی مناسبت سے شعراء نے راکھی تیوہار پر بھی کلام سنایا۔ اس شعری نشست میں مسرز ڈی ایس سنگھ ٹھاکر، سکندر محسن، نیہال سنگھ ورما، چیتن لال رودی، رودی منوہر پیرشاد گپتا، وید پرکاش لاہوٹی، ساون بجرنگ لال ورما، وجے وشال نریندر رائے، شریمتی پشپا ورما، شریمتی ریکھا اگروال، کماری سنگیتا ہنتی، فرید متین، کنہیا لال شرما، منندر مصرا، منان منظور، راجندر کمار، محمود نشتر، دیجے ناتھ سکینہ، بیگم ورما نے کلام سنایا۔

۲۵ر اگست کو ۳ بجے دن ادارہ ادب اسلامی کا طرحی مشاعرہ ہوا جناب علی الدین نوید نے صدارت کی۔ جناب محمد شریف محمود نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ببیر جری القادری کی تلاوت قرآن کے بعد ابوالفاروق شعور نے طرحی نعتیہ کلام سنایا۔ مسرز رومی قادری، نظیر علی عدیل، داؤد نصیب، ڈاکٹر عقیل ہاشمی (عثمانیہ یونیورسٹی) ڈاکٹر راہی، اقبال ہاشمی، حبیب گوندیاوی، ساقی الوبی، اسمعیل ظریف، جلیل ہما آبادی، رؤف رحیم، قاضی سعید فیضان، خواجہ ضمیر، ڈاکٹر طیبات عارف، ستار صدیقی، یوسف نظر، محمد بن حسین نقیب صادق نوید، غیاث متین، مسعود جاوید ہاشمی، فرید متین، ثاقب ہاشمی، کلیم صدیقی، زاہد قادری قمر رضا، خورشید ساجد، رشید عدیل [illegible] [redacted]

شاداب

جلد (۸) شمارہ (۱۰)

اکتوبر سنہ ۱۹۹۱ء حیدرآباد

فون 229161

زرِ تعاون

	سالانہ	اداروں کیلئے	تاحیات
ہندوستان	65 روپے	120 روپے	1500 روپے
خلیجی ممالک	200 ″	360 ″	3700 ″
امریکہ	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	45 پونڈ	400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

:-(ترسیلِ زر کا پتہ):-

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد

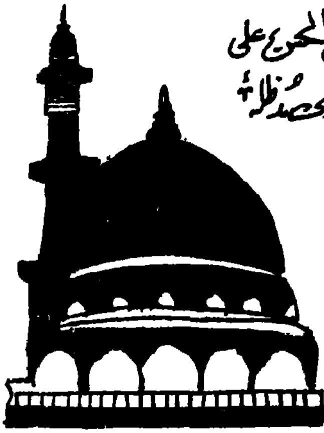
▲ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے پبلک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

مضمون نگار حضرات
اپنی نگارشات صاف
خوشخط اور مختصر
ایک جانب کاغذ پر ارسال فرمائیں
کہ جواب طلب
امور کے لئے جوابی لفافہ یا کارڈ
آنا ضروری ہے
(ادارہ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی
حسنی ندوی مدظلہٗ

سیرت کا پیغام



سب جانتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی دنیا کچھ ویران اور کوئی قبرستان نہ تھی، زندگی کا چکر جس طرح اس وقت چل رہا ہے بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُس وقت بھی چل رہا تھا سارے کاروبار آج کی طرح ہو رہے تھے، تجارت بھی تھی زراعت بھی تھی اور حکومتوں کا نظام چلانے والے اور ان کی مشنری میں فٹ ہونے والے بھی موجود تھے اُس وقت کی دنیا کے لوگ اس زندگی پر بالکل قانع اور مطمئن تھے اور ان کو اس میں کسی ترمیم یا اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین کا نقشہ اور دنیا کی یہ حالت بالکل پسند نہ تھی، حدیث میں اس زمانہ کے متعلق ہے۔

"اِنَّ اللّٰہَ نَظَرَ اِلٰی اَھْلِ الْاَرْضِ فَمَقَتَھُمْ عَرَبَھُمْ وَعَجَمَھُمْ اِلَّا بَقَایَا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ"

اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین پر نظر ڈالی، اس نے روئے زمین کے تمام باشندوں، کیا عرب کیا عجم سب کو پہلے حد ناپسند فرمایا اور وہ ان سے بے زار ہوا۔ سوائے اہلِ کتاب کے چند افراد کے

ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپؐ کے ساتھ ایک پوری قوم کے ظہور کا سامان کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کو کسی ایسے مقصد کے لیئے پیدا کیا تھا جو دوسری قوموں سے پورا نہیں ہو رہا تھا جو کام وہ سب پورے انہاک اور شوق کے ساتھ انجام دے رہے تھے اس کے لیے ظاہر ہے کہ کسی نئی اُمت کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی اور انسان زندگی کے اس پرسکون سمندر میں اس نئے تلاطم کی حاجت نہ تھی جو مسلمانوں کے وجود سے ظہور میں آیا اور جس نے زمین میں ایک زلزلہ ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تسبیح و تقدیس کے لیئے ہم نیازمند بہت کافی تھے اس کے لیئے اس خاکی پتلہ کو پیدا کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّی اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ گویا اشارہ فرمایا (اور آگے چل کر واضح کر دیا) کہ آدمؑ صرف اسی کام کے لیئے پیدا نہیں ہوئے جو ملائکہ انجام دے رہے تھے۔ ان سے خدا کو کچھ اور کام لینا ہے۔

اگر مسلمان صرف تجارت کے لیئے پیدا کئے جا رہے تھے تو مکہ کے ان تاجروں کو جو شام و یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے اور مدینہ کے ان بڑے بڑے یہودی سوداگروں کو جن کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوتے تھے۔ یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لیئے ہم گنہگار کیا کم تھے کہ اس کے لیئے ایک نئی اُمت پیدا کی جا رہی ہے۔ اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ اور خیبر کے، طائف اور نجد کے، شام اور یمن اور عراق کے کاشت کاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشت کاری اور زراعت میں ہم محنت و کوشش کا کون سا دقیقہ اُٹھا رکھتے ہیں کہ جس کے لیے ایک نئی اُمت کی بعثت ہو رہی ہے، اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشنری میں صرف فٹ ہونا تھا اور حکومتوں کے نظم ونسق اور دفتری کاروبار کو معاوضہ لے کر چلانا تھا تو روم اور ایران کے کارپردازانِ سلطنت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہم بہت

[illegible] داروں کی کیا

ضرورت ہے۔

لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لیئے پیدا کیئے جارہے تھے جو دُنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا اور نہ دے سکتا تھا اس کے لیئے ایک نئی اُمت ہی کی بعثت کی ضرورت تھی چنانچہ فرمایا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ ۔　(آل عمران ۱۱۰)

تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ۔ بھلائی کا حکم دیتے اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا۔ اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہا۔ دُنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کر لیں اور زریں موقع کھو دیئے۔ پانی کی طرح اپنا خون بہایا اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کیا ان مقاصد و مشاغل کے لیئے جن پر آج مسلمان قانع نظر آتے ہیں اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور ہموار تھا اور اس راستہ پر معاصر دنیا سے کوئی بڑی کشمکش اور تصادم نہیں تھا اور نہ یہ اہل عرب اور دُنیا کی دوسری قوموں کے لیئے وجہِ شکایت تھی انھوں نے تو بار بار انھیں چیزوں کی پیشکش کی (جو آج عام مسلمانوں کا منتہا ہے) اور ہر بار اسلام کے داعی نے ان کو ٹھکرایا۔ دولت و سرداری، عیش و عشرت اور راحت و تن آسانی کی بڑی پیشکش کو نامنظور کیا۔ پھر اگر مسلمان کو اسی سطح پر آجانا تھا جس پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے اور زندگی کے انھیں مشاغل میں منہمک اور سر تاپا غرق ہو جانا تھا۔ جن میں اہلِ عرب اور رومی و ایرانی ڈوبے ہوئے تھے اور انھیں کامیابیوں کو اپنا

منتہائے زندگی بنا لینا تھا جن کو ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بہترین موقع پر رد کر چکے تھے تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر و حنین و احزاب اور قادسیہ و یرموک میں بہایا گیا' بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سرداران قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہو تو مسلمانوں کو خطاب کر کے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصل زندگی سمجھ رکھا ہے انھیں چیزوں کو ہم گنہگاروں نے تمہارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سامنے پیش کیا تھا وہ تمام چیزیں اس وقت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہو سکتی تھیں تو کیا ساری جدوجہد کا حاصل اور ان تمام قربانیوں کی قیمت وہ طرز زندگی ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے اور زندگی و اخلاق کی وہی سطح ہے جس پر تم نے قناعت کر لی ہے' اگر ان سرداران قریش میں سے جو اسلام کے حریف تھے' کسی کو یہ جرح کرنے کا موقع ملے تو آج ہمارا کوئی بڑے سے بڑا لائق وکیل بھی اس کا تشفی بخش اور مسکت جواب نہیں دے سکتا اور امت کے لیے اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے متعلق یہی خطرہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا مقصد نہ بھول جائیں اور دنیا کی عام سطح پر نہ آ جائیں۔ آپ نے وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

"ما الفقر اخشیٰ علیکم ولکنی اخشیٰ ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علیٰ من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلککم کما اھلکتھم[1]" ([1] بخاری و مسلم)

مجھے تمہارے بارے میں کچھ فقر و افلاس کا خطرہ نہیں ہے مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی وہی کشائش نہ حاصل ہو جائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوئی' تو تم بھی اسی طرح اس میں حرص و مقابلہ کرو جیسے انھوں نے

کیا تو تم کو بھی اسی طرح ہلاک کر دے جیسے ان کو ہلاک کیا۔

مدینہ کے انصاریوں نے جب اس بات کا ارادہ کیا کہ جہاد کی مشغولیت اور اسلام کی جدوجہد سے کچھ دنوں کی فرصت حاصل کر کے اپنے باغوں، کھیتوں اور کاروبار کو درست کریں اور کچھ مدت کے لیئے صرف اپنے کاروبار میں مشغول ہونے کی اجازت حاصل کر لیں، یہ خطرہ بھی ان کے دل میں نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ ارکانِ دین نماز، روزہ حج و زکوٰۃ سے بھی کچھ دنوں کے لیئے اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرا لیں، لیکن اسلام کی عملی جدوجہد اور دین کے فروغ اور اس کے غلبہ کی کوشش سے ان کی اس عارضی یکسوئی کو بھی خودکشی مترادف قرار دیا گیا اور سورہ بقرہ کی آیت نازل ہوئی جس کی تفسیر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کی ہے۔

وَانفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (سورہ بقرہ ۱۹۵)

اللہ کے راستہ پر خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور اچھی طرح کام کرو بیشک اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

مسلمان کی زندگی کی اصلی ساخت یہی ہے کہ یا تو اسلام کی دعوت اور عملی جدوجہد میں مشغول ہو یا اس دعوت و عملی جدوجہد میں مشغول ہونے والوں کے لیئے پشت پناہ و مددگار ہو، اس کے ساتھ بھی عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم اور شوق رکھتا ہو، مطمئن شہری اور محض کاروباری زندگی اسلامی زندگی نہیں اور کسی طرح بھی ایک مسلمان کا مقصودِ حیات نہیں ہو سکتا۔ جائز مشاغل زندگی، جائز وسائل معیشت ہرگز ممنوع نہیں بلکہ نیت و احتسابی کے ساتھ عبادت و قربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں مگر یہ جب سب دین کے سایہ میں ہوں اور صحیح مقاصد کا وسیلہ ہوں نہ کہ خود مقصود بالذات۔ سیرتِ محمدی کا یہ سب سے بڑا پیغام ہے جو خالص مسلمانوں کے نام ہے اس کی طرف توجہ نہ کرنا اس مقصد کو ضائع کرنا اور سب سے بڑی حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہے جو یہ ۔ مجموعی مسلمانوں [illegible]

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی
اورنگ آباد

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ماخذ

اسلام کی گزشتہ تیرہ صدیوں کے دوران مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی حیاتِ طیبہ پر سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ان میں مسلمان مورخوں اور سیرت نگاروں کے علاوہ مستشرقین (ORIENTALISTS) عیسائی اور یہودی مورخوں کی کتابیں بھی شامل ہیں (یہاں ہم نے مورخ کا لفظ اس لیئے استعمال کیا ہے کہ بیوگرفی کو اصل میں علم تاریخ ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا رہا ہے)

سر ولیم میور کی" لائف آف محمدؐ" کو مستشرقین ایک معروضی اور منصفانہ تصنیف قرار دیتے ہیں حالانکہ اکثر جگہوں پر اس کتاب میں غلط بیانی اور اختراع سے کام لیا گیا ہے یہی باعث ہے کہ سر سید احمد خاں کو اس کتاب کا جواب لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی قرونِ وسطی کے عیسائی مورخوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں خرافات کا ایسا طومار باندھ رکھا ہے کہ ان کی تصانیف تاریخ اور بیوگرافی نہ رہ کر اسلام کے خلاف کھلا پروپگنڈہ بن کر رہ گئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب قرونِ وسطیٰ کی عیسائی دنیا تلوار اور طاقت کے بل پر اسلام کی توسیع اور اشاعت کو روکنے میں ناکام رہی تو عیسائیت کے نام نہاد علمبرداروں نے قلم کے ذریعہ اسلامی تعلیمات اور حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو توڑ مڑوڑ کر پیش کرنا شروع کر دیا کیونکہ انھیں اس بات کا خدشہ لاحق تھا کہ کہیں ان کے ہم مذہب افراد اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر

اپنا آبائی مذہب ترک کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں ۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مارگولتھ نے آنحضرت ؐ کی سوانح حیات لکھی تھی اور اس نے کتب احادیث کی غلط تعبیروں کی بنا پر رسول اکرم ؐ کی حیات طیبہ کے متعلق بڑے خطرناک نتائج اخذ کیئے تھے ۔ ۱۹۰۶ عیسوی کے آس پاس مولانا محمد علی نے (جو ایک سچے عاشقِ رسول ؐ تھے) مولانا شبلی سے مارگولتھ کی کتاب کا رَد لکھنے کی فرمائش کی تھی تب ہی سے سیرت النبی ؐ قلمبند کرنے کا خیال مولانا شبلی کے لیئے وظیفۂ جان بن گیا تھا۔ مولانا نے مغربی مصنفین کی کتابوں کو منگوا کر دیکھا اور جب اپنے کام کے سلسلے میں انھوں نے زیادہ تحقیق کی تو ان کو احساس ہوا کہ یورپ کی توپوں اور مشین گنوں کے لیئے گولہ بارود خود مسلمان مورخوں نے فراہم کیا تھا ۔ نومبر ۱۹۱۲ء کے ایک مکتوب میں مولانا شبلی لکھتے ہیں ۔

" یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے ۔ ان کے ایک ایک حرف کے لیے سینکڑوں اوراق اُلٹنے پڑتے ہیں ۔ یہ کم بخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے ۔ یہاں تو خود ہمارے سیرت نگاروں نے بہت بے احتیاطیاں کیں " (حیات شبلی، شیخ محمد اکرام)

ہمارے سیرت نگاروں کے تعلق سے یہاں مولانا شبلی کا اشارہ جرجی زیدان کی ضخیم تاریخ تمدنِ اسلامی' کی طرف ہی ہوسکتا ہے جس کا رَد مولانا نے عربی زبان میں الانتقاد کے نام سے لکھا تھا۔ بہرحال سیرۃ النبی ؐ کی تصنیف کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا مولانا شبلی کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ لیکن ان کے بعد اُن کے شاگرد اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے سی جلدوں میں سیرت النبی ؐ تصنیف کی ۔ بلاشبہ یہ کام اُن کے اعمال حسنہ کا ایک وقیع سرمایہ تو ضرور ہے لیکن اس کو سیرۃ النبی ؐ کے تعلق سے حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا ۔

مصر جدید کے عالم محمد حسین ہیکل نے جن کی مادری زبان عربی ہے موجودہ صدی کے نصفِ اول میں اپنی ضخیم کتاب "حیاتِ محمد" شائع کی تھی ۔ اس کا پیش لفظ جامعہ ازہر کے شیخ الکبر محمد مصطفےٰ المراغی نے تحریر کیا تھا ۔ (۱۳۵۴ھ) اس کتاب کے اب تک ۱۴ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں ۔

اس کے آٹھویں ایڈیشن کا انگریزی زبان میں ترجمہ ۱۹۷۶ء میں پہلی بار شمالی امریکہ اور کینیڈا کے مسلم طلبار کی انجمن اور سعودی عرب ریاض کے الندوۃ العالمیۃ للشباب اسلامیہ کی اعانت سے شائع کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر اسماعیل الفاروقی ٹمپل یونیورسٹی فلاڈلفیا میں کارگزار ہیں۔ درحقیقت یہ کتاب فاضل مصنف محمد حسین ہیکل کے عمیق نظر اور ذوقِ تجسس کی آئینہ دار ہے۔ حیاتِ رسول اللہؐ کے اصل متن کے علاوہ اس کتاب میں لگ بھگ دوسو صفحات پر مشتمل وہ تعلیقات ہیں جو فاضل مصنف نے یورپی مصنفوں کی ہرزہ سرائیوں کے رد میں لکھے ہیں (شاید یہی وجہ ہے کہ شکاگو یونیورسٹی پریس اور بعد میں ٹمپل یونیورسٹی پریس دونوں نے باقاعدہ معاہدہ کے باوجود اس کی اشاعت کو منسوخ کر دیا تھا۔ اپنے پیش لفظ میں مترجم الفاروقی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ درپردہ کچھ طاقتیں اس کتاب کی اشاعت کو رکوانے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھیں)" حیاتِ محمدؐ کے مصنف محمد حسین ہیکل نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب جدید سوانح نگاری کے اصولوں کو سامنے رکھ کر لکھی ہے اور ان کا نقطۂ نظر سرتاسر معروضی ہے اور یہ کہ انھوں نے سیرۃ النبیؐ کے ابتدائی ماخذ کی انھیں روائیتوں کو اپنی تصنیف میں جگہ دی ہے جن کو موجودہ صدی کا راسخ فکر ذہن قبول کر سکتا ہے۔

اصولاً سیرۃ النبیؐ کی بنیاد قرآن حکیم، احادیث اور ان کے بعد ابتدائی ماخذ پر رکھی جانی چاہیئے کیونکہ بعض سیرت نگاروں کا زمانہ عہدِ نبوی سے قریب کا ہے اور اس زمانی قرب کی وجہ سے مستند مواد کے امکانات زیادہ ہیں۔ سب سے پہلے ہماری نظر ابن اسحٰق کی طرف جاتی ہے جنھیں اولین سیرت نگار کہلانے کا شرف حاصل ہے لیکن عام طور پر عبدالملک ابن ہشام (متوفی ۲۱۸ھ) کو پہلا سیرت نگار تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ سیرت النبیؐ پر سب سے پہلی کتاب ابنِ اسحٰق (وفات ۸۵ھ) نے تصنیف کی تھی۔ اس تسامح کی وجہ یہ ہے کہ ابن اسحٰق کی سیرت النبیؐ کا اصل نسخہ اب معدوم ہو چکا ہے اگر ابن ہشام نے اپنی ضخیم کتاب حیاتِ محمد رسول اللہ صلعم میں ابن اسحٰق کے متن کو شامل نہ کیا ہوتا تو آنے والے زمانوں،

ابن اسحٰق کے نام سے تک واقف نہ ہوتے۔ واضح ہو کہ ابن ہشام نے محض اپنے پیشرو کے متن پر اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ اپنی طرف سے بھی انھوں نے بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔

ابن اسحٰق کے حالاتِ زندگی کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ ۸۵ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اس وقت مسندِ خلافت پر اموی خلیفہ عبدالملک متمکن تھا جب دمشق کی اموی خلافت کا خاتمہ ہوا تو ابن اسحٰق کی عمر بیس سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس طرح ابن اسحٰق نے اموی خلافت کے خلاف عباسی تحریک کے آغاز و انجام کا مشاہدہ کیا تھا اغلب ہے کہ اپنے مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ہی سیرتِ رسول اللہؐ کا بڑا حصہ ابن اسحٰق نے مکمل کر لیا تھا۔ جب اس کتاب کے مندرجات کا مدینہ منورہ میں چرچا ہوا تو وہاں کے علماء نے ابنِ اسحٰق کے اسلوبِ تحریر اور بعض سوانحی حالات کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور مصنف کو اس قدر تنگ کیا کہ وہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ واضح ہو کہ مدینۃ النبی شروع ہی سے اہلِ حدیث کا مرکز رہا ہے چونکہ ابن اسحٰق حضور اکرم کے وصال کے ۷۵ سال بعد پیدا ہوا تھا تو اس وقت مدینہ میں تابعین کی کثیر تعداد موجود تھی جن کی تربیت صحابہ رسول اللہ نے کی تھی اور جنھوں نے حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں صحابۂ کرام کی زبانی بہت کچھ سُن رکھا تھا ہو سکتا ہے کہ حیاتِ رسول اللہ کے تعلق سے ابن اسحٰق کی بہت ساری باتوں کو خرق العادات مظاہر کا آب و رنگ دے کر لکھا گیا تھا مدینہ کے علماء نے بدعت اور بے ادبی پر محمول کیا ہو۔ مصر میں ہی جہاں مدینہ سے بھاگ کر ابن اسحٰق نے پناہ لی تھی ان کی کتاب کے بعض حلقوں کی مخالفت ہوئی۔ وہاں سے ابنِ اسحٰق دارالخلافہ بغداد چلے گئے عباسی خلیفہ المنصور ابو جعفر نے ان کی دل کھول کر قدر کی۔ اغلب ہے کہ بغداد ہی میں ابنِ اسحٰق نے اپنی "حیاتِ رسول اللہؐ" مکمل کی ہو۔ ابنِ اسحٰق بغداد ہی میں ۱۵۱ ہجری میں وفات پا گئے۔ ابن اسحٰق اور ابن ہشام کے سنینِ وفات میں لگ بھگ ۷۶ سال کا فرق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ابن ہشام نے اپنی کتاب "حیاتِ رسول اللہؐ" کی تصنیف کی تو ابن اسحٰق کی اصل کتاب کا نسخہ ان کے سامنے تھا جس کے متن کو ابن ہشام نے اپنی

کتاب میں شامل کیا تھا (ابنِ اسحٰق کی اصل کتاب کے تلف ہونے کی وجہ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتی) بہر کیف بعد کے سیرت نگاروں نے ابنِ ہشام کی کتاب کو سامنے رکھ کر ابن اسحٰق کے متن کو علاحدہ کتابی صورت میں شائع کیا (ہمارے سامنے اس وقت مائیکل ایڈورڈس کی ایڈٹ کی ہوئی ابنِ اسحٰق کی حیاتِ محمد ہے جو لندن سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی اس کے علاوہ دہلی سے ۱۹۸۵ء میں ابنِ ہشام کی مرتبہ سیرتِ النبیؐ کی کامل دو ضخیم جلدیں شائع ہوئی ہیں جن کی ترتیب و تہذیب میں مولانا عبدالجلیل صدیقی اور مولانا غلام رسول مہر نے حصہ لیا ہے)

مستشرقین اور بعض جدید مسلمان سیرت نگار (جیسے کہ محمد حسین ہیکل) ابن اسحٰق کی سیرت رسول اللہؐ کے ان حصوں کو اہمیت نہیں دینا چاہتے جہاں کہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کے سوانحی حالات کے تعلق سے جگہ جگہ معجزوں اور فرق العادات واقعات کے ظہور کی اطلاع دی ہے مثلاً آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت کے سلسلے میں ابن اسحٰق نے لکھا ہے "جب حضورؐ شکم مادر میں تھے تو حضرت آمنہ سے ایک غیبی آواز یوں مخاطب ہوتی۔ " آپ کے شکم مبارک میں عرب قوم کا سردار نشو و نما پا رہا ہے۔ اس کی ولادت باسعادت کے موقعہ پر آپ کو یہ کہنا ہے" میں خدائے واحد کی امان میں اس بچے کو دیتی ہوں حاسدوں اور ظالموں سے اور تم اس بچہ کا نام محمدؐ رکھنا" حضرت آمنہ نے محسوس کیا کہ جیسے آپ کے جسدِ مبارک سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور ان کی روشنی سے شام اور بصرہ کے قلعے منور ہو گئے ہیں (رسول اللہؐ کے ابتدائی حالاتِ زندگی۔ ابنِ اسحٰق کی کتاب کا انگریزی ترجمہ صفحہ ۷۱) ابن اسحٰق ہی سے روایت ہے کہ حضورؐ کی ولادت باسعادت پر مدینہ کے ایک مکان کی چھت پر کھڑا ہو کر ایک یہودی اپنے قبیلے کے لوگوں سے کہہ رہا تھا "اے لوگو! غور سے سنو! میں نے اس ستارے کو بلند ہوتا دیکھا ہے جس کے سائے میں رسولِ خدا کی ولادت ہوتی ہے (انگریزی ترجمہ ایضاً) ۔ اس طرح کی اور بھی روایتیں ابن اسحٰق کی کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا منصبِ نبوت پر فائز رسولوں کے تعلق سے معجزوں اور فرق العادات

واقعات کا ظہور نا ممکن ہے؟ جبکہ نفسیات جدید نے روحانی مظاہر (PSYCHI- CAL PHENOMENA) کے بارے میں دفتر کے دفتر مہیا کر دیئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نبی اکرمؐ نے اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں رسل ماسق کی طرح نہ تو معجزوں کا سہارا لیا تھا اور نہ ہی کفار مکہ کی طرف سے معجزوں کے ظہور کی مانگ پر کوئی توجہ دی تھی۔ آنحضرت کے نزدیک توسب سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے اس کے باوجود اگر ابن اسحٰق اور بعض دوسرے مسلمان سیرت نگاروں نے فوق العادات مظاہر کے ظہور کی اطلاع دی ہے تو ان کی حد تک شبہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔

ہمارے اپنے دور میں علامہ اقبال جیسا عاشق رسولؐ مشکل ہی سے ملے گا۔ مولانا مودودی نے اقبال پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے۔ مگر شاید کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے تفلسف کو اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔"

حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ ذہن، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کی ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا کہ جس میں بیان ہوا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہؓ کے ساتھ احد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں احد لرزنے لگا اور حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھہر جا! تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا، کوئی نہیں ہے۔ اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔" اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے میں اس کو استعارہ ومجاز نہیں بلکہ ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور

میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ اگر تم حقیقت سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک بنی کے نیچے مادہ کے بڑے بڑے تودے بھی لرز جاتے ہیں۔ مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں۔"

محمد حسین ہیکل نے "حیاتِ محمدؐ" میں ابن اسحٰق بتوسط ابن ہشام کے حوالے سے دوسری روایتیں تو بیان کی ہیں مگر انھوں نے فرق العادات مظاہر کی روایتوں کو اپنی تصنیف میں نظرانداز کر دیا ہے۔ فاضل مصنف نے شق صدر کی آیات کی بھی الگ طرح سے تفسیر کی ہے۔ ابن اسحٰق کی رو سے شق صدر کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب آپؐ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بھیڑیں چرانے میں مصروف تھے۔ (ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں خود آنحضرت سے یہ روایت کی ہے۔ جلد پنجم پارہ عم[۳۰] سورہ الم نشرح ص ۱۴۷) سیرۃ النبیؐ کامل مرتبہ ابن ہشام میں ابن ہشام کے حوالے سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ نے آپؐ سے کہا "اے اللہ کے رسولؐ۔ اپنے کچھ حالات بیان فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا ..." میں اپنے گھروں کے پیچھے اپنے ایک بھائی کے ساتھ تھا اور ہم اپنی بکریوں کے بچے چرا رہے تھے کہ دو شخص سفید کپڑے پہنے ہوئے میرے پاس برف سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت لے کر آئے۔ انھوں نے مجھے پکڑا اور میرا پیٹ چاک کیا۔ میرا دل نکالا اور اسے بھی چاک کیا اس میں سے ایک کالا گوشت کا ٹکڑا نکالا اور پھینک دیا۔ پھر انھوں نے میرا دل اور پیٹ اس برف سے یہاں تک دھویا کہ اسے پاک کر دیا ..... (پورے متن کے لئے دیکھئے جلد ا ص ۸۶ ا-۱۸۷)

لیکن محمد حسین ہیکل کی رو سے ان آیاتِ کریمہ کو روحانی مفہوم میں لیا جانا چاہئے جس سے رسول اکرم کی سینے کی کشادگی اور تطہیر مراد ہے اور اس طرح آپ کو منصبِ نبوت کا اہل بنانا ہے

ابن اسحٰق بتوسط ابن ہشام کے بعد ابن سعد کی طبقات الکبریٰ الواقدی کی مغازی اور صحیح بخاری و مسلم سیرۃ النبی کے اہم ماخذ ہیں۔ جدید مصنفوں کی حد تک امیر علی کی "اسپرٹ آف اسلام" ایک مقبول تصنیف ہے محمد حسین ہیکل کی طرح امیر علی نے بھی ابن اسحٰق کی روایتوں کو اپنی

کتاب میں جگہ نہیں دی ہے۔ وہ رسول اکرمؐ کی شخصیت کو انسانی سطح پر رکھ کر اس کی عظمت کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں لیکن امیر علی کے ہاں سیرۃ النبیؐ کا صرف خاکہ ملتا ہے۔
کچھ عرصہ پہلے مارٹن لنگس کی حیات محمد رسول اللہؐ شائع ہوئی تھی۔ (۱۹۸۳ء)
میرے خیال میں مسٹر لنگس وہ پہلے مغربی مصنف ہیں جنھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں کوئی طویل مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ انھوں نے رسول اکرمؐ کے سوانحی حالات کے لیئے ابتدائی ماخذ سے رجوع کیا ہے۔ پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق نے اس کتاب کے مصنف کو انعام سے نوازا تھا مگر بعد میں پاکستان کے علماء نے اس کتاب پر انعام دیئے جانے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ ویسے اگر اس کتاب کے مصنف کے بعض جگہوں پر ان کے اپنے نقطۂ نظر کو الگ رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کتاب بلا شبہ سیرت النبیؐ پر انگریزی تصانیف کی حد تک ایک اچھا اضافہ ہے۔

(بقیہ سلسلہ ص ۴۴ سے آگے)

الثقافۃ الاسلامیہ فی الھندیہ" جس کو المجمع العلمی دمشق نے شائع کیا ہے یہ ہندوستان کی علمی تاریخ ہے اور گویا ایک مکمل ڈائرکٹری کی حیثیت رکھتی ہے

الغرض ! ان کتابوں میں کوئی تو اشخاص کی علمیت اور خدمات پر کوئی علوم و فنون کی تاریخ و تعارف اور ماخذ کے متعلق اور کوئی فضلائے اسلام کی تصانیف کے تعارف و بیان میں بے مثل خزینہ ہیں ان فضلاء و حکماء کی کاوشوں اور تحقیق و جستجو نے جو یادگاریں اور نقوش چھوڑے ہیں ۔ اس بحر زخار میں سے چند قطرے بطور مثال پیش کیئے گئے ہیں۔ ان سب کی علمی خدمات کا احاطہ اور بیان اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ بہر صورت ان کی خدمات سے آج بھی دنیا فیض یاب ہو رہی ہے اور ان کو نظر انداز کسی دانشور کے لیے خارج از امکان ہے۔ ▲

خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ

وَلَا اُزَکِّیْ عَلَی الرَّحْمٰنِ ذَا بَشَرٍ لٰکِنَّ عِلْمَکَ عِنْدَ الْوَاحِدِ الْعَالِیْ

میں کسی بشر کو رحمان کے مقابلے میں پاکیزہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن آپ کے صحیح مرتبہ و مقام کا علم صرف خدائے واحد ہی کے پاس ہے

حَامِی الْحَقِیْقَۃِ نَسَّالُ الْوَدِیْقَۃِ فَکَّا کُ الْعُنَاۃِ کَرِیْمٌ مَاجِدٌ عَالِ

آپ حقائق کے حامی شدائد میں پختہ عزم و ہمت والے مصیبت زدوں کو نجات دلانے والے شریف النفس، عالی ظرف، بلند حوصلہ

کَشَّافُ مَکْرُمَۃٍ مِطْعَامُ مَسْغَبَۃٍ وَھَّابُ عَانِیَۃٍ وَجَنَاءُ شِمْلَالِ

کشادہ دلی سے کرم کرنے والے بھوکوں کو کھانا کھلانے والے مصائب زدہ کو بخشش دینے والے کو عظمت و جبروت اور پسندیدہ اخلاق ملے ہیں

عَفٌّ مَکَاسِبُہٗ جَزْلٌ مَوَاھِبُہٗ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ سَمْحٌ غَیْرُ فَکَّالِ

اُن کے اعمال پاکیزہ، اُن کی بخششیں بے حد و حساب ہیں، مروّت اور رُوا داری کرنے والے اور کسی سے انتقام لینے والے اور بُرائی کرنے والے نہیں

وَارِی الزِّنَادِ وَقَوَّادُ الْجِیَادِ اِلٰی یَوْمِ الطِّرَادِ اِذَا اشْتَبَّتْ بِاَجْذَالِ

آپ جنگ کے دن جب وہ اعداء کے مقابلے میں بھڑک اُٹھے تو آپ ایسے موقع پر جنگ کے شعلہ بھڑکا دینے والے اور تیز رفتار گھوڑوں کی قیادت کرنے والے ہیں

قمر صابری
ایڈیٹر شاداب

خیر البشر ﷺ

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نعت پاک کا توضیحی ترجمہ

لاریب مقابل میں رب کے پاکیزہ نہیں ہے کوئی بشر
کیا آپ کا رتبہ عالی ہے اللہ کو ہے بس اس کی خبر
آپ حامیِ حق و صداقت ہیں، اک پیکرِ عزم و ہمت ہیں
جب کوئی مصیبت آتی ہے اٹھ جاتے ہیں ہو کر سینہ سپر

آپ حاملِ ظرفِ عالی ہیں اور مردِ شریف اطوار بھی ہیں
ہیں آپ غریبوں کے والی بھوکوں کے دلی غم خوار بھی ہیں
آپ عفو و کرم کی موجِ رواں، جبروت کے کوہِ عالی ہیں
اخلاقِ پسندیدہ کے سبب ابرار بھی ہیں مختار بھی ہیں

پاکیزگیِ کردار میں اور تقویٰ میں نہیں ہے ان کی مثال
ہے نرم مزاجی ان کی صفت، ہے ان کو جفاؤں کا نہ ملال
اللہ رے اُن کا لطف و کرم، اللہ رے خوئے مہر و وفا
بدخواہوں سے بدلہ لینے کا آتا ہی نہیں ہے دل میں خیال

گرتے ہیں صفِ اعدا پہ سدا بجلی کی طرح ہنگامِ جدل
اقدار کے شعلے بھڑکا کر رہتے ہیں سدا مصروفِ عمل
میدان میں جنگی گھوڑوں کی کرتے ہیں قیادت بڑھ بڑھ کر
[illegible] ہر طور سے ہیں یہ خیر بشر

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا
[illegible] اسٹار کی ٹاؤن ۔ ناگپور

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم

کفر و بدعت کے اندھیروں کو مٹانے والا
نورِ حق خود ہے وہ نور لٹانے والا

لقبِ سرورِ کونین کا حامل ٹھہرا
اک چٹائی پہ وہ دربار سجانے والا

فیضِ قدرت نے بنایا اسے نبیوں کا امام
سب سے اوّل رہا وہ بعد میں آنے والا

حق میں بندوں کے یقیناً ہے وہ محسنِ خاص
ایک معبود کی پہچان بتانے والا

[illegible] بعثت ہے یہی راہ نمائے کامل
بھٹکے لوگوں کو رہِ راست پہ لانے والا

حسنِ کردار و عمل میں تھا بڑا لاثانی
جینے اور مرنے کے آداب سکھانے والا

اللہ اللہ رے یہ شان کہ امی ہو کر
علم و حکمت کا ہے وہ درس پڑھانے والا

اس کے جیسا نہ کہیں ہوگا کوئی صاحبِ دل
وہ غریبوں کو کلیجے سے لگانے والے

کوئی بتلائے ذرا ہوگا وہ کیسا انساں
بگڑے انسانوں کو انسان بنانے والا

سچ تو یہ ہے کہ دل و جاں سے پیارا ہے ہمیں
شمع ایمان دل و جاں میں جلانے والا

یاد آتا ہی رہے گا کسی عنواں ہر دم
سوئی تقدیر زمانہ کو جگانے والا

پاس اللہ نے خود اُس کو بُلایا منتا
کیا بشر ہوگا سرِ عرش وہ جانے والا

٭

جگن ناتھ آزاد

ولادتِ باسعادت

طویل نظم "جمہور نامہ" کا ایک حصہ

ساقی نامہ

پلا دے معرفت کی جس قدر بھی ہے مئے باقی
کہ میرے لب پہ ذکرِ فخرِ موجودات ہے ساقی

اٹھا وہ جام جو احساس کی دنیا کو گرما دے
مرے جذبے کو اپنی ایک موجِ مئے سے چمکا دے

جو مجھ کو بات کرنے کا مؤدب ڈھنگ سکھلا دے
مری گفتار کی قوت پہ یہ احسان فرما دے

کہ اب مجھ کو گزرنا ہے بڑے نازک مقاموں سے
کبھی بطحا کی صبحوں سے کبھی یثرب کی شاموں سے

جہانِ شاعری میں آج رہ جائے بھرم میرا
سخن سنجوں کی صف میں ہو نہ شرمندہ قلم میرا

مجھے لکھنا ہے اک انسانیت کا بابِ تابندہ
متوں جس کے ہوں الفاظ مصرعے جس کے رخشندہ

مجھے اک محسنِ انسانیت کا ذکر کرنا ہے؟
مجھے رنگِ عقیدت فکر کے سانچے میں بھرنا ہے

بیاں کرنا ہے اوجِ ابنِ آدم بن کے کون آیا
بیاں کرنا ہے فخر ہر دو عالم بن کے کون آیا

بتانا ہے کہ جب انسان سچی راہ بھولا تھا
یہ جب نازاں تھا کج بینی پہ گمراہی پہ پھولا تھا

تو کیونکر غیب سے انسانیت کا رہنما آیا
شفاعت کا لئے ساماں بشر کا آسرا آیا

وہ کیا ساماں تھے جب اتری تھی رحمت دو جہانوں کی
بلندی مل گئی کیونکر زمیں کو آسمانوں کی

بشر سے کس طرح تورات کے وعدے ہوئے پورے
سحر کے، شام کے، دن رات کے وعدے ہوئے پورے

بشارت جس کی دی تھی ابنِ مریم نے زمانے کو
وہ ہستی کون تھی کیوں آئی تھی محفل سجانے کو

نہ ہے تابِ سخن مجھ کو نہ ہے تقریر کا یارا
میں ذرہ ہوں مرا موضوع خورشیدِ جہاں آرا

کہانی لکھ چکا ہوں گرچہ چاند تاروں کی [1]
بہت دہرا چکا ہوں داستاں رنگیں بہاروں کی

مگر وہ چاند تارے پھول سورج سب ہیں جسمانی
جواب موضوع ہے خورشید مرا وہ ہے روحانی

یہ خورشیدِ ضمیر آرا ہے خورشیدِ معانی ہے
اسی خورشید کی ذرے کے لب پر اب کہانی ہے

---

[1] "جمہور نامہ" کے ابتدائی ابواب کی طرف اشارہ ہے

عرب اور باقی دُنیا کی حالت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل

عَرب

عرب کی سرزمیں پر خیمہ زن گہرا اندھیرا تھا
جہاں تک کام کرتی تھی نظر ظلمت کا ڈیرا تھا

عرب کی سرزمیں ہر قید سے آزاد دُنیا تھی
یہ دنیا اک عجب مجموعۂ اضداد دُنیا تھی

یہ صحرائے لق و دق یہ شُتر بانوں کا گہوارہ
لیئے بیٹھا تھا ہر گوشے میں ایماں سوز نظارہ

قبیلوں میں یہاں تقسیم تھی انسان کی دُنیا
فقط جنگ وجدل پر تھی خدا ایمان کی دُنیا

بہانا ڈھونڈتے پھرتے تھے انساں جنگ بازی کا
ہر اک گُر اُن کی گُھٹی میں پڑا تھا فتنہ سازی کا

بظاہر گرچہ تھے یہ دینِ ابراہیم کے پیرو
یہ باطن تھے یہ اپنی اپنی ہی تنظیم کے پیرو

یہاں جتنے بھی سینے تھے شجاعت کے ٹھکانے تھے
مگر اپنے بالآخر اِس شجاعت کے نشانے تھے

بہادر جس قدر بھی تھے، بہم دست و گریباں تھے
جُنوں وہ تھا کہ اپنے ہاتھ اپنے ہی داماں تھے

کمالِ بدزبانی تھا کمال اُن کی طافت کا
نمونہ فحش گوئی کا نمونہ تھا فصاحت کا

بڑا معیار تھا ان کی شرافت کا، نجابت کا
کہ دھندلا سا تصور بھی نہ تھا عورت کی عزت کا

یہ اپنی بیٹیوں کو جاکے زندہ گاڑ آتے تھے
کتابِ زندگی کا یہ ورق خود پھاڑ آتے تھے

سمجھتے تھے کہ بیٹی داغ ہے انساں کے دامن کا
اسے کہتے تھے وہ اک خار ہستی کے گلستاں کا

عجب ہی رنگ تھا ان کی ثقافت کا عدالت کا
نرالا ڈھنگ تھا ان کی شجاعت کا سخاوت کا

جو تھے جود و کرم والے نمایاں تھا یہ حال ان کا
کہ مجبوروں کے حق کو مار لینا تھا کمال ان کا

سخی جو تھے وہ بیواؤں کا حق اپنا سمجھتے تھے
جواں بیٹے جو تھے ماؤں کا حق اپنا سمجھتے تھے

یہاں مذہب کی عزت تھی نہ تھی ایمان کی عزت
نہ ہو ایمان کی تو پھر کہاں، انسان کی عزت

غرض اس سرزمیں کی تھی عجب ناگفتنی حالت
جو نظارہ تھا اس کا تھا وہی نظارۂ عبرت

جہاں قرآن بن کر حرفِ حق کو جگمگانا تھا
وہ خطہ آج اک گہرے اندھیرے کا ٹھکانا تھا

ایران

عرب سے مختلف ہی گرچہ تھا ایران کا عالم
یہاں بھی تھا مگر ناگفتنی ایمان کا عالم

شہنشاہی کی یہ اِن بے نور شمعیں جھلملاتی تھیں
بھڑک اٹھتی تھیں یہ کچھ دیر جب بجھنے پہ آتی تھیں
یہ ان بجھتی ہوئی شمعوں کا تھا انداز نورانی
کہ ظلمت میں اضافہ کر رہی تھیں ان کی تابانی

یونان اور رُوم

وہی یونان کہلایا تھا جو تہذیب کی دُنیا
وہی روئے زمیں پر آج تھا تخریب کی دُنیا
یہ تحقیق و تجسّس کا جہاں تھا آج ویرانہ
فلاطوں کی خرد، سقراط کی دانش سب افسانہ
زمیں پتھر ہی پتھر تھی گھٹا جس پر برستی تھی
کتابِ زندگانی اہلِ معنی کو ترستی تھی
ارسطو کی طاقت ایک گم گشتہ خزانہ تھی
سکندر کی شجاعت ایک پارینہ فسانہ تھی
وہ دُنیا جس پہ تھی اسکندرِ اعظم کی دارائی
بالآخر رومیوں کے ایک دن زیرِ نگیں آئی
یہ رومی کاروبارِ زندگی میں گرچہ ماہر تھے
مگر تہذیب کے معنیٰ سمجھنے میں یہ قاصر تھے
نہ تھا اُن کو ذرا فن و ہنر کے نام سے مطلب
انھیں تھا بس حکومت اور اس کے کام سے مطلب
یہ بے چارے رہے اخلاق کے عالم سے ناواقف
یہ آدم زاد تھے ہمدردیِ آدم سے ناواقف

چین

بہت چمکا فلک پہ چین کی تہذیب کا تارا
مگر اب بجھ کے ٹھنڈا ہو چکا تھا یہ جہاں آرا
زمانہ تھا یہاں جب عام تھی تعظیم کنفیوشس
دلوں سے ہو چکی تھی خواب تعلیم کنفیوشس

ولادت رسول اکرمؐ

غرض دنیا میں چاروں سمت اندھیرا ہی اندھیرا تھا
نشانِ نور گم تھا اور ظلمت کا بسیرا تھا
کہ دنیائے عرب کے آسماں پر ایک نور ابھرا
جہانِ کفر و باطل میں صداقت کا ظہور ابھرا

خبر سچائی کی دینا زمانے کو خبیر آیا
شہنشاہی بھی جس کے پاؤں چومے وہ فقیر آیا
بھٹکتے دور کو رستہ دکھانے رہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا

جسے حق نے کیا تسلیم ختم المرسلین آیا
جسے دنیا نے مانا رحمت اللعالمین آیا
خلیق آیا، کریم آیا، رؤف آیا، رحیم آیا
کہا قرآں نے جس کو صاحبِ خلقِ عظیم آیا

بصیرت عام فرماتا ہوا مردِ بصیر آیا
اندھیرے کی حکومت میں تجلی کا سفیر آیا

بشر بن کر زمانے کا جمالِ اوّلیں آیا
متاعِ صدق لے کر صادق الوعد و امیں آیا

وہ آیا فقر و فخری رتبہ ہے جس کی قناعت کا
وہ آیا جو معلم ہے جہاں میں دینِ فطرت کا

وہ آیا جس کو کہیئے فخرِ آدم ہادیِ اکرم
وہ آیا جس کو کہیئے زندگی کا محسنِ اعظم

سراپا علم بن کر صاحبِ اُم الکتاب آیا
زمینِ تشنہ لب کی زندگی بن کر سحاب آیا

تجلّی عام فرماتا ہوا شمس الضحٰے آیا
امام الانبیاء آیا محمد مصطفےٰ آیا

محمد مصطفےٰ یعنی وہ محبوبِ خدا آیا
دلوں نے سرخوشی پائی کہ احمد مجتبےٰ آیا

کبھی پھرتا رہا جو زندگی کی چشم حیراں میں
وہی جلوہ سمٹ کر آ گیا خود بزم امکاں میں

نوید جانفزا پائی یتیموں نے، غریبوں نے
غلاموں نے، بے سہاروں، بےکسوں، آفت نصیبوں نے

پیامِ زندگانی مل رہا تھا زیر دستوں کو
تصاویر آنکھیں دکھانی پھر رہی تھی خود پرستوں کو

دلِ دنیا سے ہر ارمان اُٹھتا تھا دعا بن کر
مسرت ناچتی تھی چار جانب یہ نوا بن کر

سلام

سلام اے ظلِّ سبحانی، سلام اے نورِ یزدانی
سلام اے وقت کی تقدیر کے ماتھے کی تابانی

سلام اے سازِ ایمانی، سلام اے سوزِ قرآنی
سلام اے حرفِ روحانی، سلام اے نطقِ ربانی

سلام اے آسمانِ قدس کے مہرِ جہاں آرا
سلام اے کیف و رنگِ نو بہار، اے گلستاں آرا

سلام اے رحمتِ عالم، سلام اے سیّدِ والا
سلام اے فخرِ آدم انبیاء کے طرّۂ زیبا

سلام اے نورِ حق اے شمعِ باطل خانۂ دنیا
سلام اے ساقیِ دریا دلِ میخانۂ دنیا

سلام اے دستگیرِ بے کساں اے ہادیِ اکرم
سلام اے دو جہاں کی زندگی کے محسنِ اعظم

سلام اے وہ کہ ہے پیغمبرِ اُمّی لقب تیرا
سلام اے وہ کہ تیری ذات پر نازاں نسب تیرا

سلام اے وہ کہ تجھے تیرے لیے تورات کے وعدے
جہاں سے تجھے سحر کے، شام کے، دن رات کے وعدے

سلام اے وہ کہ تیری ابنِ مریم نے بشارت دی
جہانِ زندگی کے کیف نے کم نے بشارت دی

سلام اے بے کسوں کو عزّ و جمندی بخشنے والے
سلام اے پست حالوں کو بلندی بخشنے والے

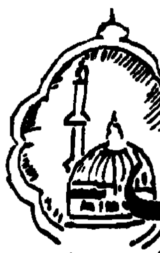
سلام اے دلیر باطل کی کلائی موڑنے والے
سلام اے آدمی کا حق سے رشتہ جوڑنے والے
سلام اے نازشِ و فخر و وقارِ آدمِ فانی
سلام اے بزمِ تاریک جہاں میں شمع نورانی

پروفیسر آزاد کو قومی یکجہتی ایوارڈ

حسینی ایوارڈ برائے قومی یکجہتی سوسائٹی لکھنو نے سنہ ۱۹۹۱ء کا حسینی ایوارڈ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے سید ضمیر نقوی سکریٹری حسینی ایوارڈ کمیٹی نے یہ بات اپنے ایک مکتوب میں جناب آزاد کو بتائی۔ اس سلسلے میں نومبر یا ڈسمبر ۱۹۹۱ء میں لکھنو میں جلسے کا انعقاد عمل میں آئے گا جس میں ملک بھر کے دانشور، قلمکار، مفکر، شعرا، سیاستداں اور آرٹسٹ حصہ لیں گے لکھنو ہائیکورٹ کے جج جسٹس سید حیدر عباس رضا کی صدارت میں قائم کمیٹی نے اس بات کا فیصلہ کیا۔

پروفیسر آزاد مشرقی یورپ کے سفر پر روانہ

پروفیسر امیریٹس جموں یونیورسٹی جموں پروفیسر جگن ناتھ آزاد اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں اس سفر میں پروفیسر آزاد ان تینوں ممالک میں اردو کے سماجی منظر ہندوپاک سے باہر کے ممالک میں اردو اور علامہ اقبال کے فکر و فن پر لیکچر دیں گے۔



نعت

محمد منظور احمد
دارالشفاء حیدرآباد

بے حد ہے تڑپ دید کی مولائے مدینہ
در پر ہوں کھڑا آپ کے آقائے مدینہ

حائل ہوئیں دیواریں مگر پھر بھی ہمیشہ
شیدائے مدینہ رہا شیدائے مدینہ

دل سے دعا مومن کی یہ رہتی ہے ہمیشہ
ہر لمحہ رہے تازہ تمنائے مدینہ

آقا کا کرم ہوگا، یہ آقا کا کرم ہے
مشتاقِ مدینہ جو پہنچ جائے مدینہ

آواز چلی آتی ہے یثرب کی فضائے سے
"خوش بخت ہے وہ شخص جو آجائے مدینہ"

سوئی ہیں تمنائیں بہت سی میرے دل میں
پر جاگتی رہتی ہے تمنائے مدینہ

دیدار ہو بس روضۂ اقدس کا شب و روز
ہے اب یہ وظیفہ میرا آقائے مدینہ

آوازۂ حق گونجتا رہتا ہے جہاں میں
یہ آپ کا ہے معجزہ مولائے مدینہ

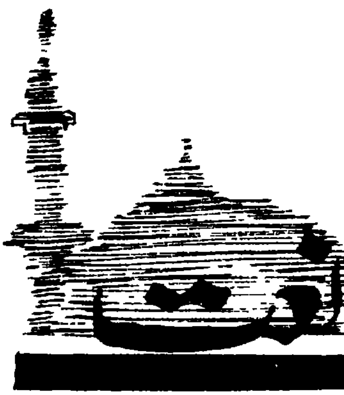
انسان سے انسان کا رشتہ رہے قائم
منشاء تھا یہی آپ کا آقائے مدینہ

پیغمبرِ انسانیت و رحمتِ عالم
مجموعۂ اوصاف ہیں مولائے مدینہ

ہے آرزو مدت سے یہی شافعِ محشر
یہ عاصی کسی طرح پہنچ جائے مدینہ

...؎...

سیدہ مہر
۲-۱۳۱/۲۲ بی۔ گنگارم تعلقہ وقارآباد
ضلع رنگاریڈی



آپؐ نبیوں میں انتخاب آئے
مژدے رحمت کے بے حساب آئے

معجزہ سب سے یہ مقدم ہے
لے کے قرآن سی کتاب آئے

ایک ذرہ ہوں تو کچھ بیاں بھی ہو
خوبیوں کے وہ لاجواب آئے

آپؐ کے امتی ہیں شاہِ زمن
ہم پہ اب کوئی کیوں عذاب آئے

مالکِ دوسرا نے جب چاہا
بام پر اپنا ماہتاب آئے

یوں تقاضے کلیمؑ کے بھی تھے
آپؐ پہنچے تو باریاب آئے

اس کو منظور کب یہ تھا جبرئیل
عرشِ اعظم پہ ہم رکاب آئے

آپؐ کی رحمتوں کے سایہ میں
یہ دعا میری مستجاب آئے

گر کوئی ابرہہ پلٹ آئے
تب ابابیل بھی شتاب آئے

غم کو سہنے کی تاب ہے مفقود
ہم پریشاں تیری جناب آئے

مسرور سلطانہ انجم ایم اے (ابتدائی)
یونیورسٹی آف حیدرآباد - حیدرآباد

سر سید احمد خان کی قومی اور علمی خدمات

قومی ہمدردی کے جذبہ اور قومی ترقی کے احساس کو متحرک رکھنے کے لئے اُن بزرگوں کے کارناموں پر نظر ڈالتے رہنا نہایت مفید ہے جنھوں نے اپنے کارہائے نمایاں سے قوم کی خدمت کی۔

اسی اصول کے تحت تاریخی مطالعہ کو اہمیت دی گئی ہے ترقی کی کوشش کے ولولہ کو زندہ رکھنے کے لیئے تاریخ کو ہمیشہ کھلا رکھنا ضروری ہے اس لیئے کہ اس سے ہم کو قوم کے عروج و زوال کے اسباب کا پتہ چلتا ہے جس کے مطابق ہم صحیح راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ " خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے نفوس میں تغیر پیدا نہ کرے۔" اس طرح ایک اٹل قانونِ حیات بیان کیا گیا ہے۔ جو ارادوں کو آزاد چھوڑتے کے باوجود تقدیر مبرم کی طرح کام کرتا ہے۔

سر سید احمد خان کے زمانے کی حالت جو کہ مسلمانوں کی تھی اس کا سرسری خاکہ یہ ہے کہ اُس وقت عموماً مشرق اور خصوصاً عالم اسلام پر حزن و یاس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی سب سے بدتر حالت ہندوستان کے مُسلمانوں کی تھی۔ جہل و غلامی کی بدولت اُن کے دلوں میں زندگی کی آگ سرد پڑ چکی تھی اور جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھیئے راکھ

سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مغربی فاتحوں کی ہیبت، مغربی تمدن کی صولت مسلمانانِ ہند کے قلب و دماغ پر مستولی تھی۔ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے تھے وہ اجتہادِ فکر اور وسعتِ نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے تھے ایسی صورت میں یہ سوچنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آخر ان کے مذہب سے منحرف ہونے اور تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی۔ شاید مورخ یہ کہے کہ دولت اور حکومت نے مسلمانوں کو کاہل اور عیش پرست بنا دیا اور اس کاہلی اور عیش پرستی نے رفتہ رفتہ فعالیت اور حرکت سے محروم کر کے انفعالیت اور جمود میں مبتلا کر دیا۔ لیکن فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ حیات کی حقیقت کو سمجھنے والے اس وجہ کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک اولوالعزم قوم میں جس نے اپنی عظمت و سطوت کا سکہ دُنیا بھر میں بٹھا دیا ہو، جسمانی تعیش اور کاہلی کی لعنت جب تک روحانی تعیش اور کاہلی کا زہر نہ بھرا ہو، ہرگز اس حد تک نہیں پہنچ سکتی کہ اس کے قوائے ذہنی اور عملی کو ماؤف کر دے۔ تحقیق سے پتہ چلے گا کہ یہ روحانی تعیش اور کاہلی وحدت وجود کے عقیدے سے پیدا ہوئی ہے جو مسلمانوں کے غیر اسلامی اثرات سے پیدا ہوا اور جس نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر ان کے دلوں میں فرد کی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو مٹا دیا اور اس طرح مذہب اور اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا۔

ایسے زمانے میں جبکہ ہندوستان کا مسلمان منفی فلسفۂ حیات پر کاربند تھا۔ اکثر و بیشتر علماء اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے باطل رنگ کو زائل کر کے اس پر مذہب اسلام کا صحیح رنگ چڑھانا آسان کام نہ تھا۔

سرسید احمد خاں کو ان کی خودداری، بلند ہمتی اور قومی درد نے للکارا انہوں نے قوم کی بیماری کی صحیح تشخیص کر لی تھی مسلمانوں کو اس پر ابھارا کہ وہ بے تکلف اپنی زندگی کو مغربی تمدن سے اگرچہ کھانے دیں۔ اس سے ابتداء میں انہیں سخت صدمہ پہنچا مگر اس سے وہ چنگاریاں بھی نکلیں جنہوں نے [illegible]

بھڑکا دی۔ مسلمانوں کی مرعوبی اور مایوسی کے طلسم کو توڑا اور انہیں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

۱۸۶۹ء میں سرسید احمد خان نے لندن کا سفر کیا۔ انگریزوں کی تہذیب شائستگی اور علمی ترقیات کو دیکھ کر ان کو مسلمانوں کی پستی اور تنزل کی حالت پر بہت ہی قلق ہوا۔ سرسید احمد خاں نے اپنی قوم کی اصلاح کے لیئے یہ حربہ استعمال کیا کہ اپنے سفر انگلستان سے واپس آنے ہی ۱۸۷۰ء میں ایک اعلیٰ پایا کا ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح تھا۔ انہوں نے خود بھی مضامین اور آرٹیکل لکھے اور ملک کے قابل اور فاضل حضرات سے بھی ایسے مضامین اور آرٹیکل لکھوانے کی تدبیر کی جن سے مسلمانوں کی اس پست حالت کی اصلاح کی تدبیر ہو سکے اور جن کو پڑھ کر مسلمانوں کے باطل خیالات، لغو توہمات اور جاہلانہ اعتقادات، روشن خیالی، بلند حوصلگی اور صحیح اعتقادات میں بدل جائیں۔ اُن کے دوستوں نے اُن کا ساتھ دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی ترقی میں اس قوم کے مذہب کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے اس لیئے مسلمانوں پر یہ بات ثابت کرنی ضروری تھی کہ اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دُنیا کی ہمہ جہتی ترقی کے حصول کے لیئے معاون ہیں لیکن بہت سی رسوم اور عادات جو پچھلے زمانے میں مفید تھیں لیکن حال کے زمانے میں نہایت ہی مضر ہوگئی ہیں ان کو ترک کرنا نہایت ضروری ہے۔

انہوں نے سوال کیا۔ کیا یہ غیرت کی بات نہیں کہ ہم غیر قوموں سے اپنی حقارت کے الفاظ سنیں اور اپنی تہذیب و تربیت و شائستگی کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ اس لیئے ہم کو کام کرنا یہ ہے کہ نیک دلی اور غور سے اپنی حالت پر غور کریں اور جو رسوم اور عادات ہم میں موجود ہیں اور جو مانع تہذیب ہیں اُن کو دیکھیں کہ وہ کہاں سے آئیں کیونکر ہم میں مل گئیں اور ان میں جو ناقص خراب اور مانع تہذیب ہوں ان کو ترک کریں اور جو قابل اصلاح ہیں اُن کی اصلاح کریں اور ہر ایک بات کو اپنے مذہبی مسائل کے

ساتھ مقابلہ کرتے جائیں کہ وہ ترک یا اصلاح موافق احکام شریعت کے ہیں تاکہ ہم اور ہمارا مذہب دونوں غیر ملکیوں کی حقارت اور اُن کی نظروں کی ذلت سے بچیں کہ اس سے زیادہ ثواب کا کام اس زمانہ میں نہیں ہے۔" پھر انہوں نے کہا کہ "یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے "تہذیب اخلاق" جاری کیا گیا ہے تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہو سکے ہم ان کی دینی و دنیاوی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقائص ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں لیکن غیر قومیں بخوبی ان کو دیکھتی ہیں ان سے آپ کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں اس میں ترقی کرنے کی آپ کو رغبت دلائیں۔"

اس زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں میں جس قسم کے علوم کا رواج تھا اور جس کے تکبر اور غرور سے ہر ایک پھولا ہوا تھا دین اور دنیا دونوں میں کار آمد نہیں تھا علم دین کا تو حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان کا یہ حال تھا کہ وہ سر سید احمد خان کی تحریروں کو مذہب کے برخلاف سمجھتے تھے اور اس پر لعنت اور ملامت کے فقرے کستے تھے۔ باوجود سر سید احمد خاں کی ذات سے مخالفت کے ان کے رسالہ تہذیب الاخلاق سے لوگ مستفید ہو رہے تھے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب چند وجوہ کی بنا پر اس کو بند کرنا پڑا تو اس زمانے کے قابل ترین لوگوں نے اس کی اجرائی پر نہایت ہی اصرار کیا اور اُن کے دوستوں نے یہ بات واضح کی کہ اس سے قوم اور مذہب کو بہت زیادہ فوائد حاصل ہو رہے ہیں رسم و رواج کی بندشیں برابر ٹوٹتی چلی جا رہی تھیں۔ تعلیم کی ترقی کی طرف رجحان ہوتا جا رہا تھا مذہبی مشکلات کو بھی چھوٹے چھوٹے آرٹیکلوں سے حل کیا جا رہا تھا اس کے بند ہونے پر یہ سب باتیں بند ہو گئیں تھیں اس لیے ان کے دوست اس کی دوبارہ اشاعت پر مصر ہے اور انہوں نے اس رسالہ میں مضامین لکھنے کا بھی وعدہ کیا۔

تہذیب الاخلاق کی دوبارہ اجرائی کے بعد اس پر جو کام ہوا وہ نہایت ہی اہم

ہے قوم کے دل ودماغ کو موافق سانچے میں ڈھالنے کا کام ایک حد تک سرانجام پا رہا تھا اب جو کام درپیش تھا وہ یہ تھا کہ قوم کو علوم جدید کی طرف مائل کیا جائے۔ اس لیئے کہ مغربی علوم کے حاصل کیئے بغیر قوم کی ترقی ناممکن تھی انھوں نے قوم کے دل و دماغ میں یہ ذہن نشین کرایا کہ یورپین سائنس اور لٹریچر کی تعلیم کو قوم کفر سمجھتی تھی یہ خیال غلط ہے۔ غیر مذہب کے لوگوں سے سچی دوستی، سچی محبت اور اخلاق کو بھی قوم معتبر سمجھتی تھی۔ اہلِ کتاب سے دوستی اور ان کے ساتھ کھانے پینے کو باوجود حلال ہونے کے وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے اس لیئے ان مسائل پر مختلف مضامین لکھے جانے لگے۔ اس کا خاطر خواہ اور مفید نتیجہ نکلا مسلمان یوروپین سائنس اور لٹریچر کے پڑھنے پر متوجہ ہو گئے اہلِ کتاب کے ساتھ مواکلت اور سوشیل برتاؤ تو بالکل ہی عام ہوگیا۔ اب ایک اہم مسئلہ حل طلب یہ ہو گیا تھا کہ نیچرل سائنس اور مذہب اسلام کو باہم ضد حقیقی تصور کیا جاتا تھا ان خیالات کے ہزاروں لوگ تھے سرسید احمد خاں "تہذیب الاخلاق" میں ایسے مضامین لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ حقیقی دلائل سے اس قول کو غلط ثابت کر دکھائیں چنانچہ انھوں نے ثابت کیا نیچرل سائنس سے مذہب اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جس قدر زیادہ واقفیت نیچرل سائنس سے ہوتی جائے گی اس قدر زیادہ ذاتِ باری اور اس کے خالق صانع ہونے کا یقین بڑھنا چاہیئے۔ دوسرا کام مسلمانوں کو اخراجاتِ فضول شادی و غمی سے روکنا اور اپنی اولاد پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر متوجہ کرنا تھا۔

ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ تہذیب الاخلاق سے علم و ادب کی کافی اصلاح ہوئی مضامین کو اس طرزِ جدید اور سادہ طریقہ پر لکھا کہ ان کی تحریر دل میں بیٹھنے والی ثابت ہوئی سرسید احمد خاں نے یورپ کے عالموں ایڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرح اور اپنی زبان میں لکھ کر ثابت کر دیا کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہونا چاہیئے اور ہماری اردو زبان میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے۔

اُن کے ایک انگریز دوست نے لکھا ہے کہ "تہذیب الاخلاق" نے یہ ثابت کر دیا کہ اُردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ اور تاریک راستہ نہیں ہے جو کہ سمجھا جاتا تھا۔"

آخر میں ہمیں سرسید احمد خان کی اس اہم اسکیم پر روشنی ڈالنی ہے جو انھوں نے اپنی قوم کی تعلیم کے لیئے تربیت دی تھی اور جس کو اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ کے ذریعہ روبہ عمل لایا۔ یہ ان کی زندگی کا شاہکار ہے جس نے ان کو زندہ جاوید بنا دیا۔ یہ ایک مایہ ناز اور اپنی نوعیت کا منفرد انداز ہے اس کے قیام پر تفصیلی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

سرسید احمد خان کے پیش نظر قومی تعلیم کا مسئلہ بہت اہم تھا اپنے پیرچہ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ انہوں نے قوم میں بیداری کی روح پھونک دی تھی اب مسلمانانِ ہند کو اپنی بیداری کا احساس ہو چلا تھا۔ برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان میں رعایا کی تعلیم کے لیئے جو اسکولس اور کالجس قائم کیئے تھے ان میں مسلمان بچوں کا عنصر بہت کم تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کا شمار ہی نہ تھا اس لیئے کہ ملک کے ہر شعبہ میں ملازمت کے لئے انگریزی دانی لازمی تھی اور مسلمان اس سے بالکل نابلد تھے۔ مسلمانوں میں جس قسم کے تعلیمی ادارے اس وقت موجود تھے ان میں مشرقی علوم کی تعلیم دی جارہی تھی اب وہ طریقے اور تعلیم سب فرسودہ ہو گئے تھے وہ کسی بھی طرح قوم کے لیئے مفید نہ تھے۔ معمولی سرکاری ملازمت کے لیئے بھی انگریزی دانی ضروری تھی۔ قوم کو اس کا احساس ہو رہا تھا کہ اگر انہوں نے تعلیم کی طرف توجہ نہ کی تو قوم بھیک منگوں کا ادارہ بن کر رہ جائے گی اس لئے زندگی کے ہر شعبہ میں اور معاشی حرکت کے لیئے انگریزی کے بغیر کام نہیں چلتا تھا ان تمام چیزوں سے مسلسل مسلمانوں کے ذہن تبدیل ہو چکے تھے اب ان کے ذہنوں سے وہ فرسودہ عقیدہ کہ انگریزی تعلیم کافر بنا دیتی ہے زائل ہو چکا تھا۔

سرسید احمد خان گورنمنٹ کی موجودہ مروجہ تعلیم سے مطمئن نہ تھے اس تعلیم سے قوم کی

تعمیر ممکن نہ تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں مثل انگلستان کی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں تو دیتی ہیں مگر اس کو اعلیٰ تعلیم کہنا نہایت شرم کی بات ہے ۔ اعلیٰ تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھنے اور طوطے کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دے دینے اور انگریزی میں بول لینے سے حاصل نہیں ہوتی ۔ بلکہ سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے جس کا وجود ہندوستان میں نہیں ہے ایک دانشمند کا قول ہے کہ انگلستان میں بچوں اور طالب علموں کو کتاب پڑھ لینے سے اس قدر تعلیم نہیں ہوتی جس قدر کہ کان اور آنکھ سے ہوتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تربیت اطفال اعلیٰ تعلیم کا اہم عنصر ہے ۔

تعلیم کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا پانا بھی نہایت ہی اہم ہے ورنہ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ مذہب سے ناواقفیت قوم کو دہریت کی طرف لے جائے گی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کی جانب سے دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کو نصاب میں شامل رکھنا ممکن نہیں تھا اس لئے کہ ہندوستان میں ایک قوم ہے نہ ایک مذہب ۔

ایک اور اہم بات تعلیم کے سلسلہ میں یہ ہے کہ قوم میں مختلف جماعتیں ہوتی ہیں اور ان کی تعلیم پانے کی خواہشات بھی مختلف ہوتی ہیں گورنمنٹ ہر قوم کی ضروریات کے موافق تعلیمی انتظام نہیں کر سکتی ۔ گورنمنٹ کی جانب سے چند ہی اسکول اور چند ہی یونیورسٹیاں ہوتی ہیں جن کو وہ عام اصول کے تحت سارے ملک کے لئے قائم کرتی ہے جو ملک کی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی ہوتے ہیں ۔

سرسید احمد خان نے ان تمام واقعات اور ضروریات کے پیش نظر قوم کی تعمیر کے لئے ایک علمی ادارے کی بنیاد ڈالی اور اس میں انہوں نے جس قسم کی تعلیمی پروگرام مرتب کیا تھا وہ فی زمانہ بھی نہایت مفید ہے ہندوستان میں اس وقت بھی مختلف تعلیمی ادارے چل رہے ہیں اُن کا تعلیمی نظام جس کو انہوں نے مرتب کیا تھا اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کا موجودہ زمانے پر بھی انطباق ہوتا ہے ۔

سرسید احمد خان نے اپنے انگلینڈ کے سفر (۷۰-۱۸۶۹ء) کے زمانہ میں یورپ کی ذہنی تربیت یورپین تہذیب، ان کے معاشرتی اور سماجی اداروں کا بغور معائنہ کیا تھا اور اس سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے وہ تعلیمی نظام سے ذہنی، معاشی اور سیاسی انقلاب لاکر مسلمانِ ہند کی قسمت بدلنا چاہتے تھے وہ مغربی علوم کو مغربی زبان ہی کے ذریعہ رائج کرنا چاہتے تھے اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی، عمارات، بورڈنگس باغات اور وہاں کے تعلیمی نظام سب کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس ہوکر انہوں نے پرچہ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ رفتہ رفتہ قوم کو اپنے خیالات میں ڈھالا۔ وہ انگلستان جانے سے پہلے ۱۸۶۴ء میں "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کرچکے تھے۔ اسی سال غازی پور میں ایک ماڈرن اسکول قائم کیا۔ ۱۸۶۸ء میں شمالی ہندوستان کے مختلف اضلاع میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کی گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی قوم سے چندہ جمع کیا بلکہ انگلستان میں اپنے انگریز دوستوں اور ان کے ذریعہ وہاں کے ذی ثروت انگریزوں سے چندہ حاصل کیا۔ بالآخر ۱۸۷۷ء میں انہوں نے علیگڈھ میں اپنے مجوزہ "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کی بنیاد ڈالی۔ یہ مسلمانانِ ہند کا پہلا کالج تھا جہاں جدید مغربی علوم کی انگریزی زبان میں تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا رفتہ رفتہ یہ کالج اس اہم علمی اور تہذیبی تحریک کا مرکز بن کر اُبھرا اسے علی گڈھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ جدید علمی اور تہذیبی نقطۂ نظر کو عام کرنا تھا جس سے انہیں دورِ جدید میں معاشی، تہذیبی اور علمی اعتبار سے زندہ رکھ سکے اس تحریک نے مسلمانوں کو دورِ متوسط کے ناکارہ علمی اور سماجی تصورات سے (جو اسلام سے مطابقت بھی نہیں رکھتے تھے) نجات دلائی اور اس نئے معاشرہ میں ایک فعال عنصر کی طرح کام کرنے کے قابل بنایا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں تشکیل پا یا تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی، علمی اور سماجی مسائل کو حل کرنے میں سرسید کے حقیقت پسندانہ تصورات آج بھی اتنے ہی معنیٰ خیز ہیں جس قدر آج سے ایک صدی پیشتر تھے۔

محمد اسلم صدیقی
غازی پور لاج، سرسید نگر، علیگڈھ

مسلمانوں کے دور میں مختلف علوم و فنون

مسلمانوں کے دورِ اقبال میں مختلف علوم و فنون سے ان کو جس قدر شوق و ذوق اور دلچسپی رہی اس کا مختصر ذکر اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان علوم و فنون کے حصول کے لیے انھوں نے کس قدر کاوشیں اور سعی و جہد کی اور اس کو ترقی دے کر ایک نیا رنگ و روپ دیا اور کتنے نئے گوشے معلومات کے پیدا کر کے ان کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ سچ تو یہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کے صاحب ذوق اور علم کے شیدائی بیٹے مامون الرشید کی سعی اور سرپرستی نے فضلائے اسلام کے لیئے بہت آسانیاں فراہم کیں اور ان کے شوقِ علمی کی تکمیل کے لیے سر و سامان مہیا کیا اور ان کی قدر افزائی کی۔ علم کے اس شیدائی (مامون) کی قدر افزائی کا ایک واقعہ ابن اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں حنین بن اسحٰق کے بیان میں لکھا ہے کہ:

"مامون الرشید حنین بن اسحٰق کو معاوضے کے طور پر اس کی ہر کتاب کے عربی ترجمہ کرنے پر اس کتاب کے برابر وزن کے سونا دیا کرتا تھا۔"

مامون کا یہ سلوک اور انعام و اکرام دوسرے اہلِ علم کے لیے بھی عام تھا۔ علم کی سرپرستی اور قدر دانی کا شیوہ کم و بیش دوسرے اہلِ ذوق خلفاء اور امراء میں بھی پایا جاتا تھا۔ قرطبہ میں الحکم ثانی کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں تھیں جن میں چوالیس

جلدیں تو صرف فہرستِ کتب پر مشتمل تھیں۔ اس کے برعکس الحکم ثانی کے چار صدیوں بعد جب چارلس عاقل شہنشاہ فرانس نے شاہی کتب خانے کی بنیاد ڈالی تو بہ مشکل صرف نوسو کتابوں سے زیادہ جمع نہیں کر سکا اور ان میں مذہبی کتابوں کی ایک الماری بھی نہ تھی ابن المسیندی جو ۶۱۰۴ء میں قاہرہ میں مقیم تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس شہر کے ایک کتب خانے میں دو کرے سماوی اور چھ ہزار کتابیں صرف فن ریاضی اور ہیئت کی تھیں۔"

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک کتب خانے میں صرف فن ریاضی اور ہیئت کی اس قدر کتابیں تھیں تو دیگر علوم و فنون کی کتابوں کی تعداد کس قدر ہوگی۔ بلاشبہ لاکھوں ہوں گی۔ بغداد کے کتب خانوں کا بھی یہی حال تھا کہ وہاں تو روم و یونان کے علمی ذخائر اونٹوں پر لاد لاد کر قافلوں کی صورت میں پہنچتے تھے۔ ابن ندیم کی کتاب الفہرست ابن اصیبعہ کی طبقات الارض، طبقات الاطبار، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور اس طرح اور کئی کتابوں میں جو کئی جلدوں میں مختلف علوم و فنون کے تعارف و تفصیل میں ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ سب عربوں کے علمی ذوق و شوق کو ظاہر کرتی ہیں۔ بقول فاضل موسیو سدی یو :

"مسلمانوں نے ایشیا اور یورپ میں اس وقت علم و سائنس کی روشنی پھیلائی جب یورپ میں جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ امویوں نے دمشق میں اور انھیں کی ایک شاخ نے اندلس پہنچ کر وہاں اور عباسیوں نے بغداد میں اور فاطمیوں نے قاہرہ میں علوم و فنون کو ترقی و سرپرستی اور فروغ دیا۔"

ان کوششوں اور سرپرستی کی ایک ہلکی سی جھلک موجودہ صدی میں حیدرآباد دکن کے آخری فرماں روا سلطان العلوم میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے قائم کردہ دارالترجمہ میں نظر آتی ہے جہاں سے بےشمار نایاب و نادر اور مستور کتابوں کی اشاعت و فروغ کا

سلسلہ شروع ہوا تھا اور جو آج بھی کم و بیش جاری ہے۔ مسلمانوں کو علوم و فنون سے کس درجہ دلچسپی اور شوق تھا اس کے متعلق ایک دوسرے فاضل گبن فرماتے ہیں:

"بغداد کے سلطان کے ایک وزیر نے وہاں مدرسہ کے واسطے دو لاکھ دینار وقف کیے اور پچاس ہزار دینار سالانہ دیگر اخراجات کے لیے اس مدرسے کے ہر درجے میں چھ ہزار طلبار مختلف اوقات میں بہرہ مند ہوئے۔"

ابن جبیر ۱۱۸۴ء میں بغداد پہنچا تو اس وقت شہر کے صرف مشرقی حصے میں تیس۳۰ بڑے بڑے دارالعلوموں کی شاندار عمارتیں اور ایوانات دیکھ کر محو حیرت ہو گیا تھا۔ ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں بغداد کے احوال میں اس کا ذکر کیا ہے اسپین میں خلیفہ الحکم المستنصر الدین اللہ کا زمانہ آیا تو اس نے اندلس کو تمام دنیا کے علوم و فنون سے معمور کر دیا۔ الحکم ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس نے بلادِ مشرقیہ میں ہر مقام پر اپنے گماشتے مقرر کیے تاکہ جس قدر نایاب کتابیں جہاں سے مل سکیں اس کے کتب خانے کے واسطے فراہم کریں۔ اس نے کوشش کی کہ جو نادر تصنیف ممالک مشرقیہ میں لکھی جائیں، وہ بغداد سے پہلے اندلس میں اس کے پاس پہنچ جایا کریں۔ چنانچہ جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ علامہ ابو الفرج اصفہانی "کتاب الاغانی" تصنیف کر رہے ہیں تو الحکم کے گماشتوں نے کتاب کے مکمل ہونے سے پہلے، ایک ہزار اشرفیاں مصنف کو پیش کیں کہ کتاب مذکور کا پہلا نسخہ جو تیار ہو وہ الحکم کے شاہی کتب خانے کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ اس زمانے میں اندلس کا خراج پانچ کروڑ سے زیادہ تھا۔ باوجود اس کے الحکم کے علمی ذوق کے لیے وہ کافی نہ تھا۔ بقول علامہ مقریزی صاحب "نفح الطیب" وہ تمام ممالک اور اطراف سے کتابیں حاصل کرتا تھا یہاں تک کہ شاہی خزانہ ان مصارف کو برداشت نہ کر سکا۔ معلوم ہے کہ اس کا سالانہ خراج پانچ کروڑ تھا اور اس قدر کثیر رقم بھی کم پڑتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے شوق علمی کے آگے ہارون اور مامون کے کارنامے ماند پڑ گئے۔ الحکم نے جو کتب خانہ جمع کیا تھا اس کی وسعت و کثرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف عربی دیوانوں کی تعداد اس قدر تھی کہ

س کی فہرست اسّی صفحات پر مشتمل تھی۔ کل کتابوں کی تعداد بقول علامہ مقریزی چار لاکھ
تھی اور یہ تمام تر منتخب اور نادرۂ روزگار کتابیں تھیں۔ رطب و یابس کا انبار نہ تھا۔
الحکم خود بڑا صاحبِ علم و فضل اور نہایت مبصر اور ناقدِ فن تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ
شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو الحکم کے مطالعہ میں نہیں آئی ہو یا جس پر الحکم نے خود کچھ
یادداشتیں نہ تحریر کی ہوں۔ یہ یادداشتیں بڑی علمی اور معلومات پر مشتمل ہیں۔

عام مسلمانوں کو حصولِ علم کا کس قدر شوق تھا اس کے متعلق ایک دو واقعات ملاحظہ ہوں
سند بن علی نامی ایک شخص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس کو اقلیدس پڑھنے کا بے حد
شوق تھا مگر اس شوق کی تکمیل کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے کسی طرح یہ کتاب حاصل
کی اور پھر ایک گوشۂ تنہائی میں پیر توڑ کر اس طرح بیٹھا کہ کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا
پھر کسی کی مدد کے اور رہنمائی کے بغیر محض اپنی ذاتی کاوش سے اس پر پورا عبور حاصل کر لیا
اور جب اس نے اپنے دور کے فنونِ ریاضی کے مشہور اور مستند استاد عباس بن سعید
الجوہری کو دکھایا تو اس کو یقین نہیں آیا کہ یہ ایک نوجوان طالب علم کا کارنامہ ہو سکتا ہے لیکن
جب اس نے سند بن علی کا امتحان لیا تو اس کی ذہانت اور سعی کا قائل ہو گیا۔ بنو موسیٰ
(موسیٰ بن شاکر کے لڑکوں کا لقب) میں سے چھوٹا بھائی جس نے پوری اصول اقلیدس بھی
نہیں پڑھی تھی مگر عہدِ قدیم کے مسائل ثلاثہ (تربیع دائرہ، تثلیث زاویہ اور تضعیف مکعب)
کے حل میں اس قدر منہمک رہتا تھا کہ دنیا کا ہوش نہ رہتا تھا۔ اس کی کتاب "مساحتہ اشکال
البسیطہ والکرویہ" اس فن میں مشہور ہے۔ یہ مثالیں ذاتی ذوق و شوق و کاوش و جستجوئے
علم کی ہیں جن میں انھوں نے اپنی تمام تر توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر دیں اور اپنے مطلوب
مقصود کو حاصل کر کے ہی چھوڑا۔ اسی کو "خود آموزی" کہتے ہیں اور جوش و ولولہ اور تعمیق فکر
بھی اور عبقریت تو نمایاں ہی ہے صاحب علم و فضیلت کی قدر و احترام کا ایک واقعہ بھی بطور
مثال پیش ہے ثابت بن قرہ صابی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا مگر معتضد باللہ خلیفہ اس کے
علم و فضل کا اس درجہ قدردان اور اس کا احترام کرتا تھا کہ ایک دن باغ میں اس کے

بے تکلفی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک اس نے ثابت کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ثابت خوفزدہ ہو گیا کہ معلوم نہیں کیا خطا ہوئی ہے۔ خلیفہ معتضد نے کہا :

"خوف نہ کرو۔ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ کے اوپر تھا۔ میں یہ گستاخی پسند نہ کی کہ اہل علم کا ہاتھ نیچے ہو اور میرا اوپر ہو۔"

یہ تھی علم کی توقیر و عظمت، جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

چند مصنفین اور ان کی علمی تصانیف کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے مسلمان فضلا اور حکما کی خدمات اور ان کا دشتہا سے ہم کی رودادو احوال اور ان کی قابل قدر تصانیف وغیرہ کے متعلق بہت سے اہل علم حضرات نے مستقل معلومات افزا کتابیں لکھی ہیں جن کے مطالعے سے ان فضلا اور حکما کی بلند مرتبت شخصیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے یہاں بطور نمونہ چند مصنفین اور ان کی گراں قدر تصانیف کے نام پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ جمال الدین ابن القفطی کی تاریخ الحکمار (۲) ابن ندیم کی الفہرست

۳۔ ابن اصیبعہ کی عیون الانبار فی طبقات الاطبار (۴) حاجی خلیفہ کی کشف الظنون

۵۔ ابن جلجل کی طبقات الاطبار و الحکمار (۶) ابن خلکان کی وفیات الاعیان

۷۔ بیہقی کی تتمۃ صوان الحکمت اور آخری دور میں ہندوستان میں

۸۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی مآثر الکرام

۹۔ مولانا نواب صدیق حسن خاں قنوجی کی ابجد العلوم (۱۰) مولانا حکیم سید عبدالحئی کی نزہۃ الخواطر آٹھ جلدیں) اس کتاب میں ہزاروں ہندوستانی علما، وفضلا اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے اعیان و مشاہیر کی تاریخ اور سوانحی حالات ہیں۔ یہ بے حد معلومات افزا، اور مفید کتاب ہے۔

۱۱۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی کی کتاب "اسلام علوم و فنون ہندوستان میں" بے حد قابل قدر اور مختصر ہونے کے باوجود اپنے فن سے متعلق شاہکار ہے اصل کتاب عربی میں ہے جس کا

[redacted]

خوابِ تنہائی کے صحرا کا گم شدہ شاعر

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید
بمعرفت اسلامک اسٹیڈی سنٹر
نائک بشیر خاں انسٹی ٹیوٹ
اندرون دلی گیٹ
مالیرکوٹلہ 148023

غمزہ بہ غمزہ کی ورق گردانی کے وقت سب سے پہلے نظر جس شعر پر پڑی وہ یہ تھا ؎

اس کو برسوں بعد تنہا جانے میں کیسا لگا
مجھ کو تو وہ اجنبی کے ساتھ بھی اچھا لگا

تو معاً احساس ہوا اردو غزل میں ایک نیا شعری کردار ابھر رہا ہے جو اپنے محبوب کو مدعی کے ساتھ دیکھ کر قیامت کو یاد نہیں کرتا۔ اردو غزل کا یہ شعری کردار شوخ کا تخلیق کردہ کردار ہے جو حسن و عشق کے اور معاملات میں بھی اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اس کردار سے متعارف ہونے کے بعد اردو شاعری کے اس "چاند" سے پھر رشتہ جوڑنے کو جی چاہا جو رقیبِ روسیاہ کے بادلوں میں کہیں کھو گیا ہے۔ شاعر کے اس شعری رویّے نے دامنِ فکر و نظر کو اپنی طرف کھینچا تو غمزہ بہ غمزہ کے مطالعہ نے خوب سے خوب تر کی سیر کرائی اور یہ احساس پیدا ہوا کہ اس شعری تخلیق کا فن کار ایک نئے لب و لہجہ اور تازہ فکر و نظر کا مالک ہے لیکن حیرت اس بات پر بھی ہوئی کہ دنیائے شاعری میں آر پی شوخ[1] کا نام کہیں سنا نہیں۔ معلوم ہوا شاعر نام و نمود اور شہرت کا بھوکا نہیں بلکہ گمنامی میں کسی انجمنِ ستائش باہمی کا ممبر بنے بغیر

---

[1] مختصر تعارف: نام: آر پی شوخ ۔ تاریخ پیدائش ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء وطن ہنگولی (ہریانہ) پیشہ لیکچرار شعبۂ انگریزی ۔ ایم این کالج شاہ آباد مارکنڈہ (ہریانہ)

ہی تخلیقِ شعر سے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ دل وجان کا تموج جب بے قرار رکھے تو تخلیقِ کرب سے دامن بھی بچایا نہیں جاسکتا یہ تو جسم وجان کا فرض ہے جو ہر صورت چُکانا ہے۔ شوخ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہوا پسند آدم کی تقصیریں۔ غمزہ بہ غمزہ کے سینے میں دل بن کر دھڑکنے لگیں اور اب یہ دھڑکن اسلوب دبیان کو محسوس کیئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

اُردو غزل میں محبوب سے شکایت کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن اپنے تیشہ سے اپنا چارہ خود تراشنے کا ہُنر بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ تقلید کی روش عام ہے لیکن شوخ اس خودکشی کو کیسے قبول کر سکتے تھے انھوں نے اس وادی میں بھی فکر و اظہار کا ایک نیا اسلوب پیدا کیا۔ دوستوں پہ طنز کے بہت پہلو ہیں لیکن یہ اندازِ نظر بھی دیکھیئے۔

ساحلوں پہ بن سکا اس سے نہ کچھ رشتہ مگر
اس نے چھوڑا جب بھنور میں وہ مجھے اچھا لگا
اُس کا ممنون ہوں اب جس نے بھنور میں چھوڑا
اتنا گہرا بھی تو میں اس کے ڈوبنے سے ہوا
وہ تیری یاد تھی جس نے ہمیں یکجا رکھا
دُکھ وہ دُکھ تھا کہ عناصر سے علاحدہ کر دے

یہاں ؏ ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز۔ والی بات بھی نہیں کہ ستم گر کے ناز محض اس لیے گوارا کر لیئے جائیں کہ اس سے مستقبل میں کچھ جانفزا اُمیدیں وابستہ ہیں "غمزہ بہ غمزہ" کے مطالعہ سے کبھی کبھی یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ شاید یہ یکطرفہ محبت کا نتیجہ ہے کہ شاعر کو اس شخص سے نسبت ہے جو ہنوز اس کے لیئے اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ حادثہ ہے مگر اس طرف ہوا بھی نہیں
جُدا ہوا بھی تو اس سے جو جانتا بھی نہیں

- .

وہ مری سانس مگر اس کو واسطہ بھی نہیں
کھنچا کھنچا سا ہے وہ جس سے فاصلہ بھی نہیں

یہ دل نے روٹھ کے کن مشکلوں میں ڈالدیا
اسی کو چاہتا اور اس سے بولنا بھی نہیں

ہم کسی کو چاہیں اور اسے اس کی خبر بھی نہ ہو کس قدر اذیت ناک کرب سے گزرنا ہے ممکن ہے کسی کے ناز و غمزہ کے مفاہیم و اشارات کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہو اور ہم بین السطور میں وہ معنیٰ تلاش کر رہے ہیں جن کا نفسِ مضمون سے دُور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

اس ہاتھ میں حنا کی لکیریں نصیب میں نہ تھا
میں وہ بھی پڑھ گیا جو کہیں بھی لکھا نہ تھا

لیکن یہ غلط فہمی یُوں ہی تو نہیں ہوسکتی۔ شاعر کا رشتہ بہرحال اپنے محبوب سے ضرور رہا ہے ورنہ یہ احساس پیکرِ شعر میں کس طرح ظاہر ہوتا ہے

آج تک کرتا رہا ہم سے وفا اور کوئی — پہلے جیسا نہ رہا تو تو سمجھ میں آیا

سمجھا ہوں اب کہ راہ دکھاتا تھا کس لیے
وہ مجھ کو تنہا چھوڑنے کی منزلوں میں تھا

کٹ گئی ہے رات تو دونوں کی لیکن فرق ہے۔ وہ ابھی جاگا نہیں ہے میں ابھی سویا نہیں

سچ تو یہ ہے ہوگئے ہم اپنی قدروں کے شکار
یُوں وفا تم نے بھی کی ہے یوں وفا ہم نے بھی کی

کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جانے کا ہنر شوخ کو خوب آتا ہے لیکن لہجہ میں کسی قسم کی سختی کبھی پیدا نہیں ہونے پائی کیوں کہ شاعر جانتا ہے کہ ابھی عشق حسن سے مغلوب ہے۔ ٹوٹے ہوئے رشتہ سے بندھ کر جینا نا داشتی کی سزا سہی لیکن اس ناکامی کے باوجود وہ سفرِ حیات میں اپنے دوست کی کمی محسوس نہیں کرتا۔

تو یوں بھی ساتھ مرے جاں بلب جُدائی میں
وگرنہ یہ جیئے جانے کی آرزو کیا ہے
دُوریوں تو ہو گئے ہٹ کر ترے رستہ سے ہم
پھر بھی جیسے بندھ کر اسی ٹوٹے ہوئے رشتہ سے ہم

اور یہ جیسے جانے کی آرزو بھی محض آرزو نہیں بلکہ شوخ اپنے آس پاس ہی کہیں اپنے مقصدِ حیات کو ہر گام پر محسوس کرتے ہیں جا ہے سفر کسی کے بھی ساتھ کٹ رہا ہو ؎

کہوں میں کیسے بظاہر سبھی کے ساتھ رہا ۔ اسی کو فرض کیا تب کسی کے ساتھ رہا

جذبۂ عشق کی اس سلامتی کے باعث راہِ محبت میں یہ مقام بھی آیا ؎

اس نے روکا نہ مجھے جبکہ میں دریا بھی نہ تھا
اب یہ کوشش کہ سمندر سے نکالے مجھ کو

سلگتے آنسوؤں کو روکنا اور آگ کے ٹکڑے چبانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ معاملاتِ حسن و عشق میں شوخ نے ہمیشہ نیاز ہی کو اپنا شعار بنایا اور دوست کی جفاکشی سے بھی ایک مثبت اندازِ نظر پیدا کر کے جینے کا بہانہ ڈھونڈ لیا۔ لیکن جب زندگی کی اس پیہم مسافرت میں قوتِ جادہ پیمائی سے محرومی کا احساس ہونے لگا تو انانیت بھی بیدار ہوگی اور بصد خود اعتمادی لہجہ میں ایک نیاز زیر و بم پیدا ہوا ؎

منزل سہی پہ تجھ کو بھی چلنا پڑے گا اب
میں تھک گیا ہوں اب تو مری جستجو میں آ

شوخ کے یہاں متضاد کیفیات کی آمیزش سے ایک نئی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ قرب و بعد اور فاصلوں کے دائروں کے پھیلنے اور سمٹنے کا عمل ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے چاہے وہ غمِ جہاں ہو یا غمِ جاناں شوخ مختلف مرحلوں سے دوچار ہوتے ہیں

دہی جاں بخش ہے جو شخص کہ جاں سوز بھی ہے
رہ گیا ہوں میں تضادوں میں بکھرتا تنہا

دستِ فکر اس آذرانہ سحر کا مالک ہوتا ہے جسے غم کہتے ہیں اور اسی غم کی بدولت دل کی برتیں جب کھلنے لگتی ہیں تو شوخ کے حرف و صوت میں ہجر کا سوز ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے "غمزہ بہ غمزہ" میں ایک نمایاں عنصر یہی دل سوزی ہے۔ درد و کسک اور شام ہی سے بجھے رہنے کی کیفیت شوخ کے کلام میں جدیدیت کا رنگ لئے ہمارے سامنے آتی ہے اور قاری دلِ ستم زدہ کو تھام تھام لیتا ہے ؎

رات آئی کہ سجائی ہے تری یاد نے بزم
چاند نکلا کہ تیرا درد ہوا ہے رقصاں

ایسی پتھر ہوئیں آنکھیں کہ نہ چھوٹیں آنسو : درد تیرا کبھی فریاد ہوا کرتا تھا

وہ پھوٹتا ہے تو راحت نصیب ہوتی ہے
مری ہنسی مرے پاؤں کا آبلہ بھی نہیں

ٹیسیں بھی اٹھتی نہیں اب اشک بھی آتے نہیں ۔ ریزہ ریزہ ہو کے میں بھی ایک پتھر ہو گیا

یہ بھی کیا زخم دیا ہے کہ ہوا ہوں بے حس
کاش اس چوٹ سے کچھ درد بھی ہوتا کوئی

یاد کرکے تمہیں رونے کا زمانہ بھی گیا : آج رویا ہوں تو سمجھا ہوں کہ تم یاد آئے

چلو وہ آنکھ میں پانی تو دے گیا ورنہ
یہ سانس اندھے کنویں میں صدا سی لگتی تھی

رات بہ تھا کچھ ایسا کہ میں رو بھی نہ سکا : مجھ سا دنیا میں نہ ہو دکھ سے بڑا اور کوئی

درد کا فریاد ہونا ۔ ہنسی پہ آبلہ کو اہمیت دینا۔ ریزہ ریزہ ہو کر پتھر ہونا، آنکھ کا اندھا کنواں کہنا ۔ ہجر و فراق کے جذبات و احساسات کو نئی لفظیات و استعارات کے سہارے تخلیقی صورت دینے سے ایسے شعروں کی تخلیق ہوئی ہے جن کے مصرعوں کا نشتر زخموں کو اور گہرا کر جاتا ہے اور دل پر جمنے والی درد کی برف ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔

ہم دیکھ چکے کہ شوخ کی غزل شعاری غزال چشم کے باعث ہے لیکن یہ ان کے ذہنی تعلق کا صرف ایک پہلو ہے جسے ان کے شعری شناخت نامہ کا ناگزیر حصہ کہا جا سکتا ہے۔ شوخ کی شاعری کا وہ نمایاں عنصر جو ان کی شاعری کو انفرادیت بخشتا ہے، ان کے تخیل کی وہ کرشمہ سازیاں ہیں جن کے باعث غزل نفسِ مضمون نیز اسلوبِ بیان کے اعتبار سے ایک نئی شناخت کا تعین کرتی ہے الفاظ کی نئی تراکیب سے فکر و خیال کی شمعیں روشن کرنا اور کلکِ جذبات سے تخیل کی روا بنانے کا عمل، پیش پا افتادہ راہ سے گریز کی نشاندہی کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ شوخ نے غزل میں عشق و محبت کا سلسلہ ستارا تا نک کرا کے اردو غزل کی روایت کو اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنایا ہے لیکن ان کے اندازِ فکر نے عام ڈگر سے ہٹ کر ان جذبات کو شعری پیکر عطا کیا ہے جنھیں ہمارے شعراء نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ بے چارگی کا احساس تو ہماری غزل میں موجود ہے لیکن شوخ کی بے چارگی میں دھوپ چھاؤں اور صبح کے دوش پر شامِ غریباں کی کیفیت شاعر کے تضادوں میں بکھر جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کا دوست اگر ان کو ناپسند کرتا ہے تو اس سے وہ برہم نہیں ہوتے بلکہ ذہن کے دھارے کو ساحل کا سکون دینے کے لیے دوست کو اس کی ناپسند کی داد دیتے ہیں۔ رشتہ ٹوٹنے سے ان کی نگاہوں کا رشتہ ٹوٹ نہیں جاتا بلکہ وہ ٹوٹے ہوئے رشتہ سے بندھ کر جینے کی سبیل ڈھونڈ لیتے ہیں اور جب تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں تو منزل کو خود اپنی جستجو کے لیے آواز دیتے ہیں۔ غرض کہ شوخ کی عشقیہ شاعری میں بھی ان کی اپنی انفرادیت ہے جو انھیں نہ صرف اپنے ہم عصر شعراء سے ممیز کرتی ہے بلکہ اردو غزل میں بھی ایک نئی جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ذیل میں شوخ کے تخیل کی کرشمہ سازیوں کو منظرِ عام پر لانے کی ایک کوشش ہے جو میں سمجھتا ہوں۔ شوخ کی شاعری کا ایک قابلِ توجہ اور جالبِ نظر رنگ ہے۔

آگ جنگل بھری نیند دں میں لگانے والے
تو بھی آنا نہ مرے خواب پریشاں کے قریب

پاؤں کی گرد ہو چکیں کتنی مسافتیں ، اب بھی مگر وہ دوری منزل ہے اڑ میں

وہ تو اک خواب ہے اور خواب بھی ریشم ریشم
نیند آجائے تو وہ نیند کو مخمل کر دے

اس نزع انتظار کو اک عمر ہو چلی ۔ کیسی ہمیشگی ہے یہ مرنے سے پیشتر
کچھ کہہ سکا نہ ڈوبتی آواز میں اسے ۔ آنکھوں تلک میں چڑھتے ہوئے پانیوں میں تھا

بہتی ندی تھی اور ہمیں عکس کی تلاش
ہم لہر لہر اپنی نگاہوں میں کٹ گئے

اڑ ہی نہ جاؤں جاگتی آنکھوں کے راستہ
نازک مزاج خواب ہوں میں مجھ کو سو کے دیکھ
بھٹکے ہوئے سے ملتا ہے بھٹکا ہوا کوئی
میری تلاش ہے تو مجھے راہ کھو کے دیکھ

ٹھکرا کے مجھ کو تو مری بیچارگی تو دیکھ ۔ میں دے رہا ہوں داد تری ناپسند کی

اک حسن سامنے ہے یوں اندھا نہ کر لے جسم
جلنا ہی ہے تو آنکھ کو اتنا دھواں نہ دے

بجھ سلگتے ہوئے جنگل پہ ہے چڑھتی آندھی
لوٹ جائے جو بھی اب گوشہ نشیں ہے مجھ میں

یہ تو دیکھو کہ کس حال میں چھاتی بیٹی
کیسے ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کو عمل میں لائے

سرزنی کی ہے دو ہاتھوں سے مشقت کی ہے
چوٹ دیکھو تو محبت نہیں محنت کی ہے

تیری صداقتوں میں یہ دکھ ہیں غزل سرا
مرمر کے کہہ رہا ہوں مکرر اسے زندگی

فطری اُبال اور داخلی ترغیب کے باعث جو تجربہ تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اس میں شناسا صداؤں کے ساتھ ساتھ معنی سے معمور اور شعریت سے تھرتھراتی ایک انجانی آواز کا رنگ بھی شامل ہوتا ہے جو تخلیقِ شعر کی نرم رو کو فرازِ خواب سے شعور کی سطح پر اتار کر لفظ و معنی کا ایک سنہرا پھیلاؤ عطا کرتی ہے شوخ کی شاعری ایک شخصی ادراک ہے جس میں طائرِ خیال کی پہنائیاں معنی کی نئی رفعتوں میں حروف کے ریشم سے احساسات کی نازک قبائیں بنتی ہیں اور جہاں کہیں سوچ کی ڈوری دوہری ہو کر پیچ کھاتی ہے تہہ در تہہ استعاراتی اور علامتی توسیع فن کار کا مقدر بن جاتی ہے ورنہ وہ مجبوراً استعمالِ الفاظ میں روایتی تراکیب کے بجائے دل کی لخت سے تراشے ہوئے الفاظ سے ایک ایسی زبان کو تشکیل دیتا ہے جو نئے محاوروں سے موصوف ہوتی ہے اور جس میں لفظوں کے درمیان کا رابطہ و رشتہ نیز ان کا تطابق و تخالف اس زبان کا وصف بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شوخ کے یہاں روایتِ غزل سے ایک گہرا اور شعوری ربط ہوتے ہوئے بھی جدت و انفرادیت کا عنصر ہے جس کے باعث قاری کو غزل کی نئی توانائیوں کا احساس ہوتا ہے۔

رفعت نواز
اورنگ آباد

ابراہیم اختر اور ان کے افسانے

سادہ ورق ابراہیم اختر کے اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ابراہیم اختر کے افسانے اس سے پہلے میرے مطالعے میں نہیں آئے تھے۔ البتہ "ہندو فلسفہ" پر ان کے ارق مضامین "شب خون" اور "کتاب" میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور ان سے ملاقات ہونے سے پہلے تک میرا خیال تھا کہ ابراہیم اختر اکیڈمک قسم کے آدمی ہوں گے۔ کسی کالج میں پڑھاتے ہوں گے، خشک اور کتابی باتیں کرتے ہوں گے لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی اور گھل مل کر باتیں کرنے کا موقع ملا تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ باغ و بہار آدمی ہیں کسی کالج میں پڑھاتے نہیں بلکہ ہندسوں کی جوڑ توڑ میں وقت گنواتے اور رزق پاتے ہیں ہندسوں کی جوڑ توڑ کا کام ایسا جان لیوا ہے کہ یہ کام کرتے ہوئے مضمون نویسی یا کہانی کے تانے بانے جوڑتے کا تصور بھی محال ہے بہت کم حسابی شخصیات ہیں جن کا ناطہ ادب سے بھی ہے۔ اردو ادب کی حد تک تو نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، ان میں سرِ فہرست نام مشتاق احمد یوسفی کا ہے لیکن حسابی فنکاروں کی اس خوبی کا اعتراف تو ان کے دشمن بھی کرتے ہیں کہ وہ لکھتے ٹھوک بجا کر ہیں اور فن کی کسوٹی پر ان کا ہر فن پارہ کھرا اترتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ہوں، مجبوب خزاں ہوں یا ابراہیم اختر۔

سب ہی حساب سے لکھتے ہیں۔ کفایتِ لفظی ان کی تحریروں کی امتیازی خوبی اور راست بیانی ان کا شعار ہے۔

ابراہیم آخترؔ کے افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے طول بیانی سے اجتناب کیا، شاعرانہ نثر سے دامن بچایا نیز ژولیدہ بیانی، بے معنی اور غیر ترسیلی علامات سے اپنے افسانوں کو بوجھل اور ناقابلِ مطالعہ نہیں بنایا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں اردو افسانہ پڑھنے اور پسند کرنے والوں کی تعداد افسوسناک حد تک کم ہوگئی ہے اردو افسانے سے قاری کی دلچسپی کیوں کم ہوتی جارہی ہے جبکہ اساطیر، داستان، قصہ اور کہانی سے دلچسپی تو انسانی فطرت ہے؟ وجوہات تو کئی ہوں گی لیکن سب سے بڑی وجہ تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ چند جوشیلے اور روایت شکن لکھاریوں نے جوشِ اجتہاد میں افسانے سے کہانی پن کو نکال باہر کیا اور واقعہ یا واردات کے بیان کو پوچ گردانا جبکہ بقول عزیز احمد "افسانہ دراصل واقعہ کا بیانی اظہار ہے اور واقعہ نگاری ہی افسانہ نگاری کی بنیادی تکنیکی غایت ہے" لیکن جب افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں واقعہ یا واردات کے بیان کو ترک کرکے صرف خیال یا احساس کو ہی تجریدی انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا تو قاری کی دلچسپی افسانے سے کم ہوتی گئی اور نوبت یہاں تک آپہنچی کہ قاری صنفِ افسانے ہی سے بدظن ہوگیا اور سچ بات تو یہ ہے کہ جب افسانے سے اس کا صنفی جوہر (کہانی پن) ہی غائب کر دیا گیا تو وہ افسانہ ہی کہاں رہا اسے کوئی اور نام دینا چاہیئے۔ اس بات کی شکایت صرف قاری ہی نہیں نقاد بھی کررہے ہیں چنانچہ مشہور ناقد ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں

"تجریدی، علامتی فضا کی تلاش میں ہمارا افسانہ لہو کی کمی کا شکار ہو رہا ہے ہمارے افسانہ نگاروں کو ایک بار پھر کہانی پن کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے تاکہ زمینی رشتے دوبارہ ہمارے افسانے میں ابھر آئیں"

خوشی کی بات ہے کہ ابراہیم آخترؔ نے اپنے افسانوں میں کہانی پن ہی کو اد بنائی

[redacted]

ہے۔ اس لیئے ان کے افسانے دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ بیانِ واقعہ میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے، گہری سے گہری بات سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔

ان دنوں جبکہ چند افسانہ نگار افسانے کے لیے تشبیہ، استعارہ، علامت اور تجرید کی بیساکھیاں لازمی جزو سمجھتے ہیں۔ ابراہیم اختر نے سادگی اور راست بیانی کو اپنایا ہے۔ مڈلٹن مرے کا یہ بیان انھوں نے شاید ازبر کر لیا ہے۔

"سادہ ہونے کے مقابلے میں پیچیدہ ہونا اور قابلِ فہم ہونے کے مقابلے میں پراسرار ہونا کہیں زیادہ آسان ہے، بڑا ادیب وہ ہے جو اپنے شعور کی پیچیدگی کو ظاہر کیئے بغیر نسبتاً سادہ الفاظ میں اپنے شعور کے اظہار کا طریقہ دریافت کرنے پر اصرار کرتا ہے۔"

ابراہیم اختر کے افسانوں میں جو واردات بیان ہوئی ہیں وہ روزمرہ زندگی میں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے بھی جانے پہچانے ہیں۔ ان کے دکھ اور خوشیاں، ان کی جد وجہد، کامیابیاں، ناکامیاں، ان کی حسرتیں، ان کی آرزوئیں اور ان کی بے بسی ان سب کا مشاہدہ اور تجزیہ ابراہیم اختر کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی اختصار بھی ہے۔ وہ طویل تمہید نہیں باندھتے، واقعہ کے بیان میں غیر ضروری جزئیات سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیئے ان کے افسانے یکسوئی اور تجسس سے پڑھے جا سکتے ہیں اور افسانہ اختتام پر بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ ابراہیم اختر کے افسانوں کی خوبیاں قلمبند کر نار ہوں تو کئی اوراق پر روشنی انڈیلنی پڑے گی اس لیئے اب بس کرتا ہوں کہ کھرے کو کھرا ثابت کرنے کے لیئے دلائل دینا دانشمندی نہیں ہے۔

عمدہ طباعت، کتابت اور کراؤن سائز پر شائع "سادہ ورق" مصنف ابراہیم اختر۔ فسانہ، فرینڈس کالونی۔ موانگی روڈ پربھنی یا ناشر "شائیمار پبلی کیشنز نیلک پیٹ۔ حیدرآباد ۳۶ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

مصطفےٰ شروانی
۳-۶-۶۰۲ حمایت نگر
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

ہماری سماجی سرگرمیاں

ماہنامہ شاداب کی ستمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں "ہماری ادبی سرگرمیاں" کالم یقینی طور پر ایک خوش آئند اضافہ ہے جو قارئین کرام کی ادبی دلچسپی کا باعث ہوگا مگر ساتھ میں اگر اسی کالم کا کینوس کسی قدر اور بڑھا کر "ہماری ادبی، سماجی سرگرمیاں" کر دیا جائے تو ماہنامہ "شاداب" کے مطالعہ کے وہ شائقین بھی اس وسیع تر کالم سے متاثر اور محظوظ اور مسرور ہو سکیں گے جو بہر حال دبستان دکن کی سماجی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہیں انجمن طلبائے قدیم علیگڈھ مسلم یونیورسٹی شاخ آندھرا پردیش، اقبال اکیڈیمی (جو از خود ایک ادبی شعری ادارہ ہے) حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، قومی یکجہتی وامن کمیٹی جو مرحوم صدر جمہوریہ عالیجناب فخر الدین علی احمد مرحوم کی یاد میں قائم کی گئی، عصمت میموریل پبلی کیشنز کمیٹی جو جناب مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کے علمی کارناموں کو گذشتہ دس سال سے منظر عام پر لاتی رہی ہے اور "ندائے رومی" جو مرحوم عصمت اللہ بیگ کا شاہکار ہے عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہوگا۔ یہ ادارے مسلسل سرگرم عمل ہیں اور آپ کے موقر ماہنامہ میں ماہ بہ ماہ ان اداروں کی کارکردگی کا تذکرہ ان بعض اہم سماجی اور معاشرتی ادبی اور اگر حالیہ "سیاست" فاونڈیشن لکچر کو شامل کر دیا جائے تو صحافتی خدمات کے اعتراف کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔

آپ کے ماہنامہ "شاداب" کی آئندہ اشاعت کے لئے ایسے سماجی اداروں کی روئیداد پیش کر رہا ہوں جو اگست اور ستمبر ۱۹۹۱ء کے ۳ ہفتوں میں منعقد ہوئے۔

۱۵ اگست ۹۱ء کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بائیز اسوسی ایشن شاخ آندھرا

[redacted]

پردیش کا جلسہ جشن یوم آزادی علیگڈھ کلب ہل فورٹ روڈ بشیر باغ کی عمارت میں بہ صدارت جناب شاہ منظور عالم سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی و نائب صدر انجمن طلباء قدیم علیگڈھ مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا جلسہ کا آغاز جناب مصطفیٰ شروانی کی قرآت کلام پاک سے ہوا اور بعد میں مصطفیٰ شروانی نے اپنی تقریر میں آزادی ہند کی اہمیت اور آزادی کے ضمن میں جن اہم شخصیتوں نے قربانیاں دیں ان کا تذکرہ کیا۔ جناب امجد اللہ صدیقی سابق سشن جج نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی اقتصادی اور معاشرتی اہمیت کا تذکرہ فرمایا۔ صدر جلسہ جناب پروفیسر شاہ منظور عالم صاحب نے موجودہ ناساعد حالات میں بھی اولوالعزمی اور مستقل مزاجی سے کام لینے کی تلقین فرمائی۔ جلسہ کے بعد مشروبات سے حاضرین کی تواضع کی گئی اور معتمد اعزازی جناب مصطفیٰ کمال الدین حسن کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔

★ یکم ستمبر ۱۹۹۱ء کو جوبلی ہال قدیم باغ عامہ میں ۴۳ ویں یوم تاسیس روزنامہ "سیاست" کا سیاست فاونڈیشن لکچر بصدارت عزت مآب جناب کرشن کانت گورنر آندھرا پردیش منعقد ہوا۔ جس کی نظامت کے فرائض جناب زاہد علی خاں صاحب مینجنگ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے بہت عمدگی سے سرانجام دیئے۔ اپنے کلیدی خطبہ میں جناب اندرکمار گجرال سابق سفیر ہند برائے روس و سابق وزیر خارجہ حکومت ہند نے سوویت یونین میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا عالمانہ اور پُر از معلومات انداز میں نقشہ کھینچا۔ جناب نواب ڈاکٹر [illegible] عابد علیخاں صاحب ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے "سیاست" کی ۴۳ سالہ خدمات پر روشنی ڈالی اور آئندہ اسی طرح ایک مخصوص صحافتی معیار قائم رکھنے کے لئے ارادہ کا اعادہ فرمایا۔

★ ۸ ستمبر ۱۹۹۱ء کو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسۂ عام صدر دفتر کانفرنس ۱۹ بیچلرز کوارٹرز جواہر لعل نہرو روڈ حیدرآباد میں بصدارت جناب مصطفیٰ کمال شروانی نائب صدر منعقد ہوا۔ سابقہ سالانہ جلسہ منعقدہ ۸ رجون ۹۰ء کی روئیداد کی توثیق،

نظامت کی سالانہ رپورٹ کی پیشکش، حسابات اور فرد و اصل باقی کی توثیق اور آئندہ سالانہ حسابات کی تنقیح کے لیے بحیثیت آڈیٹرز مسرس سنراج ایر اینڈ کمپنی چارٹرڈ اکاونٹنٹ کا سال ۹۲-۱۹۹۱ء کے لیے تقرر اور مالیاتی سال ۹۲-۱۹۹۱ء کے آمد و خرچ کا تخمینی بجٹ منظور کیا گیا۔ حسب ذیل عہدہ داروں کا سال آئندہ کے لیے انتخاب عمل میں آیا۔ مسز ایم اے شکور صاحب صدر، مصطفےٰ کمال شروانی صاحب نائب صدر، غوث محی الدین صاحب اعزازی معتمد، میر افتخار علی صاحب شریک معتمد، فخر الدین محمد صاحب خازن اور ۳۰ اراکین مجلس انتظامی جن میں جناب ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب، ڈاکٹر یوسف الدین صاحب، ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال، محترمہ ڈاکٹر امۃ المجید ناصرہ صاحبہ، جناب محبوب حسین جگر صاحب، جناب محمود انصاری، جناب مسعود انصاری صاحب، جناب منیر احمد صدیقی صاحب کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔

★ ۱۶؍ستمبر ۱۹۹۱ء کو بمقام "سرور ڈنڈا" میموریل سوسائٹی کنگ کوٹھی، حیدرآباد، جشن اعتراف خدمات جناب انور ہاشمی مدیر "شاہکار" کا مشاورتی اجلاس منعقد ہوا جس میں جناب سید رحمت علی سابق، جناب پریندر سریواستوا، جناب مصطفےٰ شروانی، جناب معین فاروقی مدیر روزنامہ "انگارے"، محترمہ اقبال جہاں قدیر نے شرکت فرمائی۔ جلسہ میں طے پایا کہ جناب انور ہاشمی مدیر شاہکار کی تقریباً نصف صدی صحافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۲۵ ہزار روپیہ کا کیسہ زر پیش کیا جائے۔ ایک کمیٹی بطور مجلس استقبالیہ تشکیل پائی جس میں سید رحمت علی صاحب کو صدر نشین مجلس استقبالیہ مسز کے پربھاکر ریڈی سابق وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش و جناب آصف پاشا سرپرست جناب مصطفےٰ شروانی، جناب معین فاروقی (ایڈیٹر انگارے) سردار کرتار سنگھ، جناب پریندر سریواستوا اور جناب سید تراب الحسن کو نائب صدور، جناب محمد لطیف الدین صاحب کو معتمد عمومی، محترمہ اقبال جہاں قدیر و سید عباس اللہ قادری صاحب کو شریک معتمدین اور شیخ غیاث الدین کو خازن منتخب کیا گیا۔

مرتبہ : موہن عاشق

ف

اشرف ولا، ۲۳-۷-۳۰، املے پلی حیدرآباد

ہماری ادبی سرگرمیاں

یکم ستمبر ۱۹۹۱ء روزنامہ سیاست کی ۴۳ ویں یوم تاسیس تقاریب کے ایک حصہ کے طور پر حیدرآباد ۴۰۰ سالہ جشن کی مناسبت سے شہر حیدرآباد پر مختلف زبانوں کی ۴۰۰ نادر و نایاب کتابوں کی ۵ روزہ نمائش آج رات اختتام کو پہونچی۔ نمائش میدان کے آرٹ پویلین میں اس قدر ہجوم بڑھ گیا تھا کہ کتابیں دیکھنے میں دشواری ہو رہی تھی شام میں گورنر مسٹر کرشن کانت اور سابق وزیر خارجہ و سابق سفیر ہند برائے سوویت یونین مسٹر اندر کمار گجرال کی آمد پر جناب عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" نے ان کا استقبال کیا۔ مسٹر زاہد علی خان مینجنگ ایڈیٹر "سیاست" عبدالقیوم اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ اور مینو اسکرپٹ لائبریری کرامت صاحب نے گورنر صاحب اور آئی کے گجرال صاحب کو کتابوں کی تواریخ اور ان کی اہمیت سے واقف کروائے۔ گورنر صاحب اور سابق وزیر خارجہ مسٹر گجرال نے نمائش کی کافی تعریف کی۔

یکم ستمبر۔ "حلقہ" کا ادبی اجلاس بہ ۳۰-۶ ساعت شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ تلگو کے مشہور شاعر مسٹر این گوپی نے اپنی منتخب تلگو نظمیں پیش کیں۔ جناب غیاث متین نے ان کا اردو ترجمہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا۔ اس اجلاس میں صدر اجلاس جناب مراہی فدائی، ڈاکٹر بیگ احساس، جناب غلام جیلانی، ڈاکٹر صدیقی علی، اکمل حیدرآبادی تلگو کے مشہور شاعر مسٹر بھانو مورتی، دیوی پریا اور نقاد پروفیسر راما راؤ نے مباحث میں حصہ لیا۔ نظموں پر سیر حاصل تبصرے ہوئے۔

یکم ستمبر۔ ۸ بجے شب "سوغات نظر" کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ بمقام اشرف ولا املے پلی

منعقد ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت جناب منان منظور (صدر سوغاتِ نظر) نے کی۔ بہ حیثیت مہمانِ خصوصی جناب حلیم بابر (محبوبنگر) نے شرکت کی۔ جناب صلاح الدین نیر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اضلاع کے باصلاحیت کہنہ مشق شعراء کے ساتھ ساتھ ایسے جواں سال منفرد شعراء جن کے لب و لہجہ میں تازگی اور فکر میں بہترین مستقبل کے عنصر نمایاں ہوں وقتاً فوقتاً شہر کی محفلوں میں مدعو کیا جانا چاہیئے۔ مشاعرہ کی کارروائی مومن خاں شوق نے چلائی۔ اس مشاعرہ میں صدر مشاعرہ جناب منان منظور، جناب حلیم بابر (مہمانِ خصوصی) کے علاوہ مسرز صلاح الدین نیر، عزیز بھارتی، مومن خاں شوق، ڈاکٹر منیر الزماں منیر اور ضیاء عرفان نے اپنا منتخب کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کی۔ معتمد عمومی سوغاتِ نظر ڈاکٹر منیر الزماں منیر نے شکریہ ادا کیا۔

۴ ستمبر ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس شام ۳۰۔۶ بجے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت محترمہ نجمہ نکہت نے کی۔ جناب امیر احمد خسرو نے ۱۲ رباعیات، ۲ قطعات، ۲ نظمیں اور ایک غزل سنا کر دادِ تحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے آغا باجی کے نام سے افسانہ سنایا۔ امیر احمد خسرو کے کلام پر جناب راشد آذر اور جناب صلاح الدین نیر نے سیر حاصل تبصرہ کیا اور کہا کہ ان کی شاعرانہ زندگی بے نیازی اور منفرد طرزِ حیات پر مبنی ہے مباحث میں مسرز ذکی شاداب، رئیس اختر، باقر حسن، محترمہ بانو طاہرہ سعید، عاتق شاہ نے حصہ لیا۔ محترمہ قمر جمالی نے بانو طاہرہ سعید کے افسانے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محترمہ نجمہ نکہت نے کہا کہ امیر احمد خسرو ہمارے شہر کے اساتذۂ سخن میں شمار کیئے جاتے ہیں۔

۶ ستمبر ۔ ۸ بجے شب مسٹر رما چاری ڈائرکٹر محکمہ تہذیبی و ثقافتی امور نے ادارہ میرا شہر میرے لوگ کے زیر اہتمام رویندرا بھارتی میں شاندار پیمانے پر شام غزل کا اہتمام کیا۔ س میں ڈاکٹر جگدیش کلا، دیوی رما مورتی، مالا بربیریہ، کلیم خان اور خان الطہر نے اپنے فن کی بلندیوں پر پہنچ کر حیدرآباد کے بقیدِ حیات ۲۲ شاعروں کا کلام پیش کیا اور دادِ تحسین حاصل کی۔ سامنے گلوکار ار دو زباں سے واقف ہیں صحیح تلفظ اور صحتِ لفظی کے ساتھ شعر سنا کر اردو زبان

کی مقبولیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے شہر کی تہذیبی روایات اور مذاقِ فنِ موسیقی میں اچھی خاصی تبدیلی لائی ہے حیدرآباد میں اپنی نوعیت کی اس منفرد محفلِ موسیقی کو اہلِ ذوق حضرات نے بے حد پسند کیا۔

۷ ستمبر۔ ۹ بجے شب "دیارِ ادب" کی جانب سے بمقام انجمنِ فمر ملے پلی انجم قمر سوز کی ۲۵ سالہ خدمات کے اعتراف میں اجلاس و مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اردو و ہندی کی ممتاز شاعرات ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید اور ڈاکٹر اندو وششٹ کی صدارت میں اجلاس منعقد کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور جناب قمرالدین صابری مدیر "شاداب" تھے دیگر مقررین میں منظور احمد منظور، نیہپال سنگھ ورما، محترمہ قمر جمالی شامل تھے سبھی نے ان کی شاعری، شخصیت اور فن پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کے بعد انجم قمر سوز کی گلپوشی کی گئی۔ بعد ازاں جناب رئیس اختر کی نظامت میں مشاعرہ ہوا۔ جس میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید ڈاکٹر اندو وششٹ، صلاح الدین نیر، انجم قمر سوز، رئیس اختر، منظور احمد منظور، عزیز بھارتی منان منظور، فیض الحسن خیال، مومن خاں شوق، نیہپال سنگھ ورما، ڈاکٹر منیر الزماں منیر بشیر امجد اور محمود حامد نے کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کی۔

۱۰ ستمبر۔ "اقلیمِ ادب" کے زیرِ اہتمام ایک پُر اثر ادبی و شعری اجلاس عزیز فاران ہل کالونی میں ممتاز ادیب و شاعر جناب مصلح الدین سعدی کے اعزاز میں منعقد ہوا۔ پروفیسر سراج الدین نے صدارت کی۔ صدرِ اجلاس کے علاوہ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، جناب مصلح الدین سعدی نے مخاطب کیا۔ جناب رحمٰن جامی نے مہمانِ خصوصی جناب سعدی کو نذرانہ خلوص کے طور پر قطعات پیش کیے۔ پروفیسر عابد پشاوری سابق صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی بھی شریک تھے۔ جناب غنی نعیم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ محفلِ شعر میں پروفیسر عابد پشاوری پروفیسر سراج الدین، مسرز صلاح الدین نیر، رحمٰن جامی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، عزیز بھارتی منان منظور، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، جمیل شیدائی، تدبیر انصاری، ناظر الدین ناظر، فسیم اعجاز رحیم رامش، کاغذی نگوی اور آر۔ رشید منظر نگوی نے حصہ لیا۔ غنی نعیم اور عزیز فاران کے شکریہ پر اختتام ہوا

۱۱؍ستمبر ۔ ۶ بجے شام ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ پر پروفیسر غلام جیلانی کے ڈراموں کے مجموعہ" دوسرا کنارہ " کی رسم اجراء بدست ڈاکٹر مغنی تبسم انجام پائی ۔ پروفیسر آئزک سیکوئیرا نے صدارت کی اور عوض سعید و بیگ احساس نے خاکہ اور مضمون سنایا ۔

۱۳؍ستمبر ۔ اُردو مجلس کا ادبی اجلاس آردو ہال حمایت نگر میں بصدارت جناب منظور احمد منظور منعقد ہوا ۔ معتمدی کے فرائض جناب قدیر انصاری نے انجام دیئے جناب حسن فرخ نے اپنا مضمون " وزن اور آہنگ " پیش کیا ۔ جناب علی احمد جلیلی نے چار خوبصورت غزلیں پیش کیں ۔ محترمہ نجمہ نکہت نے کہانی " راستہ کا پیڑ " پیش کی جسے بے حد پسند کیا گیا ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب راشد آذر، جناب اسلم عادی، جناب مظہر مہدی، محترمہ قمر جمالی نے سیر حاصل تبصرے کیئے ۔ جناب منظور احمد منظور نے اپنی صدارتی تقریر میں حسن فرخ کو مبارک باد دی اور جناب علی احمد جلیلی کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ غزلوں میں عصری حیثیت ہے انسان کی زندگی کا ماضی اور حال ہے ۔ محترمہ نجمہ نکہت کی کہانی میں سماجی مسائل اور گھریلو مسائل کو بہت عمدگی سے پیش کیا گیا جناب قدیر انصاری کے شکریہ پر محفل کا اختتام ہوا ۔

۱۳؍ستمبر ۔ ۶½ بجے شام کمشنر اطلاعات و تعلقات عامہ و غزل گندھروا ڈی مرلی کرشنا نے رویندرا بھارتی میں شبستانِ غزل کا پروگرام پیش کیا جسے سامعین نے کافی سراہا ۔ انھوں نے منتخب غزلیں پیش کرتے ہوئے ایک سماں باندھ دیا ۔ چیف منسٹر مسٹر این چندرا بابو نائیڈو نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی ۔ ریاستی وزیر اطلاعات مسٹر پی کرشنا مورتی اور ریاستی وزیر تعلیم مسٹر پی وی رنگاراؤ نے صدارت کی ۔ چیف منسٹر نے اس موقع پر مرلی کرشنا کے پہلے ویڈیو کیسٹ کی رسم اجراء انجام ۔ موسیقی مناظر الدین کی تھی ۔ مشہور بانسری نواز ملند شیوڑے کے ساتھ نجم الدین جاوید نے طبلہ پر سنگت کی اور منتخب شعراء عثمان علی احسان، سیف الدین سیف، علی احمد جلیلی، استھانہ سحر، قیصر الجعفری، معین احسن جذبی، صبا افغانی، جگر مرادآبادی، مومن خاں شوق، جوش ملیانی، فیض احمد فیض، شاہد صدیقی، ابرار گورکھپوری اور علاء الدین نوید

کے کلام کو بہترین فوٹوگرافی اور جدید کمپوزنگ کے ساتھ پیش کیا گیا جو شائقین غزل کے لیئے نایاب تحفہ ہے۔

۱۴ استمبر۔ ۸ بجے صبح ہندی سنستھان واقع ریلوے گڈس نامپلی میں یوم ہندی منایا گیا مشہور ہندی صحافی منندر جی نے صدارت کی۔ جناب سید یسین سیٹھ صدر اردو ہندی منچ مہمانِ خصوصی تھے جناب رادھے شیام دوبے جی صدر سنستھان نے کہا کہ ہندی دیوس کے اس مبارک موقعہ پر انہوں نے طے کیا کہ ہندی سنستھان ہندی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ تلگو اور اردو والوں کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ قومی یکتا کے لیئے یہ بہت ضروری ہے مدیر شاداب محمد قمرالدین صابری نے بھی مخاطب کیا اور کہا کہ اردو ہندی منچ کے ساتھ "شاداب" بھی اردو ہندی دونوں کے لئے کام کرے گا اور ہندی ادیبوں کی تخلیقات اردو میں شائع کی جائیں گی۔ ہندی سنستھان کی طالبات اور گیتا جی اور عارف الدین سلیم نے مخاطب کیا۔ دوبے جی کے شکریہ پہ جلسہ برخواست ہوا۔

۱۴ استمبر۔ ۱۱ بجے دن محفل خواتین کا ماہانہ اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر حبیب ضیاء صاحبہ منعقد ہوا۔ محترمہ انور حمید الدین صاحبہ نے افسانہ "ہائے دل" سنایا۔ محترمہ فاطمہ تاج صاحبہ نے "محفل خواتین کی خواتین میری نظر میں" کے عنوان سے دلچسپ خاکہ پیش کیا اور داد پائی۔ محترمہ آر بانو صاحبہ نے "پیروڈی یا تحریف" کے زیر عنوان مختلف شعراء کے کلام کی پیروڈی مثالیں دیتے ہوئے بہت معلوماتی مضمون پیش کیا۔ خاتون شعراء محترمہ خورشید حمید پاشاہ، فاطمہ تاج، مظفر النساء ناز، سیدہ مہر اور رخسانہ شہیدی صاحبہ نے بھی کلام سنایا۔

۱۴ استمبر ۷ بجے شام بمکان محمد قمرالدین صابری مدیر "شاداب" ریڈ ہلز مرکز ادب حیدرآباد کا ماہانہ طرحی مشاعرہ بصدارت جناب فیض الحسن خیال صاحب منعقد ہوا۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے اکمل حیدرآبادی، رئیس اختر، صلاح الدین نیر کے ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں منشا، (ناگپور) مرزا غفار بیگ آتش گلشن آبادی نے شرکت کی۔ جناب محمد قمرالدین صابری

(نائب صدر) نے شعراء اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ جناب مومن خان شوق نے نظامت کے فرائض ادا کیئے۔ صدر مشاعرہ جناب فیض الحسن خیال مہمانانِ خصوصی مسرز اکمل حیدرآبادی رئیس اختر، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر منشاء الرحمن خاں منشاء، مرزا غفار بیگ اثر کے علاوہ مسرز منظور احمد منظور، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، قاضی انجم عارفی، ڈاکٹر رشید حسن، مومن خاں شوق، محمود شریف محمود، کلیم الحق قریشی طالب، مسرور عابدی، طاہر گلشن آبادی، رؤف رحیم نے کلام سنایا۔ نیز مدیر شاداب قمر صابری نے اپنی پہلی طرحی غزل سنا کر خوب داد تحسین حاصل کی۔ محمود شریف محمود نے شکریہ ادا کیا۔

۱۹ ستمبر۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام اردو ٹائپ رائیٹنگ کلاسز کا ۲۳ ستمبر صبح ۹ ساعت سے اردو کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر نزد آندھرا بینک مہدی پٹنم آغاز ہو رہا ہے۔ اردو ٹائپ رائیٹنگ کے تجربہ کار اور ماہر ٹرینر جناب محمد علاء الدین صاحب تربیت دیں گے۔ طالبات کے لئے (۳) طالبات پر مشتمل (۵) بیاچس صبح ۹ تا ۱۲ ساعت دن اور طلباء کے لئے (۳) طلباء پر مشتمل (۵) بیاچس دو تا ۵-۳۰ بجے دن کام کریں گے۔ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی کے مطابق اس سنٹر کا محکمہ فنی تعلیم سے الحاق کیا جائے گا اور اسی کے نصاب کے مطابق تربیت دی جائے گی۔

۱۹ ستمبر۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے حیدرآباد میں نیشنل اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے صدر اکیڈیمی مسٹر محمد جلیل پاشاہ نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران بتایا کہ ریاستی حکومت نے انسٹی ٹیوٹ کیمپس کے لیے جوبلی ہلز پر پانچ ایکڑ اراضی حاصل کی ہے وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ کو انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد رکھنے کی دعوت دی جائے گی۔ انسٹی ٹیوٹ میں ہاسٹل بھی ہوگا۔ مسٹر جلیل پاشاہ نے مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل سے اپیل کی ہے کہ وہ اکیڈیمی کو پچاس لاکھ روپیے کی ماہانہ سالانہ گرانٹ جاری رکھے۔ توقع ہے کہ ریاستی حکومت سالانہ گرانٹ کو دس لاکھ سے بڑھا کر ۱۵ لاکھ روپے کر دے گی۔

[illegible] گورنمنٹ [illegible] مشاعرہ [illegible] جناب [illegible] خان [illegible]

شاداب

جلد (۸) شمارہ (۱۱)

نومبر ۱۹۹۱ء حیدرآباد

قیمت =/6 روپے

فون 22916l

زر تعاون

ہندوستان	سالانہ	65	روپے	۲ سال کے لئے	120	روپے	تاحیات	1500	روپے
ی ممالک	"	200	"	"	360	"	"	3700	"
ریکہ	"	40	ڈالر	"	70	ڈالر	"	700	ڈالر
نگلستان	"	25	پونڈ	"	45	پونڈ	"	400	پونڈ
کستان	"	175	پاکستانی روپے	"	300	پاکستانی روپے	"	3000	پاکستانی روپے

:- (ترسیل زر کا پتہ) :-

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈہلز حیدرآباد ۴

بلیشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار

سے ماہنامہ شاداب 147-5-11 ریڈہلز حیدرآباد ۴ سے جاری کیا۔

فہرست

سید احمد عروج قادریؒ قسط ۱۴

اسلامی تصوف

۱۔ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے کہا "قلت عمل کی فکر نہ کرو، قبولیت کی فکر کرو اس لیئے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا تھا کہ عمل میں اخلاص پیدا کرو، قلیل عمل بھی تمہارے لیئے کافی ہوگا۔

۲۔ یہ روایت نوافل کے لیئے ہے، فرائض تو متعین ہیں ان میں کمی بیشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ حضرت معروف کرخیؒ اپنے آپ کو مارتے اور کہتے یا نفس اخلصی تخلصی (اے نفس مخلص بن، نجات پائے گا)

۴۔ حضرت ایوب السجستانیؒ نے کہا، نیتوں میں اخلاص پیدا کرنا، عمل کرنے والوں پر تمام اعمال سے زیادہ سخت ہے

۵۔ حضرت یحیٰی بن معاذ نے کہا اخلاص، عمل کو تمام عیوب سے اس طرح الگ کر دینے کو کہتے ہیں جس طرح دودھ، گوبر اور خون سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

۶۔ صوفیہ کا ایک قول یہ ہے،

"عمل کھیت ہے اور اخلاص اس کا پانی ہے۔"

۷۔ بنی اسرائیل کے ایک عابد کی حکایت ہے کہ وہ ایک طویل مدت سے عبادت میں مشغول تھے، کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور کہا کہ یہاں کے کچھ لوگوں نے ایک درخت کی پوجا شروع کردی ہے یہ سن کر ان کو غصہ آیا، کلہاڑی اپنے کندھے پر رکھی اور اس درخت کو کاٹنے کے ارادے سے روانہ ہوئے راستے میں شیطان ایک بوڑھے آدمی کی شکل میں ملا۔ اس نے کہا " اللہ تم پر رحم کرے، کہاں چلے؟ " انھوں نے کہا " میں اس درخت کو کاٹنے جارہا ہوں " اس نے کہا بھلا آپ کو اس سے کیا تعلق؟ " آپ نے کیوں اپنی عبادت و ریاضت ترک کی اور کسی دوسرے کام کے لئے اپنے کو فارغ کیا، انھوں نے کہا " یہ کام بھی میری عبادت ہی کا حصہ ہے " اس جواب کے بعد اس نے کہا میں تمہیں یہ درخت نہیں کاٹنے دوں گا، وہ لڑنے پر تیار ہوگیا۔ عابد نے اس کو پکڑ کر پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گئے، تب اس نے کہا مجھے چھوڑ دو میں تم سے کچھ اور گفتگو کرنا چاہتا ہوں، عابد نے اسے چھوڑ دیا، ابلیس نے کہا، اے جناب، اللہ نے اس درخت کو کاٹ ڈالنا آپ پر فرض نہیں کیا ہے آپ خود اس درخت کی عبادت نہیں کر رہے ہیں۔ دوسروں کے عمل کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اللہ اپنے انبیاء بھیجتا رہتا ہے اگر وہ چاہے تو یہاں ایک نبی بھیج دے اور انھیں اسے کاٹنے کا حکم دے۔ اس کے بعد پھر عابد نے کہا میں اس کو ضرور کاٹوں گا۔ " ابلیس پھر جنگ کے لئے آمادہ ہوگیا اور عابد نے اسے پھر پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر جا بیٹھا۔ اب ابلیس عاجز ہوگیا اور اس نے کہا، کیا آپ فیصلہ کن بات نہ سنیں گے جو آپ کے لئے بہت نفع بخش ہے عابد نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے چھوڑ دیجئے تو بتاؤں۔ عابد اس کے سینے سے نیچے اتر آئے اس نے کہا (یہی ابلیس کا آخری حربہ تھا) آپ ایک محتاج آدمی ہیں، آپ کے پاس

کچھ نہیں ہے۔ آپ ان دوسرے لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں جو آپ کی کفالت کرتے ہیں اور شاید آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے احباب پر فضیلت حاصل ہو، اپنے پڑوسیوں کی مدد کریں۔ خود آسودہ ہوں اور دوسرے لوگوں سے بے نیاز ہو جائیں، یہ سن کر عابد نے کہا "ہاں"۔ ابلیس نے کہا تو آپ اس کام سے باز آجائیں، اس کے بدلے میں مجھ پر آپ کا یہ دین ہوگا کہ روزانہ رات کے وقت آپ کے سر کے پاس دو دینار رکھ دوں، صبح اٹھ کر آپ اسے لے لیں اور ان کو اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں اس کے علاوہ اپنے احباب کو صدقہ دیں۔ یہ آپ کے لیئے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے اس درخت کو کاٹنے سے بہتر ہے کہ آپ ایک درخت کاٹیں گے تو اس کی جگہ لوگ دوسرا درخت لگا دیں گے اور اس درخت کو کاٹ ڈالنے سے ان کو نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ اس سے دوسرے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا۔ ابلیس کا یہ تیر نشانے پر بیٹھا، عابد سوچنے لگا اور دل میں کہا کہ نبی نہیں ہوں کہ مجھ پر اس درخت کو کاٹ ڈالنا لازم ہو، نہ اللہ نے مجھے اسے کاٹنے کا حکم دیا ہے کہ میں نہ کاٹوں تو گنہگار ہو جاؤں گا اور اس بوڑھے نے جو بات کہی وہ زیادہ فائدہ مند ہے۔ اس کے بعد ابلیس نے اپنے وعدے کو پورا کرنے کی قسم کھائی اور عابد اپنے گھر لوٹ گیا۔ صبح کو اس نے اپنے سر کے پاس دو دینار دیکھے۔ اس نے اس کو اٹھا لیا، دوسری اور تیسری صبح کو بھی دینار رکھے ہوئے ملے، لیکن اس کے بعد دینار رکھے ہوئے نہیں ملے، اب تو اس کو بہت غصہ آیا اور کلہاڑی اپنے کندھے پر رکھ کر نکلا، ایک بوڑھے کی شکل میں شیطان پھر ملا۔ اس نے پوچھا، کہاں چلے؟ جواب ملا اس درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں، اس نے کہا، تم جھوٹے ہو، بخدا تم اسے کاٹنے پر قادر نہیں ہو اور نہ تم اس تک پہنچ سکتے ہو، یہ سن کر عابد نے پہلے کی طرح اس کو پکڑ کر پچھاڑنا چاہا، ابلیس نے کہا اب تم نہیں پچھاڑ سکتے یہ کہہ کر ابلیس نے اس کو

بکھرا اور پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا، عابد اس کے قدموں کے درمیان ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گوریا چڑیا۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر تم درخت کو کاٹنے سے باز نہ آئے تو میں تم کو ذبح کر دوں گا۔ عابد نے محسوس کیا کہ اس میں مقابلے کی طاقت نہیں ہے، کہا تم مجھ پر غالب آ گئے۔ مجھے چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ پہلے میں کیوں کر تم پر غالب آ گیا تھا اور اب تم کیوں مجھ پر غالب آ گئے؟ ابلیس نے کہا پہلی دفعہ تمہارا غصہ خالصتہً اللہ کے لیے تھا اور تمہاری نیت آخرت میں ثواب حاصل کرنے کی تھی اس لیے اللہ نے تمہارے مقابلے میں مجھے مغلوب کر دیا اور اس دفعہ تمہارا غصہ اپنے نفس اور دینار کے لیے ہے اس لیے میں نے تم کو پچھاڑ دیا ــــ

واقعہ یہ ہے کہ آدمی اخلاص کے بغیر شیطان سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ ؎

(؎ احیاء علوم الدین ج ۴ باب الاخلاص)

اخلاص کی نعمت کن لوگوں کو ملتی ہے؟ حضرت امام غزالیؒ نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ "اخلاص کی نعمت انھیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کے قلب و دماغ پر آخرت کی فکر غالب آجائے اور یہی ان کے تمام دنیوی نفع و نقصان کا پیمانہ بن جائے۔"

ظاہر ہے کہ یہ چیز نفس سے جہاد کیئے بغیر حاصل نہیں ہوتی، آدمی کا نفس اس کو دنیا اور مرغوباتِ دنیا کی طرف نہ صرف مائل بلکہ اسی کو نفع و نقصان کا معیار بنا دینے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ اس سرکش گھوڑے کے منہ میں تقویٰ کی مہار ڈال کر اس کو رام کیئے بغیر اخلاص کا حصول ممکن نہیں ہے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ عبادت و اطاعت میں بھی دنیا گھس آتی ہے اسی لیئے بزرگانِ دین نے اخلاص کو مشکل ترین کام قرار دیا ہے ▲ (باقی آئندہ)

(نوٹ: اکتوبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں کسی وجہ سے قسط نمبر ۱۲ شائع نہ ہو سکی تھی)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

سیاست نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

سیاست نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصول عام اور ہمہ گیر تھے پہلے ان ہی کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے یہ مکہ سے مقابلہ کرنے میں بھی اتنے ہی ملحوظ رہے جتنے دیگر سیاسی وحدتوں کے سلسلہ میں۔

سب سے پہلا اصول جو ہر حالت میں پیش نظر رہا وہ یہ تھا کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر آپ اٹھے تھے اس کی اشاعت ہو اس غرض کے لیئے مالی منفعت اور خواہش انتقام کو نظر انداز کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مکہ کو بلا شرط اور بندور فتح کیا تو یہ بہت آسان تھا کہ اس مالدار شہر کو آپ لوٹ لیتے اور مہاجرین کی مغصوبہ جائیدادوں اور دیگر جسمانی اور مالی نقصان کا بدلہ لیتے۔ ابوسفیان گرفتار ہو کر ہاتھ آئے تو کچھ نہیں تو ان سے چند ہزار کا فدیہ ہی طلب کر لیتے۔

کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو اکثر حقیر اور کمزور دشمنوں تک کا مقابلہ نہیں کرسکتی تاریخ عالم اس کے مثالوں سے بھری ہوئی ہے یہاں اس اصول مسلمہ کا بیان مقصود نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناگزیر باہمی اختلافات کو کس طرح روکا یا دور کیا جاتا تھا اور کس طرح اختلافات کو مٹانے سے اپنی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آتے ہیں تو مسلمانان مدینہ اوس اور خزرج کے دو رقیب اور خون کے پیاسے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ابھی بعاث کی معرکہ آرائی کا خون بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں متصادم قوموں کی سرداری

کوئی قابلِ رشک حالت میں نہیں جا سکتی جس طرح آج اسلامی مبلغین کو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک حل نہ ہونے والی گتھی سے سابقہ ہے کہ وہاں حبشیوں میں تبلیغ کرو تو وہ کہتے ہیں آمنا۔ لیکن آپ گوروں کی پنچنگ پر اتر آنے والی ننگِ انسانیت قوم کو اسلام کی برکات سے ہرگز متمتع نہ ہونے دیجئے اور گورے نو مسلم نہیں چاہتے کہ حبشی بھی مسلمان ہو کر ان سے سماجی مساوات حاصل کر لیں۔

عرب کے خانہ بدوش بدو آج بھی اپنے حضری اور بستیوں میں رہنے والے بھائیوں کو سخت حقارت سے دیکھتے ہیں۔

سب سے مقدم یہ کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں ایک تاراج تھا ایک شہری مملکت تک نہیں پائی جاتی تھی۔ چند عرب قبائل مسلمان ہو گئے تھے اور چند میں ابھی تک اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ان کے ساتھ ہمسائے میں ہزاروں کی تعداد میں یہودی رہتے تھے جو زراعت، تجارت، صنعت غرض جملہ معاشی زندگی پر حاوی تھے ان میں بھی آپس میں خونریز اور دائمٹ رقابتیں تھیں اور ان کا ایک مذہب اور تمدن تھا اور ان کے اسلام قبول کرنے کی اتنی بھی توقع نہ تھی جتنی لامذہب بدوؤں کی، ان سب کے ساتھ سیکڑوں مہاجرین تھے جو مکہ کے بیسیوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے ان تمام عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور مدینہ میں ایک شہری مملکت قائم کر کے اس کا ایک دستور مرتب کرنا اور اس کے ذریعہ راعی اور رعایا کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا اور پھر ان تمام متصادم اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لا کر ان سے مفید کام لینا یہ ابتداً سیاستِ خارجہ ہی کے مسائل تھے اور طے ہو چکنے کے بعد اندرونی مسائل بن گئے۔

مدینہ کی حفاظت کے علاوہ اس کے اندرونی استحکام کے لیئے اس بات کی ضرورت تھی کہ آس پاس کے قبائل سے دوستی کی جائے چنانچہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے جنوب مغرب اور ساحل سے متصل علاقہ کا بار بار دورہ شروع کرتے ہیں اور ینبوع وغیرہ میں رہنے والے قبائل سے حلیفی کرتے ہیں کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان ان کو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے تو یہ مدد کو آئیں گے۔ بعض معاہدات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے کی شرط منظور کی گئی تھی بعض میں اتنی پابندی بھی نہ تھی اور

قبیلہ غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہوا تھا بعض میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں ان قبائل کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ بہرحال مدینہ کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں میں کمی کی مسلسل کوشش کی جا رہی تھی ۔

ایک اور اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ عرب میں جو شخص یا خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آ بسے۔ یہ سیاست فتح مکہ تک باقی رہی اور بہت کم سے استثناء منظور کیا جاتا تھا اس سیاست کا نتیجہ یہ ہوتا تھا مسلمان فوج کے لیے محفوظ رنگروٹوں میں روزافزوں اضافہ اور ان نو مسلموں میں اسلام کی گہرائی ۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی اس طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا۔ اسلامی فوج کا نقصان اس سے کم بھی تھا۔ اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے دشمن کے ۷۰ آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی جنگ تھی ۔

دشمن کو بے بس کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو کم ترین حد تک گھٹا دینے کے لئے ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ فنون حرب میں اتنا کمال حاصل کیا جائے کہ حریف مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ اس غرض کے لیے بہر اچھی چیز جہاں سے بھی ملے ہو اختیار کی گئی ۔

عربوں میں صف بندی کا رواج نہ تھا جوش کا بے وقت اور بے محل استعمال اور اسلحہ کا بیکار خرچ بھی عام چیز تھی۔ جنگ بدر ہی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے سپاہیوں میں صف بندی شروع کر دی تھی اور معائنہ میں جو آگے پیچھے نظر آتا تھا اسے درست کیا جاتا تھا فتح مکہ کے وقت تو صف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہو گئی تھی جو وازع کہلاتا تھا ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ ہوتا تھا اور کم عمر رضاکار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا اور طور پر نامناسب افراد مثلاً مشرکین یہودی وغیرہ) واپس کر دیئے جاتے تھے جنگ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئیں تھیں وہ یہ تھیں کہ جب تک میں حکم نہ دوں کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے دشمن دور رہے

تو تیر چلا کر بیکار نہ ضائع کرے بلکہ اور پاس آئے تو مارے اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر مارے اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے۔" وردی کی غیر موجودگی میں اور شب خون کی ضرورتوں کے لیئے اسلامی سپاہیوں کے لیئے "تشعار" (واچ ورڈ) مقرر کئے گئے تھے اور ہر دو بدو کے مقابلہ کے وقت سپاہی اسے دہراتا اور حریف وہ لفظ نہ دہراتا تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ رفیق نہیں بلکہ دشمن۔

خندق کے ذریعہ محصور شہر کی مدافعت اسی اصول کی ایک دوسری مثال ہے چنانچہ جنگ خندق میں شہر مدینہ پر دشمن کو حملہ آور ہونے سے اسی کے ذریعہ سے روک کر ناکام واپس کیا گیا۔ غزوہ کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعہ کی پتھر برسائے گئے تھے طائف کے محاصرہ میں مزید براں دبابے بھی استعمال کیئے گئے تھے جو ترقی پاکر زمانہ حال میں خود بخود حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

دبابہ ایک پہیئے والی گاڑی ہوتی ہے جس کے اوپر بیل کا یا کوئی اور موٹا چمڑا منڈھ دیا تھا کہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو صدمہ نہ پہنچے۔ فصیلوں کو کھودنے اور مسائل کرنے کے لئے اسے کام میں لاتا جاتا تھا طائف میں منجنیق کے علاوہ عرادہ بھی برتا گیا تھا جو منجنیق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکتا تھا۔

فوجوں کی مشقیں، گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں وغیرہ کی دوڑ تیر اندازی کے مقابلے اور فوجی اسپورٹ، نمازوں کے ذریعہ صف بندی، روزے کے ذریعہ ہر موسم میں سپاہیوں کو بھوک پیاس کی مشق، حج کے ذریعہ عرفات کے بے آب وگیا علاقوں میں کوچ اور قیام وغیرہ ان کے علاوہ یہاں سرکاری اصطبلوں، محفوظ چراگاہوں اور اسلحہ خانوں کا قیام بھی اسی سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔

ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا قریش کے سلسلہ میں بہت مکمل مظاہرہ ہوا وہ یہ کہ دشمن کی ہر نقل و حرکت سے اسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لئے مکہ میں بھی آپ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے میں دشمن نے مدینہ کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی اتفاق سے اسی زمانہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم عرب کے شمال میں

کی طرف گئے ہوئے تھے آپ کا آدھے راستہ سے واپس آجانا اور محاصرہ کنندوں کے پہونچنے سے پہلے دو ہفتہ کی مہلت پاکر خندق کی کھدائی کو مکمل کرنا۔ خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے اسی طرح فتح مکہ کی تیاری ایک شخص نے مدینہ سے قریش کو لکھ کر بھیجی تو پیام رساں راستہ میں پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ناکوں کی بندش (جس طرح) جتنی مکمل ہوچکی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں جانے کی خبر مشہور کرنا تھا کہ دشمن مغالطہ میں مبتلا ہو اور غلط سمت میں سفر کرکے چکر کھا کر منزلِ مقصود پر پہونچنا بھی ہر وقت زیر عمل تھا اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ صرف "تبوک" کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ تو یہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترکِ وطن پر مجبور کیا تھا اور کس طرح ان مہاجرین کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلہ اشیاء کے ذریعہ وہ نفع کمایا کرتے تھے اور اسی غرض کے لئے سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ کو کاروان لے جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام، فلسطین، مصر، عراق وغیرہ جایا کرتے تھے۔

شمالی راستہ اس علاقہ سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے مابین ہے اوپر بیان ہوچکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقہ کے باشندوں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے معاہدے پیدا کرنے شروع کردیئے تھے اور جب اس کی ایک حد تک تکمیل ہوگئی تو قریشی کاروانوں کو غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کردیا اور صحرا میں سے ہوکر عراق جانے لگے۔ لیکن جلد ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے بھی غلہ ملتا تھا ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے خاص کر ثمامہ بن اُثال کے مسلمان ہونے پر غلہ کی برآمد مکہ کو روک دی گئی تھی۔

متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے موثر ہتھیار ثابت ہوا۔

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے دوستوں کو اس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے جوڑنے پر آمادہ کیا جائے یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بالآخر بہت کارگر ثابت ہوا۔

بیعت عقبہ میں جو مدینہ والے مسلمان ہوئے تھے وہ اصل میں قریش سے حلیفی کرنے آئے تھے۔ دستور مملکت میں مدینہ کے یہودیوں کو اسی شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف بڑھا دینا منظور کیا گیا تھا کہ وہ قریش کو کبھی مدد نہ دیں۔ نہ ان کے جان و مال کو کوئی پناہ دیں اس دستور میں مدینہ کے غیر مسلم عربوں کی حفاظت اس شرط سے منظور کی گئی کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور ان کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں اطراف مدینہ کے قبائل سے بھی معاہدات میں اسے ملحوظ رکھا گیا۔

کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں انہیں کاروانوں کے ٹھہرنے کے زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں پانی اور دیگر ضروریات کے فروخت سے روزگار نکلتا ہے آج کل ہم حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور دور دور سے بدوی تربوز، گھی، بھیڑ، بکری وغیرہ وہاں لے جاتے ہیں قریشی کاروانوں کے رک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی اور آ شجع وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم کارنامہ صلح حدیبیہ ہے سنہ ۶ھ میں مدینہ میں مسلمانوں کے دو دشمن تھے۔ شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ۔ دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا دوا کے بڑھنے والی دشمنی کو روکنا اور ہم خیالی کی صورت اختیار نہ کر دینا بھی ضروری تھا یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینہ کو فوج سے خالی پا کر مکہ والے آ کر نہ لوٹ لیں لہٰذا [illegible] نے [illegible] مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے اور اس کے معاوضہ میں [illegible] تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست [illegible] کہ قریش کو اس وقت موثر مدد دے سکنے والے صرف خیبری تھا

کو پچھاڑ دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ تھا۔

مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم و خزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں جو مکہ کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدار سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری فتوحات کی دھاک ہاشی وسائل پر۔ بدست اقتدار ان تمام امور نے چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع کر دیا تھا۔

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہد نبوی میں برتا گیا تھا جنگ خندق اس سلسلہ میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان کو اس پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگ خندق میں قریش اور مدینہ کے یہودیوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہو کر محاصرہ اٹھا دیا اور بے نیل مرام واپس چلے گئے۔

یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے کہ دشمن کے ایک طبقہ کو موہ لیا جائے اوپر بیان ہوا کہ قریش کے غلہ کی منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرا دی گئی مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکہ میں قحط نمودار ہو گیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا اس وبا کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہو گیا تو پھر یہ بندش اٹھالی گئی اور بہت ممنون ہوئے یہی نہیں بلکہ اسی ... میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکہ کے سردار ابوسفیان کو بھیجی گئی کہ مکہ کے فقراء میں تقسیم ہے۔

ان کارروائیوں سے مکہ میں بیسیوں بہی خواہ پیدا ہو گئے اور اس طرح کی سیاست سے موقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز۔ آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو حدیث

اطہر سلطانہ (ریسرچ اسکالر)
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

قرآن اور غور کا مقام

قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتب میں سے آخری جامع اور کامل کتاب ہے۔ ساری انسانیت کے لئے یہ ایک ہدایت نامہ اور اس پر ایمان رکھنے والوں کے لئے ایک دستورِ حیات ہے۔ رہتی دنیا تک اسی سے ہدایت وابستہ ہے جو اس سے وابستہ رہا وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اللہ کی کتاب کا حق کما حقہ ادا کرتے ہیں، ان کی تائید خود قرآن نے اپنے الفاظ میں کی ہے۔

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا "قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو" (المزمل)

یعنی کہ اس کتاب کی صحیح تلاوت اس کو سمجھ کر پڑھنا، اس کے معنی اور مطالب میں غور و فکر اور پھر اس پر انفرادی عمل اور اجتماعی حیثیت سے ساری دنیا میں اس کتاب کو پھیلانا، اس کے پیام کو ساری انسانیت تک پہنچانا، اس کے احکام کی روشنی میں خلافتِ الٰہی کا قیام، ایک صالح معاشرہ قائم کرنا حاملینِ قرآن کی ذمہ داری ہے۔

قرآن دراصل ایک دستورِ حیات، نورِ مبین اور مشعلِ راہ بن کر آیا۔ جس طرح آفتاب عالم تاب ساری دنیا کو روشن کرتا ہے اسی طرح قرآنِ کریم اپنے انوارات ہمارے دلوں کو منور کرتا ہے۔ قرآن کی تاثیر کا اصل مقام تو انسان کا دل ہے جہاں دل پر اثر ہوا وہیں ساری کائنات ہی بدل گئی۔ اس پر عمل اس بات کا متقاضی ہے کہ مسلمان کی پوری، پوری زندگی سنور جائے گی اور سب عقائد و عبادات، اخلاق و معاشرت اور معیشت و سیاست غرض سب کچھ جو انسانی زندگی سے وابستہ ہیں وہ

سب کے سب قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ اور عملی تفسیر ہیں۔

اُمت محمدیہ ہی ایک ایسی خوش نصیب اُمت ہے جس کے پاس اللہ کی کتاب آج تک من وعن محفوظ ہے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہم پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ اس میں ہمارے ہی متعلق لکھا ہے یعنی کہ اس میں مسلمان کے نام بھی پیام ہے اور غیر مسلم کو بھی خطاب کیا گیا ہے۔ مقصدِ نزولِ قرآن دراصل یہ بتایا گیا ہے۔ خود قرآن ہی کے الفاظ کی روشنی میں

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ — "یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں" (ص ۲۹)

اب جب کہ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اسے اپنا امام اور رہنما بنائیں۔ اس کے احکام کی روشنی میں اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھائیں، قرآن پاک ہی دراصل ہدایت و عبرت کا واحد سرچشمہ ہے یہ اسی لیے نازل ہوا کہ اس کی آیات پر غور و فکر کیا جائے اور اس کی تذکیر و نصیحت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اپنے نزاعات اور اختلافات کا حل اسی میں تلاش کریں۔ اسی عزم کے ساتھ اس کی تلاوت کریں کہ اسی کی رہنمائی میں ہمیں اپنی زندگی تعمیر کرنی ہے، اگر ایسا نہ کریں تو قرآن ہی کے الفاظ میں وہ "کافر، ظالم اور فاسق ہیں" (المائدہ ۔ ۴۴ ۔ ۴۷)

جو اپنے آپ کو حضورؐ کے اُمتی کہتے ہیں ان پر اوّل درجہ میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو قرآن کے سانچے میں ڈھالیں۔

اس بات کا ماحصل یہ نہیں کہ صرف قرآن شریف پڑھ کر ایمان لائیں بلکہ ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی از حد ضروری ہے اور یہی سب سے بڑی صداقت ہے یعنی کہ جنت کا حصول صرف نسل اور قومیت پر موقوف نہیں بلکہ ایمان اور عملِ صالح

پر ہے جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

"یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو بھی اللہ اور روزِ آخر پہ ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے" (البقرہ ۸۰)

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر نہیں بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے نتیجہ یہ ہے کہ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ، دنیا اور آخرت کی تباہی۔ ایمان اور نیک کاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل صالح، باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے۔ نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے۔ یہاں کی کامیابی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس عقیدے کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔ اس طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان لانا، کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے۔

الغرض حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی اصلاح کے لیئے انسانی عظمت کو برقرار رکھنے کیلئے جو سب سے بڑا پیغام لے کر آئے، جس کی جامع حقیقت صرف ایک کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" میں پنہاں ہے۔ دنیا کے اس سچے رہبر اور دینِ حق کے پیغمبر، جن کے ظہورِ بابرکت نے تاریکی کو روشنی سے، معصیت کو رحمت سے، ضلالت کو ہدایت سے اور گمراہی کو روحانیت سے بدل دیا، یعنی کہ دنیا میں عدل و انصاف

رحم و محبت اور مساوات و حریت کی بادِ صبا چلنے لگی۔ آپ نے مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلائی اور عورتوں کی عزت و احترام اور مساوی حقوق قائم کیے۔ عورت کے حق میں عموماً دنیا افراط و تفریط ہی سے کام لیتی آئی ہے۔ کبھی وہ گھٹائی گئی تو اتنی کہ جیسے اس کا شمار دائرہ انسانیت میں نہیں اور کبھی بڑھائی گئی تو ایسی کہ جیسے مرد اس کے محکوم اور تابع ہیں۔ لیکن اس محسنِ انسانیت ﷺ نے نہ صرف مرد کو ہی اشرف المخلوق ہونے کا تاج پہنایا بلکہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر عزت اور حقوق عطا کیئے اور تمام خونخوار افعال کا خاتمہ ہمیشہ کے لیئے کردیا۔ ان اسلامی تعلیمات کے آگے دنیا کی تمام قوموں اور مذاہب کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے خاص طور پر دنیائے عرب کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی ان کے یہاں تو عورتوں کا وجود ہی اہلِ خاندان کے لئے باعثِ ننگ و عار تھا ظہورِ اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں اگر کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو اس معصوم اور بے گناہ کو زندہ درگور کر دیا جاتا۔ کیوں کہ بیٹی کی پیدائش ان کے لئے باعثِ عیب شرمندگی تھی چنانچہ قرآن کریم میں عرب کے اس جہالت آمیز ماحول کا نقشہ یوں کھینچا ہے

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ‎﴿﴾‏ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ‎﴿﴾‏

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خوف کا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے، سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے۔"

(سورہ نحل ۵۹-۵۸)

لیکن جب اس کائنات عالم کے اُفق سے اسلام کا سورج طلوع ہوا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف لائے تو آپؐ نے عورت کی مظلومیت کو یکسر ختم کر ڈالا۔ آپؐ نے دنیا کو یہ بتلا دیا کہ عورت بھی آدم کی نسل سے ہے ہر ایک نیکی و بدی میں جزا و سزا کی برابر کی حق دار ہے۔ جہاں تک حقوق کی نسبت ہے قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔

" وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ

عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں"

(البقرہ - ۲۲۸)

جس طرح کوئی مرد اعمالِ صالحہ سے اپنے معبود کو راضی کر کے اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا باعث ہو سکتا ہے، اسی طرح عورتوں کے لئے بھی اعمالِ صالحہ اور جنت الفردوس کا دروازہ کھلا ہے حجتہ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی واشگاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ "اسلام میں نہ تو کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کالے پر، بلکہ فضیلت کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے

بے شک اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ بلند کردار ہے جو جتنا صاحبِ کردار ہو گا اتنا ہی عزت کا مستحق ہو گا۔ اگر کوئی مرد کسی عورت سے زیادہ صاحبِ کردار ہو تو اس عورت سے افضل ہے اسی طرح اگر کوئی عورت کسی مرد سے زیادہ بلند کردار ہو تو قرآنِ کریم کی رُو سے وہ عورت اس مرد سے یقیناً برتر ہے اس طرح سے داعیٔ اسلام نے جو اپنا اسوۂ حسنہ اس طبقے کے لیے پیش فرمایا وہ یقیناً عورتوں کی مکمل ترقی کا ضامن ہے۔

تاریخِ عالم کے اوراقِ پارینہ سے جیسا کہ ہم پر یہ حقیقت روشن ہے کہ دُنیائے انسانیت کی ہر قوم و ملت سوائے اسلام کے انہیں ہیچ و مجبور و بے بس اور کمزور سمجھتی ہے لیکن اسلام نے اس نیرنگی کا دامن چاک کیا اور ان کے آنسو پونچھے۔ انہیں جن حقوق

سے محروم کردیا گیا تھا وہ سارے حقوق ہمیں باعزت طریقے سے دینے کا اعلان کیا۔

کثرت سے ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جس سرزمینِ عرب میں عورتوں کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا جاتا تھا وہیں اس تعلیم کی بدولت ایسی عورتیں پیدا ہوئیں۔ جنھوں نے ایسے شاندار کارنامے پیش کیے کہ مشکل سے اُن کی نظیر مل سکتی ہے۔

غور کیا جانا چاہیئے کتنا مبارک وجود ہے اس کا، اگر قرآنِ حکیم کے نزدیک عورت کا مقام مرد سے کم تر ہوتا اور اُس کی زندگی اور عظمت مرد کے مساوی نہ ہوتی تو قرآنِ مجید کی یہ سورۃ حضرت مریمؑ کے بجائے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب ہوتی۔

وہ کون سی ایسی صفات ہیں جو قرآنِ پاک میں صرف مردوں کے لیئے بیان ہوتی ہیں اور عورتوں کو ان سے محروم رکھا گیا ہے؟ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ رب العزت نے مردوں اور عورتوں کو یکساں صفات بیان کرتے ہوئے قرآنِ حکیم میں متعدد اور ارشاد فرمایا ہے کہ:

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَٰتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَٰتِ وَالْقَٰنِتِينَ وَالْقَٰنِتَٰتِ وَالصَّٰدِقِينَ وَالصَّٰدِقَٰتِ وَالصَّٰبِرِينَ وَالصَّٰبِرَٰتِ وَالْخَٰشِعِينَ وَالْخَٰشِعَٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَٰتِ وَالصَّٰٓئِمِينَ وَالصَّٰٓئِمَٰتِ وَالْحَٰفِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَٰفِظَٰتِ وَالذَّٰكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّٰكِرَٰتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا۔

بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والی عورتیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں

اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے:

(الاحزاب ۳۵)

قرآن شریف میں برابری کا تصور اتنا واضح ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ نے جو بھی ہدایتیں فرمائی ہیں اس کے مخاطب عورت اور مرد دونوں رہے ہیں شروع سے آخر تک قرآن شریف میں طرزِ تخاطب دیکھیے تو ہمیشہ "یَآ اَیُّھَا النَّاسُ" اے لوگو اور یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اے لوگو جو ایمان لائے کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اس طرح جہاں مسلمین کہا گیا ہے وہاں "مسلمات" مومنین کہا گیا تو "مومنات" کہا گیا۔ صادقین کہا گیا تو "صادقات" کہا گیا، صالحین کے ساتھ "صالحات" بھی کہا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے اس طرزِ تخاطب کا ہم جب دوسرے مذاہب کے ساتھ موازنہ کریں تو اس کی اہمیت اور بھی دوچند ہو جاتی ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ متعدد آیاتِ قرآنی میں عورتوں کا ذکرِ خیر موجود ہے چنانچہ سورہ النساء، سورہ انبیاء، سورہ آلِ عمران، سورہ القصص، سورہ التحریم، میں عورت کی عظمت کا برسرِ عام اعلان کیا ہے۔

غرض اسلام اور ہادیٔ اسلام نے عورتوں کے درجہ کو بلند کرکے ان کے لئے مساوی حقوق قائم کرکے ان کا احترام مردوں پر واجب کر دیا اور یہی وہ کمی تھی جن کو امم سابقہ کے ہادی پورا نہ کر سکے تھے داعیٔ اسلام کی اس عزت افزائی کے باعث زندہ درگور کی جانے والی لڑکیاں علم و عمل، بہادری اور اولوالعزمی، زہد و تقویٰ اور خدمتِ دین میں بعض اوقات مردوں سے بھی گویا سبقت لے گئیں۔

اس لئے ہم کو چاہیئے کہ اسلامی لٹریچر کا کافی مطالعہ کریں اور ساتھ ہی ساتھ قرآن شریف کو بھی مع تفسیر پڑھیں، قرآن شریف صرف تبرکاً پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایک قانون ہے جس کے مطابق ہمیں اپنی زندگی کو ڈھالنا ہے جب تک ہم اس میں ایک مجاہدانہ عزم نہ باندھیں گے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔

وہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل : جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقشِ قدم

سعیدہ انور
ریسرچ اسکالر شعبۂ ہندی
عثمانیہ یونیورسٹی
۲-۱-۱۴ منگل ہاٹ
حیدرآباد

دکنی کے صوفی شاعر

منشی میر امداد علی علوی رنگیلا

شہر حیدرآباد جہاں گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے پیار و محبت کا سمندر ہے بھائی چارگی کا بھنڈار ہے اس کے پیچھے ہمارے بزرگوں، سنتوں، صوفیوں اور ولیاؤں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جن کی تعلیمات سے ہم مستفید ہو کر آپس میں بلالحاظ مذہب و ملت، باہمی پیار و محبت سیکھا۔ انسانیت کا درس پڑھا اور بھائی چارگی، امن و شانتی کا پیغام پایا۔ ان تمام اوصافوں کی روشنی سے سرزمینِ دکن منور ہے اور اپنی اس روشنی سے سارے ملک کو منور کرنے کا اعزاز دکن کو ضرور ہے لیکن آج ہم کو پھر ایک بار ہمارے بزرگوں کی تعلیمات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جن سے ہم نے پیار، محبت، ایثار، قربانی اور یکتا کا سبق پڑھا۔ ماں باپ اور استاد کا ادب سیکھا۔ آج پھر ہمیں انہیں بزرگوں کی تعلیمات کی ضرورت ہے۔ مخلوق سے محبت ہی انسان کا دھرم ہے

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ؎ ورنہ اطاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

پھر ایک بار ہم کو پیچھے مڑکر ہمارے بزرگوں کی تعلیم کو اپنانے کی سخت ضرورت ہے آج ہم کو ہر قسم کا آرام میسّر ہے سائینسی دنیا سے ہم بھلے ہی مستفید ہوئے جس کی وجہ سے ہر قسم کی سہولت و آرام ضرور میسّر ہے۔

لیکن ہمارے قلوب مضطرو بے قرار ہیں۔ تسکینِ قلب و سکون کے لئے ہم کو ایکبار ہمارے بزرگوں کی تعلیمات کو دہرانا اور اپنانا ہوگا۔ مخلوق سے محبّت ہی انسان کا دھرم ہے سارے دھرموں کا نچوڑ ایکتا اور پیار و محبت ہے۔ یہ درس ہم کو ہمارے بزرگوں، صوفیوں، سنتوں اور اولیاؤں کی تعلیمات میں ملتا ہے۔

آج میں ایسے ہی دکن کے ایک گمنام صوفی شاعر کا تعارف کروارہی ہوں جو ایک صوفی شاعر ہیں اور اپنے عارفانہ کلام سے ادب کی دنیا میں نظم، نثر، قصیدہ، مرثیہ، غزل و مثنوی، قطعات، دوہے، راگنیاں، ٹھمری، دادرا، وغیرہ کے تخلیق کا شاہکار و فن کار ہے جس کی ایک ایک لفظ میں عرفان کے بلند مینارۂ نور ہیں اور گرو بھکتی کا بہترین نمونہ ہے اُن میں گرو بھکتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھکتی میں فنا کر دیتے ہیں۔

علمی مذاکرات میں نظام ششم نواب میر محبوب علی خان کے دورِ حکومت میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد مشائخین، علماء و صُلحاء کا مرکز رہا ہے اسی دورِ حکومت کے ایک صوفی باصفا کا جو اپنے زمانہ کے ایک عظیم درویش شاعر ہیں۔

مغربی یوپی کے ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ تھانہ بھون واقع ہے اسی بستی میں علم و فن کے ایسے مینارۂ علم و حکمت بُلند ہوئے جن کی ضوفشانی اور روشنی اب تک محققینِ علوم حکمت کو راہ کا می کرتے رہتے ہیں انہی میں حضرت منشی میرامداد علی علوی رنگیلا تھے۔

حضرت منشی میر امداد علی (علوی رنگیلا) حضرت شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی
اندان سے ہیں حضرت عبدالرزاق قبلہ رحمۃ علیہ اپنے زمانہ کے برگزیدہ
ے ہیں۔ آپ کا لقب شاہ العالمین ہے حضرت منشی میر امداد علی علوی اس
کے مشجر شاخ کے ثمر ہیں۔ حضرت منشی علوی کے وہ بارہویں پشت کے دادا
تے ہیں شاہ العالمین کا مقبرہ جھنجھانہ میں بہت ہی خوبصورت ہے جو بنلہ روضہ
نام سے بہت مشہور ہے۔

حضرت منشی میر امداد علی کے والد کا نام میر نجابت علی صاحب ہے پانی پت
ایک مجذوب غلام مرتضیٰ صاحب نے نجابت علی صاحب کے گھر امداد علی علوی
ملا کی ولادت اور آپ کی صاحبزادی کے بطن سے مولانا اشرف علی تھانوی کی
ئش کی پیشنگوئی کی تھی۔

آپ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ۲۹ جولائی ۱۸۳۹ء م ۱۷ جمادی الاول
۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ پدر بزرگوار میر نجابت علی فرزند دلنشین تھے، بچپن
ہی آثار بزرگی حضرت کی پیشانی سے نمایاں تھے والدین نے اس پاکیزہ ماحول
اپنے بیٹے نور نظر پر تعلیم و تربیت کی خاص توجہ فرمائی علوم منازلہ میں جوں
ں قدم آگے بڑھتے گئے جوہر علمیہ صیقل ہوتے گئے۔ حضرت نے طرز دہلی میں شاعری
آغاز کیا اور منشی احسان اللہ خاں تحیر سے اصلاح فرماتے ہیں۔ تحیر صاحب نے
یکھتے ہی کہدیا کہ یہ سب تو بڑھیا کلام ہے۔ آپ علی تخلص کرتے تھے۔
یر صاحب کے کہنے پر علوی تخلص لکھنے لگے۔

ہے یہ تحیر کا فیض علوی زبان دہلی جو بولتا ہوں
دگر نہ تھانہ بھون کا ہوں ضلع مظفر نگر کو دیکھو

(دیوان عمل علوی)

آپ کا پہلا دیوان "دیوانِ عملِ علوی" ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

اب عدم سے جانبِ ہستی لیئے جاتی ہے روح
دیکھیئے کیا کیا تماشے ہم کو دکھلاتی ہے روح
آکے قیدِ جسم میں دعویٰ جو کرجاتی ہے روح
کیا ہوا آخر تو امر اب یہی کہلاتی ہے روح
اے اجل یہ خود ہے دلبرداشتہ مت چھیڑ دیکھ
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاتی ہے روح

(دیوان عمل علوی)

ہے مست صہبائے عشق ساقی شراب ہم لیکے کیا کریں گے
دماغ میں بوئے سوز دل ہے کباب ہم لیکے کیا کریں گے
وہ رندِ مشرب ہیں ہم در زاہد نہ شوقِ جنّت نہ ذوق دوزخ
ثواب ہم لیکے کیا کریں گے عذاب ہم لیکے کیا کریں گے
جو میرے سوئے عمل کو دیکھا بروزِ محشر تو پھینک کاغذ
محاسبانِ قضا یہ بولے حساب ہم لیکے کیا کریں گے

(دیوان عمل علوی)

آپ کو اپنے وطن سے بڑی محبت تھی حبِ وطن کا جذبہ بہت تھا ۱۸۵۷ء کے غدر میں ہندوستان پر طغیانی کی گھٹائیں چھانے لگیں گورے حاکموں کے خلاف پورے ملک میں ایک نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ آزادی کی وہ آگ جس کی چنگاریاں میرٹھ چھاؤنی سے اٹھی تھیں۔ تھانہ بھون میں بھی وہ قصبہ تھا جس نے آزادی کی جدوجہد میں ملک کا ساتھ دیا۔ انگریز فوج نے تھانہ بھون کا محاصرہ کرلیا آزادی کی للکار کا جواب دینے والوں میں حضرت علوی رنگیلا بھی تھے۔

انگریز فوج نے قصبہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اہل قصبہ والے بھی اپنی شمشیروں کا جوہر دکھائے کچھ دیر تک جنگ دست بدست ہوتی رہی جس سے انگریزوں کے حوصلہ پست ہوگئے اور سب گورے بھاگ گئے گورا فوج کو شکستِ فاش ہوئی اور قصبہ والوں نے فتح پائی۔ مگر میرٹھ چھاؤنی کے قریب تھا جہاں انگریز فوج اکٹھا رہتی تھی۔ گوروں نے ناکامی کا بدلہ لینے کے لیئے کثیر تعداد میں عمدہ ہتھیاروں سے لیس تھانہ بھون کا رخ کیا۔ قصبہ والوں کو دم بہ دم کی خبریں میرٹھ سے مل رہی تھیں۔ اب گوروں کا مقابلہ کرنا دشوار تھا اس لیئے قصبہ والوں نے اجتماعی ہجرت کی ٹھان لی۔

حضرت علوی رنگیلا کیرانہ منتقل ہوئے جو ۴۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اب تھانہ بھون پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور مجاہدینِ آزادی کی تلاش جاری تھی۔ حکومتِ وقت کے باغی قرار دیئے گئے تھے۔

حضرت منشی امداد علی علوی رنگیلا کیرانہ سے کنجپورہ اپنے ماموں صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ وہاں کچھ دن کے بعد حضرت منشی امداد علی کی ماموں زاد بہن کے ساتھ شادی ہوگئی۔ آپ کی بھی تلاش جاری تھا۔ آپ جنگلوں میں غیر آباد مقام پر زیادہ وقت گذارتے تھے وہیں پر اُن کی ملاقات جمنا ندی کے کنارے شاہ ظہور الحق نامی بزرگ سے ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ

تُم نے کی ہے مخالفت اُن سے
ہاتھ سر پر خدا کا ہے جن کے (یاد علوی)

اللہ کی مرضی سمجھ کر علوی صاحب قبلہ خاموش رہ گئے اور شاہ صاحب کی خدمت میں لگے رہے۔ اُسی دوران ملکۂ انگلستان نے ذریعہ فرمان مقابلہ کرنے والوں کو معافی اور پناہ کا اعلان کیا۔ شاہ صاحب کے کہنے پر حضرت علوی حاکم کے پاس

جاکر تمام کمال صورتِ حال اپنے مقابلہ و مجادلہ تھانہ بھون گوش گذار کردی ۔ حضرت کی صداقت بیانی اور جرأتِ ضمیر سے حاکم بہت متاثر ہوا اور حضرت کو بری قــــرار دیا گیا ۔

الغرض حضرت منشی جی ۲۸ مارچ ۱۸۳۹ء م ۱۲۵۵ھ آمد بلدہ فرخندہ شاد ہوئے تو پھر وہ یہیں کے ہی ہو رہے ۔

حضرت منشی امداد علی علوی اپنے ایک انجنیر دوست کے پاس ٹھہرے تھے مگر اُس دوست میں گھمنڈ اور کفر کی بُو محسوس کی تو انہوں نے وہاں سے نکل کر اپنے ایک دوسرے صاحب کے پاس رہنے لگے ۔

حضرت علوی صاحب مکہ مسجد سے نماز جمعہ سے فارغ ہو کر مولوی قادر بخشی صاحب کے ساتھ حضرت مرزا سردار بیگ صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہو کر طالبِ بیعت ہوئے ۔ مگر مرزا صاحب قبلہ نے انکار کر دیا ۔ انہوں نے کہا کہ میں اُمی ہوں آپ ایک عالم ہیں ۔ میں عالموں کو اپنا مرید نہیں بناتا منشی رنگیلے کی جستجو بڑھتی گئی وہ پانچ سال تک حاضرِ خدمت ہوتے رہے لیکن آستانہ مرزا کو نہیں چھوڑا ۔

آخر کار رحمتِ مرزا کو جوش آہی گیا وہ اپنے دستِ حق پر منشی جی کو ۱۶ جنوری ۱۸۴۷ء میں 'شرف الدین خاں کی مسجد میں جو بیرون مچھلی کمان متصل دیوان دیوڑھی نواب محی الدولہ واقع ہے بیعت فرمائی ۔ آپ کو شاعری کا بے حد شوق تھا ۔ حضرت مرزا صاحب قبلہ نے فرمایا " آپ شاعری بند کر دیجئے " تبھی منشی جی نے ایک چاقو خرید کر نیام بنا کر کمر کے تسمہ میں باندھ لیا اس ارادہ سے کہ شاید کسی محفل میں بے ساختہ شعر نکل جائے تو زبان کاٹ ڈالوں ۔ (باقی آئندہ)

صلاح الدین نیر
کہکشاں، ۲/۸۲۴-۳-۱۱
جدید ملے پلی - حیدرآباد

آفتاب دکن ڈاکٹر سی نارائن ریڈی

کسی بھی شخص کے بارے میں یہ قیاس آرائی ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے سفر میں کن کن مرحلوں سے گذرتے ہوئے شہرت کی آخری حدوں تک پہنچ سکتا ہے لیکن بعض شخصیتوں سے ملنے کے بعد اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایسے غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے لوگ ایک نہ ایک دن شہرت و عظمت کی آخری منزل پر پہنچ جائیں گے جب ایسی شخصیتوں سے مل کر یہ احساس ہو کہ یہ شخصیتیں اپنے ہی قبیلے کے آدمی ہیں تو ساری ذہنی تھکاوٹ دُور ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ دل و دماغ معطر فضاؤں میں سیر کر رہے ہیں

انسان کو اپنی زندگی میں کچھ ایسے انسانی رشتوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے جن کی وابستگی سے فہم و فراست کے بیشتر گوشے اُجالوں کا سفر طے کرتے ہوئے پُر نور فضاؤں میں پھیل جاتے ہیں زندگی کے سفر میں کچھ ایسی شخصیتوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جن سے مل کر فکر و خیال، شعور و وجدان کی شمعیں جگمگانے لگتی ہیں اور جن کی محبت، عنایت، مروت، روشن خیالی اور شائستہ مزاجی کی وجہ سے معاشرہ کے خدوخال میں رنگ و نور کی بارش ہونے لگتی ہے ہم معاشرہ کی ایسی نمائندہ شخصیتیں، رشتوں کی مہک کا احساس دلاتے ہوئے خوشبو کا سفر طے کرتی ہیں تو کتنے ہی معطر

فضاؤں میں اپنی زندگی کی صبح و شام کو سموتے ہوں گے جب ایسے کامیاب و بامراد لوگ سر اٹھا کر کامرانی کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر طے کرتے ہیں تو بے شمار افراد ان کے کاروانِ خود شناسی میں شریک ہوتے ہوئے ایک ایسی منزل کی طرف بڑھتے ہیں جس کی کوئی حد آخر نہیں ہوتی۔ ایسے ہی باکمال اور خوش نصیبوں میں گیان پیتھ ایوارڈ یافتہ ممتاز شاعر پدم پروفیسر سی نارائن ریڈی کا نام بھی سر فہرست دکھائی دیتا ہے۔

اپنے گھر کے خاص تہذیبی ماحول سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے بعد جب ڈاکٹر ریڈی نے کریم نگر سے حیدرآباد کا رُخ کیا تو یہاں انھیں مختلف النوع مزاج، لوگوں سے سابقہ پڑا۔ وہ سب کے ساتھ رہتے لیکن اپنے ضمیر کی آواز کو سنتے ہوئے اپنے انداز سے شب و روز گذارتے ہیں۔

مادرِ جامعہ عثمانیہ اپنے جن لائق فرزندوں پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی اور جب مورخ جامعہ عثمانیہ کے عالمی شہرت یافتہ سپوتوں کی فہرست بنائے گا تو ڈاکٹر ریڈی کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔

جامعہ عثمانیہ کے ماحول نے ڈاکٹر صاحب کو تہذیب و تمدن، بھائی چارگی، رواداری، نشست و برخاست کا سلیقہ اور آدابِ گفتگو کا درس دیا ہے فاضل اساتذہ کی ذہنی تربیت نے انہیں زندگی کے طویل سفر کو کامرانی و کامیابی کے ساتھ طے کرنے کا گر سکھایا ہے۔ اچھا ماحول، اچھے ساتھیوں اور اچھے دوستوں کی خوشبو ان کے فکر و خیال کو مہکاتی رہی ہے۔ ہم عثمانین کے لئے یہ خود بھی ایک اعزاز ہے کہ ہم میں سے ایک شخص حیدرآباد کی تہذیب، روایات اور یہاں کے عطر بیز ماحول میں سانس لیتا ہوا اپنے ارتقائی سفر کو جاری رکھتے ہوئے وائس چانسلر کے اعلیٰ عہدہ پر پہنچ چکا ہے۔

میں اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں تلگو کے جن نامور شاعروں کی شاعرانہ عظمت

شہرت اور ادبی حلقوں میں ان کے فکر وفن کی مقبولیت اور پذیرائی سے واقف تھا ان میں ڈاکٹر صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر ریڈی سے پہلی ملاقات سے قبل میں ان کی تلگو فلمی شاعری سے بھی واقف تھا۔ مجھے تلگو کے اس شاعر سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا جس کی شاعری میں اردو کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور جو حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب و روایت کو اپنی کویتاؤں اور اپنے فلمی نغمات میں سموتا ہے جس زمانے میں ڈاکٹر ریڈی شعبۂ تلگو جامعہ عثمانیہ سے وابستہ تھے اسی زمانے سے ہی وہ تلگو فلموں کے لیئے لکھ رہے تھے اور ان کے نغموں کی شہرت پھیلتی جارہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک یادگار اور عظیم الشان جلسۂ عام میں اُس وقت ہوئی جب ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی صدر جمہوریۂ ہند بننے کے بعد پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تھے اور جن کا شہریان حیدرآباد و سکندرآباد کی جانب سے پبلک گارڈن (حیدرآباد) میں شاندار پیمانے پر استقبال کیا گیا تھا اس تقریب میں ڈاکٹر ریڈی کو تہنیتی نظم سنانے کے لیئے مدعو کیا گیا۔ اردو شاعروں میں یہ اعزاز مجھے حاصل ہوا تھا۔ اِس پہلے تعارف کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سرکاری و غیر سرکاری مختلف تقاریب میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے تقریباً ۲۰ سالہ دوستانہ مراسم ہیں لیکن گذشتہ ۱۰، ۱۲ سال سے ہم ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب ہو گئے ہیں اردو شعر و ادب سے متعلق جب بھی کوئی بات دریافت طلب ہو یا کسی موضوع پر مشورہ مقصود ہو یا مشورۂ سخن درکار ہو تو فون کرتے ہیں یا موٹر بھیج کر تلگو یونیورسٹی یا اپنے گھر پر بلواتے ہیں یہ سلسلہ استواری کے ساتھ اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ وتیرہ ہے کہ وہ نئے شاعروں اور نئے دوستوں سے بھی بلا تحفظ ذہنی ملا کرتے ہیں۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنے دوستوں کو نوازنا چاہتے ہیں تو مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

تلگو یونیورسٹی میں جب ایم اے اردو کے کورس کی تیاری کے سلسلے میں بورڈ آف اسٹڈیز کی تشکیل عمل میں لائی گئی تو اس میں میرا نام بھی شامل تھا ڈاکٹر صاحب نے فون پر مجھے اس بات کی اطلاع دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے آپ کا نام خصوصیت کے ساتھ شامل کیا ہے۔ جب میں نے یہ کہا کہ میں نہ تو کسی کالج کا لکچرر ہوں نہ کسی یونیورسٹی کا ڈاکٹر یا پروفیسر تو پھر آپ نے مجھے کیوں بورڈ آف گورنرس میں شامل فرمایا تو ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ جب ایک شاعر کی شخصیت اور اس کے فن پر یونیورسٹی میں مقالہ لکھا جاتا ہے تو کیوں نہ اس کی صلاحیتوں سے تعلیمی امور میں بھی استفادہ حاصل کیا جائے۔ میں نے آپ کا نام شامل کر کے ایک خوشگوار روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت لسانی مسائل پر ہمیشہ غیر نزاعی رہی۔ وہ سلجھے ہوئے دانشوروں کی طرح لسانی مسائل پر اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں کہ سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ان کی اپنی زبان کے ترجمان و نمائندہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ملک کی تمام زبانوں کا احترام کرتے ہیں اردو زبان کی عظمت، اس کے رچاؤ، اس کے انشراح اور اس کی دل کو چھونے والی کیفیات کو بے حد پسند کرتے ہیں ان کا یہ لسانی نظریہ ہے کہ ملک کی ہر زبان کو اس کا دستوری حق ملنا چاہیئے جس طرح ہر شہری کو دستور کی روشنی میں سانس لینے کا حق حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب جس زمانے میں سرکاری زبان کمیشن کے صدر نشین تھے تو ان دنوں تلنگانہ کے ملازمین خاص طور پر مسلمان ملازمین، تلگو نہ جاننے کی وجہ سے بہت پریشان تھے جب ڈاکٹر صاحب نے اپنی خدمت کا جائزہ لیا تو انھوں نے سرکاری زبان کی پالیسی کو متوازن بنا دیا۔ وہ بات نہیں رہی جو ان سے پہلے کے چیرمین کے زمانے میں تھی۔ سکریٹریٹ میں ڈاکٹر صاحب کا اجلاس اور میرا سکشن ایک ہی بلڈنگ میں واقع تھا اکثر ان سے ملاقات ہوتی کبھی تو لفٹ کے پاس اور کبھی ان کے موٹر میں سوار ہوتے

ہوتے وقت اور کبھی موٹر سے اُترتے وقت اور کبھی اُن کے اجلاس پر۔ جب کبھی ملازمین کے لئے تلگو میں نوٹنگ اور مراسلت کا مسئلہ درپیش ہوتا تو میں ان سے آفس میں ملتا اور اس مسئلہ پہ گفتگو رہتی۔ میں یہ کہتا کہ تلنگانہ کے ایسے ملازمین سرکاری دفاتر میں بہت کم رہ گئے ہیں جو تلگو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں اور جو حکومت کی حالیہ پالیسی و احکامات سے سخت پریشان ہیں آپ تلگو نوٹنگ اور مراسلت کی سطح پر نرم پالیسی اختیار کریں (جیسا کہ آپ کی طبیعت کا خاصہ ہے) تو مناسب ہوگا انھوں نے کہا میں جب بھی کلکٹرس کی میٹنگ بُلاتا ہوں یا اضلاع کے دورہ پر جاتا ہوں تو متعلقہ محکموں کے سربراہوں سے یہی کہتا ہوں کہ جنھیں تلگو آتی ہے وہ تلگو میں مراسلت کریں اور جنھیں تلگو نہیں آتی انہیں مجبور نہ کیا جائے بلکہ انہیں تلگو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور ایسے ملازمین جن کی عمر ۴۵ سال سے تجاوز کر گئی ہے اور وہ جو وظیفہ کے قریب ہیں انہیں مستثنیٰ رکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی چیرمین شپ کا دور ملازمینِ سرکار کے لئے نہایت سکون و اطمینان کا رہا۔

ڈاکٹر صاحب ایک سیکولر ذہنیت اور روشن خیالات رکھنے والے انسان کی حیثیت سے بھی معاشرہ میں اپنا ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں ان کے یہاں کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں ہے انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ کون کس مذہب کس عقیدہ اور کس زبان سے تعلق رکھتا ہے وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں ان کے دوستوں اور ان کے چاہنے والوں کی فہرست میں ہر شخص شامل ہے جو زندگی کی مثبت قدروں کی پاسداری کرتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب جیسے اعلیٰ ظرف، وضع دار لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ جو بلند مرتبہ کے حامل ہونے کے باوجود انسانی کمزور رشتوں سے جُڑے ہوئے لوگوں سے بھی اپنا رشتہ رکھتے ہیں۔ وہ معاشرہ میں بکھرے ہوئے تمام انسانی رشتوں کو سمجھنا جانتے ہیں اپنوں اور غیروں کی خوشیوں اور مسرتوں اور ان کے دکھ درد میں بھی برابر کے شریک رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں سے ہی نہیں عام لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ ان کے انداز مخاطب میں نرمی ہے لہجہ میں مٹھاس ہے پُرکشش شخصیت میں ایک بانکپن ہے شگفتگی اور شائستگی ان کے لب و لہجہ کی پہچان ہے ڈاکٹر صاحب بہترین دوست، بہترین دانشور اور بہترین شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسانی رشتوں کے ترجمان ہیں ڈاکٹر صاحب نہایت سادگی اور خوش اخلاقی کے ساتھ معاشرہ کے ہر اس شخص سے بھی روابط رکھنا چاہتے ہیں جو روشنی کی تلاش میں اندھیروں کی رہ گذر سے بھی گذرتا رہتا ہے جب ایک دفعہ وہ کسی سے ملتے ہیں تو برسوں گذرنے کے بعد اگر اس سے کہیں ملاقات ہو تو اس کو پہچان لیتے ہیں شناخت اور پہچان کے معاملے میں ان کی حسّات بہت تیز ہیں۔ اپنی شرافت، دوستانہ اور مخلصانہ رویہ کی وجہ سے حیدرآباد کی ہر نمائندہ سوسائٹی میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں وہ اپنے حیدرآبادی دوستوں سے اُردو میں بات کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں شگفتگی و شائستگی کے ساتھ اپناپن بھی ملتا ہے ڈاکٹر صاحب فطرتاً جہاں سنجیدہ طبعیت کے مالک ہیں وہیں قدرت نے انہیں ظرافت کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ دورانِ گفتگو، ظریفانہ جملوں سے محفل کو لالہ زار بناتے رہتے ہیں۔ انہیں قدرت نے خوش مزاجی، خوش پوشی و خوش اخلاقی اور خوش نگاہی کے ساتھ فراخ دلی کا جوہر بھی عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں لیکن ان کے ہاں عصری حسیت بھی بہ درجہ اتم موجود ہے اُردو کے شاعروں میں قلی قطب شاہ، میر، غالب، اقبال فیض، مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی ان کے پسندیدہ شاعر ہیں گرچیکہ وہ کلاسیکی ادب کو سنگ میل اور بنیاد کا پتھر سمجھتے ہیں لیکن ترقی پسند نقطۂ نظر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں انھیں معاشرہ کا ہر وہ شخص عزیز ہے جو اُجالوں کی سرزمین پر مایوس اور غم زدہ لوگوں کو دیکھ کر اپنا لہو سمجھو لیتا ہے۔

ڈاکٹر ریڈی نے گذشتہ ۲۰ برس میں تلگو فلموں کے لیے سینکڑوں گیت اور نغمے لکھے ہیں وہ ایک کامیاب فلمی شاعر کی حیثیت سے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں انھوں نے فلمی شاعری میں قدرتی مناظر، پیار، محبت کے علاوہ انسانی اقدار اور انسانی رشتوں کو اہمیت دی ہے اپنی فلمی شاعری میں انھوں نے ادب کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا، سماج کی نابرابری، حق تلفی، بگڑتے ہوئے سماج کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اُجالوں اور اندھیروں کے درمیانی فرق کے احساس کو جگایا ہے زندگی سے پیار کرنا، اونچ نیچ کی دیواروں کو ڈھا دینا انسانی رشتوں کی پذیرائی کرنا ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

تلگو شاعری میں صنفِ غزل کو پروان چڑھانے میں ڈاکٹر صاحب کا غیر معمولی کارنامہ ہے اُردو غزل کے تمام شعری لوازمات، مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف، تخلص اور شعر کے دونوں مصرعوں میں آپسی ربط کا خاص طور پر کامیابی کے ساتھ لحاظ رکھتے ہیں انھوں نے اپنے نام سی نارائن ریڈی کی مناسبت سے اپنا تخلص سِنارے رکھا ہے ان کی تلگو غزلوں کے آڈیو اور ویڈیو کیاسٹ منظرِ عام پر آچکے ہیں جو کافی مقبول ہوئے ہیں ڈاکٹر صاحب عنقریب منتخب تلگو شاعری کا اُردو منظوم ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب شروع کیا ہے توقع ہے کہ جلد ہی وہ اس خوشگوار فریضہ سے بھی عہدہ برآ ہوں گے۔ اُردو والے ڈاکٹر صاحب کو اپنی زبان کا شاعر سمجھتے ہیں اس لیے بھی حق بجانب ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیشتر تلگو نظموں کا اُردو میں کامیاب منظوم ترجمہ کیا ہے اور ان کی بہت سی نظمیں ملک کے کثیر الاشاعت مقبول ترین اخبار سیاست میں شائع ہو چکی ہیں ڈاکٹر صاحب اُردو مشاعروں میں تلگو شاعری سُنا کر بھی داد و تحسین حاصل کرتے ہیں عوام اور دانشورانِ فکروفن ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں وہ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ذریعہ اُردو تعلیم گریجویشن کیا ہے شُستہ اُردو میں نہ صرف

طلب کرتے ہیں بلکہ ریڈیو، دوردرشن کے علاوہ ادبی جلسوں، سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے اپنی اُردو دوستی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ریڈی نے کچھ دن پہلے ملاقات میں کہا کہ میں اُردو غزلیں لکھ رہا تھا میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں میں اُردو غزلیں کہنا شروع کروں جبکہ میں تلگو میں غزلیں لکھ رہا ہوں تلگو میں کچھ میں نے لکھا سبھی واقف ہیں میں نے لسانی ہم آہنگی کے فروغ کا عملی ثبوت دینے کے لیئے اُردو زبان میں بھی شاعری شروع کی ہے اور مجھے اُردو شاعری میں صنفِ غزل زیادہ پسند ہے چاہے تو آپ میری غزلوں کو تجرباتی غزلیں بھی کہہ سکتے ہیں ویسے بھی میں نے اُردو ذریعہ تعلیم سے گریجویشن کیا ہے جامعہ عثمانیہ کے ایک سپوت ہونے کی حیثیت سے اپنی مادرِ جامعہ کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں اسی اثنا میں میں نے اپنی بہت سی تلگو نظموں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے لیکن غزل کی بات ہی کچھ اور ہے میں چاہتا ہوں کہ نظرثانی کے بعد اپنی اُردو غزلوں کو جلد ہی کتابی شکل دوں۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کے ساتھ ایک ادبی شام ۲۳ر اکتوبر کو ۶ بجے شام زیرِ اہتمام "میرا شہر میرے لوگ" منعقد کی گئی جس کی روئیداد جو روزنامہ سیاست میں شائع ہوئی حسب ذیل ہے۔

لسانی ہم آہنگی ہی ملک کو متحد اور طاقتور بنا سکتی ہے زبان تفریق کے لیئے نہیں بلکہ جوڑنے کا ذریعہ ہے ان خیالات کا اظہار گورنر مسٹر کرشن کانت کیا۔ وہ ۲۳ر اکتوبر کی شام جوبلی ہال میں گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ تلگو اسکالر و شاعر پروفیسر سی نارائن ریڈی سینا رے کی اُردو غزلوں کی ایک شام یادگار محفل سے مخاطب تھے جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے صدارت کی۔ سینارے کی اُردو شاعری کو ملک نے قوم کے مستقبل کے لیئے ایک شمع روشن سے تعبیر کرتے ہوئے گورنر کرشن کانت نے کہا کہ اُردو زبان کا تحفظ، ترقی اور ترویج ہندوستان ہی میں ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا خمیر یہیں کا ہے۔ اُردو اگر زندہ رہے گی تو سرزمینِ ہند ہی میں زندہ رہے گی انہوں نے زبان کو جغرافیہ میں

[illegible]

اِن کو محدود کرنا یا کسی خاص مذہب سے زبان کا رشتہ جوڑ دینا مذموم ہے
ہنوں نے تلگو کے شاعر سِنارَے کی اُردو غزل گوئی پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے
دئے کہا کہ "سنارے" نے ملک کو اپنی ہمہ لسانی مساعی سے ایک مقام دیا ہے
ہ وہ مقام ہے جہاں لسانی لڑائیاں ختم ہو جائیں گی انہوں نے کہا کہ ایک اہل زبان
وسری زبان سیکھتا ہو تو اس سے لسانی و تہذیبی خزانہ میں اضافہ ہوگا انہوں نے
رَدو کے لئے گرانقدر کردار ادا کرنے والے غیر مسلم مشاہیر کا تذکرہ کیا۔ فراقؔ و بعض
ے شعروں کے ذریعہ سنارَے کو خراج تحسین پیش کیا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ
سیاست نے اپنے صدارتی خطبہ میں اس محفل کو ایک مثالی قرار دیا اور کہا کہ یہ محفل بانیٔ
شہر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ورثہ سے جڑی ہوئی ہے جس نے چار سو سال قبل اُردو
تلگو کا حسین سنگم پیدا کیا انہوں نے کہا کہ قلی قطب شاہ جو تلگو اُردو کا پہلا شاعر تھا آج
سنارَے نے تلگو داں ہوتے ہوئے اُردو میں اپنے جس کمال کا مظاہرہ کیا وہ چار
سو سالہ قدیم تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ انہوں نے ریاست کی تشکیل کے بعد آنجہانی
کالیشو رراؤ کی ہمہ لسانی کوششوں کو خراج پیش کیا جناب عابد علی خاں نے ڈاکٹر ریڈی کے
کلام سے متاثر ہو کر انہیں "سِنارَے صاحب" سے خطاب کرتے ہوئے خراج پیش کیا۔
اس تقریب میں ڈاکٹر ریڈی نے اپنی دو غزلیں پیش کر کے سامعین کو محظوظ کر دیا۔
انہوں نے ترنم میں بھی اپنی غزل سنائی۔

ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے جناب صلاح الدین نیّر پر انکشاف کیا کہ انہوں نے
ماسکو کے آج کے انتشاری حالات کے دوران اُردو غزل کہی جبکہ وہ ماسکو میں
مقیم تھے۔ اور اب تک دس سے زائد غزلیں کہی ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ جلد
سے جلد ان کا اُردو کلام کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئے ▲

پروفیسر اشرف رفیع
شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد

اردو انگریزی ڈکشنری

جناب یعقوب میراں مجتہدی کی ایک مجتہدانہ کوشش

زبان انسانی خیالات، جذبات اور ذہنی ردعمل کی ترسیل کا ایک نہایت موثر آلہ ہے زب
ہی کے ذریعہ تہذیبی تبدیلیوں اور تغیرات کو محسوس اور محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تبدیلیاں او
تغیرات تلفظ، صرف و نحو، معنیات اور اسلوب میں واقع ہو سکتی ہیں۔ ان کا سراغ
ذخیرۂ الفاظ کے ذریعہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ بعض الفاظ اس تیزی سے اور غیر محسوس
طریقہ سے زبان میں داخل ہو کر استعمال ہونے لگتے ہیں کہ ان کی اصل کا پتہ چلانا مشکل ہو جا
ہے۔ صرف معیاری اور اعلیٰ درجہ کی لغات سے ہی اس کے لیے مدد لی جا سکتی ہے۔

ڈکشنریوں کی تہذیب و ترتیب کا ایک مقصد موجود ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کے علا
معنوی وسعت کا ممکنہ حد تک احاطہ کرنا بھی ہے معنوی پھیلاؤ کے تحلیل اور تجزیہ میں زما
مکاں کا لحاظ ایک ضروری امر ہے۔ ہندوستان میں آریائی زبانوں کو معیاری زبان بن
کے لیے خانقاہوں، درباروں اور علم و ادب کی محفلوں اور مجلسوں کا سہارا لینا پڑا۔ اس
ساتھ ہی زبانوں کی کمیت اور کیفیت میں تیزی سے اضافہ اور وسعت پیدا ہونے لگی او
ساتھ ہی ڈکشنریوں کی ضرورت کا شدت سے احساس پیدا ہو گیا۔ ہندوستان میں پہلے یک
لغات تیار کئے گئے۔ جیسے جیسے ہندی، اردو اور دیگر ہندوستانی زبانیں فارسی، عربی، انگر
اور مقامی زبانوں سے متاثر ہونے لگیں ویسے ویسے دو لسانی، سہ لسانی اور چہار لسانی
لغات کی ضرورت کا احساس بھی بڑھتا چلا گیا۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں اردو کی

رنج، ترقی اور تعلیم کے لیئے سازگار ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اردو انگریزی، انگریزی اردو
شنریوں کا ضرورتاً مستشرقین کو خیال پیدا ہوا۔ اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی
ں اردو کی دو لسانی لغات ترتیب دی گئیں۔ ۱۸۶۶ء میں ڈنکن فاربس DUNCAN -
FORB تے (۸۰۲) صفحات پر مشتمل ہندوستانی۔ انگلش ڈکشنری مرتب کی جسے آج سے
ہ برس پہلے مجلس علمیہ دہلی نے دوبارہ شائع کیا۔ اس ڈکشنری کے تقریباً تیرہ برس بعد یعنی ۱۸۷۹ء
یں۔ ڈبلیو۔ فیلن (S.W. FALLON) نے "نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری" ترتیب دی
ڈکشنری کے (۱۲۱۶) صفحات تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جان۔ ٹی۔ پلاٹس (JOHN.T.PLATTS)
اردو کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش ڈکشنری" شائع ہوئی۔ ان تینوں ڈکشنریوں میں پلاٹس
لسانی ڈکشنری بہت زیادہ جامع ہے اس کے (۱۲۵۰) صفحات پر صرف اردو، انگریزی کے
الفاظ نہیں ہیں بلکہ اس میں کلاسیکل ہندی کے شدہ سنسکرت الفاظ بھی شامل ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو اور انگریزی کے بڑھتے ہوئے استعمال کے پیش نظر مولوی عبدالحق
احب نے ۱۹۲۷ء میں ایک انگلش اردو ڈکشنری اورنگ آباد سے شائع کی تھی جو آج تک ہماری
رورتوں کو بڑی حد تک پورا کر رہی ہے رام نرائن لال نے الہ آباد سے اسٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری
ردو۔ انگلش شائع کروائی۔ یہ ڈکشنری وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہوتی رہی اور
ب بھی آسانی سے دستیاب ہے ایک اور اردو۔ انگلش ڈکشنری ۱۹۶۶ء میں لاہور سے فیروز
سنس نے شائع کی۔ پاکستان سے پروفیسر بشیر احمد قریشی نے ۱۹۸۰ء میں ایک اردو انگریزی
شنری (۶۸۸) صفحات پر مشتمل شائع کی۔ ان تینوں ڈکشنریوں میں طالب علموں کی ضرورتوں
پیش نظر رکھا گیا ہے اس لیئے ان کا دائرہ نہایت محدود ہے ان تمام دستیاب لغات کے
نظر سے مطالعہ کے بعد اردو۔ انگریزی کی ایک جامع لغت کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی
ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیئے جناب یعقوب میراں مجتہدی صاحب نے اردو۔ انگریزی
ت کی ترتیب کا منصوبہ تیار کیا۔ اس وقت میراں صاحب ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشنس
ت آندھرا پردیش، حیدرآباد میں بحیثیت اردو مترجم کام کر رہے تھے وہ اس دفتر سے
ڈائرکٹر آف ٹرانسلیشنس (اردو) کے عہدہ سے جولائی ۱۹۸۹ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہو چکے
بحیثیت مترجم آئے دن انہیں ہر قسم کے مثلاً قانونی، دفتری، سائنسی، علمی، ادبی، فنی اور تکنی

ترجمے کرنے پڑتے تھے۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے وقت مولوی عبدالحق کی
ڈکشنری سے کام نکل جاتا تھا۔ لیکن اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کے دوران۔ اُردو انگریزی
کی ایک جامع لغت کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ مجتہدی صاحب نے تن تنہا اس کام
کا آغاز برسوں پہلے کیا۔ اپنی اُردو۔ انگریزی ڈکشنری کی تیاری میں انھوں نے ایک مجتہدانہ
راہ اختیار کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی اُردو۔ انگریزی۔ اُردو، اُردو اور انگریزی لغات سے
مناسب مدد لی۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کی معنویت کی تلاش میں میراں صاحب کو ان کے
اپنے ترجمے کی مہارت اور طریقۂ کار سے بڑی مدد ملی۔ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد انھوں نے اُردو
انگریزی الفاظ، محاورں اور ضرب الامثال کے تقریباً تین لاکھ کارڈ تیار کئے ہیں ان کے علاوہ
ہزاروں الفاظ ایسے بھی تھے جو ان کو پیش نظر لغات میں نہیں ملتے تھے۔ میراں صاحب نے
مستند اور جامع اُردو لغات سے مقابلہ کرکے ایسے تمام اُردو الفاظ مع ان کے انگریزی معنوں
اور مترادفات کے اپنی لغت میں شامل کئے۔ اس وقت میراں صاحب ان کارڈوں کا گہری نظر
سے جائزہ لے کر انہیں قطعیت دینے اور ان کو ٹائپ کروانے میں مصروف ہیں۔ ٹائپ کاپی
تقریباً ۱۲ ہزار فل اسکیپ صفحات پر مشتمل ہوگی۔ یہ کام تیزی سے جاری ہے اب تک کوئی
گیارہ ہزار صفحات ٹائپ ہوچکے ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ چھ۔ سات مہینوں میں یہ فرد واحد
کی یہ منفرد کوشش مکمل ہوجائے گی۔ اس لغت کے ناشر بین الاقوامی شہرت کے حامل پبلشر
اورینٹ لانگ مین "ہیں اس زیر تکمیل لغت کی چند نمایاں خصوصیات ہیں

۱۔ اندازہ ہے کہ یہ لغت کم وبیش تین ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی۔ سہولت کے پیش نظر
اس لغت کو تین جلدوں میں تقسیم کیا جائے گا

۲۔ ہر اردو اندراج (entry) کے مقابل رومن رسم الخط میں تلفظ دیا گیا ہے

۳۔ ہر اُردو لفظ کے مقابل اس کے ماخذ، مصدر، تذکیر و تانیث اور واحد وغیرہ
کی صراحت کی گئی۔

۴۔ الفاظ کے مختلف معنوں اور ان کے محل استعمال کی توضیح کے لئے حسب ضرورت اُردو جملے
مع انگریزی نقل حرفی transliteration و ترجمے کے دیئے گئے ہیں۔ ان سے
روزمرہ اور محاورے پر بھی روشنی پڑتی ہے

۵۔ جہاں ضروری سمجھا گیا ہے وہاں لفظوں کی اسلوبیاتی قدر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے مثلاً قدیم، ادبی، شعری وغیرہ۔

۶۔ انگریزی میں یوروپی زبانوں کے دخیل الفاظ اور فقروں کا تلفظ بھی دیا گیا ہے

۷۔ ایک خاص اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اردو ضرب الامثال محاوروں وغیرہ کے جہ ممکن ہو، ہم معنی انگریزی ضرب الامثال و محاورے وغیرہ بھی دیئے گئے ہیں۔

۸۔ اس ڈکشنری میں ادبی، قانونی، دستوری، صحافتی، انتظامی اور محکمہ جاتی (مثلاً اور مالگذاری وغیرہ کی) اصطلاحات، تراکیب و لفظیات کا قابلِ لحاظ ذخیرہ جو مترجمین اور محققین کے لیئے بڑا سہولت بخش اور قابلِ قدر ثابت ہوگا۔

۹۔ اس میں (COLLOCATION) کا استعمال بھی جا بجا بتلایا گیا ہے

کسی لغت کے معیار کو جانچنے کے لیئے تین امور کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے ایک کا (RANGE) یعنی وسعت، دوسرے اس کا (PERSPECTIVE) یعنی تناظر اور تیسرا (PRESENTATION) یعنی ترتیب و سلیقہ کا اظہار۔ میراں صاحب کی اردو۔ انگریزی میں ان تینوں امور پر یکساں توجہ دی گئی ہے۔

(THESAURUS) کا طریقہ جو زندہ زبانوں کے لیئے استعمال ہوتا ہے اس ایک حد تک برتا گیا ہے زندہ زبانوں میں پرانے الفاظ، جگہ چھوڑتے جاتے اور نئے ا جگہ لیتے جاتے ہیں۔ لغات کو زبان کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ میں بالالتزام اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن معیاری لغات میں بھی اس سے حسبِ ضرور کیا جاتا ہے میراں صاحب نے بھی اپنی ڈکشنری میں اس طریقہ کو بڑے سلیقہ سے جگہ د گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ "بجلی" کے انہوں نے تقریباً ۱۸ امترادفات اور ۵ دیئے ہیں جس سے زبان کے تاریخی تناظر، سماجی، سیاسی اور ادبی تبدیلیوں کا اندازہ ہو سکے اردو۔ انگریزی لغت کی ترتیب و تشکیل میں ترجمے کی فنکارانہ مہارت کی ضرو صحیح تراجم کے لیئے مترجم کا نہ صرف ذولسانی ہونا ضروری ہے بلکہ اس زبان کی روح مزاج اور لب ولہجہ پر بھی قدرت حاصل ہونی چاہیئے۔ اس کے لیئے وسیع مطا اور عملی تجربہ بھی لازمی ہے میراں صاحب میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔

نے اس ڈکشنری کی تیاری میں فیاضانہ استعمال کیا ہے۔

آج سے برسوں قبل میراں صاحب نے اس ڈکشنری کا خاکہ تیار کیا اور کام کا آغاز کیا تو کی اس جرأت پر اکثروں نے معنی خیز حیرت کا اظہار کیا تھا لیکن میراں صاحب کی انتھک ت، صلاحیت اور قابلیت نے اسے اب تکمیل کے آخری مراحل پر پہنچا دیا ہے اس گراں کارنامے کو کئی اہلِ قلم اور صاحبانِ نظر نے دیکھا، پرکھا اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ب مرحوم، سابق پروفیسر جامعہ ملیہ فرماتے ہیں۔

" اردو دنیا میں عرصہ سے ایک ایسی اردو۔ انگریزی لغت کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی جو پرانی لغات، پلاٹس، فوربس وغیرہ کی کمیوں کو پورا کر سکے۔ زمانہ کی ہوا کو مخالف پا کر ادارہ کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ ایک نئی اردو۔ انگریزی لغت کی تالیف کا بیڑہ اٹھائے بوجھ نے اداروں پر "گراں" کی اسے ایک ناتواں فرد نے اپنے سر لے لیا۔ محبوب میراں ب کے حوصلے کی داد دینا چاہیئے کہ انھوں نے خدا کا نام لے کر اردو۔ انگریزی لغت کی کا کام تنہا شروع کیا ہے"

پروفیسر مسعود حسین خان صاحب نے ۱۹۶۸ء میں اس ڈکشنری کو ابتدائی مراحل میں دیکھ طرح اظہارِ خیال کیا تھا۔

" اردو کے سلسلہ میں یہ ایک بنیادی کام ہے جس کی حوصلہ افزائی مختلف اشخاص اور ں کی جانب سے ہونی چاہیئے۔ لغت کا کام جماعت کا کام ہوتا ہے لیکن اردو لغت سازی یخ گواہ ہے کہ یہ انجام پایا افراد کے ہاتھوں سے۔ میراں صاحب کے عزم اور محنت کو دیکھ امید ہوتی ہے کہ وہ ایک دن لغت کے تکملہ کے بعد یہ کہہ سکیں گے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اور اب وہ وقت آ گیا ہے۔

تبصرہ

تبصرے کیلئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

ہ نگار
یدالدین

اے گردشِ دوراں

اے گردشِ دوراں" فریدہ زین کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جس کی گذشتہ دنوں حیدرآباد
ے اہتمام سے رسمِ اجرائی انجام پائی۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے "سسکتی چاندنی"
سے دار تک" شائع ہو چکے ہیں اس طرح فریدہ زین کا نام افسانوی ادب پڑھنے والوں
نیا یا محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ایک باشعور، حساس اور باصلاحیت فن کارہ ہیں
وفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم "فریدہ زین کو کہانی بیان کرنے کا سلیقہ آتا ہے" زبان
گرفت مضبوط ہے اظہار میں ایسی جاذبیت کہ قاری انجیں کی زبان سے دیکھنے
کے دل سے محسوس کرنے لگتا ہے۔"
کہ میں نے اوپر کہا ہے فریدہ زین ایک باشعور فنکارہ ہے چنانچہ ڈاکٹر عنوان
ہیں "جہاں تک سماجی مسائل کا تعلق ہے فریدہ زین نے ایک حساس اور باشعور
ثیت سے اس دور کے عام انسانوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے بنیادی
موں نے اپنی کہانیوں میں غریبوں، مزدوروں اور مفلوک الحال کرداروں کی
کی ہے۔"

دہ زین کے اس تیسرے مجموعہ "اے گردشِ دوراں" میں جملہ گیارہ افسانے ہیں
ان کے لکھنے کا محرک ہونے کا پتہ "میں اور میرا قلم" کے عنوان سے ان
ئے مختصر سے بیان سے مل جاتا ہے اس میں انھوں نے بتلایا ہے کہ وہ آج

وقت سے ... کہ ریں لگیں جب ان کی عمر بمشکل آٹھ سال کی تھی پھر عمر اور ذہن کے
... نظر گہری، دل حساس اور انگلیاں متحرک ہونے لگیں۔ والد کی اچانک رحلت
انہیں شعورِ غم سکھا دیا ... دوران کا قلم سوگ میں ڈوب گیا۔ لکھنے لکھانے میں ...
بعد ان کے شوہر زین ما ... حب نے ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۸۰ء میں
پہلا افسانوی مجموعہ "سسکتی چاند ... نی" "شائع" ہوا اور وہ باقاعدہ افسانہ نگار ...
اس کے بعد "دل سے دار تک" شائع ہوا اور پھر اب ۱۹۹۱ء میں ان کا تیسرا افسانہ
"اے گردشِ دوراں" سامنے آیا ہے۔

تو یہ ہے فریدہ زین کا ادبی سفر۔ ... واضح ہو کہ وہ صرف افسانے
یا صرف گھر کی ذمہ داریاں ہی نہیں سنبھالتی ہیں بلکہ نئی نسل کی ساخت پرداخت
میں وہ فلاور زون ہائی اسکول لال ٹیکری کی پرنسپل بھی ہیں۔ وہ ایک پڑھے
ہیں اور پڑھانے لکھانے کے پیشے سے ہی وابستہ ہیں۔ ان کے شوہر بھی ... کے
ہیں اس طرح دونوں کسی نے کسی طرح خدمتِ خلق کیے جا رہے ہیں۔ بیوی ...
زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہی ہیں تو شوہر مظلومین کو دوا ... عطا کر رہے ہیں۔
فریدہ زین کے شعور کا احساس ہمیں ان کی اس تازہ کتاب کا انتساب ...
ہو جاتا ہے — "کاروانِ حیات تک، نام جو سفر سے منزل تک، جذب
تک، نقطے سے حرف تک، احساس سے تپش تک، روشن صبح سے مایوس
تمام راہوں پر گامزن ہے۔"

فریدہ زین کے موضوعات زیادہ تر غم کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کی گیارہ
سے بیشتر کا اختتام المیہ ہے شاید تین، چار کہانیاں ہوں گی جن کا انجام
لیکن قطع نظر اس کے جب آپ یہ کہانیاں پڑھتے ہیں تو آپ کو یہ احساس
کہ آپ گھسے پٹے موضوعات پر کہانیاں پڑھ رہے ہیں کیونکہ انہیں زبان
قابلِ تعریف ہے اور متاثر کن انداز میں کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ انہوں نے بہ ...

میں حالات حاضرہ کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں اور آپ نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ گوتم بدھ کے مجسمہ کو حسین ساگر میں راک جبرالٹر پر نصب کرنے کے لیئے لے جاتے وقت ٹرالی اُلٹ گئی جس میں کئی مزدور اور دیگر لوگ دب کر یا ڈوب کر مر گئے اس اخباری خبر کو پڑھ کر اور پھر اس کے تعلق سے کہانی کا تانا بانا بنا کر انھوں نے "چارہ گر رہ گیا" کے عنوان سے بہت کامیاب کہانی لکھی ہے جس کا انجام بھی حزنیہ ہے۔

"اے گردش دوراں" ۲۱۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کا ٹائیٹل حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ قیصر سرمست نے تیار کیا ہے جس نے اس کے گیٹ اپ کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے جو چار رنگ میں ہے کتابت حیدرآباد کے مشہور خوشنویس محمد عارف الدین کی ہے کتاب ڈائمنڈ آفسٹ پریس میں چھپی ہے جس کی تزئین کاری ایم ایم سعید اور ایچ ایس صدیقی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے بہرحال ان سب نے مل کر کتاب کو خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ڈیمائی سائیز کی اس خوبصورت کتاب کی قیمت جو بہترین کاغذ پر آفسٹ میں چھپا ہے ۸ روپے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

کتاب کے ملنے کا پتہ ہے۔ فروزاں ۹۸/۷۱ - ۵ - ۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد ۴

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۳ سے آگے) ہے۔ غیر مسلم معزز اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے اگر وہ اسلامی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ عمرو بن العاص کو اسلام لانے پر انہیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انعام واکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا۔ انہیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی۔ خالد ابن الولید کو باوجود احد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابلِ رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

عقیل عباس جعفری

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ، مختلف النوع ریکارڈز پر سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اور ساری دنیا میں نہایت ذوق اور شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ یہ کتاب کس طرح وجود میں آئی یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

یہ کہانی ۱۰۔ نومبر ۱۹۵۴ء کی ایک بے کیف شام سے شروع ہوتی ہے جب آرتھر گینس سن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائریکٹر سرہیو بیور و آئرلینڈ میں پرندوں کا شکار کر رہے تھے انھوں نے گولڈن پلوورز کے ایک غول کو نشانہ بنایا مگر پرندوں کی تیز رفتاری کے باعث اس کا نشانہ چوک گیا۔ رات کے کھانے پر یہی موضوع چھڑ گیا اور انھوں نے پلوورز کو دنیا کا سب سے تیز رفتار پرندہ قرار دے دیا ان کے کچھ ساتھیوں نے ان سے اختلاف کیا تاہم کسی انسائیکلوپیڈیا یا حوالہ جاتی کتاب سے یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ دنیا کا سب سے تیز رفتار پرندہ کون سا ہے؟

لندن واپسی کے بعد انھوں نے ایک ایسی کتاب کی اشاعت کا منصوبہ شروع کیا جس میں قارئین فوری طور پر دنیا کے سب سے بڑے، سب سے چھوٹے سب سے تیز رفتار، سب سے طویل، سب سے کوتاہ چیزوں کے بارے میں جان سکیں۔

ایسی کتاب اس وقت تک وجود میں تو نہیں آئی تھی لیکن وجود میں آنا بھی خاصی

دے سکے۔

یہاں، نورس اور روس میک ہرٹر اس کہانی میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں جڑواں بھائی۔ ایک صحافی کے بیٹے تھے ان کا گھر اخباروں، رسالوں اور حوالہ جاتی کتابوں سے بھرا پڑا تھا بچپن ہی سے انھیں مختلف موضوعات پر ریکارڈز جمع کرنے اور ان کی فہرستیں بنانے کا شوق تھا۔ انھوں نے ایک طرف تو اخبارات، ایئر بکس، انسائیکلوپیڈیا اور ایسے ہی دوسرے اداروں، نو اعداد و شمار کی فراہمی کا کام شروع کیا۔ دوسری طرف اسپورٹس جرنلزم بطور پیشہ اختیار کیا۔ اسپورٹس جرنلزم کے دوران ان کی ملاقات ایک ایتھلیٹ کرسٹوفر جیٹ اوے سے ہوئی جو سر ہیف بیور کے ادارے گینز سن اینڈ کمپنی لمیٹڈ میں ملازم تھا۔ اسے سر ہیف بیور کے نئے پروجیکٹ کے بارے میں آگہی تھی۔ چنانچہ اس نے انھیں آپس میں متعارف کروایا۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۴ء کو سر ہیف بیور اور ان کے ادارے کے دوسرے ڈائریکٹرز نے دونوں بھائیوں کا تفصیلی انٹرویو شائع کیا وہ ان کی معلومات، ان کے جمع مختلف ریکارڈز اور اعداد و شمار سے بہت متاثر ہوئے اور یوں دونوں بھائیوں کو مجوزہ کتاب کا کام سونپ دیا گیا۔

اس مقصد کے لیے لندن میں ۱۰۷ فلیٹ اسٹریٹ پر ایک چھوٹا سا آفس قائم کیا گیا۔ اور کوئی چار ماہ بعد ۲۷ اگست ۱۹۵۵ء کو ۱۹۸ صفحات پر مشتمل گینز بک آف ریکارڈز کی پہلی جلد شائع ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں یہ کتاب تمام بک اسٹالز پر موجود تھی اور سال کے آخر تک یہ کتاب انگلستان کی "نمبرون" نان فکشن بیسٹ سیلر بن چکی تھی انگلستان بھر کے لوگ اس کتاب کے مداح بن چکے تھے اور اس میں درج مختلف ریکارڈز حیرت انگیز تعجب کے ساتھ موضوع گفتگو بنے ہوئے تھے۔

کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی ہزاروں قارئین نے مختلف ریکارڈز اور اعداد و شمار بھیجنے شروع کئے۔ میک ہرٹر برادران نے ان کی باقاعدہ کیٹلاگنگ کی اور ان کی باضابطہ تصدیق کی۔ کچھ ریکارڈز کو انھوں نے مستند نہیں پایا اور جنھیں مستند پایا، انھیں

اگلے ایڈیشن میں شامل کر لیا۔

دونوں بھائی بچپن ہی سے نہایت مماثل زندگی بسر کرتے آئے تھے دونوں ۱۲ اگست ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ دونوں نے ابتدا سے ایم اے تک تمام تعلیم اکٹھے حاصل کی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک نے ایم اے کی ڈگری معاشیات میں اور دوسرے نے قانون میں حاصل کی۔ دونوں ہی یونیورسٹی کی ٹریک ٹیم کے ممبر تھے دونوں نے ۱۹۶۴ء میں کنزرویٹو پارٹی کی جانب سے الیکشن میں حصہ لیا لیکن بدقسمتی سے دونوں ہی ہار گئے دونوں بھائی بی بی سی سے منسلک رہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن دونوں جگہ کمینٹیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ سات برس تک دونوں بھائی آبزرور کے سنڈے ایڈیشن میں مل کر کام کرتے رہے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۷۵ء کو ان دونوں بھائیوں کا یہ ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا جب آئرش ری پبلکن آرمی کے ایک دہشت گرد نے سیاسی اختلاف کی بنا پر روس میک ہرٹر کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا۔

گینز بک کی اشاعت خود بھی ایک دلچسپ ریکارڈ ہے یہ کتاب اپنی اشاعت کے پہلے سال ۱۹۵۵ء سے لیکر اب تک سوائے ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۹ء کے ان سالوں میں یہ کتاب شائع ہی نہیں ہوئی تھی) انگریزی کی سب سے زیادہ چھپنے والی نان فکشن بک رہی ہے۔ اب تک یہ کتاب ۲۵ زبانوں میں ۵ کروڑ سے زیادہ تعداد میں شائع ہو چکی ہے اور ہر ہفتے اس کتاب کی اشاعت میں ۵ ہزار کاپیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے اب تک گینز بک کی جتنی کاپیاں شائع ہوئی ہیں ا نھیں اوپر تلے رکھ دیا جائے تو ماؤنٹ ایورسٹ سے ۷ گنا اونچا پہاڑ کھڑا ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں گینز سپر لیٹوز کا کاروبار اور بھی منظم شکل میں موجود ہے جہاں سے نہ صرف یہ کہ گینز کے ہارڈ کور اور پیپر بیک ایڈیشن چھپتے ہیں بلکہ ایک ٹیلی ویژن شو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں گینز بک کے سات میوزیم موجود ہیں جہاں اس کتاب میں شامل مختلف ریکارڈز محفوظ ہیں ہر سال گینز بک کے ایک چوتھائی ایڈیشن کو اپ ٹو ڈیٹ کیا جاتا ہے ▲

ن خان شوق
،ولا۔ لے پلی۔ حیدرآباد

ہماری ادبی سرگرمیاں

۲۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء سہ پہر بمکان آغا مصطفےٰ اکبر بلائی کوچہ نولہ صاحب یاقوت پورہ
ں یکجہتی کے موضوع پر نہایت کامیاب مشاعرہ ہوا جس کی صدارت حضرت سعید شہیدی
ہی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مسز روحی قادری اور صلاح الدین نیر نے شرکت کی۔
اب رشید شہیدی نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔ اس مشاعرہ میں صدر مشاعرہ حضرت
ید شہیدی، مسز روحی قادری، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر صادق نقوی، رضا آفندی
ن شکارپوری، رشید شہیدی، محمد علی وفا، ستار صدیقی، سلیم رضوی، قائم جعفری
براہیم علی حاتی نے اپنا منتخب کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کی۔ بانی انجمن محصومین
یر صابر علی نے بھی اس قومی یکجہتی مشاعرہ کے سلسلے میں تعاون کیا۔

۱۴ر اکتوبر ۹۱ء ۳۰۔۶ بجے شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں انجمن ترقی پسند مصنفین
کا اجلاس منعقد ہوا یہ اجلاس ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ادبی، سیاسی، فلاحی اور تہذیبی خدمت
کے اعتراف میں منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت جناب سری نواس لاہوٹی نے کی۔ صدر
جلسہ کے علاوہ جناب عاتق شاہ، محترمہ نجمہ نکہت، محترمہ قمر جمالی نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
کے ذہن اور شخصیت کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ جناب برق یوسفی نے منظوم
خراج عقیدت پیش کی۔ اس موقع پر جناب عبدالرحیم نے راج بہادر گوڑ کی گلپوشی کی
شریک معتمد انجمن جناب صلاح الدین نیر نے تعارفی و خیر مقدمی تقریر کی۔ دانشوران،

شاعروں، ادیبوں اور راج بہادر گوڑ کے چاہنے والوں میں منتخب شخصیتوں نے اپنی شرکت سے اس اجلاس کو کامیاب بنایا۔ جناب صلاح الدین نیر کے شکریہ پر اس محفل کا اختتام ہوا۔

۵؍اکتوبر ۱۹۹۶ء ۷ بجے شام نمائش کلب میں محفلِ خواتین کی جانب سے بہ تعاون محکمہ تہذیبی و ثقافتی امور "شامِ غزل" منعقد کی گئی جناب وینکٹ رمنا چاری آئی اے ایس نے اُردو زبان اور اس کے شعری ادب سے متاثر ہوکر محفلِ خواتین کی بھی "شامِ غزل" کے اہتمام میں تعاون کیا اور اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے جناب صلاح الدین نیر نے بھی اپنا بھرپور تعاون دیا۔ اس شام غزل کی صدارت شریمتی روڈا مستری نے کی جبکہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے محترمہ بلقیس علاء الدین بیگم جناب زاہد علی خاں (مینجنگ ایڈیٹر سیاست) محترمہ شاداں تہنیت د بیگم ڈاکٹر وزارت رسول خاں ، سابق ایم ایل اے نے کی۔ محترمہ قمر جمالی نے کارروائی چلائی۔ اس یادگار و کامیاب محفل میں ممتاز گلوکار مسز وٹھل راؤ، ڈاکٹر جگدیش کلہ کے علاوہ محترمہ دلوی رمنا مورتی اور محترمہ عالا ابراریہ نے محفلِ خواتین سے وابستہ خاتون شعراء محترمہ عظمت عبدالقیوم، محترمہ حفیظ النساء حزیں (مرحومین) کے کلام کے علاوہ ڈاکٹر ثریا نو طاہرہ سعید، زبیدہ تحسین، نایاب سلطانہ، ناز حیدر، ڈاکٹر اندو وششٹ، عزیز النساء صبا، ڈاکٹر شمع پروین، مظفر النساء ناز، فاطمہ تاج، کوتبا کرن، انجم قمر سوز، حنا شہیدی، افسر دوران اور انیس عابد کا کلام سُنا کر اچھے تاثرات چھوڑے اس محفل میں خوش ذوق خاتون سامعین کی کثیر تعداد شریک تھی۔ اس انتہائی خوشگوار شگفتہ محفل کا اختتام محترمہ مظفر النساء ناز (شریک معتمد محفلِ خواتین) کے شکریہ پر ہوا۔

۶؍اکتوبر ۱۹۹۶ء مولانا آزاد ہال متصل مسجد باغِ عامہ قدیم محترمہ فریدہ زین کے افسانوں کے تیسرے مجموعہ "اے گردشِ دوراں" کی رسم اجراء ملک کی نامور افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس جلسے کی کارروائی ڈاکٹر عقیل عثمانیہ ریڈیا

شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ چلائی۔ محترمہ جیلانی بانو نے کہا کہ لمبے سفر میں فریدہ زین صاحبہ کی سوچ، اسٹائیل اور موضوع بہت اچھے ہیں۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نے خاکہ سنایا۔ پروفیسر سرمست نے کہا کہ محترمہ فریدہ زین کے افسانوں میں سسکتی چاندنی اور دل کے درد کی باتیں جگہ جگہ جمع ہیں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ ان کے افسانوں میں زیادہ سنجیدگی اور ٹریجڈی کا ماحول بنا ہوا ہے وہ جو بھی لکھتی ہیں موضوع میں ڈوب کر لکھتی ہیں محترمہ فریدہ زین کے نصف بہتر جناب سید زین العابدین ایڈوکیٹ نے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

۶ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ملک پیٹ قدیم میں بزم عاصم کا (۴۹) واں سالانہ طرحی نعتیہ مشاعرہ زیر نگرانی شیخ سعد حسین سعد آئی اے ایس منعقد ہوا۔ قاری محمد عبدالرشید کی قرارت کلام پاک کے بعد الحاج سید کلیم اللہ قادری نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ اس مشاعرہ میں شہر حیدرآباد کے علاوہ اضلاع کے شعراء نے بھی بارگاہ رسالت مآب میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ (۵۰) شعراء نے شرکت کی جس میں قابل ذکر مسرز سعد حسین سعد، ملی احمد جلیلی، نذیر علی عدیل، رحمی قادری، کلیم قریشی، ابراہیم ملی حامی خواجہ جہیر [illegible] الدین کمال صدیق، ڈاکٹر غیاث عارف، پیر جبری، [illegible] قادری، [illegible] الفاروق شعور [illegible] جامی صدیقی، سوز عابدی، انجم عارفی، سلیم صفوی، [illegible] صدیقی [illegible] عنایت علی راہی اور دوسرے ہیں۔ [illegible] سرپرست بزم احاف مرزا شکور بیگ کی [illegible] مشاعرہ کا اختتام ہوا۔ اس نعتیہ مشاعرہ کی کارروائی عنایت علی راہی نے چلائی۔

[illegible] اکتوبر ۹۱ء حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) اور ادارۂ فکر جدید سادرہا کے [illegible] اہتمام ادبی اجلاس ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ پروفیسر آئیزک سکویرا سابق ڈین آف فیکلٹی آف آرٹس نے صدارت کی۔ ابتداء میں قدیر زماں نے پروفیسر اندرناتھ چودھری سکریٹری ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی کا تعارف پیش کیا [illegible]

[illegible] کی جانب سے

پروفیسر کیشوراؤ، جادہو، ایم علی خان، جوالا مکھی، ڈاکٹر یوسف کمال نے مباحث میں حصہ لیا۔

۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۱ء اردو مجلس کا ادبی اجلاس ۳۰۔۵ بجے شام بمقام اردو ہال حمایت نگر منعقد ہوا۔ جناب سعد حسن سعد آئی اے ایس نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے "جامعہ عثمانیہ کے محرک" کے زیر عنوان سیر حاصل مضمون پڑھا۔ محترمہ نایاب سلطانہ نے اپنا منتخب کلام پیش کیا محترمہ قمر جمالی نے افسانہ "اگنی پریکشا" پیش کیا۔ معتمدی کے فرائض قدیر انصاری نے انجام دیئے۔ مباحث میں سری نواس لاہوٹی، رشید الدین اور ناظر الدین نے حصہ لیا۔

۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۱ء بزم جوہر کی ماہانہ طرحی نشست کا ایوان طریقت بی بی بازار تالاب کٹہ میر جملہ بمکان پیر طریقت حضرت سلطان شاہ محمد بن احمد العفطی ہبر پوشش انعقاد عمل میں آیا۔ حضرت روحی قادری نے صدارت کی۔ یہ محفل جناب احمد پاشاہ مالک جیمخانہ یادو گراچی حیدرآباد سندھ کالونی کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی مسرز محمود شرفی اور ابو الفاروق شعوری طرحی نعت مبارک سے طرحی شعری نشست کا آغاز ہوا۔ مسرز ابرار اعظمی غیاث عارف، بے حس الہ آبادی، صاجزادہ اعظم علی خاں اعظم، ابو الفاروق شعور، رزمی حیدرآبادی، محبوب علی خاں اخگر، شاہد عدیل، اسمٰعیل ظریف، حضرت سید نظیر علی عدیل اور صدر مشاعرہ حضرت روحی قادری نے طرحی کلام سنایا۔ ڈاکٹر راہی نے نظامت اور شکریہ کے فرائض انجام دیئے۔

★ مرکزی انجمن مہدویہ چنچلگوڑہ کے زیر اہتمام جشن میلاد النبی کے سلسلہ میں طرحی نعتیہ مشاعرہ زیر صدارت جناب مظفر مجاز صاحب منعقد ہوا۔ اس نعتیہ مشاعرہ میں حضرت نور محمد نور اکیلوی، حضرت سید علی برتر، حضرت سید حسین اختر، حضرت محمد شرف الدین سحر طالب خوندمیری، باقر منظور، اشرف خوندمیری، علی الدین نوید، غیاث متین، خواجہ ضمیر، محمود شریف محمود، صابر کوسگوئی، سید محمود ناصر، طالب ساندوری، باقر محسن، الطاف صمدانی محمد خواجہ نواز، محمد امام، سید خوندمیر، سوز ہاشمی، شیخ داؤد اللہ دیگر شعراء نے ہدیۂ عقیدت

پیش کیا۔ داؤد رفیق نے بہ حسن خوبی معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ مقصود علی خاں معتمد عمومی نے شکریہ ادا کیا۔

* ادارۂ ادبِ اسلامی حیدرآباد کا سالانہ نعتیہ طرحی مشاعرہ زیر نگرانی ڈاکٹر غیاث عارف بمقام چھتہ بازار منعقد ہوا ابوالفاروق شعورؔ نے نظامت کی۔ جناب محمد غازی الدین کی تلاوت و ترجمہ قرآن کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر غیاث عارف صدر مشاعرہ، ابوالفاروق شعورؔ معتمد مشاعرہ کے علاوہ مسرز روحی قادری، خواجہ شوقؔ، نظیر علی عدیل خواجہ ذاکر گوڈرشاہ ثانی، ابراہیم علی جامیؔ، راحت عزمیؔ، داؤد نصیب کلیم قریشی، محمد بن حسین نقیب، یوسف نظر، پیر جیری القادری، محمود شریف، محبوب علی خاں اخگر، ثاقب بنارسی کلیم صدیقی خواجہ ضمیر، فرید متین، راغب فاروقی، روف رحیم، غازی کمال، حبیب گونڈیوی، بے ہوش محبوب نگری اور دیگر شعراء نے کلام سنا کر داد پائی۔

۱۶؍اکتوبر۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا ادبی اجلاس ۱/۲ ۶ بجے شام بمقام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت معتمد محفل خواتین محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے کی محترمہ قمر جمالی نے سوالیہ نشان کے زیر عنوان اپنا تازہ افسانہ پیش کیا۔ جناب رفیع کی شاداب نے پانچ غزلیں سنائیں ان تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ ہوا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ قمر جمالی کے افسانوں میں زندگی کی حرارت ملتی ہے، عاتق شاہ، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے بھی مباحث میں حصہ لیا۔ جناب رفیع کی شاداب کے کلام پر مباحث میں صلاح الدین نیّر، رئیس اختر اور راشد آذر نے حصہ لیا۔ صدر ادبی اجلاس نے کہا کہ افسانہ اور کلام آج کی محفل کے لئے ایک خوشگوار سرمایہ سمجھے جائیں۔ جناب صلاح الدین نیّر کے شکریہ پر یہ محفل اختتام کو پہونچی۔

۲۳؍اکتوبر۔ ۶ بجے شام بمقام جوبلی ہال باغ عامہ تلگو کے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شاعر و وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سینارے کی اردو غزل کہنے لگنے کی مسرت میں یادگار محفل کا زیر اہتمام میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے

منعقد ہوا۔ اس تقریب کی صدارت پدم شری ڈاکٹر عابد علی خان مدیر روزنامہ سیاست نے کی اور ڈاکٹر ریڈی کی غزل سے متاثر ہو کر انھیں "ستار سے صاحب" کہہ کر خراج پیش کیا۔ گورنر آندھرا پردیش جناب کرشن کانت نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی ستار سے نے اپنے بارے میں کہا کہ جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعہ تعلیم کے ذریعہ گریجویشن کیے ہیں تلگو کے مشہور فلمی گیت کار ہیں سرکاری زبان کمیشن کے چیرمن رہ چکے ہیں اور آج کل تلگو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اکثر تلگو تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کرتے رہنے کے بعد انھوں نے اردو غزل پر طبع آزمائی کی اور اس سلسلہ میں کامیاب رہے چنانچہ حال ہی میں جبکہ ماسکو میں تھے انھوں نے اردو میں پہلی غزل لکھی اور ایک مختصر سے وقفہ میں نے اردو میں متعدد غزلیں لکھ دی ہیں۔ اس تقریب میں انھوں نے اپنی ۷ غزلیں تحت میں اور ایک غزل ترنم میں پیش کی۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۹۱ء ۹ بجے شب ادبی ٹرسٹ کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ پرانے شہر کے قلی قطب اسٹیڈیم میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس عظیم شعری محفل میں گورنر جناب کرشن کانت اور وزیر جنگلات جناب چندر شیکھر نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ریاستی وزیر بھاری صنوعات جناب پی راجیندر ریڈی نے اس یادگار مشاعرہ کی صدارت کی اپنی تقریر میں وزیر موصوف نے کہا کہ آپ اس علاقہ کو پرانے شہر کے نام سے کیوں پکارتے ہیں جبکہ اصل حیدرآباد یہی ہے ندی کے اس پار والے علاقہ کو آپ توسیع شدہ حیدرآباد کہیئے۔ جناب عابد علی خان مدیر روزنامہ سیاست و سکریٹری ادبی ٹرسٹ نے خیر مقدمی تقریر کی اور اس منعقدی مشاعرہ کی غایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس سال مشاعرے سے ہونے والی آمدنی سے اردو گھر مغلپورہ میں بُک بنک قائم کیا جائے گا جس میں طب اور انجینرنگ کی قیمتی کتابیں اکٹھا کی جائیں گی۔ مشہور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے بھی مخاطب کیا۔ جناب زبیر رضوی

[redacted]

نے بڑی عمدگی سے کارروائی چلائی۔ مشاعرہ کا آغاز جناب صلاح الدین نیر کے کلام سے ہوا۔ میزبان شعراء میں مسرز سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، راشد آذر، خواجہ شوق رحمٰن جامی، علی الدین نوید، محترمہ نایاب سلطانہ نے کلام سنایا۔ بیرونی شعراء میں آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، محترمہ نکہت نسیم، رئیس لکھنوی، حسن کاظمی، حضرت بیکل اتساہی، ساجد بھوپالی، مسرز بیدار شجر، حق کانپوری، علامہ قنبر حیدری حضرت نذیر بنارسی اور زبیر رضوی نے کلام سنایا اور داد پائی۔ اس یادگار محفل میں ہزارہا افراد بشمول خواتین سیاسی و سماجی قائدین بلا لحاظ مذہب و ملت شرکت کی اس کامیاب مشاعرہ کا رات دیر گئے اختتام عمل میں آیا۔

۲۷ اکتوبر۔ مرکز ادب کا تہنیتی اجلاس و غیر طرحی مشاعرہ بمکان جناب مومن خان شوق (اشرف ولا) ملے پلی ۶ بجے شام منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب منظور احمد منظور نے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر صادق نقوی اور جناب عمر خان ڈپٹی اگزیکیٹو انجینئر تھے جناب عزیز بھارتی صدر مرکز ادب نے جناب صلاح الدین نیر کی گلپوشی کی۔ بہ ضمن جناب صلاح الدین نیر کے فن اور شخصیت پر گلبرگہ یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری۔ اس تہنیتی تقریب میں ڈاکٹر صادق نقوی، جناب عمر خان، جناب قمر الدین صابری ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید اور صدر محفل جناب منظور احمد منظور نے نیر صاحب پر سیر حاصل تقریریں کیں۔ بعد ازاں غیر طرحی مشاعرہ کی نظامت مومن خان شوق نے کی۔ اس مشاعرہ میں صدر مشاعرہ جناب منظور احمد منظور، ڈاکٹر صادق نقوی ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، مسرز صلاح الدین نیر، عزیز بھارتی، قمر صابری، مومن خان شوق، ڈاکٹر سید حسن، سوز عابدی، نشان منظور، محمود شریف محمود ابوالفاروق شعور، حلیم رضا (محبوب نگر) اور الفت شرفی نے کلام سنایا۔ جناب محمود شریف محمود نے شکریہ ادا کیا۔

٭ ~ ٭ ~ ٭

مصطفیٰ اشروانی
۶-۶-۲ حمایت نگر



ہماری سماجی سرگرمیاں

حیدرآباد نہ صرف ان انمول شعر و سخن کی محفلوں کے لیئے اردو ادب و شعر کے اُفق پر ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے جو ادبی ٹرسٹ، شنکرجی میموریل کمیٹی، گیت چاندنی سرورڈنڈا میموریل سوسائٹی کی جانب سے یا محترم جناب کونڈا لکشمن باپوجی کی سرپرستی میں منعقد ہوتی رہتی ہیں بلکہ ان سماجی اور معاشرتی مراکز اور سیمینار کے انعقاد کے لیئے بھی جاذبِ توجہ رہا ہے جو مختلف ادارے معقدی موضوعات پر ترتیب دیتے رہتے ہیں ان سماجی اجتماعات کی افادیت سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ستمبر ۱۹۷۶ء کے نصف آخر سے اواخر اکتوبر ۱۹۷۶ء کے بعض سماجی اجتماعات کا مختصر تذکرہ قارئین ماہنامہ "شاداب" کی دلچسپی کا باعث ہوگا جو درج ذیل ہے

۲۸ ستمبر ۱۹۷۶ء کو "حیدرآباد کے ۴۰۰ سال" کے موضوع پر اسوسی ایشن آف برٹش کاونسل اسکالرز آندھرا پردیش چاپٹر ASSOCIATION OF BRITISH COUNCIL SCHOLARS (A.P. CHAPTER) کا سیمینار ہوٹل گولکنڈہ اے سی گارڈز کے تاناشاہی حال میں بصدارت عالیجناب جسٹس گوپال راؤ اکبوٹے منعقد ہوا جس کا افتتاح عالیجناب جسٹس سردار علی خاں صاحب جج ہائیکورٹ نے فرماتے ہوئے حیدرآباد کی ۴۰۰ سالہ تاریخ کو ایک مثالی دور بتایا۔ سیمینار کے مدعو شرکاء کے لیئے آندھرا بینک کی جانب سے پُر تکلف ظہرانہ کا اہتمام تھا دوپہر کی محفل کی صدارت پروفیسر رادھا

[redacted]

کرشنا شرما نے فرمائی۔ ڈاکٹر وی کے باوا نائب صدر انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز اور صدر سنٹر فار دکن اسٹڈیز نے اپنی تقریر بعنوان "حیدرآباد اسٹیٹ کا دستوری اور انتظامی نظام" میں آصف جاہی حکومت کو ۲۲۴ سال کے طویل عرصہ تک قائم رہنے کا اہم سبب آصف جاہی حکمرانوں کی رواداری بتایا اور دستوری اور انتظامی پہلو پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر وی راما کرشنا نے سالار جنگ کی اصلاحات، پر جناب ایچ راجندر پرشاد پوسٹ ماسٹر جنرل نے " حکومت نظام کے دور میں ڈاک کے انتظامات کی ترقیات بالخصوص حیدرآباد و سکندرآباد میں ڈاک کے انتظامات پر تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر کے ایس ایس سیشن نے فرنچ سیاح کا ونٹ موداو کے سفر حیدرآباد کے تاثرات پر، مسٹر ای جے آرنسٹ نے حیدرآباد کے تعمیراتی نظام پر مسز اُماتھیاگراجن نے حیدرآباد میں برٹش رزیڈینٹ' کے عنوان پر سیر حاصل معلومات فراہم کی۔ اس تقریر پر مباحث کا آغاز مصطفیٰ شروانی نے حیدرآباد ریذیڈنسی کو بجائے ایک جاریہ ویمنس کالج کے لئے استعمال کرنے کے ایک یادگار عمارت کی حیثیت دی جانے سے کیا۔ اس پر متعدد دشرکا نے اظہارِ خیال فرمایا اور اکثریت نے مصطفیٰ شروانی کی تائید فرمائی کہ اس تاریخی عمارت کا مسلسل استعمال اس کے عدم استحکام کا باعث ہوسکتا ہے اس لیۓ عثمانیہ یونیورسٹی ویمنس کالج کے لیۓ ایک اور موزوں عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے یا کسی موجودہ عمارت کو اسی مقصد کے لیۓ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر جے بی ایل گوڈین نے " حیدرآباد میں تاریخی عمارتوں کے تحفظ کی اہمیت" پر زور دیا۔ سیمنار کے تیسرے دَور کی صدارت پروفیسر جوشی نے فرمائی اس میں مسٹر ایس بی شوری نے" حیدرآباد کے محلات" پر تقریر کی۔ مصطفیٰ شروانی نے حیدرآباد میں ۔ ۴ سال میں ثقافتی اور تہذیبی ہم آہنگی پیدا ہنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سلطان ابوالحسن تاناشاہ جن کے نام پر تاناشاہی حال گولکنڈہ ہوٹل میں قائم کیا گیا ہے ان کے بعض محاسن کے تذکرے کے ساتھ ہندوستان کے "بچی پوڈی رقص" کا فروغ سلطان ابوالحسن، تاناشاہ

کی شاہانہ سرپرستی کی وجہ سے ہونا بتایا۔ سلطان ابوالحسن تاناشاہ نے ایک قصبہ "کچی پوڑم" اس رقص کی مہارت کے لئے عطا کیا تھا۔ دورِ قطب شاہی اور دورِ آصفیہ کی رواداری کی مثالیں مصطفیٰ شروانی نے پیش کیں۔ اس تقریر پر کچھ مباحث بھی ہوئے۔ دیگر مقررین نے حیدرآباد کے ۴۰ سال کی ترقیات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر مسعود علی خاں نے "۴۰ سال میں حیدرآباد میں اردو صحافت" کے موضوع پر تقریر فرمائی جناب شیام دیو استھانہ سکریٹری اسوسی ایشن کے شکریہ کے بعد جلسہ برخواست ہوا۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۶۹ کو علیگڑھ کلب میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بائز اسوسی ایشن (شاخ آندھرا پردیش) کی جانب سے بانی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی جوادالدولہ سرسید احمد خاں کا ۱۵۷ واں یوم پیدائش "سرسید ڈے" کے روپ میں بصدارت نواب میر اکبر علی خاں، صدر اسوسی ایشن منایا گیا جناب حامد لطیف ملتانی کی قرأت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ جناب برادرم مسعود احمد خاں شروانی نے سرسید مرحوم پر خورشید احمد خاں ناظر کا منظوم خراج عقیدت پڑھ کر سنایا۔ نائب صدر انجمن جناب شاہ منظور عالم سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ سرسید احمد خاں مرحوم کے پیش نظر متحدہ ہندوستان کی تعمیر تھی اور سرسید کی آرزو تھی کہ ہندوستان کے مسلمان بھی دیگر ابنائے وطن کے شانہ بشانہ ترقی کے منازل طے کریں اور عصری تعلیم سے آراستہ ہوں۔ انجمن طلبائے قدیم علیگڈھ مسلم یونیورسٹی شاخ آندھرا پردیش کے دوسرے نائب صدر عالیجناب شاہد حسین صاحب نے بھی جلسہ کو مخاطب فرمایا۔ محترمہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے سرسید احمد خاں پر منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب امجد اللہ صدیقی سابق سشن جج نے سرسید علیہ الرحمہ کی زندگی اور قومی اور ملی خدمات کا جائزہ لیا۔ سکریٹری انجمن طلباء قدیم شاخ آندھرا پردیش جناب مصطفیٰ کمال الدین حسینی کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔ انجمن کی جانب سے پرتکلف عشائیہ کے بعد جناب محمد احمد کی قوالی نصف شب تک جاری رہی جو بیحد پسند کی گئی اور بہر پور داد ملی

[redacted]

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ باغ عامہ، حیدرآباد میں انسٹیٹوٹ آف ایشین اسٹڈیز اور سنٹر آف دکنی اسٹڈیز کی جانب سے منعقدہ جلسہ میں امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کی پروفیسر کیرن لیونارڈ نے حیدرآباد سے باہر حیدرآبادیوں کی قومیت کا تاریخی پس منظر HISTORICAL-CONSTRUCTION OF ETHNICITY- HYDERABADIS OUTSIDE HYDERABAD پر عالمانہ مقالہ میں سب سے پہلے اعتراف کیا کہ خود ڈاکٹر لیونارڈ کے اجداد ناروے سے امریکہ نقل وطن کر گئے اور عرصہ تک NORWEGIAN AMERICANS کہلاتے رہے۔ پروفیسر لیونارڈ حیدرآباد کے امریکہ میں رہائش پذیر باشندوں اور خود حیدرآباد کے تمدن پر ریسرچ کر رہی ہیں اور سات بار اس مقصد کے لیئے حیدرآباد تشریف لاتی رہی ہیں اپنی تقریر کے دوران پروفیسر لیونارڈ نے لندن، یورپ اور امریکہ میں حیدرآباد کے باشندوں کے تاثرات پر اظہار خیال کیا۔ تقریر کے بعد مباحث کا آغاز کرتے ہوئے مصطفیٰ شروانی نے خود محترمہ مقررہ صاحبہ کی مثال پیش کی کہ حالانکہ پروفیسر لیونارڈ کے آباواجداد ناروے سے امریکہ آئے مگر آج پروفیسر لیونارڈ اپنے آپ کو مکمل امریکن کہنے پر فخر محسوس کرتی ہیں اور جیسا پروفیسر موصوفہ نے بتایا وہ ناروے کے تمدن اور اپنے خاندان کے سابق معاشرے کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہیں اسی طرح امریکہ میں مشہور پروفیسر انسٹائن جرمن تھے مگر امریکہ آکر امریکن بن گئے سابق صدر امریکہ کے نیشنل سیکوریٹی اڈوائزر مسٹر برزنسکی پولش تھے مگر امریکہ پہنچ کر وہ صرف امریکن رہ گئے مشہور فلم ساز اسکوراز SPYROS KOURAS یونانی ہیں لیکن اب امریکی قومیت اختیار کرلی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ جو ہندوستانی یا حیدرآباد کے رہنے والے ترک سکونت کر کے امریکہ یا لندن یا فرانس یا کینڈا جاتے ہیں وہ وہاں بھی اپنے آپ کو ہندوستانی یا حیدرآبادی جتلاتے ہیں اور اس طرح نہ مکمل ہندوستانی رہ جاتے ہیں اور نہ مکمل امریکن یا برٹش یا فرنچ ہی بن سکتے ہیں

اور ان ممالک کے اعلیٰ عہدوں سے محروم رہتے ہیں محترمہ پروفیسر کیرن لیونارڈ نے اپنے جواب میں وضاحت فرمائی کہ اس کی وجہ ان ہندوستانی یا حیدرآباد کے سابق باشندوں کے معاشرہ کے پائیدار اثرات بھی ہو سکتے ہیں مباحث میں دیگر حصہ لینے والوں میں جناب ڈاکٹر رحیم الدین کمال، محترمہ بلقیس علاء الدین، پروفیسر سراج الدین بھی شامل رہے ابتداء میں انسٹیٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے خازن محترم جناب محمود بن محمد سابق سفیر ہند برائے سعودی عرب کے پروفیسر کیرسنی لیونارڈ کا خیر مقدم کیا اور سنٹر آف دکنی اسٹڈیز کے صدر ڈاکٹر وی کے باوا نے پروفیسر لیونارڈ کا تعارف کروایا مسز نیڈٹ کے شکریہ پر جلسہ کی کارروائی اختتام کو پہنچی۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۶ کو اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام مدینہ منشن نارائن گوڑہ میں ایک سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا جس کا موضوع "اشتراکی نظریہ کے بعد بائیں بازو کا موقف ؟" جلسہ کی صدارت جناب پروفیسر سراج الدین صاحب نے فرمائی جناب رحیم قریشی نے اپنی تعارفی تقریر میں اقبال اکیڈیمی کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ جناب علی ظہیر صاحب معتمد مجلس علمیہ اقبال اکیڈیمی نے مذاکرہ کے عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ جناب ڈاکٹر سلطان عمر صاحب کنوینر محافل فکر نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ کارل مارکس کو ایک طبقہ "پیغمبری" کا درجہ دیتا ہے تو دوسرا طبقہ مارکس کے خیالات کو "شیطانی تخلیقات" بتاتا ہے اپنے کلیدی خطبہ میں جناب ظہیر الدین احمد صاحب نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے بدلتے ہوئے عالمی، سیاسی رجحانات کا جائزہ لیا۔ کامریڈ جناب کے ایل مہیندر صاحب سابق ایم ایل سی نے اپنی مدلل تقریر میں فرمایا کہ جہاں ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے پیرو اپنا علیحدہ تشخص پیش کرنے کے لیئے سرگرداں ہیں وہیں دوسری جانب اشتراکیت جیسا اس کے نام سے ظاہر ہے سب مذاہب اور تمام مختلف مذہب کے اصحاب یکجا کرنے کے اصول کا پابند ہے۔ ڈاکٹر سلطان عمر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے

"بزمِ کہنہ ادب" حیدرآباد کے طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی غزلیں قارئینِ "شاداب" کے لیے پیش ہیں

غزلیں

محمد منظور احمد منظور
جام باغ۔ حیدرآباد

پھول کے آگے ترا حسن دوبالا ہوگا
عشرتِ دیدہ و دل تیرا نظارا ہوگا

وہ نہیں ہے تو ہے ہر سمت اندھیرا لوگو
چاند چمکے گا تو ہر سمت اجالا ہوگا

لاکھ فرقت سہی دوری سہی پھر بھی اے دوست
تو ہمارا ہے بہر حال ہمارا ہوگا

زندگی لطف ہے اس لطف کے کیا کہنے مگر
تو جو آ جائے تو یہ لطف دوبالا ہوگا

صلاح الدین نیّر
"کہکشاں" ۲۲/۸۲-۳-۱۱
جدید ملے پلی۔ حیدرآباد

ایک دن آئے گا ایسا بھی کرشمہ ہوگا
تیرے چہرہ پہ مری پلکوں کا سایہ ہوگا

کٹ گئی عمر مگر نام کوئی دے نہ سکا
زندگی تجھ سے مرا کونسا رشتہ ہوگا

بے دیا گھر ہے سرِ شام ہی سو جاتا ہوں
اک نہ اک دن تو مرے گھر میں اجالا ہوگا

اس توقع پہ کہ دستک کی صدا آئے گی
پاس دروازہ کے اب تک کوئی بیٹھا ہوگا

زندگی خانہ بدوشوں میں بھی گذری ہوگی
تب کسی نے تمہیں مسند پہ بٹھایا ہوگا

اسی انداز سے گر بادِ صبا چلتی رہی
دل کا یہ زخم بھی اک دن گلِ تازہ ہوگا

مٹ گئی ہوگی کئی چہروں کی نیّر پہچان
آئینہ ٹوٹ کے جب فرش پہ بکھرا ہوگا

قمر الدین صابری
ایڈیٹر "شاداب"

مصرع طرح
"آپ جب تک رہیں ہرگز نہ اجالا ہوگا"

غزل

میری جانب جو کبھی اُن کا اشارہ ہوگا .. دیکھنے والے سمجھ جائیں گے کیا کیا ہوگا

جس کسی نے مرے بارے میں بھی سوچا ہوگا .. دور تک اپنے بھی اوصاف ٹٹولا ہوگا

آپ کے حُسن کے آگے ہیں اجالے بیکار .. "آپ جب تک رہیں ہرگز نہ اُجالا ہوگا"

صبح کے خوف سے جانے کی نہ جلدی کیجئے .. "آپ جب تک رہیں ہرگز نہ اُجالا ہوگا"

میں یہی سوچ کے خاموش رہا ہوں اب تک .. میں جو کھل جاؤں تو پھر ان کا تماشا ہ

اتنے دھوکے دیئے ہیں ہم کو زمانے والے ؟ .. ہر حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ دھوکا ہ

بس یہی سوچ کے آئے تھے تری محفل میں .. حالِ دل تجھ کو سنا لینے سے ہلکا

سب کے بس میں نہیں دیوانہ یا مجنوں ہونا .. عشق جب ہوگا تو پھر جان کا سو

سامعین! اس کو ستاروں کی طرح گھیر رہے .. جب تخیل میں قمر کوئی اُجالا

غزلیں

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء (۱۱۱ اسٹارکی ٹاؤن۔ ناگپور)

پختہ جب تک نہ کمالِ دلِ بینا ہوگا
زندگانی کا کوئی راز نہ افشاء ہوگا

جاگ اُٹھے گا جہاں اس کا شعورِ ہستی
ذرّۂ خاک بھی ہم دوشِ ثریّا ہوگا

سرفروشی کا چلن جس گھڑی اپنائیں گے
ہم جنوں والوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہوگا

عشق کرنے کو تو کریجئے مگر یاد رہے
ہر قدم آگ کے دریا سے گذرنا ہوگا

پُرسشِ حال کی زحمت نہ خدارا کیجئے
اس سے تو زخم دروں اور بھی گہرا ہوگا

کامرانی ہمیں ہر گام پہ حاصل ہوگی
شاملِ حال جو رحمٰن کا منشاء ہوگا

پرویز طالب

اب تو جمہور کا دستور نرالا ہوگا ۔۔ لب کھلے ہوں گے مگر ذہن پہ تالا ہوگا
مثلِ سقراط صداقت کے امیں ہیں ہم لوگ ۔۔ اپنا انعام وہی زہر کا پیالا ہوگا
دشتِ غربت میں کوئی ساتھ رہے یا نہ رہے ۔۔ میرا غمخوار وہی پاؤں کا چھالا ہوگا
ایسے حالات میں جب کوئی سہارا بھی نہ تھا ۔۔ گردشِ وقت مجھے کس نے سنبھالا ہوگا

دید سے ہوتی ہے کس درجہ مسرت طالب
آنکھ روشن ہو تو دل میں بھی اُجالا ہوگا

عزیز بھارتی
۱۲-۱-۹۲۲ آصف نگر
حیدرآباد ۲۸

غزل

آج کے دور میں جو سچ کو اگلتا ہو گا
وہ خرد مند نہیں کوئی دیوانہ ہو گا

زندگی اس کے ہی دامن سے لپٹ جائے گی
جس کسی میں یہاں مرنے کا سلیقہ ہو گا

یوں سرِ عام مرے دل پہ ترس مت کھاؤ
سامنے سب کے مرے غم کا تماشہ ہو گا

اب کسی اور کی جانب نہ اٹھیں گی نظریں
آپ سے بڑھ کے مرا کون سہارا ہو گا

کہاں پتہ تھا کہ محبت بھی ہے اک کھیل عزیز
کیا خبر تھی کہ مرا دل بھی کھلونا ہو گا

مومن خان شوق
اشرف ولا۔ ۱۱-۳-۷۲۳
ملے پلی۔ حیدرآباد

غزل

پیاس بن کر جو مرے لب سے الجھتا ہو گا
وہ سمندر مری تقدیر میں لکھا ہو گا

دیکھنے ہم بھی گئے تھے کہ حقیقت کیا ہے
آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ تماشا ہو

اک تیرا نام ہی رہ جائے گا ہونٹوں پہ تر
دشتِ غربت میں کوئی جب نہ سہارا ہو

ہر نیا دن نئی افتاد کی لاتا ہے خ
کس نے جانا تھا کہ یوں خونِ تمنا ہ

شوق اس شخص پہ الزام نہ رکھیئے کو
بات کچھ اور تھی، کچھ آپ نے سمجھا



پروفیسر ظفر امام
قادری منزل، بیٹھ ۸۳۸ ۵۴۳۸۴

غزل کی شاخ پہ افکار کے پتوں کی بارش ہے
سرِ تسلیم خم مجھ پہ مرے رب کی نوازش ہے
ہم اپنی سرحدوں کو توڑ کر نکلیں بھلا کیسے
ہماری ایک دن کی بادشاہی میں بھی بندش ہے
عنایت مہربانی ہم پہ یلغاروں کی صورت کیوں
خلوصوں سے بھرے شاید کسی دشمن کی سازش ہے
ہم اپنی بات ان پہ ڈال کے الزام کیوں لیتے
ہماری قسمتوں کے آسماں پہ خود ہی گردش ہے
زمیں پر پاؤں رکھنے کی اجازت بھی نہیں ملتی
مگر اڑتے ہوئے آکاش چھو لینے کی کوشش ہے

یہ سچ ہے کہ نہیں دینے کی کھائی قسم تو نے
مگر ضدی ظفر کو تو دعا لینے کی خواہش ہے

فاطمہ تاج (حیدرآباد)

رنگِ صہبا بھی نہیں صبح کے رخساروں میں
پھول تک زرد ہیں اب وقت کے گلزاروں میں
اب کسی شئے کو بھی بےکار نہ سمجھا جائے
عکسِ قاتل بھی ہے ٹوٹی ہوئی تلواروں میں
تجھکو اب لوگ مرے نام سے پہچانیں گے
ذکر ہوگا ترا اب شہر کے اخباروں میں
چاہے اب کوئی صلیبوں سے گذر کر آئے
نہیں منصور کوئی شہر کے بازاروں میں

دیکھنے تجھکو سرِ دار زمانہ آیا
ہوگیا تاج تیرا نام وفاداروں میں

عزیز ناگپوری

غزل

تمہارا ہاتھ سمجھ لو کہ جس کے سر پر ہے
جہاں میں اوج پہ اُس شخص کا مقدر ہے
ہر اک بشر کے یہاں ہاتھ میں جو خنجر ہے
خراب کتنا زمانے کا یہ مقدر ہے
ہم اِس لیئے تو کبھی مسکرا نہیں سکتے
تمہارے درد کا احساس دل کے اندر ہے
سنواریں یا کہ بگاڑیں یہ زندگانی کو
نتیجہ اس کا تو بس آپ کے عمل پر ہے
دلوں کو فتح جو کر لے ہنسی خوشی سب کے
میری نظر میں زمانے کا وہ سکندر ہے
جو کام آئے بُرے وقت پر زمانے کے
میری نظر میں وہ اِنسان سب سے بہتر ہے
کہیں تو کیسے کہیں دل کی بات کھل کر ہم
ہمارے ہاتھ کے اُوپر ابھی تو پتھر ہے
عزیز دل پہ فسادوں کا ہے اثر ایسا
سُکوں کے دور میں بھی دل ہمارا مضطر ہے

جلد (۸) شمارہ (۱۲)

دسمبر ۱۹۹۱ء حیدرآباد

قیمت -/6 روپے

فون 229161

زرِ تعاون

ہندوستانی	سالانہ	65 روپے	۲ سال کے لیے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک	"	200 "	" 360 "	" 3700 "
امریکہ	"	40 ڈالر	" 70 ڈالر	" 700 ڈالر
انگلستان	"	25 پونڈ	" 45 پونڈ	" 400 پونڈ
پاکستان	"	175 پاکستانی روپے	" 300 پاکستانی روپے	" 3000 پاکستانی روپے

(ترسیلِ زر کا پتہ)

ماہنامہ "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد 4

* ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے پبلک پرنٹرس پتھر بازار میں چھپواکر دفتر ماہنامہ "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد ۴ سے جاری کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

مسلمانوں کا پہلا فرض

مسلمانوں کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ جہاں بھی اور جس ملک میں بھی ہوں، وہاں وہ اولاً اپنے ہم وطنوں کو اللہ کی اس نعمت (دینِ حق) میں شریک کرنے کی کوشش کریں جو اللہ نے ان کو عطا کی ہے اور ان کو اس کی فکر رہے یہ فکر سب سے زیادہ پیغمبروں کو رہا کرتی تھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو تسکین دی۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (سورۃ الشعراء،۳)

اے پیغمبر، شاید تم اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تیئں ہلاک کر دو گے۔

اس کے بعد درجہ بدرجہ جن لوگوں کو ان سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے ان کے اندر یہ فکر زیادہ ہوتی ہے، تو یہ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں بھی رہیں وہاں ہدایت کو عام کریں اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احسان فرمایا ہے ان کو جو ہدایت دی ہے، ان کو جو روشنی عطا فرمائی ہے اس روشنی کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

دوسرا فرض جو از روئے دین، انسانیت اور عقلِ سلیم، ہم پر عائد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنا تعارف کرائیں کہ ہم کس دین کے ماننے والے ہیں، کن اصولوں کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور ہماری زندگی کن چیزوں کی پابند ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے اخلاق سے لوگوں کو مانوس

اور فریب کریں، لوگوں کو اس دین کے مطالعے پر آمادہ کریں، جس دین کے ہم پابند ہیں اس دین کے بارے میں ان میں تجسس CURIOSITY پیدا ہو، یہ کس طرح کے لوگ ہیں، یہ کس دین کو مانتے ہیں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کسی کو تکلیف نہیں پہونچاتے یہ ہر ایک کے خیر خواہ ہیں، یہ دولت ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے ان کے نزدیک کچھ اور حقائق ہیں، کچھ اور VALUES ہیں۔ کچھ اور IDEAL ہیں یہ کس طرح کے لوگ ہیں جن کو دولت کی بڑی سے بڑی مقدار خرید نہیں سکتی۔ ان کو اپنے اصول سے ہٹا نہیں سکتی ان کو ظلم پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ کیا ان کے سامنے کوئی اور عالم ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے؟ ذہن پر چوٹ لگانے والی بعض چیزیں ہوتی ہیں جو بعض اوقات آدمی کی زندگی اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔

جبار بن سلمیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نامی ایک صحابی تھے وہ اسلام لائے، ان سے کسی نے کہا کہ آپ کیسے اسلام لائے، ان سے کسی نے پوچھا۔ آپ تو اپنے مذہب میں بڑے سخت تھے؟ انھوں نے کہا کہ ایک فقرہ سبب بن گیا، واقعہ یہ پیش آیا کہ میں نے ایک مسلمان (عامر بن فہیرہ رضؓ) کو نیزہ مارا اور وہ نیزہ ایک پہلو سے گھس کر دوسرے پہلو سے نکل گیا۔ اور وہ تڑپ کر گر گئے، زمین پر گرتے اور جان دیتے دیتے ان کی زبان سے ایک جملہ نکلا اور وہی جملہ ہے جو مجھے اسلام کی طرف کھینچ لایا انھوں نے کہا کہ "کعبہ کے رب کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا" ؎ (؎ عربی الفاظ ہیں۔ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ سیرت ابن ہشام)۔ میں نے سوچا کہ کامیابی کسے کہتے ہیں؟ کیا کامیابی کے دو معیار ہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک شخص جان کنی کے عالم میں گرتا ہے تھوڑی دیر میں وہ دنیا کی ہر لذت سے محروم ہو جائے گا، پھر کس چیز کو دیکھ کر وہ کہتا ہے کہ میں کامیاب ہو گیا؟ میرے دل میں ایک خلش پیدا ہو گئی کہ معلوم کرنا چاہیئے کہ مسلمان کامیابی کسے کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ تمام دنیا کی ناکامیاں اس کے لئے جمع ہو گئیں اور اس نے ہر چیز سے ہاتھ دھو لیا

مگر وہ ایسے وقت میں جب کوئی جھوٹ بول نہیں سکتا کہتا ہے کہ میں کامیاب ہوگیا۔ (مرتے وقت عام طور پر کوئی جھوٹ نہیں بولتا اور عرب تو زندہ رہ کر بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔) میں نے لوگوں سے کہا کہ اس نے کیا دیکھ کر کہا کہ میں کامیاب ہوگیا؟ انھوں نے کہا کہ تم نہیں جانتے اس کو خوشی تھی کہ میں نے حق کے لئے جان دی۔ یہ مسلمان اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ جو شہید ہوتے ہیں وہ جنت میں جاتے ہیں اس زخمی مسلمان نے کچھ دیکھا ہوگا، جنت دیکھی ہوگی اور یہ یقین اس کے دل میں بیٹھا ہوگا کہ میں شہید ہو جاؤں گا تو جنت میں جاؤں گا تو اس نے کہا میں کامیاب ہوگیا۔ کہنے لگے کہ اس جملے نے میرے دل کو پکڑ لیا اور کھینچ کر دائرہ اسلام میں لے آیا۔

حضرات ـــــ میں نے جو واقعہ سنایا یہ بہت آخری درجہ کا واقعہ ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ہر مسلمان اس کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور کرنا چاہیئے۔ البتہ مسلمانوں کا طرز زندگی ضرور ایسا ہونا چاہیئے تھا کہ پڑوسیوں کو اور اس ملک کی دوسری آبادی کو وہ یہ سوچنے پر آمادہ کرے کہ یہ کیسے لوگ ہیں، کیا یہ پیسے سے آدمی عیش و راحت لذت و طاقت کے کیسے سامان خرید سکتا ہے، یہ نہیں جانتے کہ جھوٹ بولنے سے بعض مرتبہ کتنا فائدہ ہوتا ہے، یہ نہیں سمجھتے کہ بڑی عمدہ کوٹھیوں میں بڑے بینک بیلنس کے ساتھ آدمی کس طرح عیش سے رہ سکتا ہے پھر یہ ان چیزوں کے پیچھے کیوں نہیں دوڑتے جن کے پیچھے ہم دوڑتے ہیں جو چیزیں ہمیں خرید لیتی ہیں وہ چیزیں انھیں کیوں نہیں خرید لیتیں۔

ہماری زندگی ایسی ہوتی جو لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتی ہیں مثال کے طور پر کہتا ہوں، یہ اہل علم کے لئے ایک سوال ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تیرہ برس تک مکہ معظمہ میں اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے اپنی تمام خصوصیات اور برکتوں کے ساتھ جو آپ کا حصہ تھیں، اللہ کی پوری، مدد پوری تائید آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ تھی، قرآن شریف نازل ہو رہا تھا اور دس برس مدینہ طیبہ میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی کل تئیس برس ہوئے، لیکن صلح حدیبیہ ہوئی ہے سنہ ۶ھ میں ہجرت کے چھٹے سال اور مکہ سنہ ۸ھ میں فتح ہوا۔ امام زہری جو بڑے جلیل القدر تابعی اور امام ہیں لکھتے ہیں کہ اس دو ڈھائی برس میں جتنی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے ہیں پورے بیس اکیس برس میں اس قدر لوگ مسلمان نہیں ہوئے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بات ہے؟ وہی اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم! وہی قرآن! وہی معجزات! وہی تاثیر، وہی صحبت کی برکت، لیکن دو ڈھائی برس میں جیسے معلوم ہوتا ہے رشتہ ٹوٹ گیا ہو یا تسبیح کی لڑی کا دھاگہ ٹوٹ گیا ہو تسبیح کے دانے بکھر گئے

اس کی وجہ یہ تھی کہ صلح حدیبیہ نے موقع دیا کہ عرب آزادانہ مدینہ آئیں جائیں اور مسلمانوں کی زندگی دیکھیں، اب تک ایک دیوار کھڑی تھی اسلام اور کفر کے درمیان اور لڑائیاں ہو رہی تھیں، غیر مسلم مدینے میں آتے ڈرتے تھے، اب مسلمان ادھر گئے غیر مسلم اُدھر گئے ان کو مسلمانوں کو دیکھنے کا یا میدانِ جنگ میں موقع ملتا تھا یا پھر سفر وغیرہ میں کہیں ساتھ ہو جائے وہ بھی کم لیکن صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ کا جو آدمی چاہے مدینہ میں بے خطر آئے اور جو مسلمان چاہے بے خطر مکہ چلا جائے، ملنے جلنے کی پوری آزادی ہے کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا، بس پھر کیا تھا مکہ کے لوگ اپنے عزیزوں سے ملنے مدینہ آئے اور آئے تو دیکھا کہ ان کی زندگیاں بدل گئی ہیں، ہم سب ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی نسل کے لوگ ہیں ایک لباس پہنتے ہیں ایک ہی خوراک ہے پھر کیا بات کہ ان کے اخلاق ہم سے مختلف ہیں؟ ان کا معاملہ اُن کا طرزِ گفتگو ہم سے مختلف ہے، ہم ان کے یہاں مہمان رہتے ہیں (حالانکہ ہم ان کے مذہب کے نہیں) تو یہ اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر ہمیں کھلاتے ہیں، یہ پہلے ہماری خبر لیتے ہیں، ہمیں پہلے آرام سے سلاتے ہیں پھر خود سوتے ہیں انھوں نے نہ کبھی ہمارا مذاق

اڑایا، نہ ہم پر کبھی کوئی فقرہ کسا ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ اپنے کاموں میں بڑے مستعد ہیں، یہ نہیں کہ اسلام لانے کے بعد یہ کاہل ہو گئے ہوں، نماز کے وقت نماز پڑھتے ہیں اور کام کے وقت کام کرتے ہیں اور اپنے بال بچوں کے ساتھ بھی ان کا بڑا اچھا برتاؤ ہے سب ان سے خوش ہیں یہ فرق کہاں سے آیا؟ معلوم ہوا کہ یہ فرق اسلام نے پیدا کیا۔ اب ان کو اسلام پر غور کرنے کا موقع ملا اور وہ اسلام کی طرف کھنچنے لگے ہزاروں ہزار آدمی مسلمان ہوئے، امام زہری سے بڑھ کر معتبر کون ہو سکتا ہے حدیث کی روایات کے بڑے حصے کا دارومدار ان پر ہے وہ کہتے ہیں کہ عربوں کو اس عرصے میں مسلمانوں سے ملنے کا موقع ملا، انھوں نے مسلمانوں کو قریب سے دیکھا، اس سے اسلام نے اُن کے دل میں گھر کرلیا اور اپنا عاشق بنا لیا۔

اب آپ بتائیے کہ کسی ملک میں مسلمان ایک ہزار برس سے ہوں اور مسلمان نہ اپنا تعارف کرا سکیں، نہ اُن کو متاثر کر سکیں۔ تو بتائیے یہ کوتاہی ہے یا نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی خوشبو ہمارے ہم وطنوں کو نہیں پہنچ سکی، انھوں نے ہم کو سیاسی میدان میں دیکھا یا انتخابی معرکہ (الیکشن) کے میدان میں ہم کو آزمایا یا تجارت کے مقابلے میں ہم کو دیکھا، مسجدوں میں یہ آتے نہیں، انھوں نے ہم کو معاملات میں نہیں پرکھا۔ انھوں نے ہم کو اخلاق سے نہیں جانچا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں جیسے بالکل غیر مانوس پردیسی اور دشمن پر کرتے ہیں ابھی تک ان کو یہی نہیں معلوم کہ ہم اپنے اندر کیا جوہر رکھتے ہیں، کیسی محبت رکھتے ہیں، کیسی انسانیت رکھتے ہیں، ہمارے دل میں ان کے لئے کیسی خیر خواہی کا جذبہ ہے، ہم اس ملک کے لئے کتنے مفید ہیں، کتنے ضروری ہیں؟ ہماری وجہ سے ملک پر اللہ کی کیسی رحمتیں نازل ہو سکتی ہیں ابھی تک ہم غیر مسلموں کو اپنے پڑوسیوں تک کو واقف نہیں کرا سکے۔ اس کا ثبوت برابر ملتا رہتا ہے آپ کسی پڑھے لکھے ہندو سے پوچھ لیجئے کہ آپ نے

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

سید احمد عروج قادری قسط نمبر (۱۵)

اسلامی تصوف

توبہ

صوفیۂ کرام نے توبہ کو "ہر مقام" کی اصل اور "ہر حال" کی کلید قرار دیا ہے توبہ ان کے نزدیک منازل سالکین کی سب سے پہلی منزل اور مقامات طالبین کا سب سے پہلا مقام ہے اس کے بغیر نہ کسی کو کوئی مقام حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی "حال" نصیب ہو سکتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے توبہ کو وہی اہمیت دی ہے جو دینِ اسلام میں اُسے حاصل ہے۔

توبہ کے لغوی معنی کسی شئے سے کسی دوسری شئے کی طرف رجوع کرنے کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں توبہ کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ان تمام چیزوں سے جو شرعاً مذموم ہیں ان چیزوں کی طرف رجوع کرے جو شرعاً محمود ہیں، مختصر لفظوں میں توبہ، معصیت اور سرکشی سے اطاعت و بندگی کی طرف پلٹنے کا نام ہے سب سے بڑی معصیت اور سرکشی کفر و شرک ہے اس لیے جب تک کوئی شخص اس سے پلٹ کر ایمان و اسلام کے دائرے میں نہ آجائے، آگے کی کسی منزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قرآن میں کفر و شرک سے رجوع کرنے کے لیے بھی توبہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ

پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں (التوبہ ع ۲)

توبہ کے لیے استغفار کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اگر کفر و شرک سے استغفار کا حکم دیا جائے تو اُس کا مطلب اسلام قبول کرنا ہوگا ۔ سورہ نوحؑ میں ہے :

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ○

تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے ۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو کفر و شرک ہی سے استغفار کا حکم دیا تھا ۔

مسلمانوں کو توبہ و استغفار کا حکم قرآن کی متعدد آیتوں میں دیا گیا ہے ۔

امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں اور امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں یہ دو آیتیں پیش کی ہیں :

(۱) وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ (النور ۳۱)

اے مومنو ! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پا جاؤ گے

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا ۔ (التحریم ۸)

اے ایمان والو ! اللہ سے توبہ کرو، صاف دل کی توبہ

ان آیتوں کے علاوہ متعدد آیتوں میں مسلمانوں کو استغفار کا حکم دیا گیا ہے ۔ مثلاً سورۃ المزمل میں فرمایا گیا ۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

اور اللہ سے مغفرت طلب کرو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے

" توبۃ نصوح " اس توبہ کو کہتے ہیں جو تمام آمیزشوں سے پاک ہو اور خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے گناہ بخشوانے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہو ۔

شریعت اسلامی میں ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے اور اس کی فرضیت پر کتاب و سنت اور اجماع اُمت کے دلائل اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو سمیٹنا بھی آسان نہیں ہے ۔ کسی بھی گناہ سے توبہ کرنا ہو تو اس کے صحیح ہونے کے لیئے تین شرطیں ہیں

۱۔ اس معصیت سے فوراً باز آجائے اور ترک کر دے

۲۔ اس پر نادم ہو۔

۳۔ عزم کرے کہ اب کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی غائب ہوگی تو، توبہ صحیح نہیں ہوگی۔ اس میں چوتھی شرط کا اضافہ اس وقت ہوجاتا ہے جب کسی ایسے گناہ سے توبہ کرنا ہو جس کا تعلق حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق سے ہو، مثلاً اگر کسی شخص نے کسی کا مال ہڑپ کرلیا تھا اور اب اس گناہ سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے صحیح ہونے کی چوتھی شرط یہ ہوگی کہ وہ اس شخص کو یا اس کے وارثوں کو واپس کرے یا اگر کسی کی غیبت کی تھی تو اس سے معافی چاہے یا اگر کسی کو جسمانی تکلیف پہنچائی تھی تو اس کو موقع دے کہ وہ بھی اسے تکلیف پہنچالے یا اس سے معافی طلب کرے۔

احادیث میں بھی توبہ و استغفار کا بکثرت حکم دیا گیا ہے، امام نوویؒ نے ریاض الصالحین میں توبہ کے وجوب اور اس کی فضیلت سے متعلق بارہ احادیث نقل کی ہیں، ایک حدیث میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسوہ پیش کرکے توبہ و استغفار کا حکم دیا ہے۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے

اغر بن یسار المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ " اے لوگو، اللہ سے توبہ کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو کیونکہ میں ہر روز سو بار توبہ کرتا ہوں۔ (مسلم شریف)

ایک حدیث قدسی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف سے اس کا یہ حکم پہنچایا ہے:

اے میرے بندو، تم رات دن خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔ پس تم مجھ سے مغفرت چاہو میں تمہیں معاف کروں گا۔
(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

×-×-×

(باقی آئندہ)

سید حامد
صدر انجمن ترقی اردو ہند
نئی دہلی

راج بہادر گوڑ
ایک منفرد شخصیت

راج بہادر گوڑ کی شخصیت تہ دار بھی ہے، پہلو دار بھی۔ ورنہ ادب کو سیاست سے بیر رہا ہے پھر بھی راج بہادر گوڑ چابک دستی کے انداز سے دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔ پہلی نظر میں ان پر منہوڑ ہونے کا گمان ہوتا ہے لیکن ان کے ذہن کے نہاں خانہ میں جھانکیے تو وہ مقطع نظر آئیں گے۔ تاہم، تھوڑی دیر بھی ان کے ساتھ بیٹھیے تو خندۂ زیرِ لب سے آگے بڑھنا پڑے گا۔ نام ان کا رکھا گیا راج بہادر۔ لیکن انھوں نے عمرِ عزیز راج کو بزدل ثابت کرنے، اس کے خلاف بغاوت کرنے اور اسے پسپا کرنے میں صرف کی اور جس گھڑی بدیسی راج کے پاؤں اُکھڑے اور دیسی راج بنام جمہوریت کے پاؤں جمے اسی گھڑی انھوں نے تجدیدِ بغاوت کا پیماں باندھ لیا۔ حالات زیادہ ناسازگار اور خطرات بے شمار ہو گئے اور ہتھ کڑیاں ہوا میں لہراتی ہوئی نظر آئیں تو زیرِ زمیں چلے گئے، قارون کے اس خزانے کی تلاش میں جو وہ راستے میں لٹاتا چلا گیا تھا، دریادلی کے تحت نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اب وہ خود اس کو صرف کرنے کے لائق نہیں رہا تھا لیکن ہم یہاں قارون کی فیاضانہ پسپائی کے محرکات پر غور کرنے نہیں بیٹھے ہیں، ہمیں تو راج بہادر

کی باغیانہ پیش قدمی کو خراج ادا کرنا ہے۔

ہندوستان کو جہدِ بسیار کے بعد آزادی تو مل گئی، لیکن اسے بھرپور بنانا اسے منصفانہ رُخ دینا، اس کے تحت ذرائع و اثمار پیداوار کو عادلانہ ڈھنگ سے تقسیم کرنا یہ سب کچھ باقی تھا اور اس میں سے بہت کچھ اب بھی باقی ہے۔ راج بہادر ان بے تاب ارواح میں سے ہیں جو سفر سے جی لگاتی ہیں اور منزل سے گھبراتی ہیں انھیں ایک لمحہ بھی اس میں شک نہیں ہوا کہ آزادی مقصد نہیں ذریعہ ہے، ذریعہ سماجی اور معاشی ناانصافیوں اور نابرابریوں کو دور کرنے کا۔ چنانچہ انھوں نے ٹھان لی کہ سرمایہ کے ہاتھوں محنت کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان پہ روک لگائیں گے جدید صنعت نے دستِ دولت آفریں کو جس طرح کچلا اور کچل رہی ہے راج بہادر نے اس کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اب اس ضمن میں کیا کر رہے ہیں، کیا اضمحلال کی گرفت میں قرار کے ساتھ ساتھ جذبہ بھی آگیا۔ عقیدت کہتی ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ لوگ جو مظلوموں کی دست گیری کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں، وقت کا احترام ابن الوقت بن کر کبھی نہیں کرتے اس سے بہتر ان لوگوں کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی لسان الغیب کر گئے ہیں۔

ازاں بہ دیرِ مغانم عزیز می دارند
کہ آتشی کہ نہ میرد ہمیشہ درِ دلِ ماست

میں باوجود پرانی لکیروں پر چلنے کے عقیدت مندانہ کنکھیوں سے ان سرفروشوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ ایک طرف ان معدودے چند سرفروشوں کو رکھیے دوسری طرف ان سرفروشوں کو جو ماضی قریب میں انبوہ در انبوہ ایوانِ سیاست میں در آئے ہیں، تب جا کر بغاوت کا اندازہ ہوگا۔

راج بہادر گوڑ کے سوانح حیات کی سرخیاں دیکھ رہا تھا علاج معالجہ ان کا جو تھا ... نظر میں ایسے دیر تک دہرا

رہیں۔ گوڑ صاحب نے ایم بی بی ایس کیا یعنی مجاہدہ کے بعد ڈاکٹر بنے۔ معلوم نہیں ڈاکٹری سے طبیعت کیوں اچاٹ ہوگئی۔ ان کے سوانح نگار نے شاید مصلحتاً یہ صراحت نہیں کی کہ مطب ان کی آماج گاہ سرے سے بنا بھی کہ نہیں۔ شاید انھیں یقین نہ تھا کہ اگر وہ اس شریفانہ پیشہ کو جس کی تیاری میں انھوں نے پانچ چھ سال کھپائے تھے اختیار کریں گے تو اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی آبادی برقرار رہے گی یا گھٹ جائے گی۔ ان لوگوں پر جو ایم بی بی ایس یا بی ایس سی (انجینئرنگ) کرکے دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں اعتراض کی انگلی اٹھا کرتی ہے کہ انھوں نے میڈیکل یا انجینئرنگ کالج کی قیمتی نشستیں ضائع کردیں۔ لیکن میں جو سول سروسیز کے انٹرویو میں ان بے شمار ڈاکٹروں اور انجینیروں کا کچھ نہ بگاڑ سکا جو شوقِ لیلائے سول سروس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ راج بہادر گوڑ پر حرف گیری کیسے کروں۔ وہ سول سروس کے دام میں گرفتار ہوتے سے رہے۔

برو ایں دام برجائے دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

انھوں نے تو مظلوموں اور ستم رسیدوں کی دادرسی اور یاوری کو مقصدِ حیات بنا لیا۔
کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ گوڑ صاحب کے علاج معالجہ سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا ہو یا نہ ہو خود انھوں نے نظامِ چارہ گری سے انوکھے طور پر فائدہ اٹھایا، خدانخواستہ دائم المریض ہوکر نہیں بلکہ بیماری کو راہِ نجات بنا کر۔ گوڑ صاحب ٹھہرے فعال اور متحرک آدمی، زنداں میں ان کا دل کیوں کر لگتا۔ چنانچہ خود کو علاج کا مستحق بنا لیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ت نے ہی ان کی رہائی بیماری کے راستے لکھی ہو۔ بیماری واقعی تھی یا مصنوعی، ہمیں سے کے پیچھے جھانکنے کی ضرورت نہیں۔ جنگی قیدیوں کی طرح سیاسی قیدیوں کے لئے ل ہر راہ روا ہے راج بہادر گوڑ کی تازہ تصنیف "ادبی تناظر" میں حسنِ بیان اور ر ب زباں کی تلاش بے سود ہوگی۔ فاضل مصنف کو عبارت آرائی سے زیادہ سروکار نہیں ، ان کے مضامین باوزن اور قابلِ قدر ہیں۔ ترقی پسند ادب اور اس کے برتنے والوں

کے بارے میں انھوں نے بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جنھیں وہ نہ بتاتے تو یہ داستان تشنہ رہ جاتی۔ سلسلۂ ذہب کی کئی کڑیاں خالی رہ جاتیں۔ چونکہ وہ خود اسی دبستان ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور اس دبستان کے اکابر اہلِ قلم کی رفاقت اور ان کی طرف سے انسیت اور احترام انھیں میسر ہوا ہے، اس لیئے ان کی تحریریں "شنیدہ" کی دوری اور پھیکا پن نہیں ہے "دیدہ" کا قرب اور التہاب ہے وہ ترجمانی اس تحریک کی کر رہے ہیں جس میں وہ گلے گلے شریک تھے مصنف کے ساتھ قارئین تیسری اور چوتھی دہائی کے اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جب ترقی پسند مصنفین ادب اور زندگی دونوں کو اپنے شدت سے محسوس کیے ہوئے نظریات کے مطابق ڈھا رہے تھے۔

راج بہادر گوڑ کی تحریر کے برعکس ان کی گفتگو رواں، شگفتہ، صاف اور دلکش ہوتی ہے اگر وہ اپنی تحریر کو خراد اتارتے تو بات ہی دوسری ہوتی۔ ان کی گفتگو کا ذکر آ گیا ہے تو دو ایک باتیں کہہ دی جائیں۔ اول تو ان کی صحبت میں انسان ناک چڑھا کر اور تیوری پر بل ڈال کر بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ ان میں ہر بلبلہ کو چھیدنے کی صلاحیت ہے ان کی گفتگو دلکش اور براق ہوتی ہے اسے دارالترجمہ والے حیدرآباد کا فیض کہیے کہ ان کا ذہن موزوں لفظ یا موزوں ترین متبادل تک ایک پل میں پہنچ جاتا ہے اور یارانِ محفل تلاش میں سرگرداں رہ جاتے ہیں۔

گوڑ صاحب قانون کی بہت اچھی فراست رکھتے ہیں اور انجمن ترقی اُردو کو اُردو زبان کے آئینی حقوق کے سلسلہ میں جتنے مرجوعات کرنے پڑتے ہیں ان میں بالعموم گوڑ صاحب انجمن کی انگلی پکڑ کر اسے چلاتے ہیں۔

راج بہادر گوڑ کی شخصیت دل پذیر ہے عام خیال یہ ہے اور صحیح ہے کہ وہ منہ تعصب سے بے نیاز اور بالاتر ہیں اس زمانہ میں بھی جب یہ سکہ رائج الوقت ہو چلا ہے یونی تو ہمارا ترقی پسند طبقہ ہی ذہنی طور پر انصاف پسند اور اقلیت دوست ہے زمانہ

بہادر گوڑ کی افتادِ طبع، عروس البلاد حیدرآباد سے ان کے تعلق اور شریف النفس اہلِ سیاست واہلِ قلم اور انصاف پسندوں کی صحبت نے اس پر اور جلا کر دیا ہے اگر آپ کو تلاش ہو کہ بے لوث اور ٹھیٹھ ہندوستانی کسے کہتے ہیں تو جو فہرست آپ بنائیں گے اس میں راج بہادر گوڑ کا نام ضرور شامل ہوگا کہ اس کے رگ و ریشہ پر بلے آمیز ہندوستانی ہونے کی مہر ثبت ہے اور اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ ہر لمحہ اس کے دل کو ہندوستانیت کی صہبائے ناب میں لہلہا رہا ہے۔ گوڑ اپنی بے نفسی اور سادگی اور بے ریائی میں حسرت موہانی کی یاد دلاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس درجہ حرارت کو نہ گوڑ پہنچتا ہے، نہ ہمارے بڑے سے بڑے قائدین میں سے کوئی۔ تاہم حسرت موہانی کے کردار سے فزیبی مماثلت کا افتخار کیا کم ہے۔

"ادبی تناظر" ۹ ار مضامین پر مشتمل ہے روشنائی سے اس فاصلہ پر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی بنا راس کے جیالوں نے کن ارادوں، اضطرابوں اور ارمانوں کے ساتھ ڈالی۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسندوں نے اردو ادب کی دیوار میں جو فرسودگی اور کجی آ گئی تھی اسے پیٹھ کا سہارا دے کر سیدھا کر دیا۔ مضامین اکثر ان معاصرین کا ذکرِ خیر کرتے ہیں جو مصنف کے ہم مشرب تھے۔ ان میں سر فہرست مخدوم ہیں اور خواجہ احمد عباس اور نیاز حیدر اور باقر زیدی بھی ہیں۔ مضامین بصیرت اور ہمدردی کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن مصنف کی وسعت نظر اور فراخی ترجیحات کا اندازہ بھی ان سے ہوتا ہے۔

ترقی پسند ادب عالمی تناظر اپنے ساتھ لایا۔ اس کی تخلیقات میں زندگی کی ندی پورے جوش و خروش کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے ان اوصاف کا انعکاس "ادبی تناظر" میں ہوتا ہے جارحانہ نہیں شارحانہ، متعصبانہ نہیں عادلانہ انداز سے یہ کتاب قارئین کے افق کو وسیع کرتی ہوئی چلتی ہے اور جو بصیرتیں اور روشنیاں وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی ہیں وہ کس پر مستزاد۔ دیکھیے۔

"بغاوت اور انقلاب میں فرق ہی یہ ہے کہ بغاوت کے سامنے مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا اور انقلاب کے آگے سماج کی تشکیلِ نو کا ایک پورا منصوبہ ہوتا ہے"۔

"کسی ادب کو یا کسی ادبی دور کو اس کے اچھے اور اعلیٰ ادب کی بنا پر جانچا جاتا ہے۔"

"کرشن چندر نے اپنی سماجی بصیرت کو اپنے مقصد کو موزوں فنی ہئیت میں پیش کیا ہے۔"

"جاگیرداری سماج میں عورت محض ایک کھلونا تھی۔ سرمایہ داری نے اپنے عروج کے زمانے میں اسے آزاد تو بنا مگر وسعتِ زنجیر تک ہی۔"

"جمہوری طریقہ کار کھلی بحث اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا پرکھنا اور مفاہمت اور مطابقت کی راہیں تلاش کرنا انجمن کا طریقہ کار تھا۔"

"اول تو درمیانی طبقہ کا المیّہ یہ ہے کہ وہ نہ تو سرمایہ دار طبقہ کی طرح سماج پر قابض ہے اور نہ مزدور طبقہ کی طرح اس پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کے خواب ہی دیکھ سکتا ہے اس لیے میں تذبذب اور تشکیک کی اس کیفیت میں منزل اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

"(غالب کے دور میں) پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی قدریں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آئند مستقبل کا نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں۔"

"ان (غالب) کے پاس غم موجود کے ساتھ نشاطِ آرزو بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔"

ترقی پسند ادب اور اس کے اہلِ قلم پر راج بہادر گوڑ کو بہت کچھ لکھنا ہے اسی منصفانہ کاوش اور عالم گیر نظر اور انسان دوستی کے ساتھ جس کا اظہار "ادبی تناظر" میں کیا گیا ہے ہم ان کی اس سلسلہ کی کتابوں کا انتظار کریں گے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا تہنیتی جلسہ اور "ادبی تناظر" کی رسم اجراء

انجمن ترقی اُردو ہند کے زیر اہتمام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو دہلی اُردو اکاڈمی کا قومی انعام ملنے کی مسرت میں ۶ر جولائی ۱۹۷٦ء کو بمقام اُردو گھر آڈیٹوریم تہنیتی جلسہ منعقد ہوا۔ اور ان کی تازہ تصنیف "ادبی تناظر" کی رسم اجراء بھی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انجمن ترقی اُردو ہند کے دوامی رکن ہیں۔ دو دفعہ نائب صدر بھی منتخب ہو چکے ہیں۔ آج کل انجمن کی عاملہ مجلس اور ادبی کمیٹی کے رکن ہیں اس کے علاوہ انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے نائب صدر ہیں گوڑ صاحب کو اُردو سے غیر معمولی محبت ہے اور اُردو زبان کے مسائل سے گوڑ صاحب جتنے واقف ہیں بہت کم لوگ ہوں گے جن کی اتنی نظر ہو گی۔ خلیق انجم نے مزید کہا کہ گوڑ صاحب جیسے سیکولر، کشادہ ذہن اور صاف گو انسان کا ملنا مشکل ہے۔

سید شریف الحسن نقوی نے کہا کہ میں گوڑ صاحب کو اُردو اکاڈمی دہلی کی طرف سے اور اپنی طرف سے مبارکباد دیتا ہوں گوڑ صاحب اُردو کے خاموش سیکولر سپاہی ہیں انھوں نے کہا کہ "ادبی تناظر" میں ان کے دو مضامین "مولانا ابوالکلام آزاد" اور "مولانا محمد علی جوہر" ان کی کشادہ ذہنی کی دلیل ہیں۔ گوڑ صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رگوں میں سیکولرزم کا خون دوڑ رہا ہے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ میں گوڑ صاحب کو بہت عرصے سے جانتا ہوں لیکن جب سے انجمن دہلی منتقل ہوئی ہے ان سے بہت زیادہ قربت حاصل ہو گئی ہے گوڑ صاحب بہت صاف اور سیکولر ذہن کے آدمی ہیں یہ ان کی شخصیت کا سب سے درخشاں پہلو ہے گوڑ صاحب ادب کے بہت سنجیدہ اور ریگولر قاری ہیں میری خواہش ہے کہ گوڑ صاحب کچھ اور نئی تحریریں پیش کریں۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ گوڑ صاحب سے وابستگی میرے لیئے آئیڈیالو قائم کیا تھا اسی آئیڈیالوجی پر آج بھی کام کر رہے ہیں گوڑ صاحب کے اندر وہ تمام وضع داریاں ہیں جس سے حیدرآباد کی تہذیب عبارت ہے قدوائی صاحب نے مزید کہا کہ گوڑ صاحب کی کتاب "ادبی تناظر" اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ ایک ایسی شخصیت کی تحریر ہے جس کا ادب سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ گوڑ صاحب سے میرے بڑے قریبی تعلقات ہیں گوڑ صاحب کے نظریات کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے ذاتی کردار بھی بہت اہم ہیں۔ گوڑ صاحب کی زندگی ہم سب کے لیے ایک آدرش اور نمونہ ہے گوڑ صاحب اُردو کے مسائل کو حل کرنے میں بہت مخلص ہیں اُردو تحریک کے سربراہ بھی رہے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے مزید کہا کہ گوڑ صاحب کے مضامین میں جو تنقید ہوتی ہے وہ تاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک نظریہ ہوتا ہے گوڑ صاحب نے بڑے مخلصانہ جذبے سے اُردو کی خدمت کی ہے

جموں یونیورسٹی کے پروفیسر منظر اعظمی نے کہا کہ گوڑ صاحب کی تازہ تصنیف "ادبی تناظر" کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ گوڑ صاحب ایک اچھے ادیب، نقاد اور سیاسی رہنما ہیں اور شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے جس طرح اپنے ہم عصروں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے اسی طرح نئی نسل کے ادیبوں کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے یہ ان کی زندہ دلی کا ثبوت ہے

ابوالفیض سحر صاحب نے کہا کہ راج بہادر گوڑ صاحب سے میرے بڑے دیرینہ تعلقات ہیں گوڑ صاحب کو اپنے کام و کاز سے جو خلوص اور محبت ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے اُردو کے مسائل کیا ہیں، اس کے دستوری حقوق کیا ہیں، یہ تمام چیزیں میں نے گوڑ صاحب ہی سے سیکھی ہیں۔

رفعت سروش صاحب نے کہا کہ میں گوڑ صاحب سے بہت عرصے سے واقف ہوں۔ بلاشبہ گوڑ صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے حیدرآباد میں اُردو تحریک کے کارواں کو

آگے بڑھایا۔ گوڑ صاحب کی جو چیز مجھے بہت زیادہ پسند ہے وہ ان کی دل لگی ہے گوڑ صاحب بڑے بے تکلف انسان ہیں۔ گوڑ صاحب اپنے ہم عصروں سے بھی سیکھتے ہیں اور نئی نسل کے لوگوں سے بھی۔ گوڑ صاحب بہت ہی منکسر المزاج ہیں

پیرزادہ فقیر عبد المغنی نے کہا کہ گوڑ صاحب نے "ادبی تناظر" میں مختلف شخصیتوں کو جمع کر دیا ہے جو ان کی وسیع النظری کا علم بردار ہے۔ گوڑ صاحب اشتراکی عناصر اور غیر اشتراکی عناصر دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ان پہ تحریر کرتے ہیں یہ ان کی کشادہ ذہنی کا ثبوت ہے۔ گوڑ صاحب اُردو تحریک کے سپہ سالاروں میں سے ہیں۔

ماہرِ غالبیات اور اُردو کے ممتاز ادیب جناب مالک رام نے "ادبی تناظر" کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کتاب کو پڑھوا کر سنا۔ یہ کتاب بہت اچھے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مالک رام صاحب نے کہا کہ مخدوم پہ ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ناکافی ہے یہ تاریخ ادب اُردو کے قارئین کا بڑا نقصان ہے میری خواہش ہے کہ گوڑ صاحب مخدوم پر کچھ مزید لکھیں۔ اُردو اکاڈمی دہلی کا ایوارڈ گوڑ صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی اردو کے لیے کام کرنے کی ترغیب بھی دینا ہے میں دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے تاثرات کا اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بہت خوشی ہے کہ اس جلسے میں اُردو کے علما و عمائدین کی کثیر تعداد نے شرکت فرما کر میری ہمت افزائی کی۔ میں نے اُردو ادب ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک اسکولوں میں یا پھر ۱۹۵۲ء سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ گوڑ صاحب نے کہا کہ میں ایک ٹریڈ یونینسٹ ہوں اسی لیے جب ہمارے ٹریڈ یونین کا کوئی کیس آتا ہے تو اس انداز سے سوچتا ہوں کہ جرم کیا ہے اور کن حالات میں وہ جرم سرزد ہوا اور وہی مطالبات رکھتے ہیں جو قابلِ حصول ہوں۔ میں نے یہی انداز تنقید میں اپنایا ہے۔ میں آپ سبھی لوگوں کا مشکور ہوں۔

آخر میں جلسے کے صدر جناب سید حامد نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ مجھے کسی شخص سے بے تکلف ہونے میں برس دو برس لگ جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے پہلی

قسط ۲

سعیدہ انور (ریسرچ اسکالر شعبۂ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی)
۲۸۶-۱-۱۴ منگل ہاٹ
حیدرآباد

دکنی کے صوفی شاعر،

منشی میر امداد علی علوی رنگیلا

ذکر واذکار، شغل و مراقبے سے اسرار کونین قلب پر روشن ہونے لگے۔ تب خدمتِ شیخ میں عرض کرنے لگے۔ حضرت مرزا صاحب نے کہا کہ تم تو شاعر ہو ان کیفیات کو نظم کرو اور ہمیں سناؤ۔ علوی صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ "وقتِ بیعت میں شاعری سے توبہ کر چکا ہوں اس لیئے تعمیلِ ارشاد میں مجبوری ہے"۔ اس بات کو سن کر مرزا صاحب قبلہ فرماتے ہیں۔ ع

شاعری آج کل کی جس کا ہے رواج
لغو اور جھوٹ کی ہے وہ معراج
اب اجازت ہے شعر گوئی کی
ہو بشرطیکہ شاعری سچی (یادِ علوی)

پیر و مرشد کی اجازت کو پا کر منشی رنگیلا مکرر آمادۂ سخن گوئی ہو گئے اور شعر فرمانے لگے اب حضرت کی شاعری پچھلی جیسی نہیں تھی۔ اب رنگِ سخن کچھ اور ہی تھا۔ اب خمخانۂ شاعری سے حقیقت و عرفان کے لبریز جام لٹانے لگے اور کیفیت و سرور سے بھرپور کلام تصوف آمیز فرمانے لگے۔

حضرت کا فطری مذاق سوز و عشق تھا۔ آپ نے بہت سے مضامین لکھے ہیں نثر۔ نظم

مثنویات۔ غزلیات۔ رباعیات۔ قطعات۔ دوہے۔ راگنیاں۔ ٹھمری۔ دادرا۔ حمد۔ نعت وغیرہ پر مشتمل ہے۔

آپ نے اُردو۔ فارسی۔ ہندی میں کلام لکھے ہیں جملہ متعلقہ اشعار موجودہ دواوین میں (۲۵،٦٧۵) دستیاب ہیں۔

دواوین کا یہ سہ لسانی مجموعہ مکمل شعبۂ مخطوطات سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں مخزون ہیں۔ ایک عدد مخطوطہ کا نسخہ جو ہندی دیوان "رنگ رنگیلا" ہے اردو ریسرچ سنٹر لائبریری، حیدرآباد میں جو محترم صمد صاحب کے پاس موجود ہے۔

ان مخطوطات میں دیوان اولیٰ علی علوی قبل از بیعت و اجازت پیرو مرشد قدس سرہٗ کا ہے۔

دیوانِ علی علوی سے کچھ نمونۂ کلام پیش ہے۔

کس منہ سے شکر کیجئے ربِ غفور کا
ذرہ بشر کی خاک میں چمکا یا نور کا
اسرار کنت کنز آ کھلے معرفت کے ساز
باعث کیا بشر کو جو اپنے ظہور کا

گو یہ آپ کا ابتدائی کلام ہے مگر سخنوری کی پختگی اس دور کا مزاجِ شاعری آداد حزن ملال تارامی کی کیفیت اور چونکہ عام طور پر صوفیائے کرام بیخ عرفان حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہٗ کو سمجھتے رہے ہیں۔ اس غزل میں اشارہ ملتا ہے۔

نحن اقرب یا علی کیجئے علوی کی جز بہر خدا
گردشِ چرخ نے اسے شان بزمن لوٹ لیا

حضرت منشی میر امداد علی علوی رنگیلا کی سات نثریات ہیں (۱) انوار محمدی (فارسی) (۲) سراسلوک (۳) حبل الورید (۴) عقائد صوفیہ (۵) روائح الوائح (٦) معیارِ سماع

(۲) ختم وحدت (اردو)۔

نظم وغزلیات کے دیوان۔

۱) دیوان شمس علوی (۲) دیوانِ نقشِ علوی (۳) دیوانِ سر علوی (۴) رموز المعانی (۵) دیوان اسرار نامہ (۶) دیوان دردعلوی (۷) دیوان حقائق علوی (۸) دیوان کنزعلوی (۹) عقد اللالی (۱۰) دیوانِ سوزعلوی (۱۱) دیوان رنگ رنگیلا (ہندی) وغیرہ وغیرہ پر مشتمل آپ کا کلام ہے بہت سارا دیوان تو مخطوطہ ہی ہے۔ مطبوعہ بہت کم ہے۔

من کے بیچ سمایا رے داتا من کے بیچ سمایا رے
جوں درپن میں چھایا رے داتا من کے بیچ سمایا رے

(دیوانِ رنگ رنگیلا) ہندی

ہوت میں جوت سمائی رے بابا جوت میں ہوت سمائی
پربت منگل رائی رے بابا ہوت میں جوت سمائی
ہوت میں جوت سمائی رے بابا

(دیوانِ رنگ رنگیلا) ہندی

سیس چرنن پہ دھرت ہوں تورے اَن داتا جی
کہت ہوں بابا ونتی کرت ہوں توری

(دیوانِ رنگ رنگیلا) ہندی

اکھٹے ہو کے حسن و عشق میرے دل میں رہتے ہیں
یہاں لیلیٰ و مجنوں ایک ہی محل میں رہتے ہیں
نہیں علوی ہیں ہم کہ آن دل سے دور مرزا کے
اگرچہ خود ہیں ناقص پہلو تے کامل میں رہتے ہیں

(دیوان کنزعلوی)

یار آیا چمن میں بہار آئی ساقی مئے ناب پلادے مجھے
سرخم کو جھکادے تو مجھ پہ کبھی او کہہ سرخم پر جھکادے
(دیوان حقائق علوی)

شروع عالم ایجاد ہوں میں
آخرِ منزل میعاد ہوں میں
کسی نے مجھ کو شیشہ میں اتارا
پری ہو گرچہ آدم زاد ہوں میں
تصور میں بنادیتا ہوں تصویر
بڑا مانی بڑا بہزاد ہوں میں (دیوان کنز علوی)

دیدم عجیب تماشا دریا درون قطرہ
کن فہم ایں معما دریا درون قطرہ (دیوان نقش علوی)

اتنا سا گوہے دیکھو تو کیا آدمی میں ہے
سب کائنات ارض و سما آدمی میں ہے

آپ کی کو تیا میں گر و بھکتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی آخر میں یہ اپنے آپ کو بھکتی میں فنا کر دیتے ہیں۔

مرزا صاحب قبلہ نے ساڑھے تین سال سخت مجاہدہ سلوک کے مراحل طے کرانے کے بعد اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا اور کہا کہ منشی جی اب ہم جس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں وہاں تم کو لا کھڑا کر دیا ہے۔ اب تم کو ہمارے پاس سے کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔

علوی صاحب قبلہ یہ سن کر رونے لگے اور کہا کہ میں تو آپ میں فنا ہو گیا ہوں اب میں کہاں ہوں۔

فنافی الشیخ کا رتبہ دیا حق نے مجھے عسلوی
میں جب جا ہوں دکھا دوں تجھکو شکل مرزا ہو کر

حضرت مرزا صاحب قبلہ کو اپنے مایہ ناز غلیفہ پر بڑا ناز تھا ایک بار سماع کی محفل میں علوی صاحب قبلہ وجد کی کیفیت میں تھے مرزا صاحب قبلہ خود فرماتے ہیں کہ "ارے بھائی منشی کو سنبھالو وہ منشی نہیں مرزا ہے"

اے یار نہ مجھ سے منہ چھپا تو اور نہیں میں اور نہیں
ہے شکل تیری میرا نقشہ تو اور نہیں میں اور نہیں

دونوں کے عشق کا ٹکراؤ ہونے لگا۔ اس ٹکراؤ سے جو شعاعیں نکلنے لگیں وہ دنیا کو منور کرنے لگی۔ اُس دور کے لوگوں نے دیکھا اُس محلہ کے لوگوں نے دیکھا کہ رات کے وقت ایک روشن اور کرن مرشد مرزا صاحب قبلہ کے گھر سے علوی صاحب قبلہ کے گھر تک ایک لکیر نما روشنی لیئے جارہی ہے اور وہی منور روشنی بھر ر نگیلے کے گھر سے مرزا صاحب قبلہ کے گھر تک جارہی ہے عشق کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ قلب منور ہو کر نور نور سے باتیں کر رہا ہے۔

آپ کے اس بے انتہا عشق کو دیکھ کر آپ کا پیر بھائیوں کو بہت حسد ہوتا تھا۔ پیر بھائیوں اور شاگردوں نے حسد کی آگ میں مبتلا ہو کر حضرت علوی صاحب قبلہ کی شکائیتیں مرزا صاحب قبلہ کے سامنے کرنے لگے۔ وہاں کچھ دال نہ گلی تو علوی صاحب قبلہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا مگر پروردگار اپنے نیک بندوں کی خود حفاظت کرتا ہے اس لیئے حاسد اپنے ارادہ میں ناکام ہوئے۔

یہ اطلاع حضرت مرزا صاحب قبلہ کو ملی تو پُر ملال ہوئے اور علوی صاحب قبلہ سے کہنے لگے کہ ہمیں بہت رنج ہے کہ ہم زندہ ہیں اور آپ پر جان کی بنی ہے یہ واقع ہماری موجودگی میں پیش آیا جس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔

انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا مگر جبکہ ہمارے پیر ومرشد کا وصال ہوچکا تھا مگر حیف کہ ہم زندہ ہیں۔

کچھ ایسے تمھارے بھائی ہیں
جو بے زور آزمائی ہیں
زحمتیں ہاتھ سے تم ان کے پاؤ
ہم رہیں زندہ تم ستائے جاؤ (یادعلوی)

حضرت مرزا صاحب قبلہ نے فرمایا کہ منشی جی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ آپ کا پیر بھائی ہو یا مرید نفس کی خواہش پر مرکر اپنا ایمان خراب کرتے ہیں۔ مگر منشی جی تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن ان کی تکلیفوں سے آپ گھبرائیے مت۔ اپنے ہی بچے سمجھ کر آپ ان کو معاف کیجئے۔

ہاں۔ ایک بات ضرور یاد رکھیئے جبکہ ہماری وفات ہو جائے گی آپ کے پیر بھائی بہت ستائیں گے روز نئے نئے فتنے کھڑا کر دیں گے۔ آپ کو حیدرآباد میں ٹھہرنے نہیں دیں گے۔

اُن سے تکلیف جب تمھیں پہنچے
قلب جس وقت مطمئن نہ رہے
تو جہاں چاہو تم چلے جانا
سایہ سا تمھارا گھر ہوگا
ہو شہنشاہ تم جہاں بھی رہو
اور ہمیں اپنے ساتھ ہی سمجھو
ڈھیر مٹی کا گو رہے گا یہاں
پر وہاں ہم ہمارا یار جہاں (یادعلوی)

سبحان اللہ! یہ تو ہر دو کی جانب سے عشق کی معراج ہے شیخ ومرید کا لافانی عشق ہے

عشق نے آگ لگائی اے سادھو عشق نے آگ لگائی
دیت ہوں رام دہائی اے سادھو عشق نے آگ لگائی
کہت رنگیلا سن اے چھبیلے اب کچھ سدھ بدھ آئی
گرو کا نام لے کود آگ میں تہیں کیوں جان جو آئی (رنگ رنگیلا)

منشی جی نے ادب سے عرض کیا کہ قبلہ یہ ارشاد تو سب بجا ہے اگر میرا قاتل کچھ مہلت دے تو بس فوراً ایک وصیت لکھ دوں گا کہ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ مجھ کو دعویٰ ہے نا میرے وارثوں کو۔

یہ جواب سن کر حضرت مرزا صاحب قبلہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ معاف کرنا ہی حقیقت میں مردوں کا کام ہے مرد وہی ہوتا ہے جو معاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور معاف کر دیتا ہے۔

مرزا جی نے سن کے یہ فرمایا
ہاں میاں یہ کام ہے مردوں کا
ہے یہی شان عارف آگاہ
مرحبا مرحبا جزاک اللہ (یاد علوی)

واقعی میں آج سلسلہ مرزائی اور مرزائی گھرانے پر منشی جی کا احسان عظیم ہے کہ آج ہم سب فیض مرزائی سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ورنہ مرزا صاحب قبلہ خود فرمائے کہ ہم وہاں جہاں ہمارا یار ہو۔ منشی جی نے حیدرآباد کو ہی اپنا مقام بنا کر ہم سب پر یعنی مرزائی گھرانہ اور سلسلہ پر احسان کیا ہے جس کو سلسلہ مرزائی، مرزائی گھرانہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔ یہ منشی علوی کا ہی کرم ہے جو ہم فیض مرزا ہو رہے ہیں۔ منشی علوی اور مرزا صاحب قبلہ دونوں ایک ہی ہیں۔ منشی بن مرزا نہیں اور مرزا بن منشی نہیں۔ منشی جی پر ہم جتنا بھی فخر و ناز کریں کم ہے۔ یہ وہ آستانہ ہے جہاں سے شیخ کامل و مرید کامل دونوں کا فیض

ہماری وساری ہے۔

اگر منشی جی چاہتے تو اپنا مقام الگ سے بھی بنا سکتے تھے ممکن ہے کہ وہ بہت ہی شہرت پاتے۔ لیکن وہ تو گمنامی کو ہی پسند کیا اور اپنے شیخ میں پوری طرح سما کر بقا کے مقام کو حاصل کر لیا۔ آزادی و گمنامی اُسے کہتے ہیں

میرا نشان نہ رہے میرے بعد

علوی تو اک آزاد قلندر کا ہے بندہ

اُس نہ زبان پہ غالب رہ راہ کی باتیں

راہ الفت میں کھو بیٹھا خودی اپنی فنا ہو کر
خدائی کا دعویٰ دل میں شاید بقا ہو کر

صفات ذات نے سیر حقیقت کر دیا افشاں
کہ ہر اک عہد آیا ہے یہاں ابن نبی ہو کر
فنا فی الشیخ کا رتبہ دیا حق نے مجھے علوی
میں جب چاہوں دکھاؤں تجھ کو شکل مرزا ہو کر

منشی جی علوی نہایت ہی متشرع۔ نفس کش اور لذائذ سے پرہیز کرتے تھے۔ یوں تو دکن میں اور بھی شاعر بہت ہیں لیکن منشی امداد علی صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے۔

انھوں نے بہت سی زبانوں پر قدرت حاصل کی۔ کلام ہندی۔ پنجابی، مارواڑی فارسی، اردو، ریختی اور دیہاتی وغیرہ زبانوں میں لکھا ہے

آپ کا تخلص اردو اور فارسی میں علوی، ہندی میں رنگیلا، ریختی میں عصمت اور دیہاتی میں نیا در ہے۔

یہی آپ کا نادر پن ہے کہ آپ کا کلام نو ادرات سے کچھ کم نہیں۔

اس کلام سراپا الہام میں غور تا امعان بحرِ حقیقت کو بڑے بڑے ڈرنا باب ملتے ہیں۔ حضرت منشی کی غزلیات عارفانہ آج بھی مقدس محفلوں میں قوال پڑھتے (گاتے) ہیں تو صاحبانِ ذوق وکیف ان کو سن سن کر انکشافِ حقائق کے تیر ونشتر قلب گداز میں چبھتے محسوس کرتے ہیں تو بلے اختیار چیخ اٹھتے ہیں اور وجد کرنے لگتے ہیں۔

یکم محرم سے روزِ عاشورہ تک روزانہ مجلس فرمایا کرتے اور خوب روتے رہتے۔ حسبِ عادت اسی محرم کی مجلس میں بہت ہی مغموم اور روتے رہے یہاں تک کہ آپ کو بخار آگیا۔ آخر کار یکم مئی ۱۹۰۱ء م ۱۱ محرم ۱۳۱۹ھ بوقت پانچ بجے شام ۶۴ سال کی عمر میں یہ اسرارِ نور کا جلوہ حقیقی نور جلوہ میں شامل ہوگیا۔

آپ نے پیشین گوئی کی تھی کہ میں حالتِ سماع میں یا پھر غم حسینؓ میں مروں گا غم حسینؓ میں جان بحق تسلیم کیا۔

آپ کا مزار مبارک احاطہ گنبد حضرت مرزا سردار بیگ صاحب قبلہ میں ہے۔ آج بھی آپ کا عرس ۱۱ اور ۱۲ محرم کو ہوتا ہے۔

کیا ملک میری حقیقت کو سمجھتے علوی
اُن کا استاد نہ سمجھا وہ مسئلہ میں ہوں

کر غور ذرا دل میں کچھ جلوہ گری ہوگی
یہ شیشہ نہیں خالی دیکھو اس میں پری ہوگی
ہم اس کو ہی سمجھیں گے شارحِ شجرِ الفت
جو آب سے سوکھے گی وہ آتش سے ہری ہوگی
ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تو مے ظالم شیشہ میں بھری ہوگی

[redacted]

ڈاکٹر میر محبوب حسین،
شعبۂ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی

خوش مزاجی ایک فن

لوگوں کے میل ملاپ سے معاشرہ بنتا ہے اس میل ملاپ کے لیے کچھ مستحکم اصول اور کچھ اچھے طریقوں کی ضرورت پڑتی ہے یہ اصول اور یہ طریقے جتنے اچھے اور جتنے پائیدار ہوں گے معاشرہ بھی اتنا ہی مضبوط اور اچھا ہوگا ہر شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ اسے زندگی گزارنا پڑتا ہے اس کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے رہیں گھر میں ہو یا گھر سے باہر دوست، احباب، بازار، دفتر، کارخانہ جہاں بھی وہ رہتا ہے اُن سے اچھے تعلقات کا خواہشمند رہتا ہے۔ تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے اپنے اندر کچھ صفات پیدا کرنے پڑتے ہیں جیسے خیر خواہی۔ ایثار۔ عدل و انصاف۔ احسان۔ صلہ رحمی۔ درگزر۔ اعتراف خطا۔ باہمی اعتماد۔ حقوق کی ادائیگی۔ عیادت سلام وغیرہ۔ بعض چیزیں تعلقات کو خراب کرنے والی ہوتی ہیں ان سے بچنے کی ضرورت ہے جیسے تجسس، غیبت، بدگمانی، مذاق اڑانا وغیرہ۔

جو چیزیں اختیار کرنے کی ہیں اُن میں ایک عمدہ صفت خوش مزاجی بھی ہے۔ خوش مزاجی کی ضرورت۔ اس کے فوائد اور اس فن کو اپنانے کے لئے کیا چیزیں لازمی ہیں ان سب کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے زندگی کے بارے میں کچھ اہم باتیں پیش کرنا ضروری

ہے۔ زندگی ایک عظیم نعمت ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے مقصد
مطالبات اور تقاضوں سے آگہی حاصل کی جائے اور زندگی کے اعلیٰ اصولوں کو اپنا کر
میابی حاصل کی جائے۔ زندگی میں خوشی و غم دونوں ہیں۔ زندگی میں راستوں
سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ مصائب، کشمکش، بدنصیبی اور ناکامی سے آنکھیں چار ہوتی
ہیں۔ مشکلات اور دشواریاں بڑے سے بڑے آدمی کو بھی پیش آتی ہیں۔ یہ مشکلات
اُن کو اُس وقت جھنجھوڑتی ہیں جبکہ ان کی عملی قوتیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ چقماق سے
رگڑ کھا کر لوہے سے چنگاریاں اڑنے لگتی ہیں اسی طرح ذہین طبیعتوں کو مشکلات
سے تصادم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے ان کی فطری صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں
بارآور اور پختہ ہونے لگتی ہیں۔ ناکامی کامیابی کا زینہ ہوتی ہے اہلِ فہم ان
ناکامیوں کے بعد ہی کمر ہمت مضبوطی سے کستے اور زیادہ دانائی سے کام لیتے ہیں ان
ہی ناکامیوں سے سبق لے کر وہ آئندہ کامیاب ہوتے ہیں۔ ملٹن کے تمام ادبی شہ پارے
اس دور کی تصنیف ہیں جبکہ وہ تنگدستی، مرض، ضعیفی اور اندھے پن کا شکار تھا۔

زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے بعد آیئے دیکھیں کہ انسان کی زندگی میں خوش مزاجی
کا کیا رول ہے خوش مزاج انسان دلشاد، شاداں، مسرور، ہنس مکھ، نیک
طینت، اچھی طرح گذر اوقات کرنے والا، مزے سے زندگی بسر کرنے والا، خوش طبع
زندہ دل، ظریف، بامذاق جو ہر وقت خوش رہے ہشاش بشاش، خوش خلق
اچھی خصلت والا، خلیق، خندہ رو، خوش خصال، صاحبِ اخلاق، بامروت،
مہذب باسلیقہ ہوتا ہے خوش مزاجی کا حامل شخص خود بھی خوش و خرم رہتا ہے اور
دوسروں کو بھی خوش رکھتا ہے معاشرہ میں انبساط اور مسرت کی فضا قائم رہتی ہے۔
غم غلط ہو جاتے ہیں۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کا دل خوش کرنے کے
لیے کبھی کبھی خوش طبعی بھی فرمایا کرتے اور اس میں بھی بات سچ ہی کہتے۔ دو ایک
مثالیں پیش ہیں ایک روز کوئی ضعیفہ سرکار دوعالم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا

"یارسول اللہ دعا کیجیے میں جنت میں جاؤں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی"۔ وہ بڑی پریشان ہوئی اور رونے لگی۔ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جوان کر کے داخل کریں گے"۔ اس پر وہ بڑھیا خوش ہو گئی ایک شخص نے رسول اکرم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ" اسے کوئی سواری کا جانور عطا فرمائیں"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" ہم تجھے اونٹنی کا بچہ دیں گے" اس نے کہا" یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اونٹنی کے بچہ کو کیا کروں گا؟ کیوں کہ سواری کے لیے بچہ تو کام نہیں دے سکتا"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اونٹ کو اونٹنی ہی تو جنتی ہے"۔ ایک دن ایک شخص سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ" بتاؤ کہ تمہارے ماموں کی بہن تمہاری کیا لگی"۔ اس سادہ دل نے سر جھکایا اور سوچنے لگا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے اور فرمایا کہ" ہوش کر تجھے تیری ماں یاد نہیں رہی"۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز صحابہ کرام کے ساتھ کھجوریں کھا رہے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حاضرین کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے آگے رکھتے جا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاحاً فرمایا کہ" گٹھلیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ کھجوریں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھائی ہیں" حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا" دیکھنے والا یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ میں نے گٹھلیاں چھوڑ دیں ہیں جن کے سامنے گٹھلیاں نہیں ہیں وہ شاید مع گٹھلیوں کے کھا گئے ہیں"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام اس حاضر جوابی سے بہت لطف اندوز ہوئے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سواری شتر کی خواہش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میں ہی تمہارا اونٹ بننے کو تیار ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کاندھوں پر اٹھا لیا اور حجرے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے

...لے گئے اسی دوران امام علیؑ مقام نے فرمایا کہ اونٹ کی تو مہار ہوتی ہے جب کہ میرے
...نٹ کی مہار کوئی نہیں۔ اس پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے گیسوؤں کے ہاتھ میں
...سے دئیے کہ یہ مہار ہے۔ اس حالت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، تشریف
...لے آئے اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے کہا کہ بھئی تمہیں سواری خوب ملی
...ہے۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سوار بھی تو خوب ہے"۔ نبی علیہ السلام
اپنے ساتھیوں کے لطیف اور پاکیزہ مذاق سے محظوظ ہوتے تھے آپ صلے اللہ علیہ وسلم
خوش ہوتے تو زیر لب تبسم فرماتے۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا مزاج شگفتگی، شائستگی
اور پاکیزگی کا حامل تھے اس سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔

آئیے اب دیکھیں خوش مزاجی سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ خوش مزاج
لوگوں کے پاس بیٹھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے موسم گرما میں کوہستان کی
ٹھنڈی ہوا ہمیں تازہ قوت بخش رہی ہے یا موسم سرما میں سورج کی شعاعیں جسم میں
حرارت پیدا کر رہی ہیں۔ درحاصل زندگی اپنے بنانے سے بنتی ہے۔ بشاشِ طبع دنیا
کو اپنے لیئے جنت بنا لیتا ہے اور غمگین طبیعت اسی دُنیا کو اپنے لیئے جہنم کر لیتا ہے۔
خوش مزاج لوگ ہر چیز میں خوبی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ کتنا ہی بڑا حادثہ ہو وہ اس
خوبی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ کتنا ہی بڑا حادثہ ہو وہ اس میں سے راحت و تسکین کا جزو
الگ کر لیتے ہیں آسمان کیسا ہی دھواں دار ہو وہ کسی نہ کسی گوشہ سے سورج کی کرن کا
کھوج لگا لیتے ہیں اور اگر سورج ان کی نگاہوں سے بالکل ہی چھپا ہو تب بھی وہ مطمئن
رہتے ہیں کہ سورج موجود ہے اور کسی حکمت یا مصلحت سے غائب ہے کوئی بار اٹھانا
پڑتا ہے تو وہ نہایت بشاشت سے اٹھاتے ہیں نہ جھنجھلاتے ہیں نہ گھبراتے ہیں نہ
[illegible] بنیاد [illegible] پریشان کرتے ہیں بلکہ ہمت سے آگے بڑھتے اور اس طرح
[illegible] میں جو لوگ دسیع القلب و عظیم الظرف ہیں
مثالیں ہیں۔
[illegible] سے ہوتے ہیں [illegible] حادثہ میں اور

کی توقع رکھتے ہیں۔ مرض میں اعادۂ صحت کے منتظر رہتے ہیں، کشمکش میں اصلاح و تربیت پر نظر رکھتے ہیں۔ مصائب میں ہمت۔ تجربہ اور علم کے سبق سیکھتے ہیں امید قدرت کی نعمت ہے۔ غریب کی مددگار ہے اسی کی تحریک پر دنیا میں بڑے بڑے کام ہوتے ہیں خوش مزاجی، خوش طبعی اور شیریں کلامی کے نتیجہ میں مخاطب اور متکلم دونوں سے شیریں حرکات صادر ہوتی ہیں اس کی عادت پڑ جاتی ہے یہ ممکن ہے کہ حسن سلوک کا جواب ناسپاس گزاری کی صورت میں ملے لیکن کسی کی ناشکری سے محسن روحانی مسرت سے محروم نہیں ہو سکتا۔ اس سے اخلاق و مروت کی تخم پاشی کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تخم تو اچھی زمین میں جگہ پا کر محبت کا پھل پیدا کرے گا۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ دوزخ کی آگ ہر ایسے شخص پر حرام ہے جو مزاج کا تیز نہ ہو، نرم خو ہو اور لوگوں کے قریب ہونے والا ہو۔ مہاتما گاندھی کہتے ہیں ہنسی من کی گرہوں کو بڑی آسانی سے کھول دیتی ہے میرے من کی ہی نہیں تمہارے اور سب کے من کی بھی۔ گوئٹے کہتا ہے۔ برتاؤ ایک آئینہ ہے جس پر ہر شخص اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں خوش مزاجی ایک بہترین جوہر ثابت ہوتی ہے غصہ کی ساری آگ نرم جواب کی پھونک سے سرد ہو جاتی ہے برنس شاعر نے اچھی بیوی کی خصوصیات کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے اس میں سے چار حصے خوش مزاجی کے ہیں، دو خوش فہمی کے، ایک لطیف ظرافت کا، ایک حسن کا اور دو حصے دیگر چیزوں کے مثلاً تعلیم خاندان وغیرہ۔ حسنِ صورت عمر کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے لیکن حسنِ سیرت بڑھتا رہتا ہے۔

خوش مزاجی ایک فن ہے۔ غمگین لوگ زندگی کو مغموم اور خوش مزاج زندگی کو پُر بہار بنا لیتے ہیں۔ کوئی دل کی دنیا میں بادشاہ ہے اور کوئی غلام۔ زندگی اپنی انفرادیت کا آئینہ ہے۔ اچھوں کے لیئے دنیا اچھی اور بروں کے لیئے یہی دنیا بُری ہے۔ خوش باشی بلند نظری خدمتِ خلق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ دنیا مسرت آگیں، امید افزا اور با برکت

جائے گی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری فکر و پریشانی ہمارے ہی تخیل کا نتیجہ ہوتی
سرت و خوشی خصوصاً سلامتی طبع صبر و تحمل اور ملنے والوں سے نرمی اور دل جوئی
برتاؤ پر منحصر ہے ۔ افلاطون کا قول ہے کہ دوسروں کی بھلائی سے اپنا بھلا ہوتا ہے
ساری اور تواضع ، نرمی ، علم و بردباری، عفو و درگزر، انکساری، دوسروں کا لحاظ ،
روں کی عزت، دوسروں کی رائے کا احترام، تحمل، خوش کلامی، محبت ، نرم گفتاری
مسکراہٹ وغیرہ خوش مزاجی کے لئے ضروری ہیں اور جن چیزوں سے بچنا ہے ان میں
ختی سے بات کرنا، ترش روئی سے جواب دینا، بات کرتے وقت پیشانی پر بل ڈال لینا
من، تشنیع، دل دکھانے والی باتیں اور حقارت آمیز الفاظ سے خطاب کرنا، اپنی برتری
ظاہر کرنا، ایذا رسانی، بدکلامی، بدگوئی، نفرت، حسد، نفاق، خود غرضی، عیش پرستی
ہمت سے شاکی رہنا، غصہ ، دنیا کی بے ثباتی سے غافل رہنا، خدا کی خوشنودی ملحوظ نہ
رکھنا، شکوہ، شکایت، غیبت، حرص، لالچ، طمع وغیرہ سے بچنا چاہیئے۔ دوستی کے
آغاز کے ضمن میں دوسروں کا انتظار کیئے بغیر آپ ہی سب سے پہلے آغاز کیجئے۔ آپ کی
یہ کوشش حقیقتاً کامیاب ہوگی۔ اگر ہم تہیہ کرلیں کہ جو کچھ بھی ہم کریں گے اس سے لطف
اندوز ہوں گے تو یہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم بچوں سے تک سیکھ سکتے ہیں۔ ایک بچہ
پہیہ گھومنے سے پیدا ہونے والی آواز سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بلیک بورڈ پر چاک کی
رگڑ، نہاتے وقت جسم پر صابن کی ملائم پھسلن سے خوش ہوتا ہے دروازے پر لگے
ہوئے پیتل کے ہینڈل کے چمکیلے پن اور اسے گھمانے سے پیدا ہونے والی آواز کا مشاہدہ
کرکے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ خوشی خوشی ازدواجی زندگی بسر
کرنی ہے تو اپنے تمام اختلافات روز کے روز ختم کرلینے چاہئیں۔ اندرجیت لال نے اپنی
نو برس کی لڑکی ریٹا کے متعلق لکھا ہے۔ ایک دن وہ اپنی ماں سے کہہ رہی تھی کہ ماں! کیا
میں اپنی سہیلی نینا کو رات کے کھانے پر بلاؤں؟ اس کی ماں نے کہا۔ "لیکن کل تو
تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری نینا سے کُٹی ہے۔ تمہیں اس سے نفرت ہے۔" اس پر بچی نے

کہا وہ قابل غور ہے۔ وہ کہتی ہے۔ وہ تو میں کل کہہ رہی تھی نا! تم سمجھتیں کیوں نہیں تھی۔ خوش مزاجی ہر امیر و غریب کے لئے یکساں ممکن ہے۔

آخر میں خوش مزاجی کے تعلق سے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں

اقبال کہتے ہیں:

خوش مزاجی ساز مانہ میں کوئی جادو نہیں : ہر کوئی تحسین کہے ایسی طبیعت چاہیئے
ہنس کے ملنا رام کر لیتا ہے ہر انسان کو : سب سے میٹھا بولنے کی تم کو عادت چاہیئے

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

ناسخ کہتے ہیں:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے : مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

سلیم پانی پتی کو دیکھیئے:

وہ طبیعت مردہ ہے پژمردہ ہے جس میں نہ ہو : تازگی جو سبزہ میں ہے یا گل شاداب میں

اور اس میں جو احتیاط ملحوظ رکھنی ہے وہ بھی سن لیجئے۔

خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

(بقیہ سلسلہ صـ سے آگے)

اسلام کا مطالعہ کیا ہے؟ کہیں گے بالکل نہیں، اچھا آپ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کیا جانتے ہیں؟ وہ کہیں گے کہ ہم مسلمانوں سے متعلق اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان ختنہ کراتا ہے، گائے کا گوشت کھاتا ہے اور کچھ بات ہو جائے تو اسے بڑی جلدی غصہ آجاتا ہے، تین علامتیں مسلمان کی بتائی (ویسے یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان سر پہ چوٹی نہیں رکھتا) ہم سے ہمارے ایک فاضل دوست کہتے تھے کہ جب امریکہ گیا تو وہاں لوگ مسلمان اور عرب سمجھ کر مجھ سے دو باتیں پوچھتے تھے — (باقی آئندہ)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ہندوستان میں اُردو کا مستقبل

تھوڑی بہت مخالفت اور رکاوٹوں کے باوجود بہت روشن ہے

چارلس یونی ورسٹی چیکوسلوواکیہ (پراگ) میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تقریر

پراگ (چیکوسلوواکیہ) ۲۹ر اکتوبر ۱۹۹۱ء (ڈاک سے) ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد پروفیسر ایمریٹس جموں یونی ورسٹی اگلے دن اپنے لیکچروں کے سلسلے میں فرینکفرٹ (جرمنی) سے یہاں پہنچے۔ ایرپورٹ پر ان کے استقبال کے لیے پروفیسر یان ماریک فیکلٹی آف آرٹس (ڈیپارٹمنٹ آف نیئر ایسٹرن، الفریقن اینڈ انڈین اسٹڈیز) چارلس یونی ورسٹی پراگ اور منسٹری آف کلچر حکومت چیکوسلوواکیہ پراگ کی طرف سے ڈاکٹر مسز یارکا پلکووا موجود تھیں۔

پروفیسر آزاد نے چارلس یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اپنا پہلا لیکچر "ہندوستان میں اُردو کا مستقبل" کے موضوع پر دیا اور اعداد و شمار کی روشنی میں بتایا کہ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل بعض حلقوں کی طرف سے تھوڑی بہت مخالفت اور رکاوٹوں کے باوجود بہت روشن ہے۔ ترقی پسند طاقتوں کی مجموعی کاوشوں کی بدولت اُردو کا قافلہ روز بروز آگے بڑھ رہا ہے آپ نے اس سلسلے میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کی مستعد مساعی اور ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی کے کام کو خاص طور سے سراہا۔

[redacted]

پروفیسر آزاد کا دوسرا لیکچر جس کا عنوان تھا MODERN TRENEDS IN URDU LITERATURE اورینٹل انسٹی ٹیوٹ پراگ میں ہوا اور IQBAL HIS ART AND THOUGHT کے زیرِ عنوان تیسرا لیکچر چارلس یونیورسٹی کے DEPARTMENT OF NEAR EASTERN AFRICAN AND INDIAN STUDIES میں ہوا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد بڈھا پیسٹ (ہنگری) روانہ ہونے سے پہلے یونین آف رائٹرز چیکوسلو واکیہ کی دعوت پر یونین کے دفتر میں گئے اور یونین کے اراکین کے ساتھ کوئی ایک گھنٹے تک بات چیت میں مصروف رہے۔ بعض اراکین کے ساتھ پروفیسر آزاد کی بات چیت انٹرپریٹر کے ذریعے سے ہوئی کیونکہ چیکوسلواکیہ میں انگریزی کا چلن بہت کم ہے۔

پروفیسر آزاد نے اپنی بات چیت کے دوران میں کہا کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا بھر میں اور بالخصوص یورپ میں رابطے کی زبان کے طور پر فرانسیسی کا چلن کم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ انگریزی کا رواج بڑھ گیا ہے اس لیئے اگر آپ حضرات کی تخلیقات کے تراجم انگریزی میں ہو جائیں تو آپ اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے اہلِ قلم کے درمیان جن میں ہمارا برصغیر ہند و پاک بھی شامل ہے علمی اور ادبی دوری قربت میں بدل سکتی ہے۔

انگریزی کی حمایت اور مخالفت

ایک سوال کے جواب میں پروفیسر آزاد نے بتایا کہ انگریزی کی مخالفت ہندوستان کی دو ایک ریاستوں میں بعض لوگ کر رہے ہیں لیکن ان ریاستوں میں اور سارے ملک میں انگریزی کے حامیوں کی تعداد مخالفوں سے کہیں زیادہ ہے اور چونکہ ہماری ایک ریاست ناگالینڈ کی سرکاری زبان انگریزی ہے اس لیئے ہم لوگ انگریزی کے مخالف ہو ہی نہیں سکتے۔ پروفیسر آزاد نے کہا کہ ذاتی طور پر میں انگریزی کے حامیوں میں ہوں کیونکہ کشمیری سے

راس کماری اور گجرات سے نیفا اور ناگالینڈ تک عملی طور پر ہماری رابطے کی زبان انگریزی ہے۔

کمیونزم کی افادیت

ایک اور سوال کے جواب میں پروفیسر آزاد نے کہا کہ کمیونزم یو ایس ایس آر کے لیے اور آپ کے ملک کے لیے تو یقیناً کام نہیں دے سکتا کیونکہ یو ایس ایس آر، چیکوسلوواکیہ اور دوسرے مشرقی یورپی ممالک اب DEVELOPING COUNTRIES نہیں ہیں بلکہ DEVELOPED ممالک ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر ہند و پاک کے تمام ممالک ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، برما، سری لنکا اور نیپال اور بھوٹان کے دکھوں کا علاج کمیونزم ہے۔

ایک اہل قلم کے اس سوال کے جواب میں کہ ویسلا ہیول (CACLAU HAVEL) کے ڈرامے انگریزی میں چھپ چکے ہیں۔ کیا آپ ان کا اردو میں ترجمہ کرنا پسند کریں گے پروفیسر آزاد نے کہا کہ ویسلا ہیول کے بعض ڈرامے میں انگریزی میں پڑھ چکا ہوں اور یہ ڈرامے میں نے اُس وقت پڑھے تھے جب وہ قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ ہیول یقیناً صفِ اول کے ڈراما نگار ہیں۔ اُن کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ ہونا میں اردو کے حق میں نیک فال سمجھتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اِن دنوں بے حد مصروف ہوں لیکن آپ یہ ڈرامے مجھے بھجوا دیں تو مجھ سے بہتر کوئی نہ کوئی مترجم ان کا ترجمہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

یونین آف رائٹرز کے دفتر سے روانہ ہوتے وقت پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی انگریزی تصانیف اور اپنے کلام کے مطبوعہ فرانسیسی ترجمے کی ایک ایک جلد یونین آف رائٹرز کے صدر ڈاکٹر جنگمان (DR JUNGMAIN) کو پیش کی۔

٭٭٭٭

[redacted]

مصطفیٰ شروانی
۶۰۲-۶-۳ حمایت نگر
حیدرآباد ۲۹ (اے پی)

ہماری سماجی سرگرمیاں

نومبر ۱۹۹۱ء کے پہلے تین دہوں میں حیدرآباد میں سرگرمیوں کا میدان خاصا گرم رہا۔ ایوانِ اُردو پنجہ گٹہ میں یوم زورؔ سے ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج آف انڈیا میں ایلڈرس کاونسل آف انڈیا کی جانب سے جناب فضل الرحمن صاحب کو معمارِ اُردو ایوارڈ کی پیشکشی، مدینہ ایجوکیشن سنٹر میں بھارت ایکتا منچ اور مسلم ویلفیر سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ دیوالی ملاپ تقریب اور مدینہ ایجوکیشنل سنٹر میں آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن کی جانب سے منعقدہ جلسہ قومی یکجہتی، اس ملے جلے ماحول کی عکاسی کر رہے تھے جو حیدرآباد کی مخصوص روایت کا طرۂ امتیاز رہا ہیں۔

۱۰ نومبر ۹۱ء کو ایوانِ اُردو پنجہ گٹہ میں بصدارت عالیجناب ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اُردو حیدرآباد "یوم زورؔ" بیاد جناب سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم بانی ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا انعقاد ایک ایسے موضوع پر سمینار سے ہوا جو حیدرآباد کی گلدستہ نما تہذیب اور ایک طرح نمائندہ کلچر پہ دانشوروں کے اظہارِ خیال کا موقعہ فراہم کر سکا۔ اپنے افتتاحی خطاب میں جناب نواب ڈاکٹر پدم شری عابد علیخاں صاحب مدیر روزنامہ "سیاست" نے دکنی تہذیب کو تمام ہندوستانی تہذیبوں کا سرچشمہ قرار دیا۔ جلسہ سے خطاب کرنے والوں میں ڈاکٹر رحمت علی خاں ڈاکٹر رحیم الدین کمال، ڈاکٹر محمد افضل الدین، جناب نریندر لوتھر، ڈاکٹر مجید بیدار اور جناب احمد جلیس بھی شامل تھے جناب رمن راج سکینہ معتمد عمومی ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے ادارہ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر مجید بیدار نے فرمایا کہ مرہٹی زبان کے ادبی ذخیرہ پر دکنی تہذیب کے

نمایاں اثرات نظر آتے ہیں دراصل ادارۂ ادبیات اردو کو کسی آئندہ سمینار کے موقعہ پر جناب ڈاکٹر مجید بیدار کے اس اشارہ سے استفادہ کرتے ہوئے خالص دکنی تہذیب کے ہندوستان کے مختلف علاقوں پر، جو نما اثرات کا کا حقہ جائزہ لینا چاہیئے جس طرح نواب سر بلند جنگ بہادر مرزا سمیع اللہ بیگ حیدرآباد کے چیف جسٹس سے پھر الہ آباد کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور نواب صاحب نے ضرور الہ آباد یوپی پر حیدرآباد کی تہذیب کے نشان مرتب کیئے اسی طرح خود جناب سید محی الدین قادری زورؔ صاحب اپنی عمر کے آخری دور میں کشمیر یونیورسٹی سرینگر کے پروفیسر اردو مقرر ہوئے تھے جناب پروفیسر زورؔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ ہونے کے لحاظ سے کشمیر میں اس تہذیب کے نشان میں ثابت ہوئے ہوں گے جناب پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم پہلے میسور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے پھر کشمیر یونیورسٹی میں اواخر عمر میں پروفیسر مقرر ہوئے جناب خواجہ عبدالغفور مرحوم حیدرآباد کی تہذیب کا منفرد نمونہ تھے ادب کے بے لوث خدمت گذار تھے مرحوم بمبئی مہاراشٹرا میں اعلیٰ خدمات پر فائز رہے اور چیف سکریٹری مہاراشٹرا گورنمنٹ مقرر کیئے گئے موصوف نے حیدرآباد کے کلچر کے نشانات بمبئی میں ضرور پیش کیئے ہوں گے ایسے اکابرین کے متعلق ایک خصوصی سمینار افادیت کا باعث ہوگا جو حیدرآباد کی تہذیب کے آئینہ دار تھے اور جن کی عمر کا ایک حصہ حیدرآباد سے باہر دیگر صوبوں میں بسر ہوا۔

یوم زورؔ میں صرف ان اثرات کا تذکرہ ہوا جو دیگر صوبوں کی تہذیب کے حیدرآباد کی تہذیب پر نمایاں رہے۔

جناب طیب انصاری صاحب کنوینر کے شکریہ پر یوم زورؔ کا جلسہ اختتام پذیر ہوا

۱۲ر نومبر ۹۱ء کو ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج آف انڈیا سوماجی گوڑہ کے دربار ہال میں ایڈ کاونسل آف انڈیا کی جانب سے جناب فضل الرحمٰن صاحب سابق وائس چانسلر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی خدمت میں ایوارڈ کی پیش کشی کی تقریب کے موقعہ پر جناب جیلانی، سکریٹری جنرل کو وزیر اعظم عالیجناب پی وی نرسمہا راؤ کا اردو پیغام جناب جیلانی پیرا کے

[redacted]

نام سنایا گیا جو جناب نرسمہا راؤ نے جناب فضل الرحمن صاحب کو "معمار اردو ایوارڈ" پیش کرنے کے سلسلہ میں روانہ فرمایا اور اس تہنیتی پیغام میں لکھا تھا۔

"میں جناب فضل الرحمن صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں اور ایلڈرز کاونسل آف انڈیا کے کامیاب مستقبل کے لیئے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

دستخط - پی وی نرسمہا راؤ"

جناب پی وی نرسمہا راؤ کے پیغام کے بعد جناب پروفیسر ٹی نوینت راؤ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے جناب پروفیسر نسیم فاروقی وائس چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا تعارف کرواتے ہوئے حاضرین کو انصاری صاحب کی کمپیوٹر ٹکنالوجی میں مہارت سے روشناس کروایا اور فرمایا کہ جہاں بھی عصری کمپیوٹر ٹکنالوجی کا کسی نہ کسی صورت میں احیاء ہوا ہے وہ پروفیسر نسیم فاروقی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ رہین منت ہے اپنی تقریر میں جناب پروفیسر نسیم فاروقی نے حیدرآباد کی تہذیب کو دلاویز اور جاذب توجہ بتایا اور کہا کہ موصوف کی ابتدائی تعلیم سے ملازمت تک کھڑکپور (بنگال) کے IIT میں گذری پھر وہاں سے ملازمت کے سلسلہ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کی وجہ سے بنگالی زبان اور تہذیب سے عرصہ تک ہم کنار رہے۔ جب بھی حیدرآباد تشریف لائے یہاں کی زبان اور یہاں کی سماجی سرگرمیوں میں ایک طرح کی اپنائیت محسوس کی۔ اس جلسہ کی صدارت جناب ڈاکٹر سی نرائن ریڈی مشہور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی نے فرمائی اور اپنی صدارتی تقریر میں اُردو کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی کا تذکرہ فرماتے ہوئے "دستخط" کے انوکھے قافیہ پر اپنی ایک تازہ اُردو غزل اپنے منفرد دلفریب انداز میں پیش فرماکر سامعین سے بھرپور داد حاصل کی۔ جناب پروفیسر نسیم فاروقی وائس چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے "معمار اُردو ایوارڈ" جناب فضل الرحمن صاحب سابق پرو وائس چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ایوارڈ ایک وائس چانسلر، ایک سابق پرو وائس چانسلر کی خدمت میں پیش نہیں کررہا ہوں بلکہ ایک منفرد ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار اور ماہر تعلیمات کی خدمت میں پیش کرنے

کی بھی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اپنے شکریہ میں ڈاکٹر وینکٹ راؤ چیرمین اے پی کالج سروس کمیشن اور رکن ایلڈر کاونسل آف انڈیا نے جناب فضل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کی اور فرمایا کہ ایلڈر کاونسل آف انڈیا کے اجزاء ترکیبی میں جناب شیخ سعد حسین سجاد منسٹر بیٹر آندھرا پردیش وقف بورڈ اور مصطفےٰ شروانی صاحب جیسے بے لوث اراکین شامل ہیں۔ جناب فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے مختصر خطاب میں اس ایوارڈ پر ایلڈر کاونسل آف انڈیا کا شکریہ ادا کیا۔

- اولڈ بوائیز اسوسی ایشن علیگڈھ مسلم یونیورسٹی شاخ آندھرا پردیش کی جانب سے ۱۳ نومبر ۹۱ء کو علیگڈھ کلب، ہل فورٹ روڈ پر جناب پروفیسر نسیم فاروقی صاحب وائس چانسلر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی خیر مقدمی تقریب کا انعقاد ہوا۔ پروفیسر فاروقی اسی شام دہلی تشریف لے جا رہے تھے اس لیے بہت مختصر تقریر میں جناب وائس چانسلر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی نے جدید سائینسی شعبوں کے قیام کی تجاویز یو جی سی اور مرکزی محکمہ تعلیم کے زیر غور ہونے کا تذکرہ فرمایا اپنی تعارفی تقریر میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز اسوسی ایشن کے نائب صدر۔ جناب شاہد حسین نے محترم پروفیسر نسیم فاروقی کے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز رہنا یونیورسٹی کے لیئے فالِ نیک بتایا۔ جناب مصطفےٰ کمال الدین حسینی سکریٹری علیگڈھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز اسوسی ایشن کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔
- ۱۴ نومبر ۱۹۹۱ء کو مدینہ ایجوکیشن سنٹر روبرو باغ عامہ میں " بھارت ایکتا منچ اور مسلم ویلفیر سوسائٹی" کی جانب سے "دیوالی ملاپ" کی تقریب کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب جسٹس گوپال راؤ اکبوٹے سابق چیف جسٹس آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے فرمائی اور جس میں حیدرآباد کے کمشنر آف پولیس عالیجناب ایم۔ وی بھاسکر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ جناب خیر الدین احمد صدیقی صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر میں فرمایا کہ موصوف کے والد جناب ظہیر الدین احمد کے دور اور حالیہ دور میں جو تفاوت ہے وہ ماحول کے بدلتے ہوئے رجحانات کی بدولت ہے اور یہ ہم سب کے لیئے لمحۂ فکر ہے کہ ہم موجودہ ماحول کو ایک ترقی

پذیر ملک کے لئے کس طرح افادی شکل دے سکتے ہیں۔ جناب محمود بن محمد سابق ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی بی آئی نئی دہلی اور سابق سفیر ہند برائے سعودی عرب نے اپنی تقریر میں ایک بہتر پُرامن ماحول کے قیام کی اہمیت پر زور دیا۔ جناب منوہر سل سکسینہ، ایڈوکیٹ نے فرمایا کہ حیدرآباد کی ۴۰۰ سالہ تقاریب بے معنی ہوکر رہ جائیں گی اگر شہر میں امن و امان کا فقدان رہے ہم لوگ اب بھی ہراساں اور خوفزدہ ہیں ایسی حالت میں ۴۰۰ سالہ جشن بے معنی اور بے کیف ہوگا جب تک عام امن و امان کا ماحول پیدا نہ کیا جائے اس سلسلہ میں یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ جو بھی روپیہ اس جشن کے سلسلہ میں صرف کیا جانے والا ہے اس میں سے بقدر نصف کم سے کم پرانے شہر کے عوام میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے میں خرچ کیا جائے۔

ڈاکٹر احمد اللہ خان صاحب نے دستوری اور قانونی اعتبار سے ایکتا اور یکجہتی کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

عالیجناب ایم وی بھاسکر راؤ صاحب کمشنر پولیس نے اپنی بیحد متاثر کرنے والی تقریر میں کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ گذشتہ ۴۰۰ سال میں سے تقریباً ۳۵۰ سال حیدرآباد کے قطب شاہی اور آصف جاہی دور میں مکمل امن و امان اور ایکتا اور یکجہتی کا ماحول قائم رہا اور پچھلی نصف صدی میں اچانک جیسے وہ امن و امان کا ماحول درہم برہم ہوگیا اس کی ذمہ داری ایک طرح ان سیاسی جماعتوں پر عائد ہو سکتی ہے جو اس دیرینہ امن و امان کے استحصال کا سبب بنی ہیں۔ جلسہ کی کارروائی جناب نواب افضل خان صاحب صدر بھارت ایکتا منچ نے خوش اسلوبی کے ساتھ چلائی۔ جناب خلیل الدین قادری نے بحیثیت معتمد جلسہ روحانی ملاپ کے کامیاب انعقاد کا اہتمام فرمایا۔

• ۱۵؍ نومبر ۱۹۹۱ء کو حیدرآباد کے پریس کلب میں عالیجناب پرنس میر نجف علی خان، قائم مقام صدر نشین انڈین لٹریچر اینڈ آرٹس کاونسل کی جانب سے ایک دلکش محفل موسیقی بعنوان "غزل در غزل" منعقد ہوئی اس عنوان کی ندرت میں اردو زبان کے شہنشاہانِ سخن کے

شاداب حیدرآباد

تخیل کا نچوڑ ہے سودا نے کہا تھا

سودا تو اس زمین میں غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرح

جناب محمد بن محمود نے موسیقی کے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔ جناب ڈاکٹر سی نارائن ریڈیا مہمان خصوصی تھے جناب نریندر لوتھر نے مومنٹو تقسیم فرمائے۔ صاحبزادی ثنا ناز صاحبہ نے اپنی مترنم آواز میں ایک متاثر کرنے والی غزل سے اس رنگین محفل کا آغاز فرمایا جسے جناب سید عدنان سلیم صاحب نے ساز پر سنایا اور پرنس میر نقی علی خان ثاقب کا کلام بھی جناب سلیم صاحب نے ساز پر پیش کیا۔ محترمہ سپریا پال صاحبہ اور محترمہ دیوی رمنا مورتی نے پرنس نقی علی خاں ثاقب کا کلام ساز پر پیش کیا ساتھ ہی جناب ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی اردو نظموں کو بھی ساز پر پیش کیا گیا۔ ہارمونیم پر منظور حسین خان صاحب نے، طبلہ پر محمود حسین خان صاحب نے، سارنگی پر سعید الرحمٰن صاحب نے اور ستار پر جناب مجتبیٰ علی خان صاحب نے سنگت دی۔ اس بزم موسیقی کی نظامت کے فرائض جناب اسلم فرشوری نے بحسن وخوبی سرانجام دیئے

- آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن کی جانب سے بموقعہ سالگرہ تقاریب آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی سابق وزیر اعظم قومی یکجہتی کے نام سے ۲۰ نومبر ۱۹۹۱ء منعقدہ جلسہ مدینہ ایجوکیشن سنٹر روبرو باغ عامہ حیدرآباد منعقد ہوا۔ جناب مسٹر پربھاکر ساؤتھ انڈیا چرچ کے صدر، جناب ایم اے احمد ڈائرکٹر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ جناب نانک سنگھ نشتر جناب امجد اللہ صدیقی سابق سشن جج اور پروفیسر بشیر الدین صدر شعبہ جرنلزم عثمانیہ یونیورسٹی و سابق سفیر ہندبرائے قطر نے اپنی تقاریر میں قومی یکجہتی کے مسائل کی وضاحت فرمائی۔ جناب پروفیسر بشیر الدین نے ہندوستانی میں اقلیتوں میں خود اعتمادی کے جذبہ کی ضرورت پر زور دیا اور دلچسپ تاریخی مثال اس طرح پیش فرمائی کہ جب پروفیسر بشیر الدین پونہ میں تھے ان کے اسٹاف میں تین افراد ایک "بانیدار" خاندان سے تھے ان میں سے ایک احمد بانیدار دوسرے محمد بانیدار اور تیسرے محمود بانیدار تھے جب اس خاندانی نام کی وضاحت دریافت

[redacted]

کی تو ان لوگوں نے بتایا کہ وہ شیوا جی کے انگ رکھشک BODY GUARDS کے خاندان سے ہیں اور یہ کہ ان کے آبا ر شیوا جی نے کلام پاک کی قسم دلائی تھی کہ وہ شیوا جی کی حفاظت کریں گے اور اسے یقین تھا کہ مسلمان قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے تو اس قسم کی پابندی میں کوئی کسر نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ اپنے ہم مذہب کے مقابلہ میں اس نے مسلمانوں کو اپنی جان کا محافظ بنایا تھا۔

اپنی صدارتی تقریر میں جناب ڈاکٹر حسن الدین احمد صدر آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن نے مقررین کا شکریہ ادا کیا۔ جناب ڈاکٹر عبدالقادر عمادی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۹ سے آگے)

ملاقات میں ہی کھل گیا یہ ان کی بزلہ سنجی کی دلیل ہے راج بہادر گوڑ کا مزاج دلوں کو چھونے والا ہے انھوں نے اپنی معصومیت کو بڑی احتیاط سے محفوظ کیا ہے گوڑ صاحب کی شخصیت تہہ دار بھی ہے اور پہلو دار بھی۔ ان کی گفتگو بہت صاف اور دل کش ہے اور شخصیت دل پذیر ہے ان کے ادبی تناظر کے مضامین بہت اہم ہیں انھوں نے مختلف شخصیات پر قلم بند کر کے اپنی وسیع النظری اور غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے راج بہادر گوڑ اپنی سادہ لوحی میں مولانا حسرت موہانی کے قریب تر ہیں دلی اردو اکاڈمی نے ان کو قومی انعام دے کر ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور ترغیب دی ہے کہ وہ اردو کے مسائل اور اسکے دستوری حقوق کے حصول میں اور زیادہ محنت لگن اور خلوص سے کام لیں۔ میں راج بہادر گوڑ کو دل مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۲۹۔ جولائی ۶۹۱ کے طوفانِ بادو باراں نے موہاڑ ضلع ناگپور میں وردھا ندی کا بند توڑ کر ایسی تباہی مچائی کہ وزیر اعظم نے خود آکر عوام کی ڈھارس بندھائی ناگپور میں ڈاکٹر منشار کے کمپونڈ کے ایسے بڑے دو پیڑ گرے کہ سامنے کی سڑک پر تین دن ٹریفک بند رہی۔ اسی سے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے گئے۔

غزل

کوچہ کوچہ دردِ فغاں لے گئی ہوا ! : جلتے گھروں سے اُٹھتا دھواں لے گئی ہوا
کیا کہیئے کیسے کیسے تنا ور درخت تھے : جن کا غرورِ تابِ تواں لے گئی ہوا
اپنی بلندیوں پہ جنھیں ناز تھا بہت : وہ پختہ چھت کہاں سے کہاں لے گئی ہوا
موسم کی سوزناکی سے بچنے کے واسطے : سر پر ردائے ابرِ رواں لے گئی ہوا
اک دو کی بات ہوتی تو کچھ بات ہی نہ تھی : سب نامیوں کے نام و نشاں لے گئی ہوا
تھیں جن کے دم سے صحنِ گلستاں کی رونقیں : ان پتیوں کو جانے کہاں لے گئی ہوا
تنکوں ہی پر دکھائی ہے یہ اپنا سارا زور : کب راستوں کے سنگِ گراں لے گئی ہوا

منشار چلی ہیں اب وہ پُر ہوں آندھیاں
کچے گھروندوں جیسے مکاں لے گئی ہوا

●

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء
۱۱، اسٹارکی ٹاؤن۔ ناگپور

مومن خاں شوقؔ

اشرف ولا ۔ ۲۳/۷ ۔ ۳ ۔ ۱۱

ملے پلی ۔ حیدر آباد

ہماری ادبی سرگرمیاں

یکم نومبر ۱۹۹۱ء ۔ آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام اُردو کمپوزنگ سنٹر، مہدی پٹنم میں
م تاسیس کے موقع پر محفلِ غزل اور محفلِ مشاعرہ منعقد کی گئی جس کی صدارت جناب محمد جلیل باشاہ
صدر اکیڈیمی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے وزیر بھاری صنعتیں مسٹر پی رام چندرا ریڈی
، وزیر تعلیم ڈاکٹر پی وی رنگا راؤ، وزیر خزانہ مسٹر سنتوش ریڈی، ٹھاکر ہردے ناتھ سنگھ
صدر نشین شریک تھے وزیر بھاری مصنوعات، وزیر تعلیم اور صدر اکیڈیمی کے خطاب کے بعد
زیر صنعت نے مسٹر ظہیر الدین بابر کے مجموعۂ کلام کی رسم اجرا انجام دی۔ بعد ازاں وزرا و صاحبان
موجودگی میں شامِ غزل شروع ہوئی۔ استاد حبیب علوی نے ناصر کاظمی کی غزل سُنا کر بے حد
داد حاصل کی۔ اس کے بعد محفلِ شعر کا آغاز ہوا۔ مشاعرہ کی نظامت کے فرائض جناب حسن فرخ نے
ی خوبی سے ادا کیئے۔ ۳۲ شعراء کے بشمول مسرز علی احمد جلیل، خواجہ شوقؔ، نذیر علی عدیل
ی قادری، کنول پرشاد کنولؔ، صلاح الدین نیرؔ، رحمن جامیؔ، علی الدین نویدؔ، اکمل حیدر آبادی
ن فرخ، فیض الحسن خیال، رضا وصفی، صادق نقوی، وقار خلیل، صادق نوید، ڈاکٹر بانو طاہرہ
، نایاب سلطانہ، جمیلہ نشاط، عزیز بھارتیؔ، مومن خان شوقؔ، ڈاکٹر منیر الزماں منیرؔ
ست علی تاجؔ، منظور احمد منظورؔ، منان منظور، رؤف خیر، قدسیہ انصاری، خواجہ ضمیر
س الہ آبادی، مظہر مہدی، محمد شجاعت علی شجیع، شوکت علی صوفی نے کلام سنایا۔ اور
سین پائی۔ محفلِ غزل میں حبیب علوی، رکن الدین، خان اطہر، سید یحییٰ اور سبیکا رومی نے سماں

باندھ دیا۔ جناب حسن فرخ پلیار او آردو اکیڈیمی کے شکریہ پر اس محفل کا اختتام رات دیر گئے عمل میں آیا۔

● ۶ر نومبر۔ ۶-۳۰ ساعت شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر طیب انصاری صدر شعبۂ اُردو آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب قدیر امتیاز پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج بیدر نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں جناب راشد آذر نے ۸ رباعیات، ایک نظم اور ایک غزل پیش کی اور جناب وسیم عباس نے عمرِ گذشتہ کی کتاب کے زیرِ عنوان افسانہ سنایا۔ صدرِ اجلاس ڈاکٹر طیب انصاری، مہمانِ خصوصی جناب قدیر امتیاز کے علاوہ ان دونوں قلم کاروں کی تخلیقات پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں مسرز سری نواس لاہوتی، عاتق شاہ، رئیس اختر، صلاح الدین نیّر، عباس زیدی (لندن) ذکی شاداب، محمود حامد، نجمہ نکہت اور قمر جمالی شامل تھے۔ مبصرین کے اظہارِ خیال کے بعض نکات پر مسرز راشد آذر اور وسیم عباس نے اپنی تخلیقات کے خدوخال کے بارے میں وضاحتیں پیش کیں ڈاکٹر طیب انصاری نے کہا کہ راشد آذر حیدرآباد کے شاعروں میں اپنی بہترین صلاحیتوں کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں انھیں اپنے فن پر دسترس حاصل ہے۔ جناب قدیر امتیاز نے ترقی پسند تحریک اور اس کے ادب کے بارے میں کہا کہ ترقی پسند ادب نے ہمارے ادب کو جو کچھ دیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ جناب صلاح الدین نیّر نے اجلاس کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

● ۷ر نومبر کی رات اُردو گھر مغل پورہ میں جشنِ یوم تاسیس آندھرا پردیش پر ایک ادبی اجلاس اور مشاعرہ زیرِ صدارت جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ "منصف" منعقد ہوا۔ مسرز جلیل پاشاہ صدر اُردو اکیڈیمی، منوہر راج سکسینہ، کے ایم خان اور خواجہ بہاؤ الدین نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ اس تقریب میں تمام مقررین نے محکمہ کی جانب سے اس جشن اور تقریب کے انعقاد

میں گرانقدر تعاون پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور مسٹر مرلی کرشنا (آئی اے ایس) کمشنر اطلاعات و تعلقات عامہ کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرہ کی نظامت جناب عثمان علی احسان نے کی۔ اس مشاعرہ میں مسرز علی احمد جلیلی، خواجہ شوق، رحمن جامی، داؤد نصیب، حسن فرخ، مومن خاں شوق، ابوالفاروق شعور، عیاث متین، نذیر نیر، وقار خلیل، خداداد گوہر ثاقب بنارسی، رؤف رحیم، ڈاکٹر شمع پروین اور عثمان علی احسان نے کلام سنایا اور داد تحسین حاصل کی۔

● ۸ نومبر۔ اُردو مجلس کا ادبی اجلاس اُردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے کی۔ معتمدی کے فرائض جناب قدیر انصاری نے انجام دئیے۔ محترمہ فریدہ زین نے متاثر کن لہجہ میں اپنا خوبصورت افسانہ "کوہکن" سُنایا۔ جناب سید عباس متقی نے اپنا طنز و مزاح سے بھر پور مضمون "کچرا" پیش کیا۔ مباحث میں ریاست علی تاج، نعیم زبیری، عباس متقی اور قمر جمالی نے حصہ لیا۔ صدر محفل ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے کہا کہ اُردو مجلس میں جو ادبی اجتماع دیکھنے میں آتے وہ ایک ہی خاندان کے افراد کے اجتماع معلوم ہوتے تھے، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں کی ہمت افزائی حکومت کا فرض ہے اُردو مجلس ہمارے بزرگوں کی مقدس یادگار ہے مگر اب اُردو پڑھنے والے تقسیم ہو گئے ہیں صدر محفل نے افسانہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فریدہ زین کا مقام بہت اونچا ہے یہ جو کچھ لکھتیں ہیں بہت ہی متاثر کن لکھتی ہیں اور جناب عباس متقی کے مضمون کے بارے میں کہا کہ زبان اور واقعات میں کرب اور نشتر ملتے ہیں اور بہت خوبصورت انداز میں سماج کی تصویر دکھائی ہے آخر میں معتمد اُردو مجلس جناب قدیر انصاری نے شکریہ ادا کیا۔

● ۹ نومبر۔ ۱۱ بجے دن محفل خواتین کا ماہانہ اجلاس بہ صدارت محترمہ زینت یوسف زئی صاحبہ منعقد ہوا۔ اُردو کی پہلی بے باک اور باغی خاتون افسانہ نگار محترمہ عصمت چغتائی مرحومہ کے انتقال پر قرار داد تعزیت پیش کی گئی اس کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا

مت نسیم سحر نے افسانہ "بہار بہکے لوٹنے تک" محترمہ افروز سعیدہ نے افسانہ "وحشتِ دل" اور ڈاکٹر عطیہ سعید صاحبہ نے افسانہ "سبز قدم" سنا کر خوب داد پائی۔ محترمہ آر بانو صاحبہ نے علامہ اقبال کے فلسفہ "خودی پر ایک سرسری نظر" کے عنوان سے نہایت پُر مغز اور دلچسپ مقالہ پیش کیا۔ محترمہ فاطمہ تاج صاحبہ نے مزاحیہ مضمون "خزانہ میری تلاش میں ہے" سنا کر محفل کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ محفلِ شعر میں مظفر النساء ناز، سعیدہ مہر، فاطمہ تاج اور نایاب سلطانہ نے کلام سنایا۔

● ۹ نومبر ۷ بجے شام بمکان محمد قمر الدین صابری، مدیر "شاداب" مرکزِ ادب حیدرآباد کا ماہانہ طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب عزیز بھارتی (صدر ادارہ) نے کی قاضی انجم عارفی اور جناب کلیم قریشی نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ابتداء میں جناب قمر الدین صابری نے مہمانوں اور شعراء کا استقبال کیا۔ مومن خان شوق نے مشاعرہ کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اس طرحی مشاعرہ میں صدرِ مشاعرہ جناب عزیز بھارتی، منظور احمد منظور، مہمانانِ خصوصی قاضی انجم عارفی اور جناب کلیم قریشی کے علاوہ مسرز صلاح الدین نیر، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، قمر صابری، مومن خان شوق، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، قاضی جامی صدیقی، محمود شریف محمود، منان منظور، ابوالفاروق شعور، ڈاکٹر سید حسن، فاروق انجم اور ساسط حیدرآبادی نے اپنا طرحی کلام سنایا اور داد تحسین پائی۔ اس خوشگوار محفل کا اختتام محمود شریف محمود کے شکریہ پر ہوا۔

● ۹ نومبر۔ رات اُردو گھر مغلپورہ میں آندھرا پردیش بھارتیہ کلچرل اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام دیپاولی ملاپ تقریب منعقد ہوئی۔ جسٹس امجد اللہ صدیقی نے صدارت کی۔ ممتاز قانون داں جناب منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ صدر نشین سرکاری زبان کمیشن، جناب عبدالباری ایڈوکیٹ جناب انور ادیب، ایڈیٹر کرنٹ نیوز سرویس اور محترمہ خورشید انور نے حصہ لیا۔ مسٹر قیوم انور نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔ بعد ازاں مشاعرہ زیرِ صدارت مسٹر ایم موہن راؤ ڈپٹی منیجر منتخب آر ٹی سی گولکنڈہ زون منعقد ہوا۔ جناب انور ہاشمی نے مشاعرے کے فرائض انجام دیئے

● ۱۰ر نومبر ۳۰۔ ۱۰ بجے دن بانی ادارۂ ادبیاتِ اردو ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی یاد میں بہ سلسلہ یوم زورؔ کا ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان صمدانی انجمن ترقی اُردو نے صدارت کی۔ جناب عابد علی خان ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ دکنی تہذیب کی بنیادیں گہری اور اٹوٹ رہی ہیں۔ جسے ہم حیدرآبادی تہذیب کا نام دیتے ہیں ہمیں اس قدیم تہذیب پر ناز ہے اس ادبی اجلاس کو مخاطب کرنے والوں میں ڈاکٹر افضل الدین اقبال، جناب نریندر لوتھر، ڈاکٹر مجید بیدار اور جناب احمد جلیس قابلِ ذکر ہیں۔ ابتدا میں جناب رحمن راج سکینہ معتمد عمومی ادارہ ادبیاتِ اُردو نے ادارہ کی سرگرمیوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بانیٔ ادارۂ ڈاکٹر زورؔ کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا اور کہا کہ ڈاکٹر زورؔ کو دکنی تہذیب اور حیدرآبادی روایات بے حد عزیز تھیں اور آج کا یہ اجلاس اسی رفاقت کا تسلسل ہے۔

● ۱۰ ر نومبر ۹ ؁ رات اردو گھر مغلپورہ میں انڈو عرب اسلامک یوتھ اسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام "ہند سعودی دوستی" تقاریب کے سلسلے میں مشاعرہ منعقد کیا گیا اس موقع پر جناب عزیز سیٹھ وزیر ٹرانسپورٹ کرناٹک نے سعودی حکومت سے خواہش کی کہ وہاں روزگار کے مزید مواقع فراہم ہوں تو وہ ہندوستانیوں کو ترجیح دیں مسٹر کے۔ ایم خان صدر نشین انڈو عرب اسلامک یوتھ اسوسی ایشن نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ دونوں ممالک کے روایتی تعلقات ہمیشہ سے اچھے رہے ہیں اور آج بھی ہمارے وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ ان روایات کی تقلید کر رہے ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے انڈو عرب اسلامک یوتھ اسوسی ایشن کی ستائش کی اور کہا کہ حیدرآباد پیار و محبت کا شہر ہے آج کا مشاعرہ اسی کی ایک مثال ہے مشاعرہ کے آغاز میں سفیر سعودی عرب برائے ہند مسٹر فواد صادق مفتی کی تحریر کردہ عربی کی نظم کا اُردو ترجمہ مسٹر علی الدین نوید نے پڑھا۔ منتخب شعرا سعید شہیدی، علی احمد جلیلی خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، فیض الحسن خیال، قاسم امام دبئی، عزیز بھارتی

مومن خان شوق، منان منظور، علی الدین نوید، منظور احمد منظور، منیر الزماں نیر ڈاکٹر شمع پروین، عزیز النساء صبا، نایاب سلطانہ، محسن کمال (مہمان شاعر) نے منتخب کلام سنایا اور داد تحسین حاصل کی جناب صلاح الدین نیر معتمد مشاعرہ نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔ رات دیر گئے مشاعرہ اختتام کو پہونچا۔

● ۱۱ر نومبر ۱۰ بجے شب مولانا ابوالکلام آزاد کالج اے سی گارڈس کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرہ کی صدارت جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے کی مشاعرہ سے قبل جناب عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ یہ اسکول ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے اور جو اب جونیئر کالج بن گیا ہے اس لیئے یہ ترقی قابل ستائش ہے۔ ابتداء میں جناب عبدالستار رکن انتظامیہ کالج ہذا نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کو خراج پیش کیا۔ پرنسپل کالج جناب جاوید صاحب نے مہمانوں کی گلپوشی کی جناب صلاح الدین نیر نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ اس مثالی مشاعرہ میں حیدرآباد کے نمائندہ شعراء مسرز سید شہیدی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، راشد آذر، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، فیض الحسن خیال، علی الدین نوید، قاضی انجم عارفی، منظور احمد منظور، عزیز بھارتی، نیہال سنگھ ورما، ریاست علی تاج، صادق نوید، منان منظور ڈاکٹر منیر الزماں نیر، مومن خان شوق، ظہیر ناصری، فاروق عارفی، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، نایاب سلطانہ، مظفر النساء ناز اور ڈاکٹر شمع پروین نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ کالج کے سکریٹری جناب عبداللہ بن المماس نے انتظامات کی نگرانی کی۔

● ۱۲ر نومبر کی شام ایلڈرس کونسل آف انڈیا کی جانب سے سابق پرو وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی مسٹر فضل الرحمن کو "معمار اردو ایوارڈ" کی پیش کشی کی تقریب ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج آف انڈیا میں منعقد کی گئی۔ جس کی صدارت وائس چا

تلگو یونیورسٹی ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے کی۔ پروفیسر ٹی نوتیت راؤ اور پروفیسر نسیم فاروقی مہمان خصوصی تھے۔ وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی جناب نسیم فاروقی نے جناب فضل الرحمٰن کو ایوارڈ پیش کیا اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے حیدرآباد کی قدیم تہذیبی روایات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ سارے ہندوستان میں حیدرآبادی تہذیب کے چرچے ہیں اور یہ وہ تہذیب ہے جو پچھلے ۴۰۰ برسوں میں مختلف زبانوں سے مل کر جنم لی ہے۔ پروفیسر فاروقی نے مسٹر فضل الرحمٰن کی خدمات کو بھی سراہا۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے کہا کہ "اردو ایک عظیم زبان ہے" اور اس زبان میں ایسی طاقت ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے میں سمو لیتی ہے اس موقع پر انہوں نے تلگو رباعی اور ایک اردو غزل بھی سنائی۔ پروفیسر ٹی نوتیت راؤ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے جناب فضل الرحمٰن کا تعارف کرایا اس موقع پر وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ اور دیگر حضرات کے پیامات سنائے گئے قبل ازیں مسٹر جیلانی پیرا کی سکریٹری جنرل کونسل نے خیر مقدم کیا اور کارروائی چلائی ڈاکٹر وینکٹ راؤ صدر نشین اے پی کالج سروس کمیشن نے شکریہ ادا کیا۔

۱۷ر نومبر ۶-۳۰ بجے شام موہن دیپالی سٹی سنٹرل لائبریری (اشوک نگر) حیدرآباد میں ہوئی قومی ہفتہ لائبریری تقاریب کے سلسلے میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب خلیل الرحمٰن (ایم پی) تھے مہمانان خصوصی سید حسین سعد (آئی اے ایس) اور جناب امیر احمد خسرو تھے ابتداء میں چیرمن سٹی سنٹرل لائبریری مسٹر آڈی سری نواس اور صدر محفل جناب خلیل الرحمٰن صاحب نے مختصر مگر پر مغز تقریریں کیں۔ جناب صلاح الدین نیر نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی اس مشاعرہ میں ممتاز شعراء مسرز سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو، سید حسین سعد صلاح الدین نیر، رحمٰن جامی، منظور احمد منظور، عزیز بھارتی، صادق نوید، مناظر عثمانی مومن

شاداب، حمد آبادی، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید اور نایاب سلطانہ خان مشوق، قاضی انجم عارفی، اپنا بہترین و منتخب کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ اس موقع پر تمام شاعروں کا سنمان کیا گیا۔

۸ ار نومبر ۔ رات ۸ بجے حضرت مرزا سردار بیگ رح کی عرس شریف تقاریب میں سماع خانہ درگاہ رح نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس کی نگرانی جناب سعید شہیدی نے کی۔ سجادہ نشین جناب غلام محمد میر لیٰسین علی نے دعا کی۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد مشاعرہ تھے۔ مشاعرہ میں نگران مشاعرہ جناب سعید شہیدی کے علاوہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، راز عابدی، حمید رونق، صلاح الدین نیر، رحمٰن جامی، فیض الحسن خیال، منظور احمد منظور، قاضی انجم عارفی، صادق نوید، عزیز بھارتی، حسن فرخ، جوہر ہاشمی، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، منان منظور، سوز عابدی، قمر الدین صابری، حبیب گوندیادی، ڈاکٹر راہی، ضیاء عرفان، بے ہوش محبوب نگری، ندیر انصاری، فاروق عاملی، محمود شریف محمود، سلطان چشتی، جبر جبرلوی، عبدالصمد نزاکی شاہین نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔

۲۰ ار نومبر ۔ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر حبیب ضیاء کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداء میں جناب راشد آذر معتمد ادارہ نے تعارفی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری انجمن کے اجلاس ہمیشہ مقررہ وقت شروع ہوتے ہیں جس کی وجہ سے شرکائے محفل کو انتظار کی اذیت سے بچ جاتے ہیں انسانی زندگی میں ڈسپلن کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ جناب اکمل حیدر نے اپنا منتخب کلام تبصرہ و تنقید کے لئے پیش کیا۔ رشید الدین، ریاست علی تاج اور تجمّل نے مباحث میں حصہ لیا۔

۳۰ ار نومبر کی شام اقلیتی کمیشن حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے "قومی یکجہتی ہفتہ" کے سلسلہ میں مدینہ ایجوکیشنل سنٹر روبرو پبلک گارڈن نامپلی مشاعرہ منعقد ہوا جس

صدارت جناب ولی قادری انجینیر نے کی۔ صدرنشین اقلیتی کمیشن ڈاکٹر حسن الدین احمد کی زیرنگرانی یہ محفل آراستہ کی گئی تھی جو شہ نشین پر موجود تھے حیدرآباد کے منتخب شعراء مسرز سعید شہیدی، ڈاکٹر علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر رحمٰن جامی، منظور احمد منظور، عزیز بھارتی، حسن فرخ، منان منظور، ڈاکٹر منیر الزماں منیر محترمہ عزیز النساء صبا اور صدر مشاعرہ جناب ولی قادری نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔

۲۱ نومبر ۔ گیت چاندنی کا ۲۹ واں ماہانہ ادبی اجلاس بھارت گن وردھک سنستھا کی جانب سے شاہ علی بنڈہ میں قومی ایکتا مشاعرہ و کوی سمیلن منعقد کیا گیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ نے صدارت کی۔ شری نہپال سنگھ ورما نے معتمدی کے فرائض انجام دئیے شری قمر الاسلام مجاہد آزادی، شری پربھو دیال، کیشپ پرواسی (گیت کار ہریانہ) شریمتی کرشنا چیرمین گیتا (ہندی، انگریزی، بنگالی کی شاعرہ) مہمان خصوصی تھے مشاعرے سے قبل جناب صلاح الدین نیر کے کلام پر گلبرگہ یونیورسٹی سے ایم فل کا مقالہ لکھے جانے پر جناب صلاح الدین نیر کی گیت چاندنی، بھارت گن وردھک سنستھا اور دکھشن بھارتی ساہتیہ پرکاش سمیتی کی جانب سے گل پوشی کی گئی اور ہندی شعراء کی جانب سے تہنیت پیش کی گئی۔ صدر محفل اور مہمان خصوصی کی سیر حاصل تقاریر کے بعد ۲۲ شعراء مسرز ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر نہپال سنگھ ورما، پروفیسر پربھو دیال، کیشپ پرواسی، نریندر راشے، منان منظور، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، وید پرکاش لاہوٹی ساون، ثاقب بنارسی، شریمتی لشپا ورما، شریمتی ریکھا اگروال، ڈاکٹر ایلیا مصرا، کماری لتا، بھگوان داس جو پٹ، کابراس کا شنکر، سدرشن کھنہ، پنکج ورما، بجرنگ لعل ورما، اسمٰعیل ذبیح، رؤف الدین شاکر، ڈاکٹر منوہر پرشاد گپتا نے کلام سنایا۔ شری کابراس کا شنکر کے شکریہ پر اختتام ہوا۔

۲۴ دسمبر ۔ ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد کا طرحی ماہانہ مشاعرہ چھتہ بازار میں بصدارت حضرت راحت عزمی منعقد ہوا۔ تلاوت و ترجمانی قرآن کے بعد جناب عابد قادری اور

ابو الفاروق شعور معتمد مشاعرہ کے طرحی نعتیہ کلام سے مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ حضرت راحت عزمی (صدر مشاعرہ) ابوالفاروق شعور (معتمد مشاعرہ) کے علاوہ مسرس روحی قادری، سید نظیر علی عدیل، ابراہیم علی عالی، محمد حسین نقیب، خواجہ ضمیر، مسعود جاوید ہاشمی، محمود شریف محمود، طاہر گلشن آبادی، الطاف صمدانی، روف رحیم، اسمٰعیل ظریف، اقبال ہاشمی ثاقب بنارسی، باسط نقوی، قوی سیف، محبوب منصور، سوز عابدی، سرفراز سحر، بے حس الہ آبادی، سرور عابدی، قمر رضا، مظہر محی الدین مظہر، باسط حیدرآبادی اور عزیز ناگپوری نے طرحی کلام سنایا۔ ڈاکٹر غیاث عارف اور زاہد قادری کا مرسلہ کلام بھی سنایا گیا۔ صدر مشاعرہ کو خلافت و ملوکیت کتاب کا تحفہ نذر کیا گیا۔ جناب محمود شریف، محمود کے شکریہ پر مشاعرہ کا اختتام ہوا۔

۴ نومبر۔ ڈھائی بجے احمد منزل نامپلی میں ادارہ پاسبان ادب کے احیاء کے سلسلے میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرہ کی صدارت جناب داؤد نصیب نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب قمرالدین صابری (مدیر شاداب) سلیم عابدی اور حلیم بابر (محبوبنگر) نے شرکت کی۔ اس موقع پر مہمانوں کی گل پوشی بھی کی گئی جناب محمود شرفی کی نعت سے مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ صدر مشاعرہ داؤد نصیب اور مہمان خصوصی مسرز قمرالدین صابری، سلیم عابدی حلیم بابر کے علاوہ مسرز عزیز بھارتی، ساقی ایوبی، عزیز ناگپوری، ضیاء عرفان حسامی، الفت شرفی، غوث الدین ابرار، آرزو حیدرآبادی، لطیف الدین لطیف، محمود فریدی، ڈاکٹر رشید الحسن رشید، ساغر گولکنڈوی، فضل الرحمٰن فضل، طاہر شرفی اور رشید رہبر نے کلام سنایا اور داد تحسین پائی۔

اردو لکھیئے، اردو پڑھیئے، اردو بولیئے

نظم

مومن خان شوق
اشرف ولا ۲۴۳-۳-۱۱ملے پلی
حیدرآباد

نہرو

نہرو نئی سحر کے اُجالے کا نام ہے
ظلمت میں روشنی کے قبالے کا نام ہے
بے باک و دردمند جیالے کا نام ہے
اخلاص اور وفا کے شوالے کا نام ہے

نہرو جدید ہند کا معمارِ اوّلیں
وہ روشنی نواز، چمکتی ہوئی جبیں
وہ شانتی کا دوت ہے اور امن کا امیں
اور شخصیت میں سب سے دلآویز دلنشیں

نہرو حیات نو کی ایک ایسی کتاب ہے
جس کے ورق ورق پہ شگفتہ گلاب ہے
اس خانداں کا لطف و کرم بے حساب ہے
آزادیٔ وطن کا وہ زرّین باب ہے

••٭••

غزلیں

قاضی انصار
قاضی پورہ کھنڈوا (ایم پی) ۱...۴۵۰

بہتر ہے فکر کہ فکر و شعور پھیلائیں
زمانے بھر میں اے انصار نور پھیلائیں

ابھی تو بھوک کی شدت ہے پیاس کی تلخی
بتاؤ کس طرح کیف و سرور پھیلائیں

وہی تو مرکزی کردار ہیں کہانی کے
زمانے بھر میں کہانی ضرور پھیلائیں

وہ چند لوگ کہ جن کا وجود کچھ بھی نہیں
وہ شہر شہر فساد و فتور پھیلائیں

میں اُن کے نام سے انصار نہیں ہوں معروف
وہ اپنا نام بہت دُور دُور پھیلائیں

— : —

ڈاکٹر محبوب راہی
غلام نبی آزاد کالج۔ بارسی ٹاکی۔ ڈسٹرکٹ اکولہ
(ایم ایس)

آگ اور خون کی برسات نہ ہونے دینگے
عہد کر لیں کہ فسادات نہ ہونے دینگے

آپسی میل، رواداری، محبت، اخلاص
ختم اپنی یہ روایات نہ ہونے دینگے

جگمگائیں گے اُفق پر نئے سورج بن کر
روزِ روشن کو سیہ رات نہ ہونے دینگے

نام پر دھرم کے، ذاتوں کے، زبانوں کے کبھی
مشتعل قوم کے جذبات نہ ہونے دینگے

زہر ذہنوں کی فضاؤں میں جو پھیلاتے ہیں
اب کہیں ان کے بیانات نہ ہونے دینگے

جان جاتی ہے چلی جائے بلا سے لیکن
ہم اُصولوں کی کبھی مات نہ ہونے دینگے

راہی صاحب [illegible]

ماحولیات اور آب و ہوا

۱۹۷۲ء کے اسٹاک ہوم کانفرنس کے بعد اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام جسے مختصر طور پر یو این ای پی (UNEP) کہا جاتا ہے کی شروعات ہوئی۔ اس ادارہ کو قائم کرنے کا مقصد تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو ماحولیاتی مسائل ہیں ان کے متعلق لوگوں کو بتایا جاسکے اور انھیں حل کرنے کے لیئے کارگر قدم اٹھائے جاسکیں۔ یو این ای پی برابر اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں لگی ہے اور اس نے کئی قسم کے نئے پروگرام شروع کیئے تاکہ بین الاقوامی سطح پر ماحول کے تحفظ کے لیئے کارگر اقدام کیئے جاسکیں۔ اسی مقصد کو دھیان میں رکھتے ہوئے اقوام متحدہ نے یہ بھی فیصلہ لیا تھا کہ ہر سال ۵ رجون کو ماحولیات کا عالمی دن جسے مختصر طور پر (WED) ڈبلیو ای ڈی کہا جاتا ہے کی شکل میں منایا جائے گا۔ عالمی دن ساری دنیا کے لوگ ماحولیات کے متعلق سوچیں اور ایسے اقدام کریں جس سے ماحول کے تحفظ کا راستہ ہموار ہو۔ ہر سال عالمی دن کے لیئے یو این ای پی ایک خاص موضوع یا مرکزی خیال چنتی ہے اس موضوع کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے کہ ماحول کو فطری طور پر کس خطرے کا سامنا ہے اور لوگوں کا دھیان کس موضوع کی طرف دلانے کی ضرورت ہے ۱۹۹۱ء کے عالمی دن (۵ رجون ۱۹۹۱ء) کے لیئے "آب وہوا میں رونما تبدیلیاں اور عالمی پیمانہ پر شراکت" موضوع دیا گیا تھا۔ اس موضوع میں دو اہم باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہماری اس زمین کی آب وہوا میں

تبدیلی ہورہی ہے اور دوسری بات یہ کہ ان حالات سے نمٹنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عالمی سطح پر شراکت ہو یعنی عالمی تعاون کو بڑھایا جائے بغیر اس کے آب و ہوا میں تبدیلیوں کو نہیں روکا جاسکتا۔

اب جو سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین کی آب و ہوا کو کس طرح کا خطرہ ہے؟ آج سے تقریباً ایک سو سال قبل سائنسدانوں نے اس امر کی پیشن گوئی کی تھی کہ جلد ہی زمین کا درجۂ حرارت بڑھنے والا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اس خطرے سے آگاہ کیا تھا کہ زمین کے درجہ حرارت بڑھنے کا سیدھا اثر یہاں کی آب و ہوا پر پڑے گا اور اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتادیا تھا کہ آب و ہوا میں ہونے والی تبدیلیوں کو واپس کرنا پھر ممکن نہیں ہوسکے گا۔ حال کی سائنسی دریافتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو بات ایک صدی قبل کے سائنس دانوں نے کہی تھی وہ بالکل درست تھی۔ اس وقت ہماری زمین کا جو اوسط درجۂ حرارت ہے وہ صنعتی دور کے شروع ہونے کے قبل درجہ حرارت سے آدھا ڈگری سیلیس (CALSIUS) زیادہ ہے ساتھ ہی اس بات کا امکانات ہیں کہ اگر یہی رجحان رہا تو اکیسویں صدی کے آخر تک زمین کا اوسط درجۂ حرارت تقریباً ۳ ڈگری سیلیس بڑھ جائے گا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ زمین کا درجۂ حرارت کیوں بڑھا اور آگے بھی کیوں بڑھے گا۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ ہم گرین ہاؤس افیکٹ کو سمجھیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹھنڈے علاقوں میں پیڑ پودے اُگانے کے لیئے شیشے یا پلاسٹک کے بنے مکان کا استعمال کیا جاتا ہے انھیں گرین ھاؤس کہتے ہیں جو پیڑ پودے باہر نہیں اُگ پاتے وہ ان کے اندر اچھی طرح اُگتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب ان گرین ہاؤس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو وہ شیشے یا پلاسٹک کی چادر کو پار کر کے اندر پہنچ جاتی ہے اندر [redacted]

پہنچ جاتی ہے اندر جاکر وہ اندر ہی زمین اور ہوا کو گرم کردیتی ہے سویڈن کے سائنسداں آر ہینیس نے یہ بتایا تھا کہ فضاء میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بڑھے گی کیونکہ ہم کاربن' ایندھن جیسے کوئلہ' پٹرول' گیس وغیرہ کا استعمال بڑھا رہے ہیں اور اس کی وجہ سے زمین کا درجۂ حرارت بڑھے گا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر فضاء میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار دوگنی ہوگئی تو زمین کا درجۂ حرارت تقریباً چار ڈگری سیلیس بڑھ جائے گا۔ یہ سب انھوں نے ۱۸۹۶ء میں بتایا تھا اور آج جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آرہینس نے جو بات ایک صدی قبل بتائی تھی وہ درست تھی۔

فضاء میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے بڑھنے کی وجہ سے زمین کا درجۂ حرارت کیوں بڑھتا ہے یہ بات ہمیں سمجھنی ہوگی۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ فضاء میں اسی طرح کام کرتی ہیں جس طرح گرین ھاوس میں شیشہ یا پلاسٹک کی چادریں کرتی ہیں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ہماری زمین کی فضاء شروع سے ہی ایسی تھی۔ جیسے اب ہے؟ اور اگر نہیں تو اب اس میں تبدیلی کیوں آرہی ہے گرین ھاوس گیسوں کی مقدار کیوں بڑھ رہی ہے؟ آج سے کافی قبل زمین کی فضاء میں صرف نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ تھا۔ پھر فضاء میں تبدیلی آئی اور یہ موجودہ شکل میں آگئی جس سے زیادہ تر حصہ نائٹروجن اور آکسیجن کا ہے اور باقی گیس بہت کم مقدار میں ہیں۔ مثال کے طور پر کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار صرف ۳۴۰ پی پی ایم (PPM) ہے یعنی دس لاکھ میں صرف ۳۴۰۔ دوسری گیس اور بھی کم ہیں جب موجودہ فضاء بن گئی اور اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تو زمین پر اس وقت موجود جانداروں کا ارتقاء ہوا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ درجۂ حرارت میں ۰.۵ ڈگری کا جو اضافہ ہوا ہے

اور آگے جس میں اضافہ کی امید ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ہے فضاء میں گرین ہاؤس گیسوں کی مقدار میں اضافہ اور ساتھ ہی سٹریٹوسفیر کے اوزون میں کمی ۔ مثال کے طور پر ۱۸۲۵ء کے مقابلہ میں اس وقت جو کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار ہماری فضاء میں ہے وہ تقریباً ۳۰ فیصد زیادہ ہے۔ میتھین کی مقدار فضاء میں ہر سال ایک سے دو فیصد کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اسی طرح نائٹرس آکسائیڈ اور کلورو کاربن کی مقدار بھی فضاء میں بڑھ رہی ہے۔ اگر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو درجۂ حرارت اور بھی زیادہ بڑھے گا۔ اگر ہم صرف ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کی طرف دھیان دیں تو دیکھیں گے کہ ان بیس سالوں میں جو آبادی بڑھی ہے وہ تقریباً ۱ر۶ بلین ہے اور یہ تعداد ۱۹۰۰ء میں اس زمین پر بسنے والوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہے اس وقت زمین پر ہماری آبادی تقریباً ۵ر۳ بلین ہے اور رواں صدی کے آخر تک تعداد ۶،۳ بلین تک پہنچ جائے گی۔
جب سے صنعتی دور اور بالخصوص ترقی کا دور شروع ہوا ہے ہماری ضروریات بڑھی ہیں اور ان کو پورا کرنے کے لئے نئی نئی صنعتیں، مواصلات کے ذرائع شہر گاؤں نئے کھیت وغیرہ بنائے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم کوئلہ، تیل گیس، لکڑی اور دوسرے قسم کے ایندھن کا استعمال بہت زیادہ کر رہے ہیں جو کوئلہ، تیل یا گیس لاکھوں کروڑوں سال میں قدرت نے بنایا تھا انھیں ہم کچھ سالوں میں خرچ کر رہے ہیں ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کی رفتار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مثال کے طور پر ہر سال قریب ۵ر۷ بلین ٹن کاربن ہماری فضاء میں اس وقت جا رہا ہے اس میں سے ۸۰ فیصد کوئلہ، گیس، پٹرول وغیرہ جلنے کی وجہ سے ہے اور باقی ۲۰ فیصد جنگلات کے کٹنے کی وجہ سے
پچھلے سو دو سو سال میں جنگلات کے کٹنے کی رفتار بھی بہت تیز رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دو دہائیوں میں ہم تقریباً ۲۰۰ ملین ہیکٹ جنگل ختم

لکڑی لے۔ جنگل کے کٹنے کا اثر دو طرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف تو پیڑ پودوں
کے جسم میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ بن کر فضا میں جاتا ہے دوسری طرف یہ
پیڑ پودے فوٹو سنتھیسس (PHOTO SYNTHESIS) کے عمل کے ذریعہ
جو کاربن ڈائی آکسائیڈ استعمال کرتے اور آکسیجن میں بدلتے اس کے امکانات بھی
ختم ہو گئے۔

اسی طرح زراعت کی وجہ سے اور دوسرے عمل کی وجہ سے نائٹرس آکسائیڈ
کی مقدار فضا میں بڑھ رہی ہے یہ گیس ایندھن کے جلنے کے دوران بھی بنتی ہے اور
یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ نائٹرس آکسائیڈ کی جو مقدار فضا میں
بڑھ رہی اس کا تناسب تقریباً وہی ہے جو ایندھن جن کا ہم استعمال کر
رہے ہیں ان میں موجود نائٹروجن کا ہے میتھین کی مقدار ہماری فضا میں
سولہویں صدی کے مقابلہ میں دوگنی ہو گئی ہے

آپ کو یہ جان کر شائد تعجب ہوگا کہ ۱۹۹۰ء ہماری زمین کا گرم ترین
سال رہا ہے جب سے ہمارے پاس درجہ حرارت کا ریکارڈ موجود ہے دس
چھ سال صرف ایک دہائی یعنی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں گنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری
زمین لازمی طور پر گرم ہو رہی ہے ابھی ہم ہر سال تقریباً ۲۴ بلین ٹن مٹی کھو
رہے ہیں اور صرف پچھلی دو دہائی میں قریب ۱۲۰ ملین ہیکٹر علاقہ ریگستان
میں تبدیل ہوا ہے اگر یہ سب اور بھی تیزی سے ہوا تو زمین پر رہنے والے
کروڑوں لوگوں کے لیے خوراک کی فراہمی ناممکن ہو جائے گی۔

زمین کے درجہ حرارت بڑھنے کی وجہ سے پہاڑوں پر اور قطبی علاقوں میں
موجودہ برف زیادہ تیزی سے پانی میں تبدیل ہوگا اس وقت اسے دیکھتے
ہیں کہ ۱۹۸۰ء سے ہی برف کے پگھلنے کی رفتار ہر جگہ تیز ہو گئی ہے جب برف تیزی سے
پانی میں تبدیل ہوگا تو سمندر میں پانی کے پہنچنے کی مقدار بڑھ جائے گی نتیجہ کے طور

پر سمندر کی سطح اوپر اٹھے گی۔ سمندر کے پانی کے زمینی علاقے میں داخل ہونے سے زیر زمین پانی کافی دور تک کھارا ہو جائے گا۔ اور پینے کے پانی کی کمی ہو جائیگی ہماری صحت کے لیئے بھی طرح طرح کی مشکلات بڑھ جائیں گی بہت سارے جراثیم کی پیداوار بڑھ جائے گی بیماریاں زیادہ ہوں گی اور آسانی سے علاج نہیں ہو سکے گا۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت جو گرین ھاوس گیز فضاء میں جاری ہیں ان کا ۷۵ فیصد روس، امریکہ اور یورپ کے ذرائع سے ہے باقی کے سارے ممالک ۲۵ فیصد کے ذمہ دار ہیں۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ یہ ترقی یافتہ ممالک گرین ھاوس گیز کی پیداوار کو فوراً گھٹانے کے لیئے اقدام کریں جب تک کہ ہماری دنیا کے ممالک اور لوگ مل کر یہیں کام کریں گے ہم اپنی آب و ہوا کو تباہی سے بچا سکیں گے۔ اگر ہم نے بین الاقوامی سطح پر، قومی سطح پر اور ذاتی سطح پر صحیح وقت پر اقدام نہیں کیئے تو خود ہمارا یعنی اشرف المخلوقات کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ یو۔این۔ای۔پی ہمیں اسی بات سے آگاہ کرنا چاہتی ہے ▲▲
